CS CamScanner

میرے ہمدم میرے دوست

گیٹ پر بیل ہوئی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر اپنے کمرے میں کھڑے ہوئے بھی اس نے بیل کی آواز بہت آسانی سے سن لی تھی۔

اب وہ اپنے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھالتے ہوئے ایک آخری نگاہ اس گھر پر ڈال رہی تھی۔ یہ گھر جہاں اس کا بچپن گزرا، جہاں وہ زندگی کے کتنے سارے سال اپنی ماں کے ساتھ رہی اور جہاں اس کی ماں نے اپنی بیماری کا سخت ترین وقت گزارا اور پھر اسی گھر میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ پرسوں صبح ہی کی تو بات تھی۔ صبح کے چار بجے انہوں نے زندگی سے شکست کھائی تھی۔ بیڈ پر بچھی ہوئی چادر بھی وہی تھی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ پاس پڑی میز پر ابھی تک ان کی دوائیاں رکھی تھیں۔ کل رات میں بھائی نے اس کا سارا سامان پیک کیا تھا۔ اس کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان۔

وہ چپ چاپ بیڈ پر بیٹھی انہیں اپنا سامان پیک کرتا دیکھتی رہی تھی۔ امی کی دوائیاں، ان کے مختلف ٹیسٹس کی رپورٹس، ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے فون نمبرز، یہ سب جو پچھلے دو سالوں سے اس کی زندگی کے ساتھ جڑے تھے اب بالکل بے معنی ہو چکے تھے۔

محض چند گھنٹوں میں بھائی نے اس کا سامان پیک کر ڈالا تھا۔ اس گھر میں ایسا تھا بھی کیا جو وہ ساتھ لے کر جا سکتی۔ وہ پرانے زمانے کا فرنیچر جسے وہ زبردستی جھاڑ پونچھ کر صاف کرنے کے جتن کیا کرتی تھی یا کچن میں

CamScanner

موجودہ وہ بالکل سستی سی کراکری جو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی اچھے اور معزز مہمان کی آمد کے موقع پر اسے پرتکلف چائے ہی پیش کی جاسکے۔

کتنے سارے خواب تھے اس کے۔ وہ گریجویشن کے بعد کہیں جاب کرے گی اور ساتھ ہی پرائیویٹ ایم اے کی بھی تیاری کرے گی۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتی جائے گی۔ اپنے اس گھر کا وہ نقشہ بدل دے گی مگر وہ کچھ بھی نہیں بدل پائی تھی۔

اس کے بی اے کے پہلے سال کے امتحان چل رہے تھے جب امی بیمار ہو گئی تھیں۔ ان کی سب جمع پونجی ان کے علاج میں خرچ ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ امی کا سارا زیور جو انہوں نے زندگی میں مشکل سے مشکل وقت آنے پر بھی کبھی بیچنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا وہ تک اس نے ان کے علاج کی خاطر بیچ ڈالا تھا۔

یہ زیورات ان کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ سوچتی تھی امی ٹھیک ہو جائیں گی پھر میں انہیں زیور بیچنے کے بارے میں بتاؤں گی۔ وہ بہت ناراض ہوں گی یہ سوچ کر فکر مند ہوں گی کہ میری شادی کے لیے ان زیورات کے علاوہ ان کے پاس اور تو کوئی چیز ہی نہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ میں انہیں منالوں گی لیکن زندگی نے یہ موقع ہی نہیں آنے دیا تھا۔ اب اس گھر میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں بچی تھی جو وہ اپنے ساتھ لے جاسکتی' سوائے ان یادوں کے جن میں اس کی ماں تھی وہ خود تھی اس کا بچپن تھا۔

ایک سوٹ کیس اور ایک ہینڈ بیگ یہ اس کی کل متاع تھی اور یہ سامان باقر بھائی پہلے ہی نیچے لے جاچکے تھے۔ زینت خالہ' بھابھی' باقر بھائی اور عارف بھائی سب اس کے لیے فکرمند تھے۔ وہ جانتی تھی ان سب کو اس سے بہت زیادہ ہمدردی ہے۔ وہ اس کا خیال کر رہے ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ان مشکل ترین دنوں میں اسے بہت سہارا دیا تھا۔ آج صبح بھی ان کا دل رکھنے کی خاطر اس نے چائے کے چند گھونٹ لیے تھے۔ انہوں نے اس کے ساتھ ناشتا کیا تھا۔ اسے اس بات پر دلاسا دینے کی کوشش کی تھی کہ کیا ہوا اگر اس کی ماں اس سے چھن گئی ہے تو؟ اس کا سگا باپ زندہ ہے اور اب وہ اپنے باپ کے پاس جا رہی ہے۔ اپنے اس باپ کے پاس جسے اس نے زندگی میں ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا جو اس کے نزدیک اتنی سی اہم بھی نہیں تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے خود آتا۔

اسے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یقیناً کوئی اسے بلانے اوپر آرہا تھا۔ اس نے ایک آخری حسرت بھری نگاہ ان در و دیوار پر ڈالی جو کل تک اس کا گھر تھا ساری دنیا میں اس کے لیے سب سے پیاری جگہ' کہیں بھی جاتی یہاں واپس آنے کے لیے اس کے قدم خوشی خوشی اٹھا کرتے تھے۔

"ایمن! وہ آگئے ہیں تمہیں لینے۔" بہت تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے سے بھابی کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ جواب میں کچھ بولے بغیر خاموشی سے ان کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"حوصلہ کرو ایمن! تم کہیں انجان لوگوں میں تو نہیں جا رہیں۔ اپنے باپ کے پاس جا رہی ہو اور پھر کراچی جیسے شہر میں جا رہی ہو۔ وہاں کی تیز رفتار بھاگتی دوڑتی زندگی اور چکاچوند میں دیکھنا کتنی جلدی تمہارا دل لگ جائے گا۔"

اس نے اسی خاموشی مگر تفکر آمیز نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا۔ امی کی بیماری کے ان دو سالوں میں زینت خالہ اور ان کے گھر کے تمام افراد نے اس کا اور امی کا بہت ساتھ دیا تھا حالانکہ ان کا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یہ ماں بیٹی ان لوگوں کی صرف کرایہ دار تھیں۔ کبھی رات میں امی کی حالت بگڑتی تو باقر بھائی یا عارف بھائی میں سے کوئی جا کر ٹیکسی لے آتا اور پھر اس کے ساتھ ہسپتال بھی چلا جاتا۔

وہ زینت خالہ اور ان کے گھر کے ایک ایک فرد کی احسان مند تھی۔

وہ بھابھی کے ساتھ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سامنے ہی صوفے پر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جسے اس کے باپ نے اسے لینے کے لیے بھیجا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ خود میں اتنی قوت پیدا کر پائی تھی کہ آنسوؤں کو پیچھے دھکیل کر اسے سلام کرے۔

"السلام علیکم۔" اس نے اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ اس کی آمد سے قبل باقر بھائی سے کوئی بات کر رہا تھا ان کے ساتھ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے فوراً اسی صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"آپ تیار ہیں؟" اس کا مہذب سا لہجہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ جلدی جلدی باقر بھائی اور زینت خالہ سے الوداعی کلمات کہنے لگا تو وہ دونوں ہی اسے چائے وغیرہ کے لیے روکنے پر اصرار کرنے لگے۔ ان لوگوں کے بے تحاشا اصرار کے جواب میں بھی وہ رکنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے انداز میں بہت عجلت تھی۔ ایسے جیسے وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا اور اس کے اس انداز کو محسوس کرنے کے باوجود بھی باقر بھائی اور زینت خالہ اس سے رکنے پر اصرار کر رہے تھے۔

پیسے میں اتنی ہی طاقت ہوتی ہے۔ اس شخص کا ہر ہر انداز پکار پکار کر اس کی امارت کا اعلان کر رہا تھا۔ اس کا لباس' اس کی نشست برخاست' اس کی گفتگو' گیٹ کے باہر کھڑی اس کی قیمتی گاڑی۔ اگر وہ کوئی معمولی سا آدمی ہوتا' معمولی سی گاڑی میں آیا ہوتا تو اس غرور اور تکبر کے مظاہرے کے بعد وہ لوگ اس سے رکنے کے لیے ذرا سا بھی اصرار نہیں کرتے۔

پانچ منٹ کے اس اصرار اور انکار کے بعد وہ سب لوگوں سے خدا حافظ کہتے ہوئے گیٹ تک آگئی۔ گھر کے سب افراد اسے گیٹ تک الوداع کہنے آئے تھے۔ زینت خالہ' بھابھی' گڑیا سب اس سے گلے لگ کر رو رہے تھے۔ کراچی جا کر ان لوگوں سے رابطہ رکھنے کے وعدے لے رہے تھے اور وہ اتنی دیر میں باقر بھائی کے ہاتھ سے اس کا سوٹ کیس لے کر گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولے وہ اپنی گاڑی کے پاس کھڑا اس کے فارغ

CamScanner

ہونے کا منتظر تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے سب لوگوں نے ایمن کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کیا۔ اس نے بھی جواباً زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا تھا۔

اسے پرسوں شام باپ کے ساتھ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو بھی یاد آ رہی تھی جس کے دوران یہ شخص بھی اس کے باپ کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ امی کی تدفین کے بعد پڑوسیوں اور چند دوسری جان پہچان والی خواتین کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔

وہ اس قیمتی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھی خود کو اپنے گھر سے' اپنے لوگوں سے' اپنے شہر سے دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے تصور میں اس کی ماں کی بالکل تازہ قبر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کوئی وہاں جا کر فاتحہ پڑھا بھی کرے گا کہ نہیں؟ وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی اور بہت کچھ سوچے بھی جا رہی تھی۔

وہ جن لفظوں میں ہمدردی کر رہی تھیں اور جس طرح اس کے ہولناک مستقبل کی تصویر کشی کر رہی تھیں ان کی باتیں سنتے ہوئے مسلسل اس بات پر رو رہی تھی کہ اب وہ دنیا میں اکیلی کس طرح جیے گی۔

اسے ان لوگوں کی باتوں سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ بہت دہشت ہو رہی تھی مگر وہ انہیں چپ نہیں کرا سکتی تھی۔ اسی وقت بھابھی کے ساتھ پیچھے آ گئی تھی۔ زینت خالہ فون پر بات کر رہی تھیں۔

"ایمن آ گئی ہے۔ آپ اس سے بات کر لیں۔" اسے آتا دیکھ کر انہوں نے ان سے کہا اور پھر ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولیں۔

"تمہارے والد کا فون ہے۔" اس نے ریسیور ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے باپ سے بات کرنے جا رہی تھی لیکن نہ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور نہ وہ کسی قسم کی خوشگواریت محسوس کر رہی تھی۔

اس نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے ریسیور کان سے لگا کر انہیں سلام کیا۔ اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس ایک فون کال کا اس کی ماں کو کتنی شدت سے انتظار تھا۔

اپنی زندگی کے آخری بیس بائیس دن انہوں نے اسی فون کال کا انتظار کیا تھا۔ اس کے سلام کا انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ زینت خالہ انہیں امی کے انتقال کی خبر پہلے ہی دے چکی تھیں اس لیے اب وہ آگے کی بات کر رہے تھے۔

"میں اور الماس آج رات امریکہ جا رہے ہیں۔" اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد انہوں نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ وہ ان کے منہ سے اتنی غیر متوقع بات سن کر ساکت رہ گئی۔ اس شخص سے اس نے زندگی میں کبھی کوئی امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں لیکن پھر بھی اتنا غیر انسانی رویہ اس کے دل کو شدید تکلیف سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ عورت اگر ان کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی تب بھی وہ ان کی بیٹی کی ماں تو تھی۔ کیا ایک انسانی زندگی اتنی سی بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے نہ اس کی ماں کے مرنے پر کوئی تعزیتی جملہ بولا اور نہ زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی سے مخاطب ہونے پر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

"حیدر! تمہیں کل حیدرآباد جانا ہے نا؟" کچھ دیر بعد اس نے ان کی آواز سنی۔ وہ اب اس سے مخاطب نہیں تھے۔ وہ غالباً اپنے قریب موجود کسی فرد سے کوئی بات کر رہے تھے۔ وہ شخص یقیناً بالکل پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ اس کا جواب بھی اس نے بالکل واضح طور پر سنا تھا۔

"جی توفیق بھائی! کل شام میں جانا ہے اور شادی میں شرکت کر کے رات میں ہی واپسی کا ارادہ ہے۔" وہ چپ چاپ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

وہ دونوں اب آپس میں جو بھی بات کر رہے تھے وہ اسے سن نہیں پا رہی تھی۔ چند سیکنڈز بعد اس نے دوبارہ اپنے باپ کی آواز سنی۔ وہ اب اس سے مخاطب تھے۔

"پرسوں صبح حیدر تمہیں لینے آئے گا۔ حیدر مسعود۔ کل کا دن تمہیں مل رہا ہے اس میں اپنی ساری پیکنگ کر لو جب تک میں اور الماس امریکہ سے واپس نہیں آ جاتے' تم حیدر کے گھر پر ہی رہو گی۔ پریشان مت ہونا' میں امریکہ سے جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

پتا نہیں اس کی پریشانی کا خیال انہیں کیونکر آ گیا تھا یا پھر شاید یہ جملہ یونہی اخلاقاً بولا گیا تھا۔ اگر اس نے اپنی مرتی ہوئی ماں سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اسی وقت فون پر اس شخص کو جو اس کا باپ تھا خود پر یہ عظیم الشان احسان کرنے سے روک دیتی۔

وہ کہیں بھی چلی جاتی اسی گرلز ہوسٹل میں یا کہیں بھی' مگر اس شخص کا احسان کبھی قبول نہ کرتی' مگر اس شخص کو خط لکھنے کے بعد اس کی ماں نے ان گزرے تمام دنوں میں ہر روز اس سے ایک ہی بات کہی تھی۔

"ایمن! میرے بعد تم توفیق کے پاس چلی جانا۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ تم تنہا کیسے رہو گی۔ وہ تمہارا باپ ہے۔ اسے اگر بہت محبت نہیں بھی کرے گا تب بھی وہاں تم محفوظ تو ہو گی۔"

ان بیس بائیس دنوں میں انہوں نے ہر روز اس سے یہ وعدہ لیا تھا۔ اپنی قسم دے کر' اپنی محبت کا واسطہ دے کر۔ وہ جیسے اس بات سے بخوبی آگاہ تھیں کہ وہ اپنے باپ سے کتنی سخت نفرت کرتی ہے۔ اسی لیے اتنی شدت سے ہر روز اس سے وعدہ لیا کرتی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ امی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی' وہ دونوں زندگی میں کبھی تنہا ہوں گی اور نہ ہی اسے کسی دوسرے فرد کے پاس جانے کی کوئی ضرورت پیش آئے گی۔

مگر امی اسے اپنے وعدے کا پابند بنا کر مجبور کر گئی تھیں اور اب جب وہ اس اجنبی شخص کے برابر گاڑی میں بیٹھی تھی تو اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن اس شخص کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ نجانے وہ اس کے باپ کا کیا لگتا تھا۔ بہرحال ان دونوں کا آپس میں جو بھی تعلق تھا وہ شخص اس کے بارے میں یہ تو ضرور سوچ رہا ہو گا کہ معلوم نہیں اس کی ماں میں ایسی کیا خرابی تھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے باپ کا دل بیوی کی طرف سے صاف نہیں ہوا۔

کتنا حقیر اور کمتر سمجھا ہو گا اس نے اسے' جس لڑکی کی اس کے باپ کے نزدیک محض اتنی ہی اہمیت ہو کہ وہ اسے اپنے پاس بلانے کے لیے کسی انجان آدمی کو بھیج دے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے خود کو رونے سے روکنے کی

CamScanner

کوشش کرتے کرتے وہ اس کے برابر میں گاڑی میں بیٹھتے ہی خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے اور رونے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس پل آنسوؤں پر بند باندھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے اپنا منہ پورا کا پورا کھڑکی کی طرف کر لیا۔

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ کوئی سسکی کوئی آواز اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی کھڑکی سے باہر سڑک پر نظریں جمائے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ خود کو رونے سے نہیں روک سکی تھی تو کم از کم اپنے برابر بیٹھے شخص سے اپنا رونا تو چھپا ہی سکتی تھی۔

یونہی خاموشی سے بے آواز آنسو بہاتے اسے نجانے کتنی دیر گزری ہوگی جب اچانک اس نے اس شخص کی آواز سنی۔ وہ اس سے مخاطب تھا۔ بڑی سرعت سے بہت احتیاط اور بڑی بے ساختگی میں اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ جلدی سے صاف کیا۔ محض دو سیکنڈز کے اندر اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف سے اپنا منہ ہٹایا اور اپنی سیٹ پر بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آپ پانی پی لیجیے۔" اس نے اپنا جملہ دہرایا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا نگاہیں ونڈ اسکرین پر تھیں اور دوسرا ہاتھ جو اس نے اس کی طرف بڑھایا ہوا تھا اس میں منرل واٹر کی بوتل تھی۔ وہ اتنا لاتعلق بھی نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھے بغیر وہ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ ذہین تھا یا شاید اس کی حسیات بہت تیز تھیں یا پھر شاید وہ اس وقت اس بے چاری اور مجبور لڑکی سے سوائے رونے کے کسی اور بات کی امید ہی نہیں رکھتا تھا۔

اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے لی۔ اس نے ایک بار بھی ایمن کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ اسی طرح ڈرائیونگ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے پانی کی بوتل لے لینے پر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اسٹیئرنگ پر رکھ لیا۔ بوتل کھول کر اس نے اسے جلدی سے منہ سے لگایا۔ بغیر سانس لیے وہ پانی کے کتنے ہی گھونٹ پی گئی۔ بوتل بند کرتے ہوئے اس نے خود کو تھوڑی دیر پہلے والی کیفیت کے مقابلے میں خاصا بہتر محسوس کیا۔

"آپ چائے پئیں گی؟" اس کی نگاہیں بدستور ونڈ اسکرین پر تھیں۔ اس کے لیے جیسے شیشے سے اس پار نظر آتی سڑک اور آگے پیچھے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں اور بسوں کے علاوہ دوسری کوئی چیز دیکھے جانے کے لائق نہیں تھی۔

ایمن نے بوتل اس کی طرف بڑھائی تو اس نے بوتل ہاتھ میں لینے کے لیے پل کی پل ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں ہٹا لیں۔

"شکریہ میں نے چائے گھر پر پی لی تھی۔" اس کا لہجہ ابھی بھی اس کے آنسوؤں کی چغلی کھا رہا تھا۔

"تکلف مت کریں۔ چائے کے لیے خاص طور پر کہیں رکنا نہیں پڑے گا۔ میرے پاس تھرماس میں چائے ہے۔" اس نے دوبارہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھے تھرماس کی طرف اشارہ کیا۔

"میں تکلف نہیں کر رہی۔" اس کے بہت ہی مہذب اور شائستہ قسم کے لہجے کے جواب میں اس نے آہستگی سے کہا۔ اس نے مزید اصرار نہیں کیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس سے لاتعلق ہو کر ڈرائیونگ میں مگن ہو چکا تھا۔

کم از کم اس سفر کے دوران اس اجنبی کے برابر بیٹھ کر تو وہ اب ہرگز بھی نہیں رونا چاہتی تھی اسی لیے اب وہ قصداً ایسی باتیں سوچنے لگی تھی جنہیں سوچتے ہوئے اس کا ذہن ماضی حال اور مستقبل کی الجھنوں سے باہر آ جائے۔

حیدرآباد اور کراچی اتنے قریب ہیں یہ بات اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ جانی تھی۔ وہ اپنی کولیگ سے باقر بھائی سے اور بعض دوسرے جاننے والوں سے اکثر کراچی کے تذکرے سنا کرتی تھی۔ وہ بہت سالوں سے جانتی تھی کہ اس شہر میں اس کا باپ رہتا ہے پھر بھی کبھی اس کا دل نہیں چاہا تھا یہاں آنے کو۔ آج جب اس شہر میں آئی تھی تو بھی اس کا دل وہیں اس کے پیارے شہر کی گلی کوچوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اس کے برابر میں بیٹھا شخص اس مختصری گفتگو کے بعد باقی سارا راستہ اس سے یکسر لاتعلق تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ خود وہ اپنی گود میں دھرے دونوں ہاتھوں پر نگاہیں جمائے اس نئے شہر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گاڑی اب ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے نظریں دوڑا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کوئی پوش علاقہ تھا۔ بہت بڑے بڑے مکانات جن کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور گیٹ بھی بہت بڑے تھے۔ وہ ان گھروں کو باہر سے دیکھ کر ہی ان میں رہنے والے مکینوں کی امارت کا اندازہ کر سکتی تھی۔ ان ہی پرشکوہ مکانات میں سے ایک سیاہ گیٹ والے مکان کے سامنے لا کر اس نے گاڑی روک دی۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی چوکیدار نے فوراً گیٹ وا کیا۔ اس شاندار مکان کے وسیع و عریض پورچ میں پہلے ہی سے تین گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔ ایک ملازم ٹائپ بندہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے مالک کے پاس آیا۔

"گاڑی میں سے سوٹ کیس نکال کر کمرے میں رکھ آؤ۔" اس نے ملازم کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گاڑی کی چابیاں اس کے ہاتھ میں پکڑائیں۔ ملازم سر ہلاتا ہوا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

"آئیے ام ایمن۔" اب کی بار وہ اس سے مخاطب تھا۔ براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔

"ام ایمن۔" اس نے خود بہت تعجب سے اپنا نام دہرایا۔ یہ اس کا پورا نام تھا یہ اس کا اصلی نام تھا۔ مگر اس کے گرد موجود لوگوں میں سے کوئی بھی اسے اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔

آج پہلی مرتبہ کسی نے اسے اس طرح اس کے پورے نام کے ساتھ مخاطب کیا تھا۔ اسے اپنا نام اس طرح لیا جانا بڑا اجنبی سا لگا۔

"آئیے۔" وہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے ایک بااخلاق میزبان کی طرح مہمان کو پہلے اندر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس گھر کا لاؤنج تھا یا ڈرائنگ روم وہ ایک نظر میں اندازہ نہیں کر سکی۔ اسے بس اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ وہ کمرہ بڑی خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کو اندر

CamScanner

داخل ہوتا دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"ام ایمن! یہ میری بی بی ہیں۔ میری پھوپھی ہیں میں انہیں بی بی بولتا ہوں۔" اس نے ان خاتون کا اس سے تعارف کروایا جب کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ غالباً وہ اپنے گھر میں ایک بن بلائے مہمان کی آمد سے پہلے ہی باخبر تھیں۔ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے انہیں سلام کیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان لوگوں کا اس کے باپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ اسے انہیں کیا کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے۔

"بہت افسوس ہوا بیٹا! تمہاری والدہ کے بارے میں سن کر۔" اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر میں صوفے پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے بہت افسوس سے کہا۔

وہ راستہ بھر خود کو ہر قسم کی سوچوں سے بچا کر رونے سے روکتی آئی تھی مگر اس وقت ان کے تعزیتی جملے نے یک دم ہی اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر آنسو بھر دیے۔

"میرا خیال ہے آپ اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو لیں۔" وہ اس کے اور بی بی کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھا اسی سے مخاطب ہوا۔

"بی بی! آپ نے ایمن کے لیے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا؟" اس نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بی بی سے دریافت کیا تو انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کل شام میں ہی پروین سے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا۔ آؤ بیٹا! میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو لو پھر لنچ کریں گے۔"

وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں آ گئیں۔ اس کے سوٹ کیس اور بیگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔

وہ کمرہ بھی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔

"جب تک توفیق اور الماس واپس نہیں آ جاتے تم ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہو گی۔ اس گھر کو بالکل اپنا گھر سمجھ کر رہنا۔ تکلف کرنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے یا حیدر سے بے جھجک بولنا۔" اسے سی آن کرتے ہوئے انہوں نے اسی محبت بھرے انداز میں اس سے کہا۔ وہ جواباً خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"اچھا اب میں باہر جا رہی ہوں۔ تم فریش ہو لو۔ وہ سامنے باتھ روم ہے۔" اس کے گال ہولے سے چھوتے ہوئے انہوں نے اسے اس طرح مخاطب کیا جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو۔

یہ کون لوگ تھے؟ یہ اس کی اتنی پروا کیوں کر رہے تھے؟ جب اس کے سگے باپ کو اس کی کوئی پروا نہیں تو انہیں کیوں تھی؟ یا پھر اس کا باپ ان لوگوں سے یہ بات کہہ کر گیا تھا کہ میری بیٹی کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ کس بات کو صحیح سمجھے وہ کس بات کو غلط سمجھے۔ اب اس کمرے میں اسے روتا ہوا دیکھنے والا کوئی بھی موجود نہیں تھا اسی لیے وہ پوری آزادی کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس شاندار ڈبل بیڈ پر بیٹھی وہ اپنے گھر کے کونے کونے کو یاد کر کے رو رہی تھی۔

یونہی روتے ہوئے اسے شاید پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے بہت گھبرائے ہوئے انداز میں جلدی جلدی دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

"السلام علیکم۔" مسکراتے ہوئے اس نے کہا پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی مزید گویا ہوئی۔

"مجھے بی بی نے یہاں بھیجا ہے تاکہ میں سوٹ کیس میں سے نکال کر آپ کے سارے کپڑے الماری میں رکھ دوں اور اگر ابھی پہننے والے کپڑے آپ کو استری کروانے ہیں تو وہ بھی مجھے دے دیں۔" وہ کمرے کے اندر آ گئی۔

وہ اسے یہ بات بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے زندگی بھر کبھی اپنا کوئی کام کسی ملازم سے نہیں کروایا۔ اس کی زندگی میں ان چیزوں کا کہیں کوئی گزر رہا ہی نہیں۔ اسے اپنے کپڑے خود دھونے اور خود استری کرنے کی عادت تھی بلکہ صرف دھونے اور استری کرنے ہی کیوں وہ تو اپنے کپڑے سیتا بھی خود کرتی تھی۔ اس لیے کہ کسی درزی سے کپڑے سلوانا وہ افورڈ کر نہیں سکتی تھی۔

"میرا نام پروین ہے۔ میں شروع ہی سے یہیں پر کام کرتی ہوں بلکہ میں تو پیدا ہی اسی گھر میں ہوئی ہوں۔ میری اماں بھی یہیں پر کام کرتی ہے۔ ابا میرا گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ وہاں حیدر بھائی کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔" وہ سوٹ کیس میں سے اس کے کپڑے باہر نکالتے ہوئے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔

"بی بی نے کل مجھے آپ کے آنے کے بارے میں بتایا تھا۔ ویسے تو اپنی طرف سے میں نے یہاں پر ضرورت کی سب چیزیں رکھ دی تھیں، پھر بھی اگر کوئی چیز کم ہے تو آپ مجھے بتا دیں۔" الماری میں اس کے کپڑے رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی بلا کی باتونی تھی۔ اس کی مسلسل خاموشی بھی اسے خاموش ہونے پر مجبور نہیں کر رہی تھی۔

"بہت شکریہ فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" بڑی مشکلوں سے خود کو بولنے پر آمادہ کر کے اسے جواب دیتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی تو پروین وہاں سے جا چکی تھی۔ دس منٹ بعد دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی اسی مسکراہٹ سمیت۔

"آپ کا کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔" یہ اس کا گھر نہیں تھا جہاں وہ اپنی مرضی چلاتی۔

"مجھے بھوک نہیں، میرا کھانا کھانے کا موڈ نہیں۔"

قسم کا کوئی بدتمیز سا جملہ بول سکتی۔ وہ یہاں مہمان تھی۔ اسے یہاں ہر طرح کی اخلاقیات نبھانی تھیں۔ اسے یہاں سب کا بہت زیادہ خیال رکھنا تھا۔ وہ شانوں پر دوپٹہ ٹھیک سے پھیلاتی ہوئی پروین کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ ان کے اصرار کے باوجود بھی اس کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے اس میز پر سجی انواع و اقسام

CamScanner

کی ڈشز کو دیکھ کر بھی بھوک کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ کھائے گی تو اسے الٹی ہو جائے گی۔

"پی پی! لگتا ہے آج کھانا آپ نے خود بنایا ہے۔" حیدر کی بات پر بی بی نے اس پر سے اپنی توجہ ہٹائی۔

"ہاں یہ سلاد اور مچھلی میں نے خود بنائی ہے۔" ان کے جواب پر وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

"پتا تھا مجھے کہ آج لنچ پر آپ میرے لیے کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے ضرور بنائیں گی۔ کتنے سارے دنوں بعد آج ہم چھٹی کا دن ساتھ گزار رہے ہیں۔ وہاں واصف مجھ سے ولیمہ میں شرکت کے لیے بہت اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا اتنے دنوں بعد تو آج چھٹی کا دن میں بی بی کے ساتھ گزارنے والا ہوں، ولیمہ کی وجہ سے رک گیا تو یہ سنڈے بھی یونہی گزر جائے گا۔"

دونوں اب آپس میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے اس شادی کے بارے میں پوچھ چکی تھیں جس میں شرکت کے لیے وہ حیدرآباد گیا تھا۔ وہ مختلف لوگوں کے نام لے کر ان کی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ وہ منظر سے ہٹ جانے پر خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ بی بی کی ساری توجہ اب حیدر کے ساتھ گفتگو میں تھی۔ درمیان میں اخلاقاً وہ کوئی نہ کوئی ڈش اس کے پاس رکھ تو رہی تھیں مگر پہلے کی طرح بغور نہیں ہو رہی تھیں۔ اسے پتا نہیں کیوں یونہی وہم سا ہوا کہ اس نے جان بوجھ کر بی بی کی توجہ اس پر سے ہٹوائی ہے۔ کھانا ختم کر کے جب حیدر اپنی کرسی سے اٹھا تو بی بی نے اپنی پلیٹ پیچھے سرکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے بالکل بھی ٹھیک طرح کھانا نہیں کھایا۔" وہ اس کے لیے یوں فکرمند ہو رہی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ وہ جواب میں کچھ بولے بغیر ان کی طرف دیکھ کر اخلاقاً مسکرائی۔

حیدر ڈرائنگ روم سے باہر جا چکا تھا۔

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو ایمن...... میرا خیال ہے تھوڑی دیر سو جاؤ۔ اس سے تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے بے پناہ سا پیار موجود تھا۔ وہ جیسے سمجھ رہی تھیں کہ ماں کے مرنے کے اس تیسرے دن میں وہ کس طرح کی اذیت اور دکھ سے گزر رہی تھی۔

ان کے کہنے پر کمرے میں آ تو گئی تھی لیکن بیڈ پر لیٹنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی سوچیں جگہ بنائے ہوئے تھیں۔ کبھی وہ ماں کے بارے میں سوچنے لگتی، کبھی اپنے باپ کے بارے میں، کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں، زندگی میں آگے کیا ہونے والا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل کو اتنی ساری فکریں لاحق تھیں کہ وہ سونے اور آرام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اتنی دیر میں اس کے بیٹھنے کے انداز میں بھی ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس طرح ایک ہی جگہ جم کر بیٹھنے سے اس کا پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ صوفے پر سے اٹھ کر بیڈ پر آ گئی مگر وہ بستر پر لیٹ کر ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ نو بجے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ اسے رات کے کھانے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔

پھر دستک دینے کے ساتھ اسے آواز بھی دی گئی تھی۔

"ایمن۔" وہ پہچان گئی یہ بی بی کی آواز تھی۔

لیکن وہ ان کی آواز سن کر بھی ڈھیٹ بنی لیٹی رہی۔

انہوں نے دوبارہ دستک دینے کے بجائے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ اسے بند آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کمرے کے اندر آ گئی ہیں۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

"سو رہی ہے ایمن۔" بیڈ سے کچھ فاصلے پر رک کر اسے بغور دیکھتے ہوئے انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔ ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جی بی بی! ابھی اٹھا دوں انہیں۔" یہ آواز پروین کی تھی۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے خود کو سوتا ہوا ظاہر کر رہی تھی۔

"نہیں! اسے سونے دو۔ پتا نہیں بے چاری کتنی راتوں کی جاگی ہوگی۔ مجھے بس یہ فکر ہو رہی ہے کہ یہ بھوکی سو گئی ہے۔" ان کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ دھیمی تھی۔

پھر اسے صرف واپس پلٹتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جب کمرے کا دروازہ واپس بند ہونے کی آواز اس نے سنی تو آنکھیں کھول کر کمرے میں دیکھا۔ وہ جاتے ہوئے نائٹ بلب جلا گئی تھیں۔

کمرے میں اب اتنا گھپ اندھیرا نہیں تھا جتنا تھوڑی دیر پہلے تھا۔ وہ خاموش لیٹی ایک ٹک چھت پر لگے فانوس کو گھورے جا رہی تھی۔ لیٹے لیٹے اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ دس بجے امی کو دوا دینی تھی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فوراً بیڈ پر کھڑی ہوئی۔ بیڈ پر سے اٹھتے ہی اس نے کچھ فاصلے پر بچھے دوسرے سنگل بیڈ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ نہ وہ بیڈ وہاں تھا اور نہ امی وہاں تھیں۔ وہ ایک دم اچانک جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔

اس کا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی دیوار پر اپنا سر مار مار کر رو دے۔ اس کے لیے دنیا میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ ایک رشتہ جو اسے میسر تھا، وہ بھی اس سے چھن گیا تھا۔ اس کے پاس تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ رو سکے۔ یہ غم اس اکیلی کا غم تھا۔ اس غم کو اس کے ساتھ بانٹنے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔

وہ دہشت زدہ ہو کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کمرے سے باہر نکل کر اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا تھا۔ وہ اندھیرے میں یونہی اندازوں سے چلتی ہوئی پتا نہیں کہاں جا رہی تھی۔ اس کا بس یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر بالکل کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو۔ وہاں کوئی دیواریں اور کوئی چھت نہ ہو۔

یونہی اندازوں سے چلتے چلتے اس نے ایک دروازہ کھولا تو باہر سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اسے اس بات کا احساس دلایا کہ اس نے صحیح دروازہ کھولا ہے۔ وہ اس دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ اس گھر کا پتا نہیں کون سا حصہ تھا۔ لیکن وہ جگہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس وقت اسے درکار تھی۔ وہ باغ تھا یا لان تھا، انجانے کیا تھا اندھیرے

میں وہ اندازہ نہیں کر پائی۔ وہاں صرف ایک گارڈن لائٹ جل رہی تھی۔

وہ کتنی بڑی اور کھلی کھلی سی جگہ تھی۔ اندھیرے سے اس کی آنکھیں تھوڑی مانوس ہوئیں تو اسے سوئمنگ پول نظر آیا۔ وہ سوئمنگ پول کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کے اس پہر وہ پانی کتنا ساکت اور کتنا اداس لگ رہا تھا۔ وہاں اس کی اکلوتی گارڈن لائٹ کے علاوہ کوئی دوسری روشنی بھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو اسے پتا چلا کہ یہ دوسری روشنی چاند کی روشنی ہے۔ وہ پانی میں نظر آتے چاند کے عکس کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے سوئمنگ پول کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے ام ایمن! آپ کو نیند نہیں آ رہی؟" اپنے عقب میں اس نے یہ مردانہ آواز سنی اور وہ پوری کی پوری ہل گئی۔ کچھ خوف اور بے بسی کے احساس میں گھرے ہوئے اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اسے اپنی یہاں موجودگی کا کیا سبب بتائے گی؟ کیا یہ کہے کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ ہوا خوری کے لیے یونہی رات کے بارہ بجے سوئمنگ پول کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

پہلے ہی دن اس کے گھر میں آ کر وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کے گھر میں ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ وہ اپنے یوں باہر نکل آنے پر اب بری طرح شرمندہ ہو رہی تھی۔

چند سیکنڈز اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ خود بھی اس سے کچھ فاصلے پر وہیں سوئمنگ پول کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں ٹیرس پر کھڑا تھا۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ کو یہاں دیکھا تو میں نے سوچا کہ مجھے جا کر پوچھنا چاہیے کہ کیا بات ہے۔" اس کا انداز بڑا سادہ سا تھا۔ ایسے جیسے وہ برسوں سے اس کے گھر میں رہتی رہی تھی۔

اس نے کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی زندگی میں باقر بھائی اور عارف بھائی کے علاوہ کسی مرد کا کوئی گزر نہیں تھا۔ وہ کبھی کوایجوکیشن میں نہیں پڑھی تھی۔ وہ اس وقت اس شخص سے کیا کہے؟ یا کچھ بھی کہے بغیر یونہی اٹھ کر شان بے نیازی سے اندر چلی جائے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"میں بھی آپ کے ہی جتنا تھا جب میری ممی کا انتقال ہوا تھا۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بہت آہستہ آواز میں بولا۔ ایمن نے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں پڑھنے کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا۔ میرے پیچھے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں پہلی فلائٹ سے کراچی آیا مگر انہیں زندہ نہیں دیکھ پایا تھا۔" وہ اب بھی بڑی آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں موجود دکھ وہ بہت اچھی طرح پہچان سکتی تھی اس لیے کہ اس دکھ سے اس وقت وہ خود بھی گزر رہی تھی۔

"وہ کیا بیمار تھیں؟" اس کے سوالیہ انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ صرف دکھ تھا۔

"وہ بالکل بھی بیمار نہیں تھیں۔ بس اچانک ہی۔ میں تو کراچی سے جاتے وقت انہیں بالکل صحت مند اور ہنستا مسکراتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ فون پر پاپا نے مجھے ان کی بیماری کی اطلاع دی حالانکہ حقیقت میں تو اس وقت ان کا

انتقال ہو چکا تھا۔ میں یہاں آیا تو پتا چلا کہ ممی مجھ سے ملے بغیر کوئی بات کیے بغیر ہی چلی گئی ہیں۔" اس کی بات سنتے سنتے وہ رو پڑی۔

"آپ روئے تھے؟" اس نے روتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں میں بہت رویا تھا۔ اس عمر میں ایسا لگتا ہے ناں کہ ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں اب ہمیں کسی کے سامنے رونا نہیں چاہیے۔ پھر میں تو لڑکا بھی تھا۔ میرے لیے تو یہ بات اور بھی زیادہ شرمندگی کا باعث تھی کہ میں کسی کے سامنے روؤں چاہے وہ میرے پاپا اور پی پی ہی کیوں نہ ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ بے وقوف تھا میں۔ مجھے یہ بات پتا ہی نہیں تھی کہ دکھ چھپانے سے نہیں بلکہ کسی کے ساتھ شیئر کر لینے سے کم ہوتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی ممی کو تو کوئی بیماری نہیں تھی لیکن میری امی بہت بیمار تھیں۔ وہ پچھلے دو سالوں سے بیمار تھیں۔ وہ بہت تکلیف میں تھیں۔" روتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

ماضی، حال اور مستقبل کو ذہن سے نکال کر صرف اور صرف اس بات پر کہ اسے جنم دینے والی وہ ہستی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ گئی ہے۔ وہ ان تین دنوں میں اس وقت پہلی مرتبہ صرف اور صرف امی کے لیے رو رہی تھی۔

"میں نے ان کی صحت کے لیے اتنی دعائیں مانگی تھیں۔" وہ اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔ "سب کہہ رہے تھے کہ ان کے حق میں یہی بہتر ہوا ہے۔ وہ اتنی تکلیف میں تھیں مزید زندہ رہتیں تو مزید تکلیف جھیلتیں مگر مجھے ان باتوں سے تسلی نہیں ہوتی۔ آپ بتائیں آپ نے کیا کیا تھا؟ آپ کو صبر کس طرح آیا تھا؟ مجھ سے تو یہ دکھ جھیلا نہیں جا رہا۔" اس نے اپنے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر آنسو بہاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وقت ام ایمن۔ صرف اور صرف وقت۔" وہ اسی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"وقت خود بخود تمہارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا۔ وقت خود بخود ہی تمہیں صبر بھی دے دے گا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ دکھ اب بھی میرے ساتھ ہے مگر یہ اب مجھے رلاتا نہیں ہے۔ میں نے اس دکھ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔ صبر کر لیا ہے۔ پھر زندگی میں اس ایک دکھ کے علاوہ بے شمار خوشیاں بھی تو ہیں۔" وہ بلک بلک کر روتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

اس شخص سے پہلے بھی ان تین دنوں میں بہت سے لوگوں نے اسے تسلیاں اور دلاسے دیے تھے مگر کسی کی تسلی اور کسی دلاسے سے اس کے دل کی بے قراری کم نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے لفظوں میں نجانے ایسا کیا اثر تھا کہ اس کے دل کو قرار آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وہ جو کہہ رہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ شاید آنے والے دنوں میں وقت ہی اس کے اس زخم پر مرہم رکھ دے گا۔ وہ جس طرح اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنی ماں سے کتنی شدید محبت تھی۔ جب اتنی شدید محبت کے باوجود اس نے اس غم کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تو پھر وہ بھی ضرور ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ اب دوپٹے سے اپنے بھیگے ہوئے چہرے کو خشک کر رہی تھی۔

CamScanner

"اندر چلیں؟" کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ایمن سے پوچھا تو وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اندر آ گئے۔ وہ اسے ساتھ لیے کچن میں آ گیا۔

کچن کی لائٹ آن کرتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ "بیٹھو امِ ایمن۔" اس نے کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ حیران سی ہوتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں میرا تم کہنا برا تو نہیں لگا؟" کیبنٹ میں سے کچھ نکالتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

"تم مجھے خود سے اتنی چھوٹی لگیں کہ آپ جناب کرنا بڑا بے تکا اور فضول سا لگ رہا تھا۔ ویسے بائی دا وے تمہاری عمر کتنی ہے؟" اس کی ہونق سی شکل کو دیکھ کر وہ بردباری سے بولا۔

"مجھے پتا ہے کسی لڑکی سے اس کی عمر پوچھنا مینرز کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری عمر ابھی اتنی نہیں ہے کہ تم عمر پوچھے جانے پر برا مانو گی۔" وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس کے چہرے کے تاثرات تو بہت سنجیدہ قسم کے ہی تھے۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھ کر وہ پلیٹ اس کے پاس لے آیا۔

"بائیس سال آٹھ مہینے۔" اس نے مہینوں کے حساب کتاب کے ساتھ اس طرح اپنی عمر بتائی کہ وہ اس کے اس سادگی بھرے انداز پر بڑی مشکلوں سے اپنی بے ساختہ ہنسی چھپا پایا۔

"تھوڑا سا میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ میں تمہیں سترہ یا اٹھارہ سال کا سمجھ رہا تھا۔ خیر پھر بھی تم مجھ سے کافی چھوٹی ہو۔ میں چونتیس سال کا ہوں۔ مہینوں کا حساب کتاب اس لیے شامل نہیں کر سکتا کیونکہ پچھلے ہفتے ہی میں نے اپنی چونتیسویں سالگرہ منائی ہے۔" وہ پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

"گویا کہ تم مجھ سے بارہ سال چار مہینے چھوٹی ہو اور اتنے بڑے فرق کے ساتھ تو مجھے پورا حق حاصل ہے تم سے تم کر کے بات کرنے کا۔" وہ اب کوکنگ رینج کے پاس کھڑا تھا۔

"چائے پیو گی ناں؟" اس کے سوال پوچھنے کے انداز میں اتنا یقین شامل تھا جیسے کہ اس کے انکار کا کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"ویسے میں کوئی بہت اچھا کک نہیں ہوں لیکن چائے اور کافی بنانے میں بہرحال مجھے خاصی مہارت حاصل ہے۔ تمہیں میرے ہاتھ کی بنی چائے پسند آئے گی۔" وہ اس کے جواب میں ہاں یا نہ کہنے سے پہلے ہی مزید گویا ہوا۔ پانچ منٹ میں ہی اس نے چائے تیار کر لی۔

"تم چینی کتنی لو گی؟" شوگر پاٹ اٹھاتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ایک چمچ۔" اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب جب وہ چائے بنا ہی چکا تھا تو وہ نخرے نہیں دکھا سکتی تھی۔ اس کے اور اپنے کپ میں چینی ملاتے ہوئے وہ میز کے پاس آ گیا۔

"یہ میرے ہاتھ کی بنی گرما گرم مزے دار سی چائے۔" اس نے ایک حیرت بھری نگاہ اس پر اور ایک کچن میں لگی گھڑی پر ڈالی جو ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بجے وہ اتنے خوشگوار انداز میں اس کی خاطر مدارات کر رہا تھا جیسے دن کا ڈیڑھ بجا ہو۔

اس کا کپ اس کے آگے رکھ کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے کا گھونٹ لینے کے لیے وہ کپ اٹھانے لگی تو وہ کچھ ناراضی بھرے انداز میں بولا۔

"یہ بسکٹ میں نے جانے کے لیے یہاں نہیں رکھے تھے۔ کم سے کم دو بسکٹ تمہیں لازمی کھانے ہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کھانا دل چاہنے پر نہیں' بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور تمہیں بھوک لگی چاہیے بلکہ لگ رہی ہے۔ مجھے پتا ہے یہ بات' تم نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟" اس کا انداز قطعیت بھرا تھا۔ اس کے کہنے پر اسے خود بھی یاد آ گیا کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"ہمارے بھوکا رہنے سے جانے والے واپس نہیں آ سکتے۔ کیا بھوکی رہ کر تم اللہ کے ساتھ اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی ہو۔ چونکہ اس نے تمہاری دعائیں قبول نہیں کیں اس لیے اب تم اس کے دیے کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ کیا ہمیں اللہ کے ساتھ ناراض ہونے اور ضد کرنے کا کوئی حق ہے؟ ہم نہیں جانتے ہمارے لیے کیا بہتر ہے۔ جو کچھ بظاہر ہمیں غلط ہوتا ہوا لگ رہا ہوتا ہے وہی درحقیقت ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔" اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس نے ناصحانہ انداز اپنایا تھا۔ اس کی بات مکمل ہوتے ہی اس نے فوراً ہی پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھا لیا اور اسے کھانا بھی شروع کر دیا۔

"شاباش تمہاری جیسی اچھی لڑکی اللہ کے ساتھ ضد کرتی اور ناراض ہوتی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔" اس کے لبوں پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔

وہ بسکٹ کھاتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر آتی اس اپنائیت کو تعجب سے دیکھ رہی تھی جب کہ وہ اس کی حیرت سے انجان اب اپنی چائے کا سپ لینے لگا تھا۔

"ایک اور لو یہ بٹر کوکیز ہیں۔ میری فیورٹ جب میں انہیں کھا رہا ہوں تو چار پانچ سے کم پر کبھی نہیں رکتا۔ تمہیں کیا یہ اچھے نہیں لگ رہے؟" اسے چائے کا کپ اٹھاتے دیکھ کر اس نے کچھ مصنوعی سی حیرت سے پوچھا۔ اسے اس وقت کسی چیز کا ذائقہ پتا نہیں چل رہا تھا اور وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اس طرح کی بات کر رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے دوسرا بسکٹ اٹھا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس نے اب اپنی نظریں ایمن پر سے ہٹا لی تھیں۔ اچانک ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس سے یہ بات پوچھے کہ اس کا اس کے باپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سوال کس طرح کرے۔ اسے یہ سوال پوچھتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی لیکن وہ کوئی مناسب قسم کے الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی۔ کچھ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنا چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" وہ ہکا بکا ایک مرتبہ پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"زیادہ حیران مت ہو۔ تمہارے چہرے پر اتنا بڑا سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ فوراً ہی پتا چل رہا ہے کہ تم

کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔" وہ اس کی ہونق شکل دیکھ کر مبہم سا مسکرایا۔

"میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ....." وہ بولتے بولتے ہچکچا کر خاموش ہو گئی تھی۔ آگے کا جملہ اس نے اپنے اندر ہی روک لیا تھا۔

"وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟" وہ اس سوال سے کیا سمجھتا اس لیے نرمی سے بولا۔

"پوچھو ام ایمن! تم جو کچھ بھی پوچھنا چاہتی ہو مجھ سے بے جھجک پوچھ سکتی ہو۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اس طرح آگئی تھی جیسے وہ اسے بات کرنے کے لیے حوصلہ دینا چاہ رہا تھا۔ "میں ان کے بارے میں۔" وہ بولتے بولتے پھر خاموش ہو گئی۔

"تم توفیق بھائی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے رسانیت سے پوچھا۔ اس نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا۔

"وہ کب واپس آئیں گے؟ یہ پوچھنا چاہتی ہو؟" اس کا لہجہ بہت نرم اور دھیما سا تھا۔ اس نے منہ سے کچھ بولے بغیر سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر؟" خود سے مزید کوئی اندازے لگانے کے بجائے اس نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا اور وہ اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اتنی سی بات پوچھتے ہوئے تم اتنا گھبرا رہی تھیں۔ میں سمجھا پتا نہیں کیا بات ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ بات تمہیں اس قدر پریشان کر رہی ہے تو تمہیں کراچی آتے ہوئے راستے ہی میں اس بارے میں بتا دیتا۔" کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنی نظریں اس کے مسکراتے چہرے پر سے ہٹا لیں۔

"ہم فیملی فرینڈز ہیں، بزنس پارٹنرز ہیں۔ ہم دونوں کو بزنس میں ساتھ کام کرتے ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ پہلے میرے پاپا، توفیق بھائی اور جمیل انکل بزنس سنبھالتے تھے۔ مجھے امریکہ سے واپس آئے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ میرے واپس آنے کے بعد صرف ایک سال پاپا اور جمیل انکل بھی ہمارے ساتھ کاروبار میں موجود رہے پھر آگے پیچھے ان دونوں کی ڈیتھ ہو گئی تو اب بزنس ہم دونوں مل کر سنبھالتے ہیں۔ جمیل انکل میرے اور میری فیملی کے لیے بالکل ایسے تھے جیسے ہمارے انتہائی قریبی رشتہ دار۔ جمیل انکل الماس آپی کے۔" وہ روانی سے بولتا بولتا یک لخت ہی خاموش ہو گیا۔

"تم نے چائے ختم نہیں کی؟" اس نے اچانک ہی بات بدل دی۔ وہ یقیناً اسے کیا بات بتانے والا تھا، یہ تو وہ نہیں جانتی تھی، لیکن یہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں کا اس کے سامنے نام لیتے ہی اسے خود اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اپنی سوتیلی ماں کا ذکر اس کے لیے ہرگز خوشگوار نہیں ہو سکتا۔ اس نے بغیر کچھ کہے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

کپ میں موجود چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں وہ باقی بچی ہوئی چائے ختم کر لی تھی۔

"توفیق بھائی کا امریکہ جانا بہت ضروری تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے ان کا جانا کسی نہ کسی وجہ سے ٹل رہا تھا۔

انہیں وہاں سائر کے پاس جانا تھا۔ وہ بوسٹن پڑھنے گیا ہوا ہے۔ جانتی ہو ناں تم سائر کو؟" بولتے بولتے اس نے کچھ سوچ کر اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سائر ان کا بیٹا ہے، تمہارا بھائی ہے۔" تمہارا بھائی کا لفظ جیسے اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔ اس کا رشتہ ایک انجانے لڑکے کے ساتھ جوڑنے کے لیے۔ وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بنا خاموشی سے اس کی سمت دیکھتی رہی۔

"اسے بوسٹن گئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے چار پانچ مہینے ہی ہوئے ہیں۔ وہ وہاں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا۔ وہ اصل میں وہاں جا کر پڑھنے میں اتنا انٹرسٹڈ بھی نہیں تھا۔ توفیق بھائی نے اسے زبردستی وہاں بھیجا ہے۔ اس کا وہاں دل نہیں لگ رہا اور اس پریشانی میں وہ وہاں بیمار ہو گیا ہے۔ کافی دنوں سے توفیق بھائی سائر کے پاس امریکہ جانا چاہ رہے تھے لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت ایسی نکل رہی تھی کہ ان کا جانا ملتوی ہوتا چلا جا رہا تھا۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بہت آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط سے بول رہا تھا۔

"تمہاری امی کا خط انہیں بہت دیر سے ملا۔ اصل میں خط ان تک پہنچنے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ غلطی پتا نہیں کس کی تھی شاید میری سیکریٹری کی یا ان کی سیکریٹری کی یا چپڑاسی کی۔ بہرحال ہوا کچھ یوں کہ تمہاری امی کا خط غلطی سے میری ڈاک میں شامل ہو گیا۔ میں پچھلے دنوں پاکستان میں تھا نہیں۔ آفس کے کام سے زیورچ گیا ہوا تھا۔

پچیس چھبیس دنوں بعد میری واپسی ہوئی۔ واپس آ کر اس روز میں پہلی مرتبہ آفس گیا تھا۔ اس روز جب توفیق بھائی نے حیدرآباد تمہارے گھر فون کیا تھا میں نے آفس جا کر سب سے پہلے اپنے لیے موجود سب میسجز اور اپنی ڈاک ہی دیکھی تھی۔ وہ خط دیکھا تو پتا چلا کہ یہ توفیق بھائی کے لیے ہے اور اسے یہاں آئے ہوئے بھی پچیس چھبیس روز ہو چکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس خط کو پہلے ہی توفیق بھائی تک پہنچنے میں خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔ مجھے اسے پہلی فرصت میں ان تک پہنچا دینا چاہیے۔

وہ اس دن امریکہ جا رہے تھے اسی لیے آفس نہیں آئے تھے۔ میں خط لے کر ان کے گھر ہی چلا گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ انہیں خدا حافظ بھی کہہ آؤں گا اور یہ خط بھی انہیں دے دوں گا۔ اس وقت میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ خط اس قدر اہم ہے۔ تم یقین کرو کہ میرے ہاتھ سے خط لے کر اسے پڑھتے ہی انہوں نے اسی وقت فوراً تمہیں فون کیا تھا۔ اس وقت ان کے جانے کی سب تیاری ہو چکی تھی۔ ان کے ایئرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلنے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ وہ رک نہیں سکتے تھے۔

اگر خط انہیں پہلے مل جاتا تو وہ شاید اپنا جانا کینسل کر دیتے اور خود جا کر تمہیں حیدرآباد سے لاتے لیکن پھر بھی تم پریشان مت ہو۔ وہ زیادہ دنوں کے لیے نہیں گئے ہیں۔ میرا خیال ہے بہت سے بہت وہ بیس پچیس دن میں واپس آ جائیں گے۔" جو باتیں اس کے باپ کو اس سے کرنی چاہیے تھیں وہ سب انجان شخص اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ اس کے احساسات کی پروا کر رہا تھا وہ جیسے سمجھ سکتا تھا کہ اسے کیا بات ہرٹ کر رہی ہے۔

اس کے دل میں موجود سب بدگمانیاں دور کر دینا چاہتا تھا۔ آج صبح سے پہلے وہ اس آدمی کو جانتی تک نہیں

CamScanner

تھی اس نے اسے زندگی میں کبھی دیکھا تک نہیں تھا' کبھی اس کا نام تک نہیں سنا تھا اور آج رات میں وہ اسی انجان آدمی کے ساتھ بیٹھی اپنی انتہائی پرسنل باتیں کر رہی تھی۔ وہ جیسے اس کے اندر تک جھانک لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں نظر آتا غصہ' نفرت اور بدگمانی بڑی آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔

وہ جو اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی' اس نے ایک دم ہی کچھ گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔ وہ اپنے باپ کے لیے کیا سوچتی ہے' وہ انہیں کیسا انسان سمجھتی ہے' یہ سب کچھ وہ اس اجنبی سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اس کے جھکے ہوئے سر کو بغور دیکھتا رہا۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے یا ابھی بھی سونے کا دل نہیں چاہ رہا؟" کچھ دیر بعد اس نے اس کی مدھم سی آواز سنی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"سر کس بات پر ہلایا ہے؟ نیند آنے والی پر یا سونے کا دل نہیں چاہ رہا والی بات پر؟" وہ اس کے سر ہلانے پر مسکراتے ہوئے بولا۔

"نیند آنے والی بات پر۔" اس کے دوستانہ سے اپنائیت بھرے انداز نے اسے بے ساختہ اور بے جھجک بولنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا کرسی پر سے اٹھا تو وہ بھی اٹھ گئی۔

"کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرنا۔ تمہارے لیے نیند بہت ضروری ہے۔ بستر پر لیٹ کر دوسری کوئی بھی بات مت سوچنا سوائے اس کے کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو اور تمہیں سخت نیند آ رہی ہے۔" کچن سے باہر نکلتے ہوئے وہ سمجھانے والے انداز میں بولا اور پھر اسے شب بخیر کہہ کر سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ وہ اس کے آگے بڑھ جانے کے باوجود اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایمن ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر بہت تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا پرابلم ہے ام ایمن؟ تم کیا کوئی اور بات بھی پوچھنا چاہتی ہو؟" وہ واپس اس کے پاس آ گیا۔ وہ جھنجلایا ہوا نہیں تھا' بس اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا' میرا کمرہ کس طرف ہے۔" اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کی بات سن کر ہنسے گا' اسی لیے سر جھکا کر شرمندگی سے اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

"آؤ۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی' اسے ساتھ لے کر آتے ہوئے وہ اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ "اب نہ رونا ہے اور نہ کچھ سوچنا ہے۔ صرف سونا ہے' ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی جبکہ وہ واپس سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔

وہ کمرے میں آ کر لیٹ تو گئی تھی لیکن نیند اسے ابھی بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہونے والی ساری باتیں یاد کر رہی تھی۔ وہ انجان آدمی' جسے وہ ڈھنگ سے جانتی تک نہیں ہے۔ وہ اس کا کچھ بھی تو نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس کا انداز اتنا مخلص کیوں تھا؟ وہ عام لوگوں سے اتنا مختلف کیوں لگ رہا تھا؟ وہ اس طرح کیوں بات کر رہا تھا جیسے اسے اس کی بہت پروا ہے؟ وہ اگر رو رہی تھی تو اس میں کمزوری سے زیادہ اس کی اپنائیت کو دخل تھا۔

وہ اتنی اپنائیت سے اتنے خلوص سے بات کر رہا تھا کہ وہ اپنے آنسو روک ہی نہیں پائی تھی۔ اسی بات کو سوچتے سوچتے اسے نجانے کب نیند آئی تھی۔

⊛⊛⊛

صبح اس کی آنکھ آٹھ بجے کھلی تھی۔ یہ وہ گھر نہیں تھا' یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں ہر صبح آنکھ کھلنے پر وہ خود کو موجود پایا کرتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ بیڈ پر بیٹھی خاموشی سے اس کمرے کو دیکھتی رہی۔

اسے رات کو پاپا کا خود اسے کھانے کے لیے بلانے آنا بھی یاد آ گیا۔ وہ رات جیسی بدتمیزی کا مظاہرہ اس وقت نہیں کر سکتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ابھی کوریڈور سے ہوتی ہوئی لاؤنج کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے سیڑھیوں پر سے حیدر اترتا نظر آیا۔ وہ بریف کیس ہاتھ میں لیے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوشگوار سے انداز میں مسکرایا۔

"تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ جواباً بغیر کچھ بولے تکلفانہ تھوڑا سا مسکرائی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ کل اس نے بہت عام سی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ ہاف سلیوز کی وائٹ کلر کی ٹی شرٹ اور خاکی کلر کی جینز جبکہ اس وقت وہ بڑے شاندار طریقے سے تیار تھا۔

اس نے کل سے لے کر آج تک ایک بار بھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ اس وقت پہلی مرتبہ اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ بہت ہینڈسم ہے۔ اس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی گہرے کلر کی آنکھوں میں ذہانت بھی تھی اور خوب صورتی بھی۔

اس کے سیڑھیوں سے اتر کر اپنے پاس آنے کے دوران وہ اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ اس مختصر سے جائزے کے بعد اس نے خود پر نظریں دوڑائیں۔ کل صبح کا پہنا ہوا کاٹن کا قمری پیچ سوٹ جو شکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی۔

"آ جاؤ ام ایمن۔ ہم دونوں ساتھ ناشتہ کر لیتے ہیں۔" وہ اس جگہ پر خود کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ شکل و صورت اس کے اختیار میں نہیں تھی' لیکن اپنا حلیہ درست رکھنا تو اس کے اختیار میں تھا۔ اسے کمرے سے کپڑے بدل کر اور بال بنا کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔ وہ بے چارہ مروت میں اس کے ساتھ اچھی بات کر رہا ہے' اسے اپنے ساتھ ناشتے کی آفر کر رہا ہے' ورنہ اس وقت ام ایمن سے بہتر حلیہ تو اس کی ملازمہ کا تھا۔ وہ غم میں ہے' سوگ منا رہی ہے تو ساری دنیا تو اس کے ساتھ سوگ نہیں منائے گی' دنیا تو ظاہر کو دیکھتی ہے۔

اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آتے ہوئے اس نے ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی صاف ستھری ملازمہ کے کپڑوں کے ساتھ اپنے کپڑوں کا موازنہ کیا۔

"بیٹھو۔" وہ بہت زیادہ مہذب تھا۔ مہمان کے بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنی کرسی نہیں سنبھالی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تو وہ بھی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لو گی تم ناشتے میں؟" اس کے اس سوال پر اس نے میز پر ایک نگاہ دوڑائی۔ وہ صرف چائے پینا چاہتی تھی۔ "آملیٹ لو گی؟" پروین نے آملیٹ کی پلیٹ لا کر میز پر رکھی تو اس نے فوراً ایمن سے آملیٹ کھانے کے

CamScanner

بارے میں پوچھا۔

پروین وہاں سے واپس کچن میں چلی گئی جبکہ اس کی ماں ابھی وہیں موجود تھی۔ وہ غالباً اپنے مالک کے مہمان سے ناشتے کے بارے میں پوچھے جانے کے بعد ملنے والے احکامات کی منتظر تھی۔ اپنے ناشتے کو ایشو بنانے اور کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھنے سے بہتر اسے یہی لگا کہ وہ ایک اچھے مہمان کی طرح میزبان کو تنگ کیے بغیر ناشتہ کر لے۔

"میں رول لوں گی۔" اسے وہاں موجود چیزوں میں رول ہی سب سے ہلکی پھلکی ڈش لگی تھی۔ حیدر نے رول کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ جبکہ مکھن اس نے خود اپنے قریب کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رول پر مکھن لگا رہی تھی اور وہ خود آملیٹ کھانے میں مشغول ہو چکا تھا۔ پروین کی ماں بھی واپس کچن میں چلی گئی تھی۔

"بی بی تمہاری وجہ سے جلدی اٹھ گئی تھیں۔ پھر یہ دیکھ کر کہ تم ابھی سو رہی ہو وہ میرے کہنے پر دوبارہ سونے چلی گئیں۔ میرا خیال تھا کہ تم کافی دیر تک سوؤ گی۔" کیتلی اپنے سامنے کر کے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے وہ اسے بی بی کی غیر موجودگی کے بارے میں بتانے لگا۔

"وہ اصل میں تین ساڑھے تین بجے اٹھ جاتی ہیں۔ پھر فجر کے وقت تک ان کی عبادت چلتی ہے۔ ان کا معمول اسی طرح کا ہے۔ فجر کے بعد پھر وہ سو جاتی ہیں اور پھر دس ساڑھے دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتیں۔ ان کا ناشتہ بھی پھر اسی وقت ہوتا ہے۔" اسے چائے دینے کے بعد اب وہ کیتلی میں سے اپنے لیے چائے نکال رہا تھا۔

"بی بی تو سو رہی ہیں۔ میرے آفس جانے کے بعد تم کیا کرو گی؟" کچھ دیر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر اسے مخاطب کیا۔ اسے خود نہیں پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ وہ بغیر کوئی جواب دیے احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟" اس کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا تو اس نے بغیر سوچے سمجھے فوراً گردن ہلا دی۔ کتابیں پڑھنے کا اسے واقعی شوق تھا۔ ایمن کا خیال تھا کہ وہ اسے پڑھنے کے لیے دو چار کتابیں دے جائے گا۔ لیکن ناشتہ ختم کر کے میز پر سے اٹھتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

"آ جاؤ۔ ناشتہ تو تم پہلے ہی کافی زیادہ کر چکی ہو۔" وہ اس کے آدھا رول کھانے پر کچھ طنزیہ انداز میں بولا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر سے اٹھ گئی اور وہ اسے اسٹڈی روم میں لے آیا۔

اتنی بے تحاشا کتابیں! اس کی اسٹڈی تو ام ایمن کی کالج کی لائبریری کو مات کر رہی تھی۔ وہ اپنی حیرت چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ ابھی تک اس عالیشان مکان کی کسی قیمتی چیز کو دیکھ کر اس نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات نہیں آنے دیے تھے کہ وہ یہ چیز زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہے' لیکن اس کتابوں سے بھری ہوئی اسٹڈی کو دیکھ کر وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پائی۔

اس وسیع و عریض ہال نما کمرے کے بالکل بیچ دو میزیں آپس میں کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں میزوں کے گرد بہت ساری کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک الگ تھلگ سی میز پر کمپیوٹر اور اس سے جڑے

دیگر تمام لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ وہ رشک اور حیرت سے اس اسٹڈی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک نظر میں تو اسے یہی لگا تھا کہ یہاں دنیا زمانے کے ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہیں مطالعہ کا بہت زیادہ شوق ہے۔" وہ اس کے تاثرات انجوائے کرتے ہوئے بولا۔ اس نے جواباً نہ تائید میں کچھ کہا تھا اور نہ تردید میں۔

"چلو پھر تم بور نہیں ہو گی۔ جب تک بی بی نہیں اٹھ جاتیں تم کتابیں پڑھو۔ اگر دل چاہے تو نیٹ سرفنگ بھی کر لینا۔" اس نے کمپیوٹر کی ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اسے اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ یہاں کتابیں بھی پڑھ سکتی ہے اور کمپیوٹر بھی استعمال کر سکتی ہے۔ وہ اسے خدا حافظ کہتا ہوا اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔ ایمن کچھ دیر تک گھوم پھر کر چاروں طرف نظر آتی کتابوں کی طرف دیکھتی رہی لیکن وہ نہ کسی کتاب کا نام پڑھ رہی تھی نہ ہی کوئی کتاب اس نے ہاتھ میں لی تھی۔ وہ بس یونہی وقت گزار رہی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ حیدر آفس جا چکا ہو گا تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔ کچھ دیر پہلے وہ حیدر مسعود کے سامنے جس طرح شرمندگی محسوس کر چکی تھی اب اسی شرمندگی سے بی بی کے سامنے نہیں گزرنا چاہتی تھی۔ اس کا تیار ہونے کا 'کپڑے بدلنے کا' بال بنانے کا دل چاہ رہا تھا یا نہیں اس بات کو ذہن سے نکال کر اسے اپنا حلیہ درست کرنا تھا۔ بہت زیادہ قیمتی اور شاندار ملبوسات اس کے پاس نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے پاس موجود کپڑوں ہی میں سے کوئی بہتر لباس تو زیب تن کر ہی سکتی تھی۔ اس نے اپنی ریڈ کلر کی کاٹن کی قمیص نکالی اس پر سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے ڈاٹس تھے۔ ساتھ کاٹن کا سفید رنگ کا کلف لگا دوپٹہ اور شلوار۔ وہ کپڑے ہاتھ میں لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ اسے یہاں اس طرح رہنا ہے کہ اس کے میزبان اس کے مہمان ہونے پر کوفت محسوس نہ کریں۔ وہ اپنے حلیے سے توفیق کمال کی بیٹی لگے۔ یہ اس کی خواہش نہیں تھی' لیکن یہ اس کے باپ کی عزت کا سوال تھا اور جب وہ باپ کے پاس کراچی آ گئی تھی تو پھر اسے اس کی عزت کا خیال بھی رکھنا تھا۔ توفیق کمال نے اس کی ماں کو اسی لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اس جیسے شاندار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد کے ساتھ جچتی نہیں تھی۔ اسے سوسائٹی میں موو کرنا نہیں آتا تھا' اسے اچھی گفتگو کرنی نہیں آتی تھی' اسے اچھی طرح تیار ہونا اور پہننا اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جس طرح اس کے باپ نے اس کی ماں کو اس کی جہالت' کم علمی اور میٹرز سے ناواقفیت کی بنا پر رد کر دیا تھا ایسے ہی اسے بھی کر دے۔ وہ دوبارہ نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اسے توفیق کمال سے محبت تھی بلکہ صرف اس لیے کہ اس شخص کے علاوہ اب اس کے پاس زندگی میں کوئی جائے پناہ نہیں رہی تھی۔ آج صرف ایک دن کے اندر اندر اس نے حقیقت پسندی سے ساری صورت حال کا جائزہ لے ڈالا تھا اور حقیقت چاہے جتنی بھی تلخ تھی لیکن وہ حقیقت تھی اور ام ایمن کو اسے قبول کرنا تھا۔ وہ امپورٹڈ شیمپو اس کی آنکھوں میں چلا گیا تھا' اسی لیے اس کی آنکھوں سے اتنی روانی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ورنہ رونے والی ایسی کوئی بات تھی تو نہیں۔ نہانے کے بعد اس نے اچھی طرح خود پر باڈی اسپرے کیا' ٹیلکم پاؤڈر استعمال کیا۔ اپنے اچھی طرح شیمپو ہوئے بالوں میں خوب

دیر تک برش کیا۔ وہ بال شانوں پر ڈال کر اس نے خود کو قدِ آدم آئینے میں دیکھا۔

"کیا اب وہ توفیق کمال کی بیٹی لگ رہی ہے؟" اس نے خود سے سوال پوچھا۔ اسے بڑا مایوس کن جواب حاصل ہوا۔ وہ اب بھی توفیق کمال کی بیٹی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اس کی طرح خوب صورت نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں جیسی تھی۔ بالکل عام سی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ اپنے باپ جیسی حسین ہوتی۔

اس کی ماں نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ توفیق کمال کو خوب صورتی اور ذہانت متاثر کرتی ہے۔ وہ خود بھی خوب صورت اور ذہین ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے گرد موجود سب لوگ اس کی طرح خوب صورت اور ذہین ہوں۔ وہ اپنے معیار سے کم تر چیزوں پر سمجھوتا کر لینے والوں میں سے نہیں تھا اور ام ایمن اس کے معیار پر کیسے پوری اتر سکتی تھی۔ وہ نہ خوب صورت تھی نہ ذہین۔ وہ باپ کو اپنی کس خوبی سے متاثر کرے گی۔ کاش وہ اپنی ماں کے بجائے باپ کے نقوش چرا لیتی۔

اس کی آنکھوں میں شاید ابھی تک شیمپو چلے جانے کی وجہ سے جلن ہو رہی تھی اسی وجہ سے ابھی تک اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ بجائے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کرنے کے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹشو پیپر باکس میں سے ایک ٹشو پیپر نکالا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مینرز سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے دوپٹے کے بجائے ٹشو پیپر سے منہ صاف کرنا چاہیے اور وہ بھی بڑی نزاکت اور احتیاط کے ساتھ وہ ٹشو پیپر ڈسٹ بن میں ڈال کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ اس کا رخ ایک دفعہ پھر اسٹڈی کی طرف تھا۔

چند دن پہلے تک اس کی زندگی میں فرصت نام کی کسی چیز کا دور دور تک گزر نہیں تھا۔ گھر اسکول ٹیوشنز کچن دوائیں اس کی زندگی چوبیس گھنٹے ان ہی چیزوں کے پیچھے بھاگتے گزرا کرتی تھی۔ اسے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ بی اے کے پہلے سال تک جب امی بیمار نہیں تھیں وہ اپنے اس شوق کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا کرتی تھی۔ پھر جب امی بیمار پڑیں اور گھر کا سارا بوجھ مکمل طور پر اس کے کندھوں پر آ پڑا تو وہ اپنے اس شوق کو بالکل ہی بھول گئی۔ آج کتنے عرصہ بعد اسے فرصت سے بیٹھ کر کچھ پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ آج اسے اس کی پسند کا ماحول میسر تھا۔ یہاں ڈھیر ساری کتابیں تھیں، سکون تھا، خاموشی تھی، وہ جتنا مرضی پڑھ سکتی تھی لیکن اسے کیا پتا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر کتاب پڑھنے والی اس کی یہ خواہش اتنے تکلیف دہ انداز میں پوری ہونے والی ہے۔

بی بی کو اسٹڈی میں آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی اور جلدی سے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ کل والی ابتر حالت کے مقابلے میں اس وقت وہ خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ اس وقت انہیں اس کے چہرے پر دہشت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"مجھے جمیلہ نے بتایا کہ تم اسٹڈی میں ہو۔ میں نے سوچا تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ لوں۔ رات تو بغیر کھانا کھائے ہی سو گئی تھیں اب بتاؤ کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو؟" وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ قصداً تھوڑا سا مسکرائی۔

"کیا پڑھ رہی تھیں؟" اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ اس نے جواباً کتاب کا نام انہیں بتا دیا۔ اسی وقت پروین ہاتھ میں ٹرے لیے اسٹڈی میں آ گئی تھی۔

"میں نے اپنا ناشتہ یہیں منگوا لیا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ پروین نے ٹرے میز پر ان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتے کی دعوت دی۔

"میں ناشتہ کر چکی ہوں۔" وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ انہیں کیا کہہ کر مخاطب کرے۔ اس کے اس مختصر جملے میں بہت زیادہ تکلف، اجنبیت اور غیریت شامل تھی۔

وہ ناشتہ کرتے ہوئے اس سے اسی کتاب کے بارے میں باتیں کرنے لگی تھیں جو اس وقت اس کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کی گفتگو سے وہ ان کی علمی قابلیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ انہوں نے انگوری رنگ کا کڑھا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ساتھ نفیس سی جیولری۔ یہ جیولری شاید وہ گھر میں مستقل پہنے رہا کرتی تھیں کیونکہ کل بھی اس نے ان کے کانوں میں یہی ٹاپس، گلے میں یہی چین اور ہاتھوں میں یہی کنگن دیکھے تھے۔ انہوں نے دولت کی نمائش کے لیے بے تحاشا جیولری نہیں لادی تھی۔ وہ لگ بھگ ساٹھ سال کی ہوں گی اور ان کے نقوش یہ بات بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بہت خوب صورت ہوں گی۔ وہ ان کی سوبر سی تیاری کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اسے بولنے پر نہیں اکسا رہی تھیں بس خود ہی بول رہی تھیں۔

اس کے تاثرات سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان باتوں سے بور نہیں ہو رہی اس لیے وہ بڑی فرصت سے بولنے میں مصروف تھیں۔ ان کی باتیں سنتے سنتے ہی دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ پروین نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ اسے ساتھ لیے ڈائننگ روم میں آ گئیں۔

"میں لنچ نہیں کرتی۔ ناشتہ ہی میرا اتنی دیر سے ہوتا ہے کہ پھر دوپہر میں کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہوتی لیکن آج تمہاری وجہ سے میں تھوڑا سا اپنا روٹین چینج کر رہی ہوں۔" اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پُرشفقت انداز میں کہا۔ انہوں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد لیا جب کہ اسے وہ بالکل کل کی طرح اصرار کر کے مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔

وہ ان کے خلوص اور محبت سے متاثر ہونے لگی تھی کہ اچانک اسے یہ بات یاد آ گئی کہ اس کے ساتھ یہ محبت بھرا سلوک اس وجہ سے ہو رہا ہے کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔ اس کے ان کے گھر قیام کا حوالہ بھی یہ ہے کہ توفیق کمال اس کا باپ ہے۔ صرف ام ایمن کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔

حیدر مسعود کا کل رات اور آج صبح کا اپنائیت بھرا اور دوستانہ انداز اور بی بی کا محبت اور خلوص سے بھرا ہوا رویہ، اعزازی سلوک توفیق کمال کی بیٹی کے ساتھ ہے۔ زینب توفیق کی بیٹی کے ساتھ نہیں۔ ام ایمن کے ساتھ نہیں۔ وہ اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ وہ یہاں صرف باپ کے نام کی وجہ سے عزت اور اہمیت پا رہی ہے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے کے لیے جانے لگیں تو وہ بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئی۔ نماز کے بعد انہیں اپنے کسی جاننے والے کے گھر ملنے جانا تھا انہوں نے اس سے بھی اخلاقاً ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے بڑی شائستگی کے ساتھ معذرت کر لی۔

CamScanner

انہوں نے زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ ان جیسی قابل اور ذہین خاتون یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں کہ ابھی وہ جس صدمے سے گزر رہی ہے اس میں وہ لوگوں سے میل جول اور کہیں آنے جانے کے بالکل قابل نہیں ہے۔ کمرے میں آ کر نماز پڑھنے کے بعد وہ لیٹی تو جانے کب نیند آ گئی۔ عصر کے وقت اٹھی۔ اب کی بار اس نے صبح والی غلطی نہیں دہرائی۔ وہ کمرے سے اپنا حلیہ درست کر کے باہر نکلی۔

جیلہ نے اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی آ کر چائے کا پوچھا۔ اس کے انکار پر اس نے چائے کے متبادل کے طور پر دو تین مشروبات کے نام لیے لیکن جب اس نے ان سب کے لیے انکار کر دیا تو وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اس نے صوفے کے پاس سائیڈ میں رکھی میز پر سے ایک میگزین اٹھا لیا۔

"مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ تم اکیلے بور تو نہیں ہو گئیں۔"

"میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھی ہوں۔" اس نے میگزین بند کر کے واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے پی لی تم نے؟" انہوں نے مزید دریافت کیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لان میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔ دھوپ کب کی ڈھل چکی تھی۔ وہ چائے پیتے ہوئے ان کے لان کی خوب صورتی کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں سے بیٹھ کر وہ لان کے آخری سرے پر بنے سوئمنگ پول کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ رات میں وہ کس دروازے سے باہر نکلی تھی جو سیدھی سوئمنگ پول کے پاس والی جگہ پر پہنچی تھی۔ بی بی اس وقت علمی گفتگو کے بجائے ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھیں۔ مغرب کے وقت تک وہ اسے یونہی کمپنی دیتی رہی تھیں۔ مغرب کی اذان ہونے پر وہ دونوں اٹھ کر اندر آ گئیں۔

بی بی نماز کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ خود بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا دل اس جگہ اور اس ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھا اسی گھر میں۔ دیر تک جائے نماز پر بیٹھی روتی رہی تھی پھر اسے کچھ خیال آیا۔ یہ رونے کے لیے ہرگز کوئی مناسب وقت نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر آ گئی۔

اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو وہاں صوفے پر حیدر بیٹھا نظر آیا۔ وہ بڑے بے فکرے سے انداز میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک سی گئی۔

"ہیلو! کیا حال ہیں اچھی لڑکی۔" اس نے فوراً ہی اسے دیکھ لیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ ابھی تک وہیں رکی ہوئی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔" اس کے کہنے پر وہ آہستہ سے چلتی ہوئی آ کر سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کون سا پروگرام دیکھو گی؟ ایسا کرو تم اپنی مرضی کا چینل لگا لو۔" اس نے ریموٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"جو آپ دیکھ رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔" وہ بہت پرتکلف سے انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ وہ جواباً کھل کر ہنسا۔

"تم نے ابھی تک ٹی وی کی طرف دیکھا نہیں ہے۔ میں تو بزنس نیوز دیکھ رہا تھا۔ پاکستان کے علاوہ دیگر ایشیائی ملکوں کے اسٹاک ایکسچینج کی کیا صورت حال رہی۔ دیکھو گی بزنس نیوز؟" اس کی بات سن کر نہ چاہتے

ہوئے بھی بے ساختہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ صرف ایک پل کے لیے۔ وہ اپنے مسکرانے پر خود حیران ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ خود کو بمشکل رونے سے روکتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی تھی اور صرف چند منٹوں بعد وہ بجائے رونے کے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک پل کے لیے ابھرنے والی اس مسکراہٹ کو اس نے بغور دیکھا جب کہ وہ خود سنجیدہ نگاہوں سے ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ خود بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی ان دونوں کے درمیان مزید کوئی دوسری بات ہوئی نہیں تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ حیدر نے ٹی وی کی آواز ذرا کم کرتے ہوئے اٹھ کر فون اٹینڈ کیا۔

"پہنچ گئے آپ لوگ خیریت سے۔ ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ آپ کا فون نہیں آیا۔" سلام دعا کے فوراً بعد اس نے یہ بات کہی تھی اور وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی کہ دوسری طرف کون ہے۔

"سارہ ٹھیک ہے؟ اسے کہیے گا حیدر کہہ رہا ہے کہ سارہ توفیق! اب آپ ذرا بڑا ہونے کی کوشش کیجیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے بعد وہ خاموشی سے ان کی بات سننے لگا۔

"ہاں ایمن بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت میرے ساتھ بیٹھ کر بزنس نیوز دیکھ رہی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے ان سے کہا اور پھر ایک مسکراتی ہوئی نظر اس پر بھی ڈالی۔

"توفیق بھائی تم سے بات کریں گے۔" ان کی بات سننے کے بعد اس نے ریسیور کان سے ہٹاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ کچھ حیرت زدہ سی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگاتے ہوئے اس نے انہیں سلام کیا۔ اس کی آواز میں نہ نفرت تھی نہ غصہ صرف اور صرف اجنبیت تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو تم؟" ان کی بھاری مردانہ آواز کسی بھی قسم کے جوش اور محبت سے عاری تھی۔ اسے تو کم از کم ایسا ہی لگا تھا کہ ایک غیر آدمی اس کی خیریت پوچھ رہا ہے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ کوئی ایسی بات اس کے منہ سے نہ نکلے جو اس جیسے ذہین اور قابل آدمی کو ناگوار گزرے۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہے تمہیں؟ کچھ چاہیے تو نہیں ہے؟" اس کا باپ ایک بزنس مین تھا اور وہ اس سے اسی طرح کی بات کر سکتا تھا۔

"نہیں۔" اس نے جواباً لمبا فقرہ بولنے کا رسک نہیں لیا۔

"کچھ چاہیے ہو تو حیدر سے کہہ دینا۔ اچھا یہ الماس تم سے بات کرے گی۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس سے اس کی مرضی پوچھے بغیر ریسیور اس عورت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ تم الماس سے بات کرنا چاہتی ہو یا نہیں۔

وہ اب دوسری طرف اس عورت کی آواز سن رہی تھی جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

"کیسی ہو ایمن؟" اس نے الماس توفیق کو سلام نہیں کیا تھا۔ وہ سرے سے کچھ بولی ہی نہیں تھی۔ اس سے پہلے

CamScanner

پھر کر انہوں نے خود ہی اس کی خیریت پوچھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو جواب دینے پر آمادہ کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" زندگی میں یہ وقت بھی آنا تھا۔ اسے اس عورت سے بات کرنی پڑ رہی تھی جس نے اس کی ماں سے اس کی سب خوشیاں چھین لی تھیں۔

وہ اتنی کمزور تھی کہ اس عورت سے کھل کر نفرت کا اظہار تک نہیں کر سکتی تھی۔

"تمہاری امی کے لیے بہت افسوس ہوا ایمن! ہمارا امریکہ جانا اتنا ضروری نہ ہوتا تو ہم لوگ ضرور رک جاتے۔" وہ خون کے گھونٹ پیتے ہوئے یہ تعزیتی جملے سن رہی تھی۔

اگر وہ توفیق کمال کے پاس رہنے کی محتاج نہ ہوتی' اگر وہ اس کے نام کا سہارا لیے بغیر جینے کے قابل ہوتی تو اس عورت کو اتنی گالیاں دیتی اتنا کچھ کہتی جتنا کہ اس نے زندگی میں بھی کسی کو نہ کہا ہوتا۔

"ویسے بی بی اور حیدر کے پاس تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم لوگ بھی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنا قیام مختصر کر کے جلدی کراچی واپس آ جائیں۔" یہ ساری باتیں یقیناً رسماً کی جا رہی تھیں ورنہ انہیں اس توفیق کو یا ایمن سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ شاید اخلاقاً 'دکھاوے' کے لیے شوہر کے دل میں اپنی قدر و منزلت بڑھانے کے لیے۔

وہ ان کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں صرف جی بولی تھی۔

"اچھا پاپا توفیق سے بات کرو۔" انہوں نے ریسیور دوبارہ توفیق کمال کو دے دیا۔

"حیدر کہاں ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔" انہوں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی اس سے کہا۔ اسے خود بھی اتنی دیر میں پہلی مرتبہ حیدر کا خیال آیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ صوفے پر نہیں تھا۔ اس نے لاؤنج میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ اسے اس کے باپ کے ساتھ گفتگو کرتا چھوڑ کر شاید ریسیور اس کے ہاتھ میں دیتے ہی لاؤنج سے چلا گیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ آپ ہولڈ..." اس کا آہستہ آواز میں دیا جانے والا یہ جواب انہوں نے درمیان ہی میں کاٹ دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اس سے آفس میں بات کر لوں گا۔ خدا حافظ"

حیدر سے پھر اس کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی۔ وہ ریسیور اسے دے کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا یا کہیں اور لیکن بہرحال وہ اس کے بعد اسے اب نظر آیا تھا۔

وہ اور بی بی پہلے ہی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں' حیدر ملازم کے بلانے پر ابھی ابھی آیا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر ایمن پر ڈالی۔ وہ سر جھکائے اپنی پلیٹ کو گھور رہی تھی۔

"شروع کرو بیٹا۔" بی بی نے حسب عادت اس کی کھانے کی میز پر دل و جان سے میزبانی شروع کر دی۔

اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈال لیا۔

"آج گل باز کا فون آیا تھا۔ دو چار معمولی نوعیت کے مسائل ہیں۔ میرا خیال ہے میں خود ہی زمینوں کا چکر لگا آؤں۔" حیدر اور بی بی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

بی بی اس کے مسائل کی نوعیت جاننا چاہ رہی تھیں' لیکن وہ بجائے ان مسائل کو ان کے ساتھ ڈسکس کرنے

کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ایمن نے پلیٹ میں ڈالے تھوڑے سے سالن کو آہستہ آہستہ اس طرح ختم کیا کہ وہ کھانے کے اختتام تک ان لوگوں کا ساتھ دے سکے۔ بی بی کھانا کھا چکی تھیں' ان کے بعد اس نے اپنی پلیٹ میں موجود سالن ختم کیا تھا۔

وہ پانی پینا چاہتی تھی اور پانی پینے ہی کے لیے اس نے اپنا اتنی دیر سے پلیٹ پر جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ سر اٹھاتے ہی اس کی نگاہ حیدر پر پڑی۔ وہ بی بی کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں اس پر تھیں۔ اس کے دیکھ لینے پر بھی اس نے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔ اسے اس شخص کی ان ذہین آنکھوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ اس وقت اس کے چہرے پر کیا پڑھ رہا ہے؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حیدر مسعود اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ اپنے باپ سے بات کرنے کے بعد شدید مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہے۔ اسے اپنے باپ سے بھی کوئی توقعات وابستہ نہیں رہیں پھر بھی اس وقت وہ بہت اپ سیٹ تھی۔

وہ کل رات کی طرح دوبارہ کبھی اس شخص کے سامنے اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حیدر نے پانی کا جگ اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد حیدر اور بی بی کا لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے کا پروگرام تھا۔ وہ چائے کے لیے منع کر کے بڑی شائستگی سے ان دونوں سے معذرت کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ تکیے میں منہ چھپائے بے آواز رو رہی تھی۔ وہ زندگی میں ہر طرح تنہا ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی بھی نہیں۔ کسی کو بھی اس کی پروا نہیں۔ کسی کو بھی اس سے محبت نہیں۔ دروازے پر دستک سن کر وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔

جلدی جلدی اپنا چہرہ صاف کر کے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے حیدر مسعود کو دیکھ کر وہ بے حد حیران ہوئی۔ وہ بی بی یا پروین کو سامنے دیکھنے کی توقع کر رہی تھی' حیدر کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی سامنے سے ہٹتے ہوئے اسے اندر کے لیے راستہ دینے لگی لیکن وہ اندر نہیں آیا تھا۔

"میں تمہیں یہ پیسے دینے آیا تھا۔" اس کے ہاتھ میں بہت سے نوٹ تھے جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اس نے وہ پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔" زندگی میں اور کوئی فخر اس کے پاس تھا یا نہیں کم از کم یہ فخر تو حاصل تھا کہ اس کی ماں نے اسے اپنے بل بوتے پر محنت کر کے بغیر کسی کی مدد لیے پالا تھا۔

"یہ کوئی میرے پیسے نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا کے ہیں۔ ابھی فون پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ایمن کو کچھ پیسے وغیرہ دے دینا۔ اب کتنے دینا یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔ میں اپنی مرضی سے لے آیا ہوں۔ تم ان پیسوں کو بے تکلف استعمال کر سکتی ہو بلکہ اگر اور چاہیے ہوں تو بھی مجھے بتا دینا۔ ابھی تو یہ پیسے میں اپنے ہی پاس سے لایا ہوں لیکن بے فکر رہو اتنا سخی نہیں ہوں' توفیق بھائی کے واپس آتے ہی سارے پیسے ان سے لے لوں گا۔" اس نے ابھی بھی پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ایمن! تم کہو تو میں تمہاری بوسٹن توفیق بھائی سے بات کرا دوں۔ انہوں نے

مجھ سے بھی کہا تھا کہ ایمن کو شاید پیسوں کی ضرورت ہو تو اسے پیسے دے دینا۔ ان پیسوں پر تمہارا حق ہے۔ یہ تمہارے پاپا کے پیسے ہیں۔" وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کا اپنے باپ کی کسی چیز پر کوئی حق نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے خاموشی سے وہ نوٹ ہاتھ میں لے لیے۔ وہ کچھ طمانیت بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

"میں کل جیکب آباد جا رہا ہوں۔ تین چار دن میں واپس آؤں گا۔ بی بی تو ہیں یہاں تمہارے پاس۔ میں نے بی بی سے کہا ہے کہ میرے پیچھے ام ایمن کو بور مت ہونے دیجیے گا۔ ہو سکا تو کل ان کے ساتھ شاپنگ پر چلی جانا۔ اس طرح تمہاری کراچی کی بھی تھوڑی بہت سیر ہو جائے گی۔" وہ جیسے مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی اور وہ اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے دل و جان سے تیار۔ وہ اسے اپنے گھر میں لایا تھا تو لانے کے بعد سے ایک پل کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے شب بخیر کہتا وہاں سے چلا گیا اور وہ دروازہ بند کر کے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

پچیس ہزار روپے۔ ان نوٹوں کو گننے کے بعد وہ مسخرانہ انداز میں خود پر ہنسی۔ چند ہی دنوں میں ام ایمن کی زندگی میں کیا ٹھہراؤ آیا تھا۔ وہ اسکول میں پچیس سو روپے کمانے والی ام ایمن جس نے تین مہینے پہلے بڑی کوششوں کے بعد اپنی تنخواہ پچیس سو سے بڑھوا کر ستائیس سو روپے کروائی تھی آج اسے یونہی شاپنگ اور سیر و تفریح کے لیے پچیس ہزار روپے دیے جا رہے تھے۔ اس نے وہ نوٹ یونہی دراز میں ڈال دیے تھے۔

⊛ ⊛ ⊛

بی بی نے اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد اس سے شاپنگ پر چلنے کی بات کی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسے زبردستی ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔ اس کے انکار پر انہوں نے بات وہیں ختم کر دی۔ بی بی ہی سے اسے پتا چلا کہ حیدر صبح آفس چلا گیا تھا، وہیں سے اسے لنچ کے بعد سے جیکب آباد چلے جانا تھا۔ شام میں بی بی کے کچھ مہمان آ گئے تو وہ تھوڑی دیر لان میں گھوم پھر کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

رات کے کھانے کے بعد فوراً سونے کے لیے چلے جانے کے بجائے وہ بی بی کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھی رہی۔ اس کے ساتھ چائے پی کر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

اگلی صبح بی بی اپنے معمول کے مطابق دس بجے اٹھی تھیں۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

"رات حیدر کا فون آیا تھا۔ تمہاری خیریت پوچھ رہا تھا۔" اس کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے بتایا۔ وہ ناشتے کے طور پر ایک کپ چائے پی کر بی بی کے جاگنے سے بہت پہلے ہی فارغ ہو چکی تھی۔

"پوچھ رہا تھا آپ ایمن کو لے کر کہاں گئیں۔ شاپنگ کرانے یا کہیں گھومنے پھرنے۔" چائے پیتے ہوئے انہوں نے اسے مزید بتایا۔

"آج چلو تم میرے ساتھ۔ ابھی پہلے مجھے مسز پرویز کی عیادت کرنے جانا ہے۔ ان کی بیماری کا اتنے دنوں سے سن رکھا ہے اور جا نہیں پائی۔ آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھیں گے پھر اس کے بعد شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے۔"

انہوں نے جانا یہ پروگرام پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔ وہ ان کے کسی جاننے والے سے مل کر کیا کرتی اور شاپنگ؟ وہ انہیں یہ بات کیسے بتاتی کہ اپنے باپ کے دیے پیسے اس کا استعمال کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔ اس

نے ساری زندگی اس شخص کا دیا ایک پیسہ استعمال نہیں کیا پھر اب کیسے؟

"آپ پلیز مجھے ایکسکیوز کر دیں۔ میرا ابھی شاپنگ کا یا کہیں بھی جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بڑی بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دم ہی سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئیں۔

"مجھے پتا ہے بیٹا! ابھی تمہارا کہیں آنے جانے یا سیر و تفریح کا دل نہیں چاہ رہا۔ تم ماں کی جدائی کے اتنے بڑے سانحے سے گزری ہو لیکن پھر بھی بیٹا یوں خاموش اور گم صم مت رہا کرو۔ تمہارا دل نہیں چاہ رہا تو کوئی بات نہیں۔ کل اگر تمہارا موڈ ہوا تو ہم کل چلیں گے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت اور اپنائیت سے کہا تو وہ اپنے آنسو روک نہیں پائی۔ اسے رونے سے منع کرنے کے بجائے انہوں نے محبت بھرے انداز میں اپنا ہاتھ اس کے کندھے کے گرد رکھ دیا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

"سارہ بوسٹن میں ماریہ ہی کے پاس تو رہ رہا ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے بی بی نے بڑی روانی سے ماریہ نام کی خاتون کا یوں ذکر کیا گویا وہ انہیں پہلے سے جانتی تھی۔ بات شروع انہوں نے حیدر کے ذکر سے کی تھی۔

"پتا نہیں زمینوں پر کیا مسئلہ ہے۔ شروع کی عادت ہے یہ اس کی اپنی پریشانیاں اور مشکلات کسی کے ساتھ ڈسکس نہیں کرتا۔ میں ناراض ہوں تو کہتا ہے کہ بی بی آپ ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ بس اسی لیے میں آپ کو نہیں بتاتا۔ آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں تو میں آپ کے ساتھ اپنی ساری کاروباری الجھنیں ڈسکس کرنا شروع کر دوں گا۔" یونہی حیدر کا ذکر کرتے کرتے انہیں یہ ماریہ نامی خاتون یاد آ گئی تھیں۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

جس محبت سے وہ حیدر کا ذکر کر رہی تھیں اب اسی محبت سے کسی ماریہ کا ذکر کر رہی تھیں۔

"ماریہ حیدر کی چھوٹی بہن ہے۔ حیدر سے دو سال چھوٹی ہے۔ میرے لیے تو یہ دونوں ہی بھتیجا اور بھتیجی نہیں بلکہ میری اولاد کی طرح ہیں۔" اس نے ان سے ان کی کوئی بھی پرسنل بات نہیں پوچھی تھی لیکن آج وہ خود ہی اس کے ساتھ اپنے بارے میں بہت سی باتیں کرنے لگی تھیں۔

وہ حیدر کے والد سے بڑی تھیں۔ شادی کے دس سال بعد ان کے شوہر اور بیٹے کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا پھر انہوں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا محور بھائی، بھاوج اور ان کے بچوں کو بنا لیا تھا۔ حیدر کی ممی کے ہوتے ہوئے بھی ان کا اپنے بھتیجے بھتیجی کی تربیت میں خاصا دخل تھا۔

"حیدر اپنی ماں کا ذرا زیادہ لاڈلا تھا اور ماریہ مجھ سے زیادہ قریب تھی۔ خاندان میں سے ہی رشتہ آیا اور آناً فاناً ماریہ کی شادی ہو گئی۔ ہمارا تو اتنی جلدی اس کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ صرف اکیس سال کی تو تھی وہ اس وقت لیکن کرم کے گھر والوں کو شادی کی بہت جلدی تھی۔ ماریہ کی شادی کے بعد کتنے دنوں تک تو میرا حال ہی برا رہا۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ اب تو ماشاءاللہ اس کے دو بچے ہیں۔ بہت خوش ہے۔"

وہ اپنے خیالوں میں الجھی ہوئی تھی اب جو انہوں نے یہ ذکر کیا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے اور حیران

CamScanner

ہونے پر مجبور ہوئی وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کے شوہر اور بیٹا ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ کتنا بڑا دکھ ہوگا بیان کے لیے مگر وہ اس بات پر کوئی شکوہ یا گلہ کرتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جب انسان خود دکھ سے گزرتا ہے تو دوسروں کا دکھ بہت اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اس بات کا جتنے عام سے انداز میں ذکر کر رہی تھیں درحقیقت یہ بات ان کے لیے اتنی عام تھی نہیں۔ اس نے بے ساختہ دعا کی کہ وہ بھی ان جیسی ہو جائے۔

"اس کے بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ ہوتا ہے اسی لیے ایک ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں رکتی۔ صرف حیدر کی شادی پر ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ پورے تین مہینے کراچی میں رہی تھی۔" ان کی اس بات پر اس نے کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

حیدر شادی شدہ تھا۔ اسے اس بات پر حیرت ہوئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دنوں میں اس نے نہ تو اس کی بیوی کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی ذکر سنا تھا۔ بلاوجہ کا تجسس ظاہر کیے بغیر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ہو سکتا ہے اس کی بیوی ملک سے باہر کہیں گئی ہوئی ہو۔ اس نے از خود یہ بات فرض کر لی اور ایک مرتبہ پھر بی بی کی گفتگو کی طرف دھیان دینے لگی۔

کھانے کے بعد بی بی زیادہ دیر نہیں جاگتی تھیں۔ ان چھ دنوں میں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ انہیں رات کے آخری پہر عبادت کے لیے اٹھ جانا ہوتا تھا' اسی لیے دس ساڑھے دس بجے سو جایا کرتی تھیں۔ کھانے کے بعد کچھ دیر اس کے ساتھ باتیں کر کے وہ دس بجے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ بجائے اپنے کمرے میں جانے کے اسٹڈی میں آ گئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ پڑھے۔ تھوڑی دیر کے لیے سب باتوں کو بھول کر وہ کسی اچھی سی کتاب کو انجوائے کرے۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کے موڈ میں یہ اچانک تبدیلی بی بی کی باتیں سن کر آئی ہے۔ اسے پتا تھا وہ ان جیسی صابر اور شاکر نہیں پھر بھی تھوڑی دیر کے لیے وہ زندگی سے اپنے سارے گلے شکوے بھول جانا چاہتی تھی۔ اس وقت گھوم پھر کر کتابیں دیکھتے ہوئے وہ باقاعدہ ان کے نام پڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے باقاعدہ انتخاب کر کے اکنامکس کی ایک کتاب نکالی۔

تھرڈ ایئر میں اس کی اکنامکس کی لیکچرار نے لیکچر دیتے ہوئے ایک مرتبہ اسی مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ اس وقت تو وہ کتاب نہ اسے اپنے کالج کی لائبریری میں ملی تھی اور نہ کہیں اور سے دستیاب ہو پائی تھی لیکن آج اسے اسی مصنف کی اسی موضوع پر ایک دوسری کتاب پڑھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بڑے مطمئن سے انداز میں کتاب ہاتھ میں لے کر وہ وہیں میز کے آگے سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ صرف لفظوں کو پڑھ نہیں رہی تھی بلکہ انہیں سمجھنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ اسے یہاں بیٹھ کر کتاب پڑھتے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" دروازے سے اندر آتے حیدر کو دیکھ کر اس نے فوراً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے دوری سے اس کے سلام کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اسٹڈی کی لائٹ آن دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ خاتون یہاں ہیں۔" وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ اسے گھر واپس آئے غالباً کافی دیر ہو چکی تھی اس کے لباس اور اس کے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں نے سوچا کہ ابھی تم جاگی ہوئی ہو تو یہ ابھی تمہیں دے دوں۔ صبح پھر جب میں آفس جاؤں گا تو شاید اس وقت تم سو رہی ہوگی۔" ایمن نے چونک کر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اس میں بڑی خوب صورتی سے ریپ ہوا ایک ڈبا تھا۔

"جہاں میں گیا تھا وہاں سے تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ تمہارے لیے کیا لے جاؤں اس لیے آج کراچی واپسی پر یہ یہیں سے خریدا گیا ہے۔ میں سات بجے کراچی واپس آ گیا تھا۔ آفس میں ایک دو ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے بجائے گھر آنے کے سیدھا آفس چلا گیا بلکہ نہیں سیدھا نہیں گیا تھا' پہلے تمہارے لیے یہ خریدا اس کے بعد آفس گیا تھا۔ میں نے سوچا تم کہو گی کہ میں خالی ہاتھ واپس آیا ہوں۔ تمہارے لیے کچھ بھی نہیں لایا۔" اس کے سامنے ڈبا رکھتے ہوئے وہ بڑی بے تکلفی سے بولا۔

وہ ہونق سے انداز میں منہ پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا کب اس کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ تھا جو وہ اس کے لیے تحفے لاتا اور اگر لانا بھول جاتا تو وہ برا مانتی۔ اس بے تکلفانہ انداز کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کوئی تحفہ دے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں پھر دینے والے کی خوشی کی خاطر اس تحفے کو اسی کے سامنے کھول کر دیکھتے ہیں۔ اگر چیز پسند کی ہے تو پھر تو کیا ہی بات ہے اور اگر پسند کی نہیں ہے تو بھی دینے والے کا دل رکھنے کی خاطر اس تحفے کی جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے اسے مینرز سکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ نروس سی ہو گئی وہ میز پر اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میز پر دونوں کہنیاں ٹکائے وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ "اب کھول بھی چکو' کب تک اس کا معائنہ کرو گی۔" ایمن نے اس کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر۔ بہت دوستانہ سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے رکھے تحفے کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر وہ اسے کھولنے لگی۔ وہ ڈبا سرخ اور سفید رنگ کے بڑے خوب صورت سے ریپنگ پیپر میں لپٹا ہوا تھا اور اس پر سرخ رنگ کا ہی ربن بھی بندھا ہوا تھا۔

اسے کھولنے پر اندر سے ایک بہت ہی خوب صورت چاکلیٹ باکس نکلا تھا۔ اس نے وہ باکس کھولا تو اس میں بیضوی شکل کی بہت ساری چاکلیٹس گولڈ کلر کے فوائل میں لپٹی ہوئی بڑی خوب صورتی اور نفاست سے لگی تھیں۔ ابھی اس نے باکس کو کھول کر چاکلیٹس پر ایک نظر ہی ڈالی تھی کہ وہ بولا۔

"اور اگر تحفہ کوئی کھانے کی چیز ہو تو اسے دینے والے ہی کے سامنے تھوڑا سا چکھتے ضرور ہیں۔" وہ اس کے مذاق کو سمجھ گئی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے اس کی باتیں بری نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ نے لے لی تھی۔ اس نے ان میں سے ایک چاکلیٹ اٹھا کر اس کا فوائل کھولنے کے بعد اسے منہ میں ڈال لیا تھا۔

CamScanner

"مصرف خود ہی نہیں کھاتے' اطلاقات دینے والے کو بھی پوچھ لیتے ہیں۔" اب کی بار وہ خود کو ہنسنے سے بالکل نہیں روک پائی۔ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا مذاق اتنی سنجیدگی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ چاکلیٹ باکس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایمن نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ بڑی شرارتی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"جب تمہاری ہنسی اتنی خوب صورت ہے تو پھر تم ہنسنے میں اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہو؟" اپنے لیے ایک چاکلیٹ نکالتے ہوئے اس نے اسی شرارتی مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں اس کے انداز میں اس کی نگاہوں میں سوائے خلوص اور اپنائیت کے دوسرا کوئی رنگ نہیں تھا' پھر بھی وہ بری طرح گھبرا گئی۔

چاہے وہ عام سے ہی انداز میں اس کی تعریف کر رہا تھا لیکن اس کے لیے یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک مرد نے اس کی کسی ظاہری خوبی کو سراہا تھا۔ اسے پتا تھا اس وقت اس کے چہرے پر شرم بھی ہے اور گھبراہٹ بھی۔

"کوئی تعریف کرے تو بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ اس نے سر اوپر کر کے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"جا رہا ہوں میں' تم اپنی کتاب انجوائے کرو۔" وہ ہنستے ہوئے کرسی پر سے اٹھ گیا۔

⊛ ⊛ ⊛

"جلدی سے تیار ہو جاؤ' میں تمہیں باہر لے کر جا رہا ہوں۔" آفس سے آتے کے ساتھ ہی بی بی کو سلام کرنے کے بعد اس نے اس سے یہ بات کہی تھی۔ اس کا انداز حکمیہ اور بالکل دو ٹوک تھا۔

"میں...... لیکن وہ......" فوری طور پر وہ انکار میں کوئی ڈھنگ کی بات بول بھی نہیں پائی۔

"ہاں' میں وہ کیا؟" اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میرا کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں ہے۔" ہمت کر کے اس نے دو ٹوک انکار کر ہی دیا۔

"میں نے تم سے تمہارے موڈ کے بارے میں پوچھا بھی نہیں ہے۔ تم نے شاید میرے جملے پر غور نہیں کیا۔ میں تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھ رہا ہوں' میں تمہیں بتا رہا ہوں۔" بی بی حیدر کے تحکمانہ انداز اور ایمن کی پریشان شکل کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

"مجھ سے بھی کل رات آتے ہی اس نے یہی پوچھا تھا کہ آپ ایمن کو لے کر کہیں باہر گئیں۔ میرے انکار پر مجھ سے خفا ہوا تھا کہ اگر وہ منع کر رہی تھی تو بھی آپ زبردستی لے جاتیں۔ اتنے دنوں سے وہ مسلسل گھر میں بند ...." ان کی مخاطب ایمن تھی۔

"ہاں تو میں بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ توفیق بھائی آ کر کیا کہیں گے کہ ہم نے ان کی بیٹی کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھا۔ اسے بالکل بھی وقت نہیں دیا۔ میں بس دس منٹ میں آ رہا ہوں' تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" پہلے بی بی اور پھر بعد میں اس سے کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

بی بی کے نرمی بھرے انداز میں کیے جانے والے اصرار کو وہ بڑے آرام سے ٹال گئی تھی مگر اس کے حکمیہ اور دو ٹوک انداز پر اسے انکار کرنا نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کا ماحول نہیں تھا اس طرح کسی مرد کے ساتھ گھر سے باہر جانے

کا اس کی زندگی میں کبھی کوئی تصور نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی جانے لگی تھی کہ یہ اس کے باپ کا ماحول تھا اور یہ کہ اس کے میزبان اس کی اتنی دل جوئی اس لیے کر رہے تھے کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔

اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی وہ انتہا سے زیادہ نروس تھی۔ اس کے ساتھ اکیلے کسی جگہ جانے کا تصور اسے بری طرح بوکھلا رہا تھا۔ وہ اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو پانے سے قاصر تھی۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔

ہاں! وہ اس کی تھوڑی تھوڑی دیر بعد خود پر پڑنے والی سرسری سی نظروں کو ضرور محسوس کر رہی تھی۔

اسے پتا تھا کہ اس کا گھبرانا اور نروس ہونا انتہائی احمقانہ تھا۔ وہ اس سے عمر میں اتنا بڑا تھا وہ شادی شدہ تھا' وہ اس سے بات بھی بالکل اسی طرح کرتا تھا جیسے کسی اپنے سے عمر میں چھوٹے فرد کے ساتھ کی جاتی ہے۔

وہ یہ سب سمجھتی تھی پھر بھی گھبرا رہی تھی۔ اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ خود اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔ اس کا ماحول تبدیل ہوا تھا اس کا گھر تبدیل ہوا تھا تو خود بخود ہی اس کے لیے سوچ کے بھی کئی در وا ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ ہو رہی تھی۔ اپنی جن خامیوں کے بارے میں اس نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا ان پر وہ اس وقت غور کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جانے سے اس لیے نہیں گھبرا رہی تھی کہ وہ ایک مرد تھا۔ وہ اس سے بات کرتے وقت اس لیے نروس نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ ایک مرد ہے۔ یہ ڈرنا' گھبرانا اور لوگوں کو فیس نہ کر سکنا یہ سب تو اس کی بچپن کی عادتیں تھیں۔ وہ مردوں سے تو کیا عورتوں سے بھی اعتماد کے ساتھ بات نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی ماں احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ شاید شوہر کے رد کر دینے نے اس کے اندر اس احساسِ کمتری کو جنم دے دیا تھا اور ماں کا یہی احساسِ کمتری پورا کا پورا اس کے اندر منتقل ہو گیا تھا۔

اس کی اور امی کی زندگی میں ذہنت خالہ کی فیملی کے علاوہ دوسرا کوئی فرد تھا نہیں۔ اس میں تو اتنی سی بھی اہلیت نہیں تھی کہ وہ اس معمولی سے پرائیویٹ اسکول میں اپنے بل بوتے پر جاب حاصل کر لیتی۔ امی کی بیماری اور ان لوگوں کی مالی مشکلات دیکھتے ہوئے اس کے فائنل ایئرز کے دوران اسے وہ معمولی سی نوکری بھی عارف بھائی نے دلوائی تھی۔ چند مہینوں پہلے جو اس کی سیلری بڑھی تھی وہ بھی عارف بھائی ہی کی وجہ سے بڑھی تھی۔ وہ اب تک یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک چھوٹے شہر سے بڑے شہر میں آئی ہے' مڈل کلاس سے اپر کلاس میں داخل ہوئی ہے اس لیے گھبرا رہی ہے۔ پھر ابھی وہ ماں کی جدائی کے غم سے بے حال ہے' باپ کے متوقع رویوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس وقت پہلی دفعہ اسے اندازہ ہوا تھا کہ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ اصل وجہ اس کا ابنارمل ماحول ہے۔ اس کا خود کو کمتر سمجھنا ہے' اسے سوشل ہونا آتا ہی نہیں تھا۔ پہلی دفعہ اس کے دل میں ماں کے لیے ایک شکوہ بھی پیدا ہوا تھا۔

"امی! آپ نے مجھے ایک ابنارمل ماحول کیوں دیا۔ آپ نے میری پرورش نارمل بچوں کی طرح کیوں نہیں کی۔"

اس نے حیدر آباد میں اپنی ہی طرح کے متوسط طبقے کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے اور اچھی اچھی جابز کرتے دیکھا تھا۔ پیسے کی کمی نے ان سے ان کا اعتماد نہیں چھینا تھا۔ وہ پیسے کی کمی

کے باوجود خود پر بھروسہ کرتی تھیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا اور وہ اپنی کسی صلاحیت پر کیا بھروسہ کرتی اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا اس میں کوئی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟

وہ اسے ایک شاپنگ سینٹر میں لے آیا تھا۔ اپنے بارے میں سوچی تمام باتوں کے باوجود وہ خوش بے تحاشا نروس اور گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ مختلف دکانوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ اسے لے کر ایک بوتیک میں داخل ہو گیا۔ وہ نہ کپڑوں کو دیکھ رہی تھی اور نہ کسی اور چیز کو۔ وہ بس اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہیں کوئی بھی ڈریس اچھا نہیں لگ رہا؟" کافی دیر بعد اس نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ہینگرز میں لٹکے مختلف ملبوسات پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہ جواباً بےبسی سے سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کے جواب نہ دینے پر اس نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔

"تمہارا شاپنگ کا دل نہیں چاہ رہا۔ چلو میں تمہیں کہیں سے اچھا سا ڈنر کرا دوں پھر گھر واپس چلیں گے۔"

اس سے کہتے ہوئے اس نے باہر جانے والے راستے کی طرف اپنے قدم موڑ لیے۔ وہ ڈنر کی بات سن کر مزید گھبرا گئی تھی۔ اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں جانا اور کھانا کھانا وہ اس بات کو سوچ کر ہی بوکھلا گئی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی دفعہ کہیں باہر کھانا کھانے آئی تھی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو کیا اس نے کبھی کسی عام سے ہوٹل میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اچھے ہوٹلز اندر سے کیسے ہوتے ہیں یہ اس نے صرف فلموں اور ڈراموں ہی میں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اپنے اندر اعتماد پیدا ہو جانے اور اپنی نروسنیس پر قابو پالینے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"اسٹیمڈ رائس (Steamed Rice) منگوا لوں؟ سلاد کون سی ٹھیک رہے گی۔ رشین یا اٹالین؟ روسٹ چکن اور فرائیڈ فش کھاؤ گی؟ یہاں فرائیڈ ویجی ٹیبلز جن چیزوں کے ساتھ سرو کیے جاتے ہیں بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ ٹرائی کرو گی؟" وہ ہر ڈش پر صرف اقرار میں سر ہلانے کا کام کر رہی تھی۔

جب تک کھانا سرو نہیں ہوا وہ اسے اپنے پچھلی دفعہ اس ہوٹل میں آنے کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ ایک بزنس ڈنر کے لیے یہاں آیا تھا اور اسے یہاں کا کھانا بہت پسند آیا تھا' اس لیے آج وہ اسے لے کر یہاں دوبارہ آ گیا تھا۔ ویٹر نے کھانا سرو کر دیا تو وہ اسے کھانا شروع کرنے کے لیے کہتے ہوئے خود بھی اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالنے لگا۔

اپنی پلیٹ میں فرائیڈ فش اور چاول ڈالتے ہوئے وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اس کی ساری گھبراہٹ اور سارا خوف جو اس میز پر بیٹھ جانے تک موجود تھا اس وقت یکسر غائب ہو چکا تھا' وہ اس وقت ذرا سی بھی نروس نہیں تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر ہوٹل میں داخل ہونے تک جو پسینہ پھوٹ رہا تھا وہ اب بالکل خشک ہو چکا تھا۔ اسے اس وقت حیدر مسعود کے سامنے بیٹھے ہوئے ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جب کہ وہ سارے راستے اسی وقت سے گھبراتی آئی تھی۔ اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا' وہ خود بھی بڑے مگن سے انداز میں کھانا کھا رہا تھا۔ "یہ چکن بھی تو لو۔" اس نے اپنی پلیٹ میں چکن کا ایک پیس ڈالنے کے بعد ایک پیس اس کی پلیٹ میں بھی رکھ دیا۔

"تمہیں کوکنگ آتی ہے؟" اس کی نظریں اپنی پلیٹ پر تھیں لیکن وہ مخاطب اسی سے تھا۔

"بہت زیادہ تو نہیں' بس پاکستانی کھانے بنانے آتے ہیں۔" وہ اس طرح بغیر نروس ہوئے اس کی بات کا جواب دینے پر خود ہی دل بھر کر حیران ہوئی۔

"سیکھ ڈالو پھر۔ شوہر حضرات بیویوں کی اس خوبی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ابھی تو تمہارے پاس کافی سال ہیں سیکھنے کے لیے۔ پھر دیکھنا آگے یہ خوبی تمہارے کس قدر کام آئے گی۔" وہ جیسے اسے کوئی گر کی بات بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی سرخی سی پھیل گئی۔ وہ اس کے چہرے پر بکھرتے اس رنگ کو دیکھ کر محظوظ سے انداز میں ہنسا۔

"میں نے تم سے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم کیا پڑھتی ہو؟"

"میں نے بی اے کیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے اسے بتایا تو وہ بی اے میں اس کے مضامین کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ بہت آرام سے کھانا کھاتے ہوئے اسے اپنے مضامین کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"ہیلو حیدر۔" ان دونوں کے قریب ایک خوب صورت نسوانی آواز ابھری تو ان دونوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔

"ہیلو۔" حیدر نے اس لڑکی کو جواباً ہیلو کہا۔

"کیسے ہیں آپ؟" اس لڑکی نے بڑے غور سے ایمن کی طرف دیکھا اور پھر حیدر سے اس کی خیریت دریافت کی۔ ایمن اس وقت واقعی گاؤں کی گوری والے انداز میں گنواروں کی طرح اس لڑکی کو تک رہی تھی۔ اس نے بلیک کلر کی سلیولیس قمیص جس کا گلا بھی خاصا گہرا تھا اس کے ساتھ بلیک ہی کلر کا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ ٹراؤزر کا پائنچہ اس حد تک کھلا ہوا تھا کہ اس کی بے حد سڈول اور گوری پنڈلیاں بہت آرام سے نظر آ رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کا دوپٹہ اس کے ایک کندھے پر جھول رہا تھا۔ اپنے کمر تک آتے سلکی بالوں کو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی ادا سے ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

اچھی زبردست ایکسپوژنگ کے ساتھ اس نے میک اپ بھی بہت نفاست اور سلیقے سے کر رکھا تھا۔ ایک تو وہ خوب صورت تھی اس پر اسے میک اپ کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس لڑکی کو تکتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ جب میں لڑکی ہو کر اس پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تو حیدر مسعود کا کیا حال ہوگا؟ وہ سراپا حسن تھی اور اپنے حسن کو اس نے ہر ہر طرح اجاگر کرنے کی پوری پوری کوشش بھی کر رکھی تھی۔ اس نے ایک چور نگاہ حیدر پر ڈالی لیکن اسے بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس کی طرح منہ پھاڑے اس لڑکی کے حسن اور اداؤں سے متاثر ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شائستگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بھی تھی۔

اسے حیدر کے اس لڑکی کے ساتھ اس طرح مغرورانہ اور پرتکلف انداز میں گفتگو کرنے پر بے ساختہ اس کا پور آباد میں زینت خالہ کے گھر والوں سے ملنے والا انداز یاد آیا۔ ان لوگوں سے بھی وہ بالکل اسی طرح بات کر رہا تھا بظاہر بڑی شائستگی کے ساتھ لیکن اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مخاطب کو اس سے بے

تکلف ہونے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ یوں منفرد اور پُر تکلف انداز میں باتیں کرنے والا حیدر مسعود اس شخص سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے ساتھ اپنائیت اور بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔

اپنی کم عمری اور کم علمی کے باوجود اسے پوری طرح اندازہ تھا کہ وہ لڑکی ہر انداز سے حیدر کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ متاثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کی انگریزی میں کی جانے والی گفتگو کا انگریزی میں ہی جواب دے رہا تھا۔ مگر اس کا لہجہ کتنا سپاٹ اور کسی قسم کی گرم جوشی سے عاری تھا۔

"چلیں پھر ملاقات ہو گی آپ سے۔ میں یہاں اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہیں۔" اب اس لڑکی کی آنکھوں میں مایوسی اور غصہ نظر آ رہا تھا لیکن اس نے اپنے لہجے میں اس مایوسی اور غصے کو شامل نہیں ہونے دیا۔ حیدر سر ہلاتے ہوئے دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا جب کہ وہ ابھی تک اسی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی اپنی دوستوں کی طرف جا رہی تھی۔

"کیا یہ شخص اتنی حسین لڑکی کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ جب کہ وہ دل و جان سے اس پر نثار ہو رہی ہے۔" اس کا دھیان ایک دم ہی حیدر کی بیوی کی طرف گیا۔ وہ بھی حسین ہو گی، وہ بھی شاندار شخصیت کی مالک ہو گی۔ اس غیر معمولی اور شاندار شخصیت کے پاس موجود کوئی بھی شخص اور کوئی بھی چیز معمولی نہیں ہو سکتی۔ اس سے وابستہ ہر شخص اس کی طرح ہو گا۔

"کیا ہوا بھئی! کھانا کھاؤ۔" اس نے اسے ٹوکا تو وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"میٹھے میں کیا لو گی؟ آئس کریم یا کچھ اور؟" اس کے ساتھ وہ وہی حیدر تھا۔ خوش اخلاق اور مہربان۔ وہ اس شخص کے اتنی جلدی جلدی بدلتے موڈ کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

"آئس کریم منگوا لیں۔" اس نے بجائے انکار کرنے کے آئس کریم کے لیے ہامی بھر لی۔ حیدر نے اپنے لیے آئس کریم آرڈر نہیں کی۔ اس نے اپنے لیے کافی منگوائی۔ وہ کافی پیتے ہوئے اسے اپنے اسکول کے دنوں کی کچھ شرارتوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"میں بچپن میں بہت شرارتی تھا، ماریہ بڑی سوبر سی بچی تھی۔ اسے میں اپنی شرارتوں میں شامل کرتا تو وہ ڈرتے ہوئے کہتی تھی۔ 'بھائی! پاپا ناراض ہوں گے، پی پی سے ڈانٹ پڑے گی۔'" وہ ہنستے ہوئے اسے بتانے لگا پھر جیسے اسے اچانک یہ بات یاد آئی کہ ایمن، ماریہ سے کیونکر واقف ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑی۔

"مجھے پتا ہے، وہ آپ کی بہن ہیں اور وہ بوسٹن میں رہتی ہیں۔"

"میرے خیال میں تمہاری معلومات تو قابلِ رشک حد تک بڑھ چکی ہیں۔" وہ اس کے بے ساختگی میں بولنے کو انجوائے کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ کافی پی چکا تھا اب وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے پوری توجہ سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی اپنی طرف دیکھنے سے بالکل بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں کے جواب بھی دے رہی تھی۔

"آئس کریم اور منگواؤں؟" اس نے اپنی آئس کریم ختم کی تو اس نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کچھ اور لو گی؟" اس نے اس بار بھی نفی میں سر ہلا دیا تو وہ پوچھنے لگا۔

"چلیں پھر؟" اس نے اقرار میں گردن ہلائی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تم جب ہاں اور نہ کہنے کے لیے زبان کا استعمال کرنے کے بجائے گردن اور سر کا استعمال کرتی ہو تو واقعی بہت کیوٹ لگتی ہو۔" وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ واپسی میں جاتے وقت کی طرح ان دونوں کے درمیان خاموشی نہیں تھی۔ گاڑی پورچ میں لا کر روکتے ہوئے وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔

"تم بور ہوئیں؟" اس نے بجائے نفی میں سر ہلانے کے منہ سے نہیں کہا۔

"تم نے انجوائے کیا؟"

"ہاں۔" اس نے سنجیدگی سے ہاں کہا تھا اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ شرارتی مسکراہٹ لے لی۔

"اب کیونکہ میں نے تعریف کر دی ہے اس لیے تم منہ سے جواب دیا کرو گی۔" وہ دونوں گاڑی سے اتر گئے تھے۔ حیدر بھی اسے شب بخیر کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹنے کے بعد آج کی ساری باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ اس شخص کے پاس ایسا کیا جادو ہے۔ وہ اس سے جتنا بھی گھبرائے، جتنا بھی خائف ہو، جب وہ پاس آ کر بیٹھتا ہے تو سارا خوف اور ساری گھبراہٹ کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس گھر میں آنے کے پہلے دن سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

اس شخص میں کوئی جادو ہے، کوئی کرزما ہے، کوئی مقناطیسیت ہے جو اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ خود بخود اس کے زیرِ اثر آ جاتی ہے۔ اسے اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں، اسے اس کا اپنائیت بھرا انداز اچھا لگتا ہے، اسے اس کے پُر مزاح فقرے اچھے لگتے ہیں۔

⊛ ⊛ ⊛

اسے یہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ توفیق کمال نے دوبارہ اسے فون نہیں کیا تھا۔ حیدر نے تین چار روز پہلے آفس میں ان کا فون آنے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس سے ایمن کی خیریت معلوم کر رہے تھے۔ اسے اس کی اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا۔ اگر انہیں اس کی خیریت کی اتنی فکر ہوتی تو وہ اسے گھر پر فون کر سکتے تھے۔

بی بی اور حیدر کا رویہ اس کے ساتھ اول روز جیسا ہی تھا۔

وہ آفس سے آنے کے بعد خاص طور پر ڈنر کرتے ہوئے اور پھر ڈنر کے بعد چائے یا کافی پیتے ہوئے اس سے بہت ساری باتیں کرتا تھا۔ یونہی عام سے موضوعات پر۔ ان باتوں کے دوران اس کی حیثیت محض سامع کی ہی ہوتی تھی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ اس نے اور بی بی نے ایک ساتھ ناشتہ کیا جبکہ حیدر ان لوگوں سے پہلے ہی ناشتہ کر چکا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد ایمن اور بی بی بھی لاؤنج میں آ گئیں۔ حیدر نے میگزین اپنے پاس رکھ کر باقی اردو اور انگریزی کے دونوں اخبارات اس کی طرف بڑھا دیے۔

CS CamScanner

اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر اس نے اپنی عادت کے مطابق اخبار کے ایڈیٹوریل صفحے پر نظر ڈالنی شروع کر دی تھی۔

"کیوں حیدر! لنچ کے لیے کیا بنواؤں؟" پروین کو لنچ کے لیے ہدایت دیتے دیتے بی بی نے حیدر سے پوچھا۔ "بتاؤ ام ایمن! لنچ میں کیا کھاؤ گی؟" وہ بی بی کو جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھنے لگا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کچھ بھی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"بس پھر بی بی آج لنچ میں "کچھ بھی" بنوالیں بائی داوے مس ام ایمن! یہ کچھ بھی روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے یا چمچ کے ساتھ یا پھر چھری اور کانٹے کے ساتھ؟ یونہی میں اپنی نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

بی بی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ پروین بھی سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر ذرا سی بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

"تم سے جو بات پوچھی جاتی ہے اس کا سیدھا سادا جواب نہیں دے سکتیں؟" وہ اپنے چہرے پر کچھ مصنوعی سی خفگی لاتے ہوئے بولا۔

"کوئی سی بھی سبزی۔" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آہستہ سے بولی۔

"کچھ بھی، کوئی بھی یہ کچھ بھی اور کوئی بھی کیا اردو زبان میں تمہارے پسندیدہ الفاظ ہیں۔"

"پالک یا بھنڈی۔" وہ اپنی پسند کی سبزیوں کے نام لینے پر مجبور ہوگئی۔

"اتنی لمبی چوڑی گفتگو کے بغیر میرے پوچھنے پر پہلی دفعہ ہی بتا دیتیں تو کوئی حرج تھا؟" بی بی حیدر اور ایمن پر سے توجہ ہٹا کر اب دوبارہ پروین کو کھانے کے بارے میں بتانے لگیں۔

شام میں وہ لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ اس کے پاس چلا آیا۔

"اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ آؤ تھوڑی دیر لان میں واک کریں۔" وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہوگئی۔

"کیا ہم اسی طرح خاموشی سے ٹہلتے رہیں گے؟" پچھلے دس منٹ سے ان کے درمیان خاموشی تھی۔

"بھئی کوئی بات کرو۔ میں بور ہونے لگا ہوں۔" وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں چڑ کر بولا۔

"کیا بات کروں؟" جو اس نے دل میں سوچا تھا وہی اس کے لبوں سے بھی نکل گیا تھا۔

"اب یہ بھی میں بتاؤں۔ بھئی کسی بھی موضوع پر بات کرو۔ اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہوں، آج تم میرے ساتھ باتیں کرو۔ مجھ سے میرے بارے میں کچھ پوچھو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ چلو یہی بتا دو کہ تمہارا اسٹار کیا ہے؟ تمہارا فیورٹ ایکٹر اور ایکٹریس کون ہے؟ تمہیں پھول کون سا پسند ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔" وہ اسے تفصیلاً گفتگو کے لیے مواد فراہم کرنے لگا۔ اس نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا اور پھر جھجکتے ہوئے انداز میں بولی۔

"آپ نے کیا پڑھا ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کی کوالیفکیشن۔"

"میں نے ایم بی اے کیا ہے۔" اس کا جواب بہت مختصر اور سادہ سا تھا۔ ایمن نے بغور اس کی طرف دیکھا اس نے اندازہ لگایا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے بارے میں اتنے سادہ اور عام سے انداز میں بات کر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ شخص اس سے بہت بڑھ کر تھا جتنا وہ اس کے سامنے خود کو ظاہر کرتا تھا۔

"کہاں سے؟" اس کے سوال میں اس بار ہچکچاہٹ پہلے سے قدرے کم تھی۔ اس نے چونک کر ایمن کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نظر آتے سوالوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"یہ سوال کیوں پوچھا تم نے؟ پہلے اس بات کا جواب دو پھر میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔"

"مجھے ایسا لگا کہ آپ نے کسی بہت اچھی یونیورسٹی سے پڑھا ہے۔" وہ اسے یہ نہیں بتا سکی کہ وہ اس کی تعلیمی قابلیت مکمل تفصیل کے ساتھ اس لیے جاننا چاہتی ہے کیونکہ وہ اس کے باپ کا ایک انتہائی قریبی واقف کار ہے اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ توفیق کمال اپنے پاس کسی معمولی آدمی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اس کی نگاہوں میں موجود سنجیدگی دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اسے شاید یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی تعلیمی قابلیت پوری تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتی ہے۔

"مارٹن اسکول سے۔" اس کے جواب پر وہ متاثر ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، حالانکہ اسے ایسے ہی کسی ادارے کا نام سننے کی توقع تھی پھر بھی سننے کے بعد وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پائی تھی۔

"اور؟"

"اور کیا؟" وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اسے اس رات ہوٹل میں ملنے والی اس لڑکی کا حیدر سے کسی کورس سے متعلق استفسار یاد تھا، اسی لیے اس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"بھئی میں توفیق بھائی جتنا قابل نہیں ہوں۔ اب اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں کہوں گا کہ اور میں نے ان کی طرح ہارورڈ بزنس اسکول سے پی ایچ ڈی کر رکھا ہے تو افسوس ایسی کوئی قابلیت میرے پاس نہیں ہے۔" یہ اس کی معلومات میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اس نے بس امی سے یہ سن رکھا تھا کہ وہ بے تحاشا ذہین ہیں، انہوں نے آئی بی اے سے ایم بی اے کیا ہوا ہے، وہ بھی پہلی پوزیشن اور گولڈ میڈل کے ساتھ۔ اس کا دل ایک دم ہی بہت سے وسوسوں میں گھر گیا۔ وہ اسے رد کر دیں گے۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی اور مایوسی چھا گئی تھی۔

"ویسے میں نے ہارورڈ سے مارکیٹنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما بھی کر رکھا ہے اس کے علاوہ بھی تین چار ڈپلوما کورسز اور کر رکھے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بزنس کی مصروفیات اس کام کے لیے مہلت نہیں دے رہیں۔ دیکھو شاید آنے والے سالوں میں یہ کام کر ہی ڈالوں۔" وہ اتنا قابل تھا جبکہ اس کا علم اور اس کی تعلیم تو بڑی محدود سی تھی۔

وہ تو اسے یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ اس نے ہارورڈ، مارٹن اسکول اور لندن اسکول آف اکنامکس کے صرف نام سن رکھے ہیں۔

اس کا احساس کمتری پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ اس کے آگے خود کو بالکل جاہل سمجھ رہی تھی۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں؟ کچھ اور پوچھو؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس نے بغور حیدر مسعود کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"تم کچھ نہیں پوچھ رہیں تو پھر چلو میں تم سے کچھ پوچھ لیتا ہوں۔" وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم آگے کیا پڑھنا چاہتی ہو؟" پڑھنا! اس کے مستقبل کے خواب۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی تھی۔ اس کے سب خواب بکھر چکے تھے۔

"میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔" وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ان پانیوں کو دیکھ چکا تھا۔ اسی لیے اس نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"تمہیں شعیب اختر زیادہ پسند ہے یا بریٹ لی؟"

اس نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا "بتاؤ بھئی؟"۔

"مجھے کرکٹ میں بہت دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اس کے ایک دم موضوع تبدیل کر دینے پر حیران ہوئی لیکن پھر بھی اس نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔

"اچھا کرکٹ میں نہیں ہے تو پھر فلموں میں تو ضرور ہوگی۔ یہ بتاؤ تمہیں کیسی فلمیں پسند ہیں؟" لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے دور سے نظر آتے ملازم کو آواز دے کر پاس بلایا اور اس سے دو گلاس ایپل جوس لانے کے لیے کہا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر جوس پیتے ہوئے وہ اس سے فلموں اور شوبز کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔

⊛⊛⊛

رات کے کھانے کے بعد کمرے میں جا لیٹنے پر خلاف معمول اسے جلدی نیند آ گئی تھی۔ لیکن سونے کے فوراً بعد ایک بہت ہی برا خواب دیکھنے پر وہ خوفزدہ سی ہوتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اپنے رد ہونے کا جو خوف اس کے اعصاب پر سوار تھا اس نے خواب میں بھی وہی دیکھا تھا۔ توفیق کمال امی ہمیں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

وہ نہ توفیق کی ہی جیسی معمولی اور بالکل عام سی لڑکی کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے قبول کرنے اور اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ امی ان سے التجائیں کر رہی تھیں کہ وہ اپنے گھر میں اپنی بیٹی کو تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسے اس بڑے کمرے میں پھیلے اندھیرے اور خاموشی سے بے تحاشا ڈر لگا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی، پانی پیا مگر اس کا خوف اور ڈر پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ وہ بے ساختہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ لاؤنج کی طرف تھا۔ اسے اس وقت آوازیں چاہیے تھیں، شور چاہیے تھا ایسا شور جو اس کے اندر کے شور کو دبا سکے۔ اسی لیے وہاں آ کر اس نے جلدی سے ٹی وی آن کیا۔ بی بی بھی اس کی طرح کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ حیدر ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ اسے آج آفس میں کسی کام کی وجہ سے دیر تک رکنا پڑ گیا تھا اور وہ بی بی کو فون کر کے اپنے دیر سے گھر واپس آنے سے آگاہ کر چکا

تھا۔ ابھی وہ صوفے پر بیٹھی بھی نہیں تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ خوفزدہ سے انداز میں اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"ٹی وی دیکھا جا رہا ہے۔" وہ اسے دیکھ کر حسب عادت خوش دلی سے مسکرایا۔ پھر کچھ بے فکرے اور لاپرواہ سے انداز میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اپنا کوٹ اور موبائل بھی اس نے یونہی لاپروائی سے صوفے پر ڈال دیے تھے۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" وہ اس سے خود کو چھپا کیوں نہیں پاتی اسے خود سخت غصہ آیا۔

"ٹھیک ہے۔" چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے خود پر سے ڈر، خوف، مایوسی اور بے بسی والے تمام تاثرات کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم ابھی بیٹھی ہو یہاں پر؟" ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

"میں دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔ پھر ہم ساتھ بیٹھ کر کافی پئیں گے۔" اس کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ مزید گویا ہوا اور پھر اپنا کوٹ اور بریف کیس اٹھاتے ہوئے لاؤنج سے نکل گیا۔ جبکہ موبائل وہ صوفے پر ہی چھوڑ گیا تھا۔

"چائے تو میں تمہیں بنا کر پلا چکا ہوں۔ آج تم میرے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی بھی پی کر دیکھ لو۔ تم اتنی دیر ٹی وی دیکھو۔ میں بس جلدی سے کافی بنا کر لا رہا ہوں۔" صبح آٹھ بجے آفس جا کر رات ساڑھے گیارہ بجے گھر واپس آنے کے بعد وہ بجائے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کے اس کی مہمان نوازی کے لیے خوشی خوشی تیار تھا۔ "یہ رہی تمہاری ایک چمچ چینی والی کافی اور یہ میری دو چمچ والی۔" اسے اس کے لاؤنج میں آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر لا کر رکھتے ہوئے یہ بات کہی تو وہ چونکی۔ وہ اپنا مگ لے کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اتنی دبلی پتلی ہی تو ہو تمہیں ڈائٹنگ کی کوئی ضرورت ہے تو نہیں۔" کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اس کی ایک چمچ چینی پر تبصرہ کیا۔ وہ مروتاً مسکرا دی۔

"کیسی ہے کافی؟" وہ اس کے منہ سے اپنی بنائی کافی کی تعریفیں سننے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"بہت مزے کی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے فوراً تعریف کر دی۔ اسی وقت اس کے موبائل نے شور مچایا۔ اس لاپرواہ سے انداز میں کافی کے سپ لیتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز کو سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ اچانک ہی سنجیدگی اور برہمی نے لے لی تھی۔

"آپ یہ بے کار کے ایکسکیوزز مجھے مت دیں۔ غیر ذمہ داری اور لاپروائی میں کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کی گھریلو زندگی کی کیا مجبوریاں ہیں وہ آپ مجھے مت سنائیں۔ اگر آج میں نے غور سے ان ڈاکومنٹس کو اسٹڈی نہ کر لیا ہوتا تو کچھ اندازہ ہے آپ کو ہمیں کتنا نقصان ہوتا۔ اتنے اہم کانٹریکٹ میں اتنی بڑی بڑی غلطیاں۔" اس کا لہجہ کسی بھی قسم کی مروت سے عاری تھا۔ وہ نہ تو چیخ رہا تھا اور نہ ہی اس کا لہجہ بدتمیزی والا تھا

لیکن پھر بھی اس میں کوئی بات تھی جو زارا رہی تھی۔ مالکانہ تحکم لیے وہ اپنے مخاطب سے جس طرح بات کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کی غلطی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ محض پانچ منٹ میں ہی وہ بات ختم کر کے موبائل ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہیں کیا ہوا؟ تھوڑی دیر پہلے تو اچھی خاصی بیٹھی تھیں۔" اس کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ تھی۔

"کچھ نہیں۔" آہستگی سے جواب دیتے ہوئے اس نے اپنا کافی کا خالی مگ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ چند سیکنڈ تک وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتا ہوا اس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے صوفے کے بالکل پاس اپنے دائیں ہاتھ پر رکھی سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا رائٹنگ پیڈ اور پین اٹھایا اور اس سے بولا۔

"Hang Man کھیلو گی؟" وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بہت فریش اور بالکل فارغ نظر آ رہا تھا۔

اس کی حیرت سے بے نیاز، اپنے ہاتھ میں پکڑا رائٹنگ پیڈ اور پین اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔

"تم ابھی تک صوفے پر ہی بیٹھی ہو۔ یہاں آ کر بیٹھو۔" اس نے اپنے سامنے رکھے دوسرے فلور کشن کی طرف اشارہ کیا۔

"آتا ہے ناں تمہیں Hang man کھیلنا۔ بچپن میں ضرور کھیلا ہو گا تم نے۔ میں اور ماریہ تو ہینگ مین بہت زیادہ کھیلا کرتے تھے۔" وہ فلور کشن پر آ کر بیٹھی تو وہ اس سے بولا۔ ان کے درمیان ٹیبل تھی۔

"پہلی باری میری ہے۔" وہ پین اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے بولا۔

"میری Vocabulary (ذخیرہ الفاظ) زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کھیل سکتی۔" وہ بہت شرمندگی سے سر جھکا کر بولی۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری بھی Vocabulary کچھ خاص نہیں۔ تم کھیلو گی تو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا۔ ہمیشہ ماریہ Hang man میں مجھ سے جیتا کرتی تھی۔ آخری بار شاید ہم دونوں نے یہ اس وقت کھیلا تھا جب میں چودہ سال کا تھا اور اس روز بھی ماریہ ہی جیتی تھی۔ اس کی Vocabulary بہت زبردست ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ایسے لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی تھی کہ جو میں نے کبھی سنے ہی نہیں ہوتے تھے۔" وہ مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہا تھا۔

"چلو کھیل شروع کریں؟" اس نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کے جواب دینے سے پہلے کاغذ پر پین سے اشارہ کر کے اسے بتانے لگا۔ "دیکھو یہ ایک لفظ ہے۔ اس میں پانچ Letters ہیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ لفظ کیا ہے۔" کچھ بوکھلاتے ہوئے انداز میں اس نے کاغذ پر نگاہیں دوڑائیں۔ اس شخص کے سامنے کم علم اور نالائق ثابت ہونے کا تصور اس کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

"مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ بالکل ڈل ڈفر اور کند ذہن ہوں میں۔ کیا سوچے گا یہ کہ توفیق کمال کی بیٹی میرا پوچھا ہوا ایک عام لفظ بھی نہیں بوجھ سکی۔" دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہ باتیں کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کر کے سارے Vowels بول دیے تھے۔

اس نے دو Blanks میں E اور A لکھ دیا تھا۔ اسے خود اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ اس کے صرف E اور A لکھ دینے کے بعد ہی لفظ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے ہکلانے والے انداز میں T بولا۔ اس نے پہلے Blank اور T لکھ دیا۔ Tepid وہ ایک دم سے بقیہ حروف بولنے کے بجائے پورا لفظ ہی بول گئی۔

"اتنی جلدی بتا دیا تم نے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کم از کم آدھا گھنٹہ تو تم سوچ بچار میں ضرور لگاؤ گی۔ بول ایسے رہی تھیں کہ میری Vocabulary اچھی نہیں ہے اور صرف دو منٹ میں میرا پوچھا لفظ بتا دیا۔" اس نے اسے گھورا اور پھر رائٹنگ پیڈ اس کی طرف کرتے ہوئے پین اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"اب تمہاری باری ہے۔ کوئی آسان سا لفظ پوچھنا۔ ایسا جو میں آرام سے بتا سکوں۔" پین ہاتھ میں لے کر اس نے ایک دو منٹ سوچا پھر کسی لفظ کے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد کاغذ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم میں اور مجھ میں ایک بات مشترک ہے۔ بتاؤ کیا؟" لکھتے لکھتے اس نے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"ہم دونوں الٹے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔" بغیر کچھ سوچے یا حیران ہوئے اس نے بے ساختہ اسے جواب دیا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس وقت میں اس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں نے تم میں اور اپنے آپ میں کوئی اور چیز ایک جیسی دیکھی ہوتی اور میں اس وقت اس کا ذکر کر رہا ہوتا۔"

"آپ نے یہ بات میرے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھی تھی۔ اسی لیے مجھے لگا کہ اس وقت آپ اسی بارے میں بات کر رہے ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا یہ Left Hnaderst کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے۔ وہ بات کیا ہے؟"

"یہ لوگ غیر معمولی ذہین ہوتے ہیں۔" وہ رائٹنگ پیڈ سے توجہ ہٹا کر اس کی باتوں کے جواب دینے لگی تھی۔

"تم ہو؟" اس کے بتانے پر اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"نہیں۔" یہ انکساری یا عاجزی والا نہیں تھا۔ بلکہ یہ نہیں بہت سچائی اور یقین کے ساتھ بولا گیا تھا۔

"میں بھی نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے اس طرح کی باتیں لوگوں نے یونہی اڑا رکھی ہیں۔ ان میں سچائی وچائی بالکل نہیں ہے۔" وہ ذرا مسخرے پن سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے ہم دونوں میں کافی ساری باتیں ایک جیسی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ ہم دونوں الٹے ہاتھ سے لکھتے ہیں، پھر یہ کہ ہم دونوں ہی کی Vocabulary بھی بس گزارے لائق ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ہم دونوں ہی ذہین بھی نہیں ہیں۔" وہ اب کاغذ پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے اس کے پوچھے گئے الفاظ کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا تھا۔

بہت دیر کے بعد وہ لفظ مکمل کرنے میں اس وقت کامیاب ہوا تھا جب اس کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"شکر میں نے لفظ صحیح بتا دیا ورنہ تم سے ہار کر مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ لڑکیوں سے ہارنا ذرا انسلٹنگ

"لگتا ہے ناں۔" وہ گیم لفظ بوجھ لینے پر بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ ایمن نے ایک نظر بڑے غور سے اس کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھا پھر پین رائٹنگ پیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے جان بوجھ کر لفظ مکمل کرنے میں اتنی دیر لگائی ہے۔ مجھے پتا ہے آپ کو بہت پہلے پتا چل گیا تھا کہ میں نے کیا لفظ سوچا ہے۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں برہمی تھی۔

"اچھا؟" اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہیں کیسے پتا چلی یہ بات؟" وہ بجائے اس کی بات کی تردید کرنے کے تمسخرانہ انداز میں پوچھنے لگا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔" ایمن کو اس کے انداز پر مزید ناگواری محسوس ہوئی۔

"واقعی؟" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں زور سے ہنسا۔

"جب سے میں تم سے ملا ہوں۔ آج پہلی مرتبہ تم سے یہ بات مجھے پتا چلی ہے کہ امام ایمن بے وقوف نہیں ہے۔ ورنہ اتنے دنوں سے تم مجھے اپنے بارے میں یہی بات بتاتی رہی ہو کہ امام ایمن ایک نہایت ہی بے وقوف، نااہل اور کم علم لڑکی ہے۔" وہ اب ہنس تو نہیں رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں طنزیہ سا استعجاب موجود تھا۔

اس نے بہت چونک کر براہ راست حیدر کی طرف دیکھا۔ یہ سب لفظ اس نے اس کے سامنے اپنی زبان سے تو کبھی بھی نہیں کہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

"یہی تاثر دیتی رہی ہو تم اپنے بارے میں مجھے۔ یہاں تک کہ ابھی اس معمولی سے کھیل کو کھیلنے سے پہلے بھی تم نے مجھ سے یہی بات کہی تھی کہ تم اسے نہیں کھیل سکتیں اس لیے کہ تمہاری Vocabulary اچھی نہیں ہے۔ اب میں تمہاری کون سی بات کا یقین کروں۔ جو تم نے پہلے بتایا وہ یا جو اب کہہ رہی ہو وہ؟" اس نے بڑی متانت سے اس سے پوچھا پھر وہ میز پر اپنی کہنیاں ٹکاتے ہوئے اس کی طرف ذرا جھک کر رازداری والے انداز میں پوچھنے لگا۔

"تم نے ابھی ابھی اپنے بارے میں یہ کہا کہ تم احمق نہیں ہو۔ اب احمق کی ضد تو عقل مند ہے۔ اگر تم بے وقوف نہیں ہو تو پھر عقل مند ہوگی۔ ایک بات فیصلہ کر کے بتا دو کہ تم ان دونوں میں سے کیا ہو۔ تاکہ آئندہ میں تم سے اسی حساب سے بات کروں۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہی ہوں۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں فوراً اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ کسی بڑے کی بات بیچ سے کاٹ کر چلے جانا بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے، تمہیں یہ بات کسی نے نہیں بتائی۔" وہ آنکھوں میں ناپسندیدگی لیے اسے گھور رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ نہیں پائی۔ ناچار اسے نگاہیں چرا کر اسے یہیں بیٹھا رہنا پڑا۔

"پتا نہیں تم نے اب تک کی زندگی کس طرح کے لوگوں کے بیچ میں گزاری ہے۔ جو تمہیں کبھی کسی نے تمہاری غیر معمولی ذہانت کے بارے میں نہیں بتایا۔" اس کے لہجے میں اچانک ہی تیزی آ گئی تھی۔ اس نے اس کی بات بغیر کسی توجہ کے سنی۔

"سچ بتاؤ، کیا واقعی کبھی تمہارے کسی ٹیچر نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ تم عام لوگوں سے زیادہ ذہین ہو۔ تم میں

بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑے گا کہ تمہیں اب تک تمہاری ذہانت اور اہلیت کو پہچان لینے والے کوئی اساتذہ ملے ہی نہیں۔ کسی نے تمہاری چھپی ہوئی ذہانت کو کبھی دریافت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جیسا کہ تم نے خود کو پیش کیا انہوں نے تمہیں ویسا ہی تسلیم کر لیا۔" وہ بری طرح چونک کر سر اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ صرف اس کا دل رکھنے کی خاطر اتنی زیادہ اور اتنی جھوٹی تعریفیں۔ وہ ان تعریفوں پر خوش ہوتی اگر جو وہ خود کو ان کا اہل سمجھتی ہوتی۔

"میں نے اپنے جاننے والوں میں کسی بیس بائیس سال کی لڑکی کو شوقیہ اور اپنی خوشی سے اتنے مشکل موضوع پر کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے تمہاری عمر کی لڑکیوں کو اخبار میں اتنے شوق سے ایڈیٹوریلز پڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہے۔ تمہاری ایج میں سب لڑکیوں کی دلچسپی اخبار کے شوبز، فیشن اور اسٹائل سے متعلق صفحات میں زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا تو میں بھی نہیں تھا تمہاری عمر میں۔ تمہاری عمر میں، میں بھی اخبار میں ایڈیٹوریلز کو توجہ سے نہیں پڑھتا تھا۔ سنجیدہ موضوعات پر لکھے گئے آرٹیکلز اور کالمز بھی کبھی تمہاری ایج میں مجھے پڑھنے کے قابل نہیں لگتے تھے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اس کی تعریفوں سے زیادہ اس بات پر چونکی تھی کہ وہ ان تمام دنوں میں اتنی گہرائی سے اس کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ جب اس کا مشاہدہ اتنا زبردست ہے تو پتا نہیں اس نے ایمن کے بارے میں اور بھی کیا کیا کچھ جان لیا ہوگا۔ اسے ان گہری آنکھوں سے بے تحاشا خوف محسوس ہوا۔

"اپنے بارے میں منفی انداز سے سوچنا چھوڑ دو امام ایمن! اگر تم ذرا سا بھی اپنی صلاحیتوں کو پہچان لو اور اپنے بارے میں مثبت انداز میں سوچنا شروع کر دو تو یقیناً بہت آگے جاؤ گی۔ خود اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلاؤ کہ میں بہت اچھی ہوں۔ مجھ میں بہت سی خوبیاں ہیں، پھر دیکھنا تمہاری سوچ میں کتنی تبدیلی آ جائے گی۔ پھر تم خود اپنی ان تمام خوبیوں سے آگاہ ہونے لگو گی جن سے ابھی تم ناواقف ہو۔" وہ اس کی کسی بھی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا انداز اتنا ٹھوس اور پختہ یقین لیے ہوئے تھا کہ وہ متحیر سی اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب سو جانا چاہیے۔" وہ ایک دم ہی صوفہ کشن پر سے اٹھ گیا اور پھر اسے شب بخیر کہتا فوراً ہی لاؤنج سے چلا گیا۔

وہ بھی واپس اپنے کمرے میں آ گئی جس خواب سے ڈر کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی اب وہ اس کے بارے میں سوچنے کے بجائے حیدر مسعود کی کچھ دیر پہلے کہی گئی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ جو باتیں آج اس نے اس سے کہی تھیں، وہ اس سے پہلے بھی کسی نے نہیں کہی تھیں۔

اس نے پڑھائی میں کبھی ایسا کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا کہ اس کے اساتذہ اسے کوئی غیر معمولی اہمیت دینے پر مجبور ہو جاتے۔ ہاں یہ تھا کہ اس نے کبھی کوئی ٹیوشن نہیں پڑھی تھی۔ اچھا برا جیسا بھی پڑھتی تھی وہ خود ہی پڑھتی تھی۔

وہ اپنی کلاس فیلوز کی طرح کبھی رٹے نہیں لگاتی تھی۔ جو بھی پڑھتی تھی سمجھ کر پڑھتی تھی۔ اس کے چھوٹے سے اسکول میں ساری ٹیچرز عام سی ہی پڑھی ہوئی تھیں۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت گھسا پٹا اور فرسودہ تھا۔ بعض

CamScanner

دفعہ تو سب سے آخری بینچ پر بیٹھی ہوئی وہ عام سی لڑکی ام ایمن تک ان کی غلطیاں پکڑ لیا کرتی تھی۔ لیکن اتنی ہمت اس میں کبھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ٹیچر کو اس کی غلطی بتا سکے۔

اسے ساتویں کلاس میں سوشل اسٹڈیز پڑھانے والی اپنی مس رسالت اچھی طرح یاد تھیں۔ کیسے ایک مرتبہ کلاس میں آ کر انہوں نے سب لڑکیوں کو ان کی چیک ہوئی نوٹ بکس واپس دینے کے بعد اس کی نوٹ بک اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ کھلی ہوئی نوٹ بک اس کے سامنے لہراتے ہوئے زور زور سے چیخ رہی تھیں اور وہ سر جھکا کر کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ انہوں نے یورپ کی آبادی' وہاں کے رقبے اور وہاں کے چند اہم ممالک کے بارے میں ان لوگوں کو ایک مضمون لکھوایا تھا۔ بلیک بورڈ سے نقل کرتے وقت اس نے اپنی عادت کے مطابق وہاں کا رقبہ لکھتے وقت کلومیٹر Km کو اسکوائر کلومیٹر Square Kilokmetre میں تبدیل کر دیا تھا۔

آسٹریا کے دارالحکومت کو روم سے بدل کر Vienna کر دیا تھا۔

دراصل اس روز ان کی کلاس کی تمام کاپیاں چیک ہونے ان کی اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے پاس گئی تھیں۔ ان کی وہ غلطی ہیڈ مسٹریس کی نگاہوں سے چھپی رہ سکتی تھی اگر اس نے اپنی کاپی پر isgurare Km اور Vienna سے نمایاں کر کے الگ رنگ کے مارکر سے نہ لکھے ہوتے۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ ہیڈ مسٹریس نے پوری نوٹ بک میں سے صرف اسی مضمون کو توجہ سے پڑھا تھا اور تمام نوٹ بکس میں ایک ہی جیسی غلطی پائی تھی۔ سوائے سب سے پہلے دیکھی جانے والی نوٹ بک کے جو ام ایمن کی تھی۔ مس رسالت کو اس بات پر اعتراض تھا اس نے وہ کیوں نہیں لکھا جو انہوں نے لکھوایا' وہ خاموش کھڑی ان کی ڈانٹ کھاتی رہی۔ جتنی ڈانٹ وہ ہیڈ مسٹریس سے کھا کر آئی تھیں' جب تک اتنی ہی ڈانٹ اور غصہ انہوں نے اسے منتقل نہیں کر دیا' اس وقت تک چپ نہیں ہوئیں۔

اور آج وہ حیدر مسعود کہہ رہا تھا کہ ام ایمن ایک ذہین لڑکی ہے' اس میں بہت سی صلاحیتیں ہیں' وہ ان سب باتوں کا یقین کیسے کر سکتی تھی۔ اسے پتا تھا اس میں ان میں کوئی بھی خوبی نہیں لیکن وہ حیدر مسعود صرف اس کا دل رکھنے ہی کی خاطر اس کی جھوٹی تعریفیں کتنی سچائی سے کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ صرف اس کا دل رکھ رہا تھا اس کے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر بھی وہ اس کی تعریفوں پر یقین کر لینے سے خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

اگلے روز آفس سے آنے پر حیدر نے اسے توفیق کمال کی واپسی کے متعلق بتایا تھا۔

"توفیق بھائی کل رات کراچی پہنچ رہے ہیں۔ مجھے آج صبح آفس میں یہ اطلاع مل گئی تھی' لیکن میں بزی اتنا تھا کہ تمہیں فون کر کے یہ خوشخبری سنا نہیں سکا۔" وہ بڑے خوشگوار موڈ میں اسے اس کے باپ کی واپسی کی خوشخبری دے رہا تھا۔

وہ عجیب سی کیفیات کا شکار تھی۔ جب تک وہ یہاں نہیں تھے انہوں نے اسے حیدر مسعود کے گھر پر رہنے کے لیے چھوڑا ہوا تھا تو اسے یہ بات بہت بری اور ذلت کا باعث لگی تھی اور اب جب وہ واپس آ رہے تھے تو وہ سوچ

رہی تھی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنے باپ کا سامنا کس طرح کرے گی۔

اس نے اپنا سارا سامان پیک کر لیا تھا۔ حیدر کی اطلاع یہ تھی کہ وہ ایئرپورٹ سے سیدھے یہاں اسے لینے کے لیے آئیں گے اسی لیے وہ شام سات بجے ہی تیار ہو گئی تھی۔ ان کی فلائیٹ کے آنے کا ٹائم رات آٹھ بجے کا تھا۔ توفیق کمال اب سے پہلے اس کے لیے صرف ایک نام تھا جو اس کے تمام سرٹیفکیٹس' ڈگری اور شناختی کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ وہ نام اب زندہ ہو کر اس کے سامنے آنے والا تھا۔ محبت اسے توفیق کمال سے کبھی ہو نہیں سکی تھی لیکن نفرت؟ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے دل میں ان کے لیے سرے سے کوئی جذبہ ہی موجود نہیں تھا۔ بس ایک خوف تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اگر توفیق کمال نے مجھے رد کر دیا' بالکل اس طرح جیسے میری ماں کو کر دیا تھا پھر میں کیا کروں گی؟ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بغور خود کو دیکھ رہی تھی۔

اپنے پاس موجود سب سے بہترین لباس آج اس نے پہنا تھا۔ چکن کا آسمانی رنگ کا سوٹ' یہ سوٹ اس نے عید پر بنایا تھا اور فی الحال اس کے پاس اس سے زیادہ نیا اور بہتر لباس دوسرا کوئی نہیں تھا۔

بالوں کی چوٹی بنانے کے بجائے اس نے پونی بنانی چاہی' لیکن اس کے بال اتنے بے رونق سے تھے کہ پونی بنا کر وہ بالکل جھاڑ جھنکار جیسے لگ رہے تھے۔

مایوس ہو کر اس نے دوبارہ چوٹی ہی بنالی تھی۔ میک اپ اس نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ ہاں اسکول میں جاب کرنے کے بعد اس نے لپ اسٹک کے ایک دو شیڈز ضرور خرید لیے تھے لیکن یہاں آتے وقت وہ لپ اسٹک اس کے سامان کے ساتھ نہیں آ سکی تھیں۔

پھر بھی اپنے طور پر وہ جتنی اچھی طرح تیار ہو سکتی تھی' ہوئی لیکن تیار ہونے کے بعد جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو بہت مایوس ہوئی۔ اتنی تیاری اور کوشش کے باوجود بھی وہ وہی ام ایمن لگ رہی تھی۔ وہی اعتماد سے محروم' معمولی شکل صورت والی ام ایمن۔

وہ اپنی ماں سے کتنا زیادہ ملتی تھی۔ بالکل ویسی ہی آنکھیں' ویسی ہی ناک' ویسے ہی ہونٹ' بالکل ویسی ہی عام شخصیت' ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ بی بی کے بلانے پر وہ ڈنر کے لیے آ تو گئی تھی لیکن صرف دو تین نوالوں کے بعد ہی اس نے اپنا ہاتھ روک لیا' پھر بی بی کے اصرار پر بھی اس نے مزید کچھ نہیں لیا۔ حیدر اس کی طرف دیکھ تو ضرور رہا تھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ان دونوں سے نماز پڑھنے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے اپنی بے چینی اور اضطراب دور کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے اس نجانے کتنا وقت ہو گیا تھا کہ دروازے پر دی جانے والی دستک نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔

اسے یوں لگا کہ جیسے وہ میلوں کا سفر پیدل طے کرتے کرتے اچانک رکی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا' سامنے جمیلہ کھڑی تھی۔ وہ اسے اس کے باپ کے آنے کی اطلاع دیتی وہاں سے پلٹ گئی۔ وہ کل شام سے اس وقت کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی لیکن اب حقیقت میں وہ وقت آیا تھا تو اس کی حالت بڑی عجیب سی تھی۔ وہ اپنی کوئی بھی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی آہستہ آہستہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وہ چاروں افراد

CamScanner

آپس میں گفتگو میں مگن تھے لیکن اسے اندر آتا دیکھ کر انہوں نے اپنی گفتگو روک دی۔

"السلام علیکم۔" اس نے اپنے بالکل سامنے صوفے پر براجمان اس شاندار انسان کو سلام کیا جو اس کا باپ تھا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کے سلام کا جواب دے دیا۔ اس نے کل سے لے کر اب تک کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ لیکن حقیقت اس کی سوچوں سے کتنی مختلف تھی۔ باپ اور بیٹی کے زندگی میں پہلی مرتبہ ملنے والے واقعہ میں کوئی فلمی سچویشن پیدا نہیں ہوئی۔

انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد سرے سے اس سے دوسری کوئی بات کی ہی نہیں' یہاں تک کہ رسمی طور پر اس کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ دل ہی دل میں شاید لاشعوری طور پر وہ ان کی طرف سے ایسے کسی فلمی انداز کی متمنی تھی۔ وہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے کی کوشش کریں گے اور۔ وہ ان کے گلے نہیں لگے گی' وہ انہیں پیار نہیں کرنے دے گی۔ "جس شخص نے زندگی میں کبھی پلٹ کر میری خیر خبر نہیں لی' میں اسے اپنا باپ نہیں مانتی۔ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں؟ اپنی اولاد سے اتنے لاپرواہ اور لاتعلق۔" وہ ایسا کوئی جملہ بولے گی اور پھر وہ جواباً اپنی آنکھوں میں اشک لیے بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی کوئی مجبوری اسے بتانے لگیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ایسا کوئی فلمی اتفاق نہیں ہوا۔

وہ بیٹی سے ملنے کے لیے صوفے پر سے نہیں اٹھے تھے لیکن بی بی کے برابر میں بیٹھی وہ حسین عورت ضرور صوفے پر سے اٹھی تھی۔

"کیسی ہو ایمن؟" وہ ایک قدم آگے بڑھا کر اس کے پاس آ گئیں' بڑی آہستگی اور نزاکت سے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے اس کی خیریت پوچھی۔ بڑی پیاری خوشبو آ رہی تھی اس عورت کے وجود سے غالباً کسی فرنچ پرفیوم کی۔ لیکن اسے اس عورت کا خوشبوؤں میں بسا ہوا وہ لمس سخت ناگوار گزرا۔

ان کے خیریت پوچھنے پر آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلام دعا اور خیریت کا یہ وقفہ جو صرف دو منٹوں پر مشتمل تھا' ختم ہوا تو ایک دفعہ پھر وہ لوگ آپس میں اسی طرح بات کرنے لگے جیسے اس کے آنے سے پہلے کر رہے تھے۔

توفیق کمال حیدر سے اپنی غیر موجودگی کے دوران آفس میں پیش آنے والے خاص خاص واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے اور الماس توفیق بی بی کو اپنے دورہ امریکہ کی تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"زیادہ دن تو ہم رک نہیں سکتے تھے۔ توفیق کو یہاں آفس میں کچھ ضروری کام تھے۔ بس سارہ کی سالگرہ کی اور فوراً واپس آ گئے۔ پہلی مرتبہ گھر سے دور ہوا ہے تو بالکل ہی بچہ بن گیا ہے۔ توفیق کا تو آپ کو پتا ہے' اس طرح کی بچکانہ باتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔ وہاں سارا وقت لیکچر دیتے رہے کہ اب تم اٹھارہ سال کے ہو چکے ہو' کوئی چھوٹے بچے نہیں رہے جو ماں سے دور رہ نہیں سکتے۔ سنجیدگی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ جیسا رزلٹ میں چاہتا ہوں' ویسا رزلٹ مجھے لا کر دکھاؤ۔ ماریہ اور مکرم اس کا اتنا خیال رکھ رہے ہیں' ویک اینڈ پر اسے گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں' ماریہ تو خاص طور پر اس کا بالکل چھوٹے بچوں کی طرح دھیان رکھ رہی ہے۔ ماریہ اور مکرم ہی کی وجہ سے مجھے سارہ کی طرف سے مکمل اطمینان ہے۔"

وہ اپنے بیٹے کے بارے میں بی بی سے باتیں کر رہی تھیں اور توفیق کمال' حیدر سے بزنس سے متعلق جس طرح کی مشکل گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اسے سننے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھی۔ ام ایمن پس منظر میں جا چکی تھی۔ اسے دو منٹ دے دیے گئے تھے وہی اس کی اوقات کے حساب سے کافی زیادہ تھے۔

یہاں زندگی اسی معمول کے مطابق تھی جیسی اس کی آمد سے قبل ہوا کرتی ہوگی۔ اس کی آمد سے ایسا کوئی تغیر نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے معمول کی گفتگو میں تبدیلی پیدا کر دیتے۔ الماس توفیق کی بی بی کے ساتھ جس طرح بے تکلفانہ گفتگو ہو رہی تھی اس سے اسے ان دونوں گھرانوں کی قربت کا بڑی اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ بی بی نے ان دونوں سے چائے اور کافی کے متعلق پوچھا تو ان دونوں نے انکار کر دیا۔

"کافی دنوں سے نیند پوری نہیں ہو رہی اور پھر اب سفر کی تھکن بھی ہے۔ بس اب جلدی سے گھر پہنچ کر خوب دیر تک سونے کا پروگرام ہے۔" الماس توفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ جانے کے لیے اٹھ گئے۔ بی بی نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

"اپنے گھر جا کر ہم لوگوں کو بھول مت جانا۔ آتی جاتی رہنا۔" ان کا انداز ویسا ہی شفقت بھرا تھا جیسا اول روز اس نے محسوس کیا تھا۔

حیدر نے بھی مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اس قدر الجھی ہوئی اور ڈسٹرب تھی کہ چلتے وقت ان دونوں کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکی۔

جب اس نے گاڑی کو اس گھر سے دور ایک سڑک پر دوڑتے دیکھا تو اسے اچانک ہی اپنی بد اخلاقی اور بدتمیزی کا خیال آیا۔ اسے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں وہ مینرز کب سیکھ پائے گی۔ ڈرائیور درمیانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا اور وہ اپنے باپ کے برابر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ درمیان میں توفیق کمال تھے اور ان کے ایک طرف ام ایمن اور دوسری طرف الماس توفیق بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے سگے باپ کے برابر میں اتنے تکلف سے اور دور ہٹ کر بیٹھی تھی جیسے وہ ایک غیر آدمی کے برابر میں بیٹھی ہو۔ وہ اس سے بے نیاز گاڑی میں سارا وقت خاموش رہے تھے۔ ان کی اپنی بیوی کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں وہ واقعی اتنے ہی کم گو تھے یا صرف اس وقت خاموش تھے۔

وہ گھر اتنا عالیشان تھا جتنا کراچی آنے کے بعد سے ان تمام گزرے دنوں میں اس نے اس کے بارے میں تصور کیا تھا۔ اس کا باپ ایک امیر آدمی ہے' یہ بات وہ کراچی آنے سے پہلے بھی جانتی تھی' لیکن وہ اتنا زیادہ امیر ہے' اس کے پاس پیسے کی اتنی زیادہ ریل پیل ہے' وہ اتنا زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والا' ایک صاحب حیثیت اور معاشرے میں نہایت اعلا مرتبہ اور مقام رکھنے والا انسان ہے' یہ بات اسے یہاں آنے کے بعد ہی پتا چلی۔ حیدر مسعود اور اس کے باپ کے گھر میں ایک چیز مشترک تھی۔ وہ دونوں گھر بہت بڑے تھے' نہایت عالیشان تھے' وہاں دنیا زمانے کی ہر سہولت اور ہر آسائش موجود تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ گھر کے اندر آ گئی۔

وہاں کا فرنیچر قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت اور آرام دہ بھی نظر آ رہا تھا۔ تمام آرائشی اشیاء مالکوں کی خوش ذوقی کا اعلان کر رہی تھیں۔ دیواروں پر لگی خوب صورت پینٹنگز مختلف کونوں میں نفاست سے سجے

ڈیکوریشن پیس اُن ڈور پلانٹس اُس شاندار گھر میں وہاں کی قیمتی آرائش دیکھ رہی تھی۔

اتنا زیادہ امیر تھا ام ایمن کا باپ۔

وہ ام ایمن جس نے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے ہوئے زندگی گزاری تھی۔ ماں کی مجبوری اور اپنی غربت سے سمجھوتا کرتے ہوئے اس نے بچپن میں بھی کبھی امی سے کوئی ضدیں اور فرمائشیں نہیں کی تھیں۔ لیکن اس کا دل چاہتا اچھے اچھے کھلونوں سے کھیلے گو بہت ساری چاکلیٹس اور آئس کریم کھائے گو اچھے اچھے لباس پہنے گو جیسا کھانا اسے کھانے کو ملا کرتا تھا اس سے اچھا کھانا تو اس کے باپ کے گھر کے نوکروں کو مل جایا کرتا ہوگا۔

اس احساس نے اس کے اندر بہت ساری تلخی بھر دی۔

"ایمن کو اس کا کمرہ دکھا دو۔" الماس توقیق نے سامنے کھڑی ملازمہ کو ہدایت کی توقیق کمال چند سیکنڈز پہلے۔ "میں سونے جا رہا ہوں۔" کہتے ہوئے سٹنگ روم سے باہر چلے گئے تھے۔ ملازمہ نے ان کی بات پر سر ہلا کر اسے آنے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر ضرور باتیں کرتی ایمن! لیکن اس وقت اتنی تھکن ہو رہی ہے اور اتنی سخت نیند آ رہی ہے کہ میں تمہیں بالکل کمپنی نہیں دے پاؤں گی۔ تکلف بالکل مت کرنا۔ چائے کافی جس بھی چیز کا موڈ ہو رشیدان سے کہہ دینا اور بھی کچھ چاہیے ہو تو اسے کہہ دینا۔ صبح انشاء اللہ تم سے باتیں ہوں گی۔" ایک رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے انہوں نے اس سے معذرت چاہی۔ وہ جوابا کچھ کہے بغیر ملازمہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

حیدر مسعود کے گھر میں جو کمرہ اسے ملا تھا اسے وہ ایک عارضی ٹھکانا سمجھ کر استعمال کر رہی تھی۔ لیکن یہاں جو شاندار فرنیچر اور خوب صورت قالین قیمتی پردوں سے آراستہ کمرہ اسے ملا یہ اب اس کا مستقل ٹھکانا تھا۔ پھر جب وہ وضو کرنے باتھ روم میں آئی تو اس نے وہاں لگے اٹالین ٹائلز کی طرف خوب غور سے دیکھا۔ کیبنٹ میں قیمتی شیمپو باڈی لوشن باڈی اسپرے ٹیلکم پاؤڈر پرفیوم ہر وہ اچھی چیز موجود تھی جس کا اس نے زندگی میں کبھی بھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ حیدر مسعود کے گھر میں بھی بچا سب چیزیں موجود تھیں لیکن وہ گھر اس کا نہیں تھا اور یہ گھر اور یہ کمرہ کیا یہ اس کے تھے؟ یہ اس کے تھے یا نہیں لیکن اسے اب رہنا تو یہیں تھا۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کل رات وہ باپ کی آمد کی ٹینشن میں نہیں سو پائی تھی اور آج؟؟ آج وہ پتا نہیں کیوں جاگ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے رونا کیوں آ رہا تھا۔ ساری رات وہ جاگتی اور روتی رہی تھی۔ ساری رات وہ اس انتظار میں رہی تھی کہ شاید اب وہ اس کے کمرے میں آ ئیں۔ جو باتیں انہوں نے اس سے فون پر نہیں کی تھیں جو انہوں نے اس سے ملنے کے بعد نہیں کی تھیں اور جو انہیں کرنی چاہیے تھیں شاید وہ اب اس کے کمرے میں آ کر اس سے کریں۔ جو شخص کبھی اس کی زندگی میں تھا ہی نہیں جس سے اس نے کبھی کوئی امیدیں وابستہ کی ہی نہیں تھیں اس وقت وہ اس سے یہ امید کر رہی تھی کہ وہ اس کے پاس

آئے۔ اسے پیار کرے اس سے باتیں کرے اسے اس بات کا احساس دلائے کہ ماں کے مرجانے کے بعد وہ دنیا میں تنہا نہیں ہوگی۔

اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ کیا ہوا جو وہ پہلے اپنی کوئی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکا وہ اب اپنی سب کوتاہیوں کا ازالہ کر دے گا۔ اپنی یکطرفہ خواہشوں اور امیدوں پر رونے کے ساتھ ساتھ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ جس شخص نے زندگی کے بیس سال کبھی پلٹ کر بیٹی کی خبر نہیں لی اسے اب اچانک بیٹی سے محبت کس طرح ہو سکتی تھی۔

صبح ملازمہ نے دروازے پر دستک دے کر اسے ناشتے کا بلاوا دیا۔ وہ رات سوئی ہی نہیں تھی جو جاگنے کا کوئی سوال پیدا ہوتا۔ اپنا لباس بھی اس نے نماز پڑھنے کے بعد تبدیل کر لیا تھا۔ بال بھی بنا لیے تھے۔ وہ ملازمہ کے پیچھے پیچھے ڈائننگ روم میں آئی تو اس وسیع و عریض میز پر صرف توقیق کمال بیٹھے نظر آئے۔ وہ انہیں سلام کرتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے میز پر اخبار پھیلا ہوا تھا اور وہ ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخبار پر بھی نظر ڈال رہے تھے۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھی۔ ان کے پیچھے وہ ان کے بارے میں چاہے جو کچھ بھی سوچتی ہو لیکن آمنے سامنے بیٹھ کر ان کی رعب دار شخصیت کو دیکھتے ہوئے وہ سوائے ان کی رعب دار پروقار اور مغرور شخصیت سے متاثر ہونے کے کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔ ان کی تصویریں اس نے بے شمار مرتبہ دیکھ رکھی تھیں۔ وہ تصویروں میں بہت ہینڈسم لگتے تھے بہت زبردست بہت شاندار۔ لیکن اب جب اس نے انہیں قریب سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ تصویروں میں تو اپنی اصل شخصیت کا دس فیصد بھی نہیں لگتے تھے۔

پچاس سال کی عمر میں اتنے زبردست اور ہینڈسم تھے کہ اسے یقین تھا کہ اب بھی کتنی ہی لڑکیوں کے دل انہیں دیکھ کر تیز تیز دھڑکنے لگتے ہوں گے۔ ان کے سر میں سیاہ بالوں کے ساتھ ساتھ سفید بال بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ یا شاید وہ جانتے تھے کہ یہ گرے بال ان کی شخصیت کے وقار میں کچھ اضافہ کرتے ہیں اسی لیے وہ انہیں ڈائی نہیں کرتے تھے۔

ان کے شانے بہت چوڑے اور بالکل سیدھے تھے اور ان کا قد اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی طرح چھ فٹ سے کم نہیں۔ اخبار پڑھتے ہوئے انہوں نے گلاسز لگا رکھے تھے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ گلاسز کے ساتھ زیادہ ہینڈسم لگتے ہیں یا ان کے بغیر۔

ان کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کا ذہن اپنی امی کی طرف چلا گیا۔ اس نے تصور میں امی کو ان کے برابر والی کرسی پر لا کر بٹھایا۔ ماں سے بہت سے زیادہ محبت کرنے کے باوجود اسے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس کے تصور میں امی اسی حلیے میں آئی تھیں جس میں وہ رہا کرتی تھیں۔

عام سے پرنٹ کا کوئی سستا سا سوٹ پہنے ہوئے سر پر دوپٹہ اس طرح اوڑھا ہوا کہ اسے دونوں کانوں کے پیچھے اڑسا ہوا ہو پاؤں میں گھٹیا سی دو پٹی والی چپل کسی بھی قسم کی جیولری اور میک اپ سے بے نیاز وجود گفتگو میں اٹھنے بیٹھنے میں غرض یہ کہ ہر انداز میں احساس کمتری کی واضح جھلک۔ اعتماد سے محروم آنکھیں چاہے یہ حقیقت جتنی بھی تلخ تھی لیکن ام ایمن کو یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ اس کی ماں اس شخص کے ساتھ بالکل نہیں جچ

CS CamScanner

رہی تھی۔ یہ ایک بے جوڑ شادی تھی۔

اور اب اگر امام ایمن ماں کو چھوڑ کر باپ کے ساتھ خود اپنا موازنہ کرتی تو بھی یہی جواب پاتی۔ وہ اس کے ساتھ اس کی بیٹی کے طور پر کھڑے ہو کر بھی کبھی بچ نہیں سکتی تھی۔ توفیق کمال آسمان تھے اور امام ایمن زمین تھی۔

وہ ناشتہ کر چکے تھے۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر گلاسز اتارتے ہوئے انہوں نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اسے دیکھا۔ وہ اتنی دیر سے انہیں چپکے چپکے دیکھنے میں مصروف تھی۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"کیا پڑھ رہی ہو تم؟" ان کی بھاری مردانہ آواز بے شک بہت خوب صورت تھی مگر وہ پھر بھی خائف ہو گئی۔ اس کی ہتھیلیوں پر نمی اتر آئی۔ تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اس نے انہیں جواب دیا۔

اس کی نگاہیں اپنے کپ پر جمی تھیں۔

"کس کالج سے؟"

وہ ان کی نظروں میں عزت پانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ بی بی اے کر رہی ہے یا کسی اچھے مضمون میں آنرز کر رہی ہے۔ اس نے ایک سیدھا سادہ بڑا عام سا بی اے کر رکھا تھا اور وہ بھی ایک بہت ہی چھوٹے کالج سے۔ انٹر میں اس کے مارکس کافی اچھے تھے وہ اگر چاہتی تو کسی اچھے کالج سے بھی بی اے کر سکتی تھی۔ مگر اس نے جہاں سے انٹر کیا تھا اسے وہی کالج گھر سے قریب پڑتا تھا۔ اس لیے اس نے وہیں سے ہی بی اے بھی کیا تھا۔

اس نے سر جھکائے بغیر ان کی طرف دیکھے ان کے دونوں سوالوں کے جواب دیے تھے۔ اس بے مثال ذہانت اور اعتماد رکھنے والے انسان کی نظروں میں عزت اور اہمیت پانے کے لیے وہ خود میں اچانک کانفیڈنس کہاں سے لے آتی۔ وہ ان کی طرف نہیں دیکھ سکتی' وہ اعتماد سے ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ اس کے پاس ایسی کوئی خوبی نہیں جس پر فخر محسوس کر کے وہ کہیں کہ ہاں امام ایمن واقعی میری بیٹی ہے۔ توفیق کمال کی بیٹی۔

"صرف اورنج جوس لاؤ مجھے' تھوڑی دیر بعد اگر موڈ ہوا تو فروٹس لے لوں گی۔ کافی وزن بڑھا لیا ہے میں نے۔ اب کچھ دنوں تک کھانے میں بھی میں صرف بوائل سبزیاں' وائٹ میٹ اور براؤن بریڈ لوں گی۔" اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ میز پر کب آ کر بیٹھی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ شاید ابھی ابھی ہی آئی تھیں ملازمہ کو اپنے ناشتے اور کھانے سے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ ملازمہ سر ہلاتی کچن کی طرف چلی گئی۔

"ذرا سا ایکسر سائز اور سوئمنگ کرنے میں بے قاعدگی کیا آئی میرا وزن ہی بڑھ گیا۔" وہ اب توفیق کمال کی سے مخاطب تھیں۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولے۔ شاید وہ کم بولنا پسند کرتے تھے۔

"نیند ٹھیک سے آ گئی تھی ایمن؟" وہ مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔ وہ ان کے خود کو مخاطب کرنے سے پہلے بھی ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔ سر اثبات میں ہلا کر انہیں جواب دے دیا اور اپنا چہرہ دوبارہ چائے کے کپ کی جانب کر لیا۔

"تم آفس دیر سے آؤ گی؟" کرسی پر سے اٹھتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

"ہاں آج میں آفس بارہ ساڑھے بارہ بجے تک آؤں گی۔ ابھی تیار ہوں گی پھر مجھے مسز انور کے پاس جانا ہے۔ اس کے بعد آفس آؤں گی تو دیر ہو ہی جائے گی۔" ملازمہ الماس کے لیے جوس لے آئی تھی۔ اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے وہ ڈائننگ روم سے نکل گئے تھے جبکہ ان کے پیچھے پیچھے ایک ملازم ان کا بریف کیس ہاتھ میں لیے باہر نکلا تھا۔ الماس جوس کے سپ لیتے ہوئے اب اخبار دیکھنے لگی تھیں۔

تمام تر نفرتوں کے باوجود وہ یہ کڑوی سچائی تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ توفیق کمال جیسے انسان کے ساتھ الماس توفیق جیسی حسین عورت ہی جچتی تھی۔ وہ اس کے باپ کی ہم عمر ہی ہوں گی لیکن اس عمر میں بھی انہوں نے خود کو کتنا مین ٹین کر کے رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ یہ ایک آئیڈیل جوڑا ہے۔ کتنی اچھی ہائٹ تھی ان کی۔ کتنا پرفیکٹ فگر تھا جسے یقیناً ایکسر سائز اور سوئمنگ کے ذریعے اس عمر میں بھی انہوں نے بہت اچھی طرح مین ٹین کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس دراز قامت وجیہہ مرد کے ساتھ چلتے ہوئے وہ یقیناً کسی بھی طرح اس سے کم نہیں لگتی ہوں گی۔ ان کے تراشیدہ سلکی بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس وقت گلابی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیص میں بغیر کسی میک اپ کے بھی وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھیں۔ وہ اپنا جوس کا گلاس پی لینے کے بعد اس سے معذرت کرتے ہوئے اٹھ کر لاؤنج سے چلی گئیں اور وہ وہیں بیٹھی بے وجہ اس عورت کے ساتھ اپنی ماں کا موازنہ کیے چلی جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ لاؤنج میں واپس آئیں تو وہ ان کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ کچھ دیر پہلے گلابی رنگ کے شلوار قمیص میں اگر وہ حسین لگ رہی تھیں تو اب اس آف وائٹ رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں بے تحاشا حسین۔ بغور دیکھنے پر پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے میک اپ کیا ہوا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر' ان کی آنکھوں پر جو رنگ بھی استعمال ہوئے تھے وہ سب ان کے چہرے کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے الگ سے کوئی رنگ اپنے چہرے پر لگا رکھا ہے۔

ان کے گلے میں بس ایک ڈائمنڈ کا نیکلس تھا' کانوں میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ ہی کے ایئر رنگز' بائیں ہاتھ میں صرف گھڑی اور دائیں ہاتھ میں سونے کے دو کنگن۔ انگلیوں میں انہوں نے چار پانچ رنگز پہن رکھی تھیں۔

"میں جا رہی ہوں ایمن۔ تم اکیلی بور ہونے لگو تو ڈرائیور گھر پر موجود ہے۔ جہاں دل چاہے اس کے ساتھ چلی جانا۔" ایک دلکش سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا اور پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

بے ساختہ ایک بچکانہ اور بے وقوفانہ خواہش اس کے دل میں ابھری۔ "کاش میری امی اس عورت کے جیسی ہوتیں۔ پھر توفیق کمال انہیں کبھی نہیں چھوڑتے۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ رہتے اور پھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ زندگی گزارتی۔" وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اپنی سوکن کی بیٹی سے وہ کس طرح اتنے مہذب اور خوش اخلاق والے انداز میں مل رہی تھیں۔ یہ شاید ان بڑے لوگوں کی ایک اضافی خوبی تھی۔ دل میں یہ جس کسی کے لیے جو کچھ بھی رکھیں لیکن چہرے پر اسے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ملازمہ نے آ کر ناشتے کے تمام لوازمات ٹیبل پر سے سمیٹنے شروع کیے تو وہ اس کی خود پر پڑنے والی نظروں سے اکتا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے مالک کی اچانک کہیں سے دریافت ہو جانے والی اس بیٹی کو سارے ہی ملازم کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

CamScanner

وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر شام تک وہ اسی طرح اپنے کمرے ہی میں رہی تھی۔ ملازمہ نے اس سے دوپہر کے کھانے کے لیے پوچھا تھا لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ وہ مالکانہ انداز میں گھر میں چلنے پھرنے کے بجائے سارا وقت اپنے کمرے میں قید رہی تھی۔ پورا دن اس کا خاموشی سے گزر رہا تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے وہ اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ گئی تھی۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا اور اس کے کمرے سے ملحق ایک بالکونی بھی تھی۔ وہ بالکونی میں کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ریلنگ پر بازو ٹکا کر وہ گہری سانسیں لیتے ہوئے شام کی ٹھنڈی ہوا کو اپنے اندر پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بالکونی سے پورچ کا کچھ حصہ اور لان تو تقریباً پورا کا پورا بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔ لان میں چاروں طرف نظر آتی ہریالی اسے کچھ پل کو ہی سہی لیکن سکون پہنچانے لگی تھی۔

پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز پر اس نے اس سمت دیکھا۔ توفیق کمال ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے نظر آئے۔ ایک ملازم بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا تھا۔ وہ اس پر نظر ڈالے بغیر آگے بڑھ گئے جبکہ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سے ان کا بریف کیس اور کوٹ نکالنے لگا تھا۔ وہ بالکونی میں کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ کتنی دیر تک اسے ایسا لگتا رہا کہ شاید وہ اس کے کمرے میں آئیں یا شاید اسے اپنے کمرے میں بلوائیں۔ یونہی اس کی خیر خیریت پوچھنے۔ مگر جب رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو اسے اپنی خوش فہمیوں پر ہنسی آئی۔ زندگی کے بائیس سال اگر اس نے اپنی ماں کے ابنارمل رویوں کے ساتھ الجھتے ہوئے گزارے تھے تو اب بقیہ تمام سال ایک پتھر کو اپنے باپ کے روپ میں دیکھتے ہوئے گزارنے تھے۔

⊛⊛⊛

ملازمہ اسے بلانے آئی تو ڈائننگ روم میں قدم رکھتے ہی اسے وہاں کچھ اضافی آوازیں سنائی دیں۔

"آؤ ایمن۔" الماس نے مسکراتے ہوئے یہ بات اس سے اردو میں کہی ان کے دونوں مہمان غیر ملکی تھے۔

"یہ میری بیٹی ہے ام ایمن۔" وہ میز کے قریب پہنچی تو توفیق کمال نے اس کا اپنے مہمانوں سے تعارف کروایا۔

ان دونوں نے مسکرا کر اسے ہیلو کہا۔ وہ جواباً ہیلو کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھانے کی میز پر بہت شاندار دعوتی اہتمام تھا۔ وہ شاید ان کے کوئی کاروباری دوست تھے کیونکہ توفیق کمال اور ان صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کاروباری نوعیت اور بڑی پرتکلف قسم کی تھی۔ اس میں بے تکلفی کا کوئی انداز شامل نہیں تھا۔ الماس انہیں اور ان کی بیگم کو ایک اچھے میزبان کی طرح مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔

اس نے دل ہی دل میں اس بات پر شکر ادا کیا کہ وہ حیدر کے ساتھ اس شاندار ہوٹل میں ڈنر کر آئی تھی۔ اس طرح کے پرتکلف ڈنرز میں کس طرح کے مینرز کا خیال رکھنا پڑتا ہے وہ اس ہوٹل میں جانے سے پہلے بھی یہ بات جانتی تھی لیکن خالی کتابوں میں پڑھنے اور خود عمل کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اگر وہ اس روز اس کے ساتھ ڈنر کرنے نہ گئی ہوتی تو اس وقت اسے کافی مشکل پیش آتی۔ اس نے تکلفاً اپنی پلیٹ میں ایک دو چیزیں ڈال لی تھیں اور آہستہ آہستہ انہیں کھانا شروع کر دیا تھا۔

"اور آپ کیا کرتی ہیں؟ ابھی تو یقیناً پڑھ ہی رہی ہوں گی؟" وہ چائنیز دوست اچانک اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ اتنی دیر سے ان لوگوں کو آپس میں مصروف دیکھ کر مطمئن سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ یوں براہ راست اس سے مخاطب ہوں گے۔

"میں نے گریجویشن کیا ہے۔" بمشکل وہ یہ جملہ بول پائی۔ اس کی انگریزی لکھنے پڑھنے کی حد تک تو اچھی تھی مگر بولتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوا کرتی تھی۔

مگر یہاں ان غیر ملکیوں کے ساتھ انگریزی میں اعتماد کے ساتھ بات کرنا اس کے لیے بالکل ناممکن کام تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ ڈائننگ روم میں آنے سے پہلے ہی اسے کیوں نہیں پتا چل گیا کہ آج اس کے باپ کے کچھ غیر ملکی مہمان مدعو ہیں۔

"آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ یقیناً اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے اس کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے مگر وہ اپنی گھبراہٹ پر کس طرح قابو پاتی۔

توفیق کمال کے غیر ملکی مہمان نے حیرانی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسی طرح گھبرائے اور پریشان ہوتے ہوئے ان کے سوال کا کوئی جواب دینے کی کوشش کرتی توفیق کمال نے بڑی مہارت سے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لی۔

"ابھی تو اس نے گریجویشن کیا ہے۔ آگے دیکھیں اس کا کیا موڈ بنتا ہے۔"

الماس نے ان کی بیگم کو جو ایمن کو تعجب سے دیکھ رہی تھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کا تیز تیز دھڑکتا دل اب جیسے بالکل رک چکا تھا۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی وہ ہو چکی تھی۔ باقی سارے وقت توفیق کمال اور الماس نے اپنے مہمانوں کو باتوں میں اس طرح مصروف رکھا تھا کہ وہ ایک پل کے لیے بھی ایمن کے بارے میں کچھ سوچنے یا حیران ہو کر اسے دیکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے تھے۔

ان لوگوں کے اٹھتے ہی وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بڑی تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا جس طرح اس کے باپ نے اس کی ماں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اب اسی طرح اسے بھی رد کر دیں گے۔

باپ کی نظروں میں کچھ تھوڑی بہت عزت یا اہمیت پانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ غلط کر آئی تھی۔ وہ واقعی صرف شکل و صورت میں ہی نہیں بلکہ اپنے ہر انداز میں اپنی ماں جیسی تھی۔

روتے روتے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور پھر صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اٹھنے کے ساتھ ہی اسے کل رات کا سارا واقعہ ایک دفعہ پھر یاد آ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ابھی بھی رونا آئے چلا جا رہا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی روتی رہی۔ یہاں اسے گلے لگا کر پیار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو ایمن؟" یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنے آنسو خود ہی صاف کرنے تھے سو اس نے خود ہی انہیں صاف کر لیا تھا۔ ناشتے کے لیے بلائے جانے پر اس کا دل چاہا کہ وہ منع کر دے۔ اس میں باپ

کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں لکھا یہ جملہ کیسے پڑھ پائے گی۔ "میں تمہیں قبول نہیں کرتا ایمن۔ تم میری بیٹی کیسے ہو سکتی ہو۔ تم صرف منصب شیری کی بیٹی ہو۔" لیکن اسے باہر تو نکلنا تھا۔

وہ مردہ قدموں سے خود کو گھسیٹتے ہوئے ڈائننگ روم میں آ گئی۔ آج ناشتے کی میز پر توفیق کمال کے ساتھ الماس بھی موجود تھیں۔ وہ کل کی طرح اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ الماس ڈائٹنگ پر تھیں اس لیے وہ فریش فروٹس سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ کھانے کی خواہش ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈال لی تھی۔ ٹیبل پر نظریں جمائے وہ چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ناشتہ ختم کر چکے تو اخبار دور ہٹاتے ہوئے انہوں نے آنکھوں پر سے گلاسز اتارے۔

"آج ڈرائیور کے ساتھ جا کر اپنے لیے کپڑے خرید لینا۔" انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھائی۔ ان کا لہجہ ویسا ہی سپاٹ تھا جیسا کل صبح اس سے ناشتے کی میز پر بات کرتے ہوئے تھا۔ اس میں نہ محبت تھی نہ نفرت، نہ غصہ نہ ناراضی۔ اس میں کسی بھی طرح کے جذبات تھے ہی نہیں۔ الماس اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ نہ ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں اور نہ انہوں نے اس بارے میں کوئی تبصرہ کیا تھا۔

"مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہئیں۔ آپ اپنے پیسے اپنے پاس رکھیں۔" پیٹھ پیچھے وہ ان کے لیے اس طرح کے جملے سوچ سکتی تھی مگر منہ پر بولنے کا تو وہ مر کر بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اسی طرح ان سے نظریں ملائے بغیر وہ ڈھیر سارے نوٹ ہاتھ میں لے لیے۔ کل رات صرف اس کے اعتماد سے عاری چہرے اور اس کے الجھے گھبرائے بے وقوفانہ انداز ہی نے نہیں بلکہ اس کے لباس نے بھی انہیں ان کے مہمان کے سامنے شرمندہ کروایا تھا۔ وہ میز پر سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ چند منٹوں بعد الماس بھی چلی گئیں۔

وہ دونوں آفس جا چکے تھے اور وہ نوٹوں کی گڈی ہاتھوں میں لیے خاموش بیٹھی تھی۔ کاش وہ پاپا کے کہنے پر ان کے ساتھ شاپنگ کرنے چلی گئی ہوتی۔ کاش وہ حیدر کے ساتھ بازار جا کر اپنے لیے کچھ اچھے ڈریسز خرید چکی ہوتی۔ اس وقت وہ پیسے استعمال کرنا اس کی غیرت اور انا کو گوارا نہیں تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں خود پر ہنسی۔

وہ اس شخص کے گھر میں رہ سکتی ہے اس کے گھر میں کھا پی سکتی ہے لیکن وہ اس گھر کے مالک کے پیسوں کو خرچ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اتنی ہی انا اور غیرت والی ہے تو اسے اس گھر میں رہنا بھی نہیں چاہیے۔ یہاں کھانا پینا بھی نہیں چاہیے۔ اسے اپنا ٹھکانہ کہیں اور ڈھونڈ لینا چاہیے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو پھر اسے اس نام نہاد انا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہیے۔ اسے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ اسے یہاں بلانے کے لیے نہیں تڑپ رہے تھے اس کی ماں نے ان سے التجائیں کر کے انہیں بیٹی کو اپنے پاس بلانے کے لیے کہا تھا۔

یہ اس کے پاس آخری ٹھکانہ تھا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں اس کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی اور جب اسے یہاں رہنا تھا تو پھر اسی طرح رہنا چاہیے تھا جیسے کہ اس گھر کا مالک چاہتا تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ اسی بوتیک میں آ گئی جہاں اس دن حیدر لے کر آیا تھا۔ اس نے نہ رنگوں پر دھیان دیا اور نہ کپڑوں کے اسٹائل پر بغیر سوچے سمجھے اور پسند کیے اس نے دس بارہ ڈریسز خرید لیے تھے۔ گھر واپس آ کر

اس نے وہ سارے شاپنگ بیگز بیڈ پر الٹ دیے۔ اس نے نیلے رنگ کے چار ڈریسز خرید لیے تھے۔ گرین اور وائٹ ڈریس صرف رنگوں کی وجہ سے مختلف تھے ورنہ ان پر کڑھائی ایک جیسی ہی ہوئی تھی۔ تب ہی سیلز گرل اور وہاں پر خریداری کرنے آئی ہوئی ایک خاتون اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا پتا وہ دونوں اسے نفسیاتی مریضہ سمجھ رہی ہوں۔ وہ ایک ایک کر کے الماری میں اپنے سارے قیمتی ڈریسز لٹکانے لگی۔

اس نے ان کے مہمانوں کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ انہیں اپنی وجہ سے مزید کسی شرمندگی سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ناشتے پر البتہ اس کی ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنے قیمتی ڈریسز میں سے کوئی لباس پہن کر ہی ان کے سامنے جاتی۔ وہ انہیں سلام کرتی 'وہ جواب دے دیتے۔ وہ کھانے کے دوران خاموش رہتے پھر ناشتہ ختم کرنے کے بعد اس سے "پیسے تو نہیں چاہئیں' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے" جیسے مختصر سے سوال کرتے وہ انکار میں سر ہلا دیتی اور وہ میز پر سے اٹھ جاتے۔ ان کے مہینے میں چند روز ہی کراچی میں گزرتے تھے تو باقی چند روز دن کراچی سے باہر۔ اس عمر میں بھی ان کی صحت قابل رشک تھی اور وہ مسلسل سفر کرنے سے بالکل نہیں تھکتے تھے۔ اگر کسی صبح لمبی فلائٹ پر سفر کر کے کراچی پہنچے ہوتے تو بھی آفس جانے کے لیے اپنے وقت پر تیار ہو جاتے۔ جب وہ موجود نہیں ہوتے تو پھر وہ ناشتے اور کھانے کے لیے بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ الماس کے ساتھ نہ اس کا کوئی واسطہ تھا اور نہ اسے کوئی واسطہ رکھنا تھا۔ اب اس نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ الماس اس سے نفرت کیوں نہیں کرتیں۔ اسے اپنے سارے سوالوں کے جواب خود بخود ہی مل گئے تھے۔ اس بے چاری قسم کی ام ایمن سے نفرت اور دشمنی پال کر آخر وہ کرتیں بھی کیا۔

* * *

وہ حسب عادت شام کو بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے آج وہ سارا دن اپنے کمرے میں رہی تھی۔ توفیق کمال کسی سیمینار میں شرکت کے لیے ملائیشیا گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹھنڈی اور خوشگوار سی ہوا کو محسوس کرتے ہوئے ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر لان کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے لان چیئرز پر الماس اور حیدر بیٹھے نظر آئے۔

ان دونوں کے بات کرنے کے انداز میں کافی زیادہ بے تکلفی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ حیدر نے الماس توفیق کا ذکر کرتے ہوئے انہیں الماس آپی کہا تھا اور پھر وہ ان کے ساتھ اپنے قریبی تعلق کی نوعیت بتاتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ کیا وہ دونوں آپس میں کزنز تھے؟ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک حیدر نے سر اٹھا کر بالکونی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ رشیدہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تو اس کے پوچھے بغیر خود ہی اسے بتا دیا کہ کھانے پر ایک مہمان بھی موجود ہیں۔ وہ اب اس کے پوچھے بغیر ہی اسے اس بات سے آگاہ کر دیا کرتی تھی۔

"کون حیدر مسعود؟" اس کے استفسار پر اس نے سر ہلا دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" توفیق کمال کی عدم موجودگی میں تو اسے کھانے کی میز پر ویسے ہی نہیں جانا تھا۔ وہ

اب بیڈ پر بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ رشیدہ نے ڈائننگ روم میں جا کر ان دونوں کو اس کے کھانے سے انکار کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ اتنی دیر سے اگر وہ ان دونوں کے درمیان موضوعِ گفتگو نہیں بنی تھی تو اب ضرور بنے گی۔

وہ تو ہر بات سے واقف تھا۔ وہ توفیق کمال اور الماس توفیق کے انتہائی قریبی افراد میں شامل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کے لیے امریکہ اپنے بیٹے کی دلجوئی کرنے کے لیے جانا ضروری ہے بہ نسبت اس بات کے کہ اپنی بیٹی کو خود جا کر اپنے گھر لے آئے۔ چاہیں وہ ہر ایک کے لیے ناپسندیدہ انداز رکھتا تھا یا صرف اسے ایمن پر ہی ترس آ گیا تھا لیکن نہیں وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش نہیں آتا تھا۔ اسے ہوٹل میں ملنے والی وہ خوب صورت لڑکی یاد آئی جس کے ساتھ اس نے جو روڈ انداز اختیار کیا تھا۔

وہ توفیق کمال کی بیٹی تھی اس بات سے بہت زیادہ بڑھ کر وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔

جب وہاں رہ رہی تھی تو حیران ہونے کے باوجود اسے اس کا رویہ اچھا لگتا تھا۔ اس کی باتیں اور اس کا انداز اچھا لگتا تھا لیکن اب وہ سنجیدگی سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں تھا؟ کیا اسے اس مجبور اور بے سہارا لڑکی پر اس پہلی رات اتنا زیادہ رحم آیا تھا کہ پھر آنے والے تمام دنوں میں وہ اس کے ساتھ غیر معمولی سلوک کرتا رہا؟

⊛ ⊛ ⊛

اس صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے اس سے "وعلیکم السلام" اور "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، پیسے تو نہیں چاہئیں" والی معمول کی باتوں کے بعد ایک اضافی بات کی۔

"تم کمپیوٹر کا کوئی کورس کیوں نہیں کر لیتیں۔" اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"سارا دن گھر پر فارغ رہتی ہو۔ بہتر ہے اپنے لیے کوئی اچھی مصروفیت ڈھونڈ لو۔ انگلش لینگویج وغیرہ کا بھی کورس کر سکتی ہو۔" انہوں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔ الماس اس گفتگو کے دوران بالکل لاتعلق نظر آ رہی تھیں۔

یہ مشورہ دینے کے بعد انہوں نے اگلے ہی روز اس کے کمرے میں کمپیوٹر رکھوا دیا تھا۔ وہ دو ملازمین کو کارٹن اٹھا کر اپنے کمرے میں لاتا دیکھ کر ایک پل کو حیران ہوئی پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے لیے بالکل نیا کمپیوٹر منگوایا گیا ہے۔ پینٹیم فور پرنٹر اور دیگر تمام لوازمات کے ساتھ۔ اب اسے اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کے علاوہ بھی ایک مصروفیت مل گئی تھی۔

اس نے کہیں سے باقاعدہ کمپیوٹر کا کورس نہیں کیا تھا لیکن زینت خالہ کے گھر پر عارف بھائی اور گڑیا کو دیکھ دیکھ کر وہ کافی کچھ سیکھ گئی تھی۔ اسے انٹرنیٹ کا بھی تھوڑا بہت استعمال آتا تھا۔ اب سارے دن کی فراغت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں کمپیوٹر آیا تو وہ خود ہی اس میں بہت سی نئی چیزیں سیکھنے لگی۔

وہ باپ کے مشورے کو بھولی نہیں تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس انسٹی ٹیوٹ سے کمپیوٹر کا کورس کرنا چاہیے۔ اس نے اخبار سے مدد لینی چاہی تو اسے اس میں بہت سے انسٹی ٹیوٹ کے خوبیوں سے بھرے ہوئے اشتہار نظر آئے۔ ہر اشتہار کو دیکھ کر لگتا کہ یہی انسٹی ٹیوٹ سب سے اچھا ہے۔ وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر کسی اچھی جگہ سے کورس کرنا چاہتی تھی تاکہ باپ کی نظروں میں کچھ تو سرخرو ہو سکے۔

⊛ ⊛ ⊛

دالان میں واک کر رہی تھی۔ ابھی پانچ بجے تھے اور الماس ساڑھے پانچ بجے سے پہلے آفس سے نہیں آتی تھیں۔ موسم آج صبح ہی سے بہت اچھا تھا۔ سارا دن دھوپ نہیں نکلی تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بارش ہونے والی ہے۔ پھول توڑنا اسے بچپن میں بھی بہت خالہ کا منع کرنا تھا اور اب بھی وہ ایسی ہی تھی۔ وہ بس پھولوں کو دیکھتی اور ان کی خوب صورتی کو سراہتی رہتی تھی۔ اسے چوکیدار کے گیٹ کھولنے کی آواز آئی تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ آج الماس اپنے وقت سے پہلے آ گئی تھیں۔ وہ ان سے ملنے اور بات چیت کرنے سے بچنے کی خاطر تیزی سے وسیع و عریض لان کو عبور کرتی آگے بڑھی لیکن جب تک پورچ میں گاڑی آ کر رک چکی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پورچ کی طرف دیکھا تو وہاں ایک نہیں دو گاڑیاں آگے پیچھے آ کر رکی تھیں۔ آگے والی گاڑی میں سے توفیق کمال اترے تھے اور پیچھے والی میں سے حیدر مسعود۔ وہ باپ کو دیکھ لینے کے بعد اب سیدھی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔ اس نے رک کر ان کے قریب آنے کا انتظار کیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" سلام کا جواب ان دونوں نے دیا تھا۔ توفیق کمال کا جواب ویسا ہی سرد اور سپاٹ سا تھا جب کہ حیدر کے جواب میں گرم جوشی موجود تھی۔ توفیق کمال بغیر رکے دروازہ کھول کر "آؤ حیدر" کہتے ہوئے اندر داخل ہو گئے جب کہ حیدر نے اسے پہلے اندر جانے کا موقع دیا تھا۔

"کیسی ہو بے مروت لڑکی؟ اپنے پاپا کے گھر میں آ کر بھول گئیں نا ہمیں۔" اس کا لہجہ ویسا ہی اپنائیت بھرا اور دوستانہ تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ دونوں سٹنگ روم میں آ چکے تھے۔ توفیق کمال صوفے کے پاس کھڑے حیدر کا انتظار کر رہے تھے۔

"کل ڈنر ہے گھر پر۔ امریکہ سے ہمارے بزنس فرینڈ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی آئے ہوئے ہیں۔ انہیں اور اپنے دو چار خاص خاص جاننے والوں کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے میں نے۔ ویسے تو میں توفیق بھائی سے بھی تمہیں لانے کو کہہ چکا تھا لیکن اب تم مل گئی ہو تو تمہیں خاص طور پر تاکید کر رہا ہوں۔ ضرور آنا۔ مجھے اور بی بی کو بہت اچھا لگے گا۔" اس نے ایک نظر حیدر کو اور پھر توفیق کمال کو دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے ہی دین محمد ہاتھوں میں چار پانچ فائلیں اور ان کا بریف کیس اٹھائے اندر داخل ہوا۔ دین محمد نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ فائلیں کہاں رکھنی ہیں۔

"کہاں بیٹھو گے حیدر؟" انہوں نے حیدر کو مخاطب کیا۔

"اسٹڈی میں بیٹھ جاتے ہیں۔" وہ جواباً بولا۔ دین محمد کے بروقت آ جانے سے یہ ہوا تھا کہ وہ جواب دینے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔ "ان دونوں کو ساتھ بیٹھ کر کاروباری معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔" وہ فائلوں کو دیکھ کر اندازہ لگاتے ہوئے ان دونوں سے پہلے ہی سٹنگ روم سے نکل گئی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

CamScanner

"صاحب نے کہا ہے نو بجے چلنا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔" وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھی تھی جب رشیدہ نے اسے آ کر یہ پیغام دیا۔ وہ رشیدہ کو منع کرنے کے لیے کہتے کہتے رک گئی۔

"وہ کہاں ہیں؟" وہ ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائی تھی کہ انہیں کیا کہہ کر بلایا کرے۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔" رشیدہ اسے جواب دے کر کمرے سے چلی گئی تو وہ خود بھی کرسی سے اٹھ گئی۔ وہ آج پہلی مرتبہ ان کے کمرے میں جا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دروازے پر دستک دی۔

"کم ان۔" اندر سے فوراً ہی جواب موصول ہوا تو وہ کچھ خوفزدہ سی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ یقیناً اس وقت وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"بیٹھو۔" انہوں نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جو بات کہنے آئی تھی اس کے لیے بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے وہ جلدی سے بولی۔

"میرا آفس جانے کا موڈ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سوچتی اور ڈرتی ہوئی آئی تھی کہ اگر انہوں نے "کیوں" "کیا" جیسے سوالات کیے تو وہ کیا جواب دے گی لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ شاید خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ جائے۔

رات گئے تک وہ انٹرنیٹ کنکٹ کیے بیٹھی رہی تھی۔ کھانے کا اس کا موڈ نہیں تھا ہاں رشیدہ سے ایک کپ چائے منگوا کر اس نے ضرور پی لی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر سارا منظر معمول کے مطابق تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ بیٹھی اخبار پڑھا کرتی تھی اور اس وقت بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔

"حیدر صاحب کا فون ہے۔" دین محمد نے اسے آ کر اطلاع دی۔

"تم نے انہیں بتایا نہیں کہ......"

"جی میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ صاحب اور بیگم صاحبہ آفس کے لیے نکل گئے ہیں لیکن انہیں آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بولا۔

حیدر کو اس سے کیا بات کرنی تھی اور کیوں؟ اور وہ الماس توفیق کے کسی رشتے دار سے جو بلاوجہ اس پر ترس کھاتا ہے کیوں بات کرے۔ وہ چڑ سی گئی تھی لیکن ملازم سے اس بارے میں کچھ کہنا اسے مناسب نہیں لگا اسی لیے کرسی سے اٹھ گئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے ریسیور اٹھایا۔

"وعلیکم السلام۔" دوسری طرف سے بڑے غصے میں جواب آیا تھا۔

"کہاں تھیں تم کل؟ میں نے کتنے خلوص سے تمہیں انوائٹ کیا تھا اور تم......" اس نے غصے میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دل میں چڑنے اور اس بے تکلفانہ انداز میں بازپرس کرنے پر غصہ میں آنے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کر سکی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" اسے سب سے معقول بہانہ یہی سوجھا تھا۔

"کیا طبیعت خراب ہوئی ہے آپ کی ذرا میں بھی تو سنوں۔" اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ ساتھ اب طنز بھی شامل ہو گیا تھا۔

"وہ میرے سر میں......" اس نے اٹکتے ہوئے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ اس نے بڑی خفگی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"بلاوجہ جھوٹ مت بولو۔ تم کل جان بوجھ کر نہیں آئیں اور یہ بات سن لو کہ تمہارے نہ آنے کو میں نے بہت مائنڈ کیا ہے اور صرف میں نے ہی نہیں پاپا نے بھی برا مانا ہے۔ تمہیں ہوا کیا ہے میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہمارے پاس سے تو اچھی خاصی آئی تھیں۔ توفیق بھائی کے پاس آ کر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس روز بھی بجائے اس کے کہ مجھے دیکھ کر لان میں آ جاتیں میری شکل دیکھتے ہی چلی گئیں۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر نہیں کھایا۔ میں اس روز تمہارے گھر پر مہمان تھا، ہاں کیا مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے اور کیا جب تم ہمارے پاس مہمان تھیں تو ہم نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟" وہ بڑی اپنائیت سے شکوہ کر رہا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ وہ اتنی اہم نہیں تھی کہ اس کے نہ جانے سے کل رات کسی کو کوئی فرق پڑا ہو پھر وہ کیوں اس طرح بات کر رہا تھا۔ شاید ابھی وہ اپنے آفس پہنچا ہو گا اور آفس آتے ہی اس نے سب سے پہلے اسے فون کیا تھا۔ ام ایمن کو لیکن کیوں؟

"آئی ایم سوری۔" وہ اتنے سارے شکوؤں کے جواب میں سوری کے علاوہ کچھ نہ بول سکی۔

"صرف سوری سے میری ناراضی دور نہیں ہو سکتی۔ تم مجھے وجہ بتاؤ اپنے نہ آنے کی بھی اور اس روز مجھے اگنور کرنے کی بھی۔" کتنے سارے دنوں بعد کوئی اسے بولنے کا موقع دے رہا تھا۔ کوئی تھا جو اسے سننا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے کیا کہے۔ وہ اس شخص کے سامنے اب کوئی بھی تماشا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جواباً خاموش رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں اچانک ہی ڈھیر سارے آنسو آ گئے تھے۔

"ام ایمن! کیا ہوا ہے؟ تم خاموش کیوں ہو؟" وہ اس کی خاموشی سے تنگ آ کر بولا۔ اس نے جواباً کچھ کہے بغیر ایک دم ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ وہ وہیں کھڑی ہوئی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ ایسے کیوں بات کرتا ہے؟ وہ اسے اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے؟

وہ اس کے بارے میں چاہے جتنی بھی منفی باتیں سوچ لے لیکن جب وہ اس سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کا اپنائیت بھرا پرخلوص انداز اسے ہر بات بھلا دیتا ہے۔ اچانک ہی دل چاہنے لگتا ہے کہ اس شخص پر اعتبار کر لو۔ اس سے دل میں موجود ساری باتیں کہہ دو۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو وہ اس یقین کے ساتھ کہ کال اس نے ریسیو کی ہے جلدی سے بولا۔

"تم رو رہی ہو؟ لیکن میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا جو تمہیں رلا دے۔"

"آپ نے اپنے گھر پر میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا تھا تو اس کے لیے وہ لوگ آپ کے شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے وہ برتاؤ کیا گیا تھا اور پھر بھی اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کروں تو ٹھیک ہے میں کر دیتی ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنے گھر پر میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے بہت زیادہ ٹائم دیا۔ مجھ پر ترس کھا کر ہی سہی لیکن گھنٹوں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں۔ اپنا قیمتی وقت میرے لیے برباد کیا۔ بس ٹھیک ہے کر دیا میں نے آپ کا شکریہ ادا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"اب آپ مجھے فون مت کیجیے گا۔ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔" اس نے اسی طرح روتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نوکروں میں سے کوئی اسے روتا ہوا دیکھے۔ کافی دیر تک رونے کے بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی تو اپنی کچھ دیر پہلے کی گفتگو کو یاد کر کے پچھتانے لگی۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ اسے حیدر مسعود کے ساتھ اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

رات کے کھانے کے فوراً بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ آج صبح والی بات سے وہ اتنی زیادہ مضطرب تھی کہ نہ اس کا ٹی وی دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا نہ کتاب پڑھنے کو اور نہ کمپیوٹر آن کرنے کو۔ وہ بالکل فارغ بیٹھی ہوئی تھی جب رشیدہ دروازہ تھپتھپا کے اندر آئی اور اسے حیدر اور بی بی کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"وہ ڈرائنگ لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" صبح جس طرح اس نے حیدر سے بات کی تھی اس کے بعد اس وقت وہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی۔

"السلام علیکم۔" وہ لاؤنج میں آ گئی تھی۔ بی بی نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ "میں پچھلے دنوں دبئی گئی تھی۔ وہاں سے اپنے سب قریبی جاننے والوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھی لائی تھی۔ تمہارے لیے بھی یہ ایک دو چیزیں خریدی تھیں میں نے سوچا تھا کہ کل تم آؤ گی تو یہ تمہیں دے دوں گی۔ اب تم تو کل آئیں ہی نہیں۔ اس لیے آج مجھے خود ہی یہ دینے کے لیے تمہارے پاس آنا پڑا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک بیگ پکڑا دیا۔ وہ تحفہ قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی تو ان کی آنکھوں میں تحفہ قبول کر لینے کی ہدایت نظر آئی۔

"تھینک یو۔" اس نے وہ بیگ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ الماس اور حیدر آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ تحفے کے دیے اور لیے جانے کے اس منظر میں ان دونوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔

اس نے اپنے کل نہ آنے پر معذرت کی اور کسی دن ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر آنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس نے ایک بار بھی حیدر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس بی بی سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس دوران چائے سرو کی جا چکی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو آج کل؟" حیدر کا اس سے پوچھا جانے والا یہ سوال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ بری طرح چونک گئی۔ اسے ذرا سی بھی امید نہیں تھی کہ وہ یوں براہ راست اسے مخاطب کرے گا۔ اس کی صبح کی بدتمیزی کے بعد تو اسے اب اس سے کبھی بھی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"میں.... کچھ بھی نہیں۔" اتنے غیر متوقع سوال کا وہ اور کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دے پائی تھی۔

"لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارا یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا پروگرام ہے۔" اس نے ہونق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ بات اس نے حیدر مسعود سے کب کی تھی اسے اپنا ایسا کوئی جملہ یاد نہیں آیا تھا۔

"اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی توقیر بھائی؟" وہ اب ان سے سوالیہ انداز میں مخاطب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بیٹی کی ہونق شکل پر نگاہ ڈالتے وہ خود ہی مزید بولا۔

"مجھ سے تو اس نے اس بارے میں خوب لمبی چوڑی گفتگو کی تھی۔ میرا ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔ خالی گریجویشن کی بھی کوئی ویلیو ہے وغیرہ وغیرہ۔" وہ اتنے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا کہ توقیر کمال بھی اس جھوٹ کو پکڑ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے بیٹی کے جھکے ہوئے سر پر ایک نظر ڈالی اور سنجیدگی سے بولے۔

"میں اس سے کمپیوٹر کا کوئی کورس کرنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن اگر اس کا ماسٹرز کا ارادہ ہے تو یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔" وہ اس کی ذات سے منسوب کر کے ایسی باتیں کیوں کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی کی ہی نہیں تھیں۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اب سب کے سامنے وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

"اتنے عرصے سے فارغ بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ پتا ہے یونیورسٹی میں ایڈمیشنز شروع ہو چکے ہیں۔ تین چار دن پہلے میں نے اخبار میں ایڈمیشنز کے متعلق پڑھا تھا۔ اب اگر اخبار پڑھا ہوتا تو پتا ہوتا کہ ایڈمیشنز شروع ہو چکے ہیں۔ کیا آخری ڈیٹ پر فارم جمع کروانے کا ارادہ ہے؟" وہ ہمیشہ اسی طرح سے نروس ہی رہتی تھی اس لیے اس وقت اس کی خاموشی اور نروس نیس کسی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔

"اس نے مجھے بتایا نہیں ورنہ میں اسے فارم منگوا دیتا۔" وہ بیٹی پر افسوس بھری نگاہ ڈال کر حیدر سے بولے۔ اس میں اتنا سا بھی اعتماد نہیں تھا کہ وہ انہیں یہ بات بتا سکتی کہ وہ کمپیوٹر کا یا کسی بھی اور چیز کا کوئی کورس نہیں کرنا چاہتی بلکہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔

"کل ڈرائیور کو بھیج کر فارم منگوا لینا۔" انہوں نے اپنی مایوسی اور تاسف کو چہرے پر لائے بغیر بیٹی کو مخاطب کیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سر ہلانا پڑا۔

اسے اس شخص پر انتہا سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اس کی ذات سے منسوب کر کے اس نے جو جھوٹ بولے تھے وہ اس سے ان کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی۔ آخر اسے اس کے ذاتی معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں تھی؟

⊛ ⊛ ⊛

اگلے روز صبح گیارہ بجے حیدر کا فون آیا تھا۔

"تم نے فارم منگوا لیا؟" اس کے ہیلو کے جواب میں اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔"

"تم سے یہی امید تھی مجھے۔" یہ کہتے ہوئے اس کا جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے حیرانی سے کھڑی رہ گئی تھی۔ ایک تو اسے اس کے ایڈمیشن کی اس قدر فکر تھی کہ صبح ہی فون کر کے اس بارے میں پوچھا تھا اور اب اس کے انکار پر کوئی تنقید اور تبصرہ کیے بغیر اچانک ہی بات ختم کر دی تھی۔ وہ پھر کے

CamScanner

ڈیڑھ بجے اسے دین محمد سے حیدر کی آمد کی اطلاع ملی۔
''وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔'' وہ باہر آئی تو پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے اتر گیا۔
''صرف اسے قبول کرنے کا احسان کر دیجیے۔ باقی سب کچھ میں خود ہی کر لوں گا۔'' اس نے فارم اس کی طرف بڑھایا۔
''آپ کو آخر میری اتنی فکر کیوں ہے؟'' اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس پل اس کی فطری کمزوری اور کم اعتمادی پر غصہ حاوی ہو گیا تھا۔
''بہت دنوں بعد تم نے کوئی عقل مندی والا سوال پوچھا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب بہت ساری تفصیلات اور وقت چاہتا ہے جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔ پھر کبھی فرصت سے تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔'' وہ جیسے اس کے غصے کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا اس بارے میں فیصلہ کرنے والے آپ کون ہیں۔ کب میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہوں۔ آپ نے کل رات جھوٹ کیوں بولا تھا؟'' اس کے چہرے کی مسکراہٹ نے اس کے غصے کو مزید بڑھایا تھا۔
''مجھے آپ کے رحم اور ترس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس لیے توفیق کے کسی رشتے دار سے کسی بھی طرح کا کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ آپ توفیق کمال کے بزنس پارٹنر ہیں اور جو کچھ بھی ہیں تو اپنا تعلق ان ہی تک رکھیے۔ مجھ پر جتاتے ہیں اور نوازشیں کرنے کی آپ کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔''
''تم نے کل بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔ میں تم پر کیوں ترس کھاؤں گا امامہ۔ تم میں ایسی کیا کمی ہے جو تم پر ترس کھایا جائے۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔
''تو پھر میرے باپ نے آپ سے کہا ہوگا کہ میری بیٹی کو کچھ سدھار دو۔ وہ تھوڑی پڑھ لکھ جائے تاکہ اسے ہمارے ماحول کے مطابق اٹھنا بیٹھنا اور لوگوں سے بات کرنا آ جائے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسے رونا نہیں ہے وہ بالکل بھی نہیں روئے گی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو سمجھایا۔
اس نے ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے تو حیرت سے گنگ کچھ بول نہیں پائی لیکن اگلے لمحے اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے کہا۔
''آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے امامہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
''آئی ایم سوری لیکن وہاں گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا اور بھی کوئی ملازم وہاں آ سکتا تھا۔ پورچ میں کھڑے ہو کر اس طرح کی بات کرنا بالکل ٹھیک نہیں تھا۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ویسے ہی کھڑی ہوئی تھی۔
''ہاں اب بولو تم کیا کہہ رہی تھیں۔'' اس کا دل چاہا وہ میز پر سے ایش ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

''میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔'' وہ مشتعل انداز میں بولی۔
''تمہیں توفیق بھائی سے جو بھی شکایتیں ہیں اور چاہے وہ سب درست بھی ہوں تب بھی تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کا نام لینا یا میرا باپ کہنا بہت بدتمیزی کی بات ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ امامہ جیسی اچھی لڑکی کسی بدتمیزی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔'' اس نے بہت نرم انداز میں اسے اس کی بدتمیزی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ''مجھ سے انہوں نے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ ایڈمیشن کی بات اگر میں نے کی ہے تو خود کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔'' اس کا سنجیدہ لہجہ ہنوز نرمی لیے ہوئے تھا۔
''آپ میری جھوٹی تعریفیں مت کریں۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں جو ان تعریفوں پر خوش ہو جاؤں گی۔'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ''جو میں ہوں وہ مجھے پتا ہے۔ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں۔ میں توفیق کمال کی بیٹی نہیں لگتی۔ نہ شکل صورت میں نہ عادتوں میں نہ ذہانت میں اور اسی وجہ سے انہوں نے مجھے اس اون کر دیا ہے کیونکہ میں ان کے جیسی نہیں۔ میں اپنی ماں کے جیسی ہوں۔''
''انہوں نے تمہیں اس اون نہیں کیا امامہ۔'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ ''اور تم توفیق کمال کی بیٹی لگتی ہو۔ شکل صورت اور عادتیں چاہے تمہاری ان کے جیسی نہیں ہیں لیکن ذہانت تمہارے پاس بالکل ویسی ہی ہے۔ تم نے ان سے وراثت میں ذہانت لی ہے۔ ابھی تمہیں خود نہیں پتا لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ اگر کوئی تمہیں صحیح سمت میں چلنا سکھا دے تو تم کہاں پہنچو گی۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ بس اس کے لیے تمہیں تھوڑی سی محنت کرنی ہوگی۔ خود پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کو درست طریقے سے استعمال کرنا ہوگا اور میری ان سب باتوں میں سے کوئی بات بھی جھوٹ نہیں ہے۔''
''میں آپ کی کسی بھی بات کا یقین نہیں کروں گی۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ میں اب تک ان کے سامنے کیسی ثابت ہو چکی ہوں۔ اس گھر میں آنے کے پہلے دن سے لے کر آج تک میں مسلسل یہ کوشش کرتی رہی ہوں کہ ان کی نظروں میں میرا امپریشن مزید خراب کر چکا ہے۔ اگر مجھ میں واقعی کوئی ذہانت ہوتی تو میں ان کے سامنے کسی نہ کسی بات سے تو اسے ثابت کر ہی دیتی۔'' وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔
''تم ان کی بیٹی ہو ان کی کوئی ملازمہ نہیں۔ باپ بیٹی کے رشتے میں امپریشن کا سوال کہاں سے آ گیا کہ اگر اچھی کارکردگی ہوئی تو باس خوش ہوں گے ورنہ نہیں۔ کام درست اور وقت پر کریں گے اچھا رزلٹ دیں گے تو ملازمت برقرار رہے گی ورنہ نکال دیے جائیں گے۔ تم کچھ اچھا کرو گی تو بھی ان کی بیٹی کہلاؤ گی اور برا کرو گی تو بھی۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔
''یہ بات آپ کہہ رہے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ میری ماں انہیں پسند نہیں تھی اس لیے انہوں نے انہیں چھوڑ دیا۔ جو لوگ اور جو چیزیں انہیں اچھی نہیں لگتیں وہ انہیں خود سے جدا کر دیتے ہیں۔ جس روز وہ مجھ سے مکمل طور پر مایوس ہو گئے تو مجھے بھی خود سے دور جدا کر دیں گے۔''

CS CamScanner

"تم توفیق بھائی کو غلط سمجھ رہی ہو امامہ ایمن! تم ان کی بیٹی ہو۔ بیوی اور بیٹی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بیوی کو چھوڑا جا سکتا ہے بیٹی کو نہیں۔ وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے' کبھی تمہیں خود سے دور نہیں کریں گے چاہے تم کچھ بھی کرو۔" وہ نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جیسے انہوں نے پچھلے انیس سالوں میں مجھے بھلائے رکھا ہے ایسے ہی اب بھی وہ مجھے بھول بھی سکتے ہیں اور چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ ان کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے میں جانتی ہوں۔ ان کی زندگی میں میری یہ اہمیت تھی کہ وہ مجھ سے فون پر ایک مختصری گفتگو کر کے اپنے کسی جاننے والے کو مجھے لانے کے لیے کہہ کر خود امریکہ اپنے لاڈلے بیٹے کی سالگرہ منانے اور اس کی دلجوئی کرنے چلے گئے۔ انہیں اپنے بیٹے کی بہت فکر تھی' برسوں سے نظر انداز کی ہوئی بیٹی کی نہیں۔ وہ بیٹی جو دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی' جس کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ بوسٹن میں اس کا دل نہیں لگ رہا' اسے اپنا کراچی کا عالی شان گھر اور محبت کرنے والے ماں باپ یاد آ رہے ہیں بلکہ یہ کہ اس کے پاس عالی شان نہ معمولی کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ محبت کرنے والا یا نفرت کرنے والا نہیں بلکہ سرے سے اپنا کہنے کے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ اب آپ یہ مت کہیے گا کہ میں بدتمیزی کر رہی ہوں یا انہیں غلط سمجھ رہی ہوں۔" وہ روتے ہوئے غصے سے بولی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہارا ان سے یہ شکوہ بالکل جائز ہے۔" اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا' پہلی بار وہ ان کا دفاع کرنے کے بجائے اسے ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"جب توفیق بھائی نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں تمہیں حیدر آباد سے کراچی لے آؤں تو مجھے یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ان کے جانے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا' وہ ایئرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلنے والے تھے لیکن اتنی بڑی بات سننے کے بعد انہیں اپنا جانا ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ سائرہ کے پاس الماس آپا چلی جاتیں اور توفیق بھائی تمہارے پاس خود حیدر آباد آتے لیکن میں ان سے اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ ان کا اتنا زیادہ پرسنل معاملہ تھا کہ باوجود انتہائی قریبی تعلق کے میں اس پر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے کہنے کا یہ مطلب لیتے کہ مجھے ان کی بیٹی کو اپنے ساتھ لانے اور اپنے گھر میں ٹھہرانے پر اعتراض ہے۔

مگر جب حیدر آباد سے کراچی آتے ہوئے راستے میں میں نے تمہیں روتے دیکھا تو مجھے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ تمہیں صرف اپنی امی کے مرنے کا دکھ نہیں رلا رہا بلکہ توفیق بھائی کا خود تمہیں لینے کے لیے نہ آنا بھی رلا رہا ہے۔" اس کی آواز میں سنجیدگی کے ساتھ کچھ دکھ بھی شامل ہو گیا تھا۔

"صرف نہ آنا نہیں۔" وہ روتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔

"آپ تو اس وقت ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ سنا تھا ناں آپ نے انہوں نے فون پر مجھ سے کیسے بات کی تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ میری ان کے ساتھ زندگی میں پہلی بات تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی کے ساتھ بات کرنے پر انہوں نے اس سے کیا کہا تھا' کس لہجے میں کہا تھا۔ مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے پر انہوں نے کیا کیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے سرسری سے انداز میں میرے سلام کا جواب دے دیا تھا۔

مجھے ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ میرے باپ ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں کسی اجنبی کے گھر میں رہ رہی ہوں۔"

"ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے امامہ ایمن! توفیق بھائی کی نیچر ہی اس قسم کی ہے۔ وہ سب سے ہی فاصلہ رکھ کر ملتے ہیں۔ وہ جذباتی انداز نہیں اپنا سکتے' محبت بھری باتیں نہیں کر سکتے۔ وہ سائرہ کے ساتھ بھی ایسے ہی ہیں۔ اچھی یا بری جیسی بھی ہے لیکن یہ ان کی عادت ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتے۔ وہ اس سے بھی محبت کرتے ہیں اور تم سے بھی۔ بس ان کا محبت کرنے کا انداز مختلف ہے۔ جیسا تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں پیار کریں' تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ اس کی شکایتوں کے جواب میں بردباری سے بولا۔

"آپ پھر ان کی طرف داری کر رہے ہیں۔ آپ ان کے بیٹے کے ساتھ مجھے مت ملائیں۔ وہ بچپن سے ان کے ساتھ تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے پاس ماں اور باپ دونوں کو دیکھا تھا' اسے سب کچھ میسر تھا۔ ماں باپ کی محبت' آسائشیں' اچھی تعلیم' بہترین زندگی...... اور میں؟ زندگی کے تیرہ سال تک مجھے یہ ہی نہیں پتا تھا کہ میرا باپ کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر اس نے میری ماں کو چھوڑ دیا ہے تو کیوں۔ میں امی سے اپنے باپ کے متعلق پوچھتی تو وہ مجھ سے کہتیں کہ وہ ملک سے باہر ہیں۔ شروع شروع میں میں نے ان کی اس بات کا یقین کر لیا لیکن جیسے جیسے میں بڑی ہوئی تو میرے دل میں سوالات اٹھنے لگے۔ وہ باہر تھے تو کبھی ہم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں آتے تھے' کبھی ہمیں کوئی خط کیوں نہیں لکھتے تھے' فون کیوں نہیں کرتے تھے۔ سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ امی مجھ سے جھوٹ بولتی رہی ہیں۔ آپ نے دیکھا تھا میں کس گھر میں رہتی تھی۔ میں بچپن سے اسی گھر میں رہتی تھی۔ میری امی تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ وہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں' گھر پر بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں' بہت مشکلوں سے ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر آتے آتے یہ ہوا کہ میں لوگوں سے کہنے لگی کہ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے یہ جواب زیادہ بہتر لگتا تھا بجائے "وہ ملک سے باہر ہیں" والے جھوٹ کے۔ ایک مرتبہ امی نے میرا یہ جھوٹ سن لیا۔ وہ مجھ پر بہت ناراض ہوئیں۔ میں اپنے زندہ باپ کو مار رہی تھی' اس بات پر خفا ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں خود ہی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ مجھے ساری بات بتا دینی چاہیے۔ تب تیرہ سال کی عمر میں امی کی زبانی میں نے اپنے باپ کے بارے میں سب کچھ سنا تھا۔

توفیق کمال' ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والے بڑے آدمی۔ وہ غلط جگہ پیدا ہو گئے تھے۔ جس ماحول میں وہ پیدا ہوئے وہ ان جیسے ذہین اور شاندار انسان کے شایان شان نہیں تھا اور انہوں نے خود کو کبھی بھی اپنے اس غربت بھرے پسماندہ ماحول کا حصہ نہیں بننے دیا تھا۔ انہیں زندگی میں بہت آگے جانا تھا' وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور انہوں نے بیٹے کی قابلیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے شروع سے اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی تھی۔

میری امی ان کی کزن تھیں۔ ان کی خالہ کی یتیم بیٹی' وہ بچپن سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہے تھے۔ توفیق کمال کو اپنی اس ڈری سہمی اور بزدل سی کزن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ اپنے اس ہینڈسم اور غیر معمولی خوبیوں

CamScanner

کے مالک کزن سے دل ہی دل میں محبت کرنے لگی تھیں۔

پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی چلے گئے۔ وہ اچھے خاصے' اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور میری امی انہوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے غریب خالہ اور خالو پر اپنی تعلیم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ ایم بی اے کے بعد جب بیٹا کراچی ہی میں بہت اچھی جاب بھی کرنے لگا تو میری دادی کے دل میں بیٹے کی شادی کا ارمان جاگا۔ بہو ڈھونڈنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہیں اپنی بھانجی سے زیادہ پیارا کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اس رشتے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اس شادی سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں دادی بہت بیمار تھیں۔ انہیں اپنے بعد بھانجی کے بے سہارا رہ جانے کی فکر تھی۔ دادا کا چند سال پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ماں کی بیماری دیکھتے ہوئے وہ ان سے مزید کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اس لیے انہوں نے میری امی سے بات کی۔ انہیں بتایا کہ وہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی آئیڈیل لڑکی ابھی انہیں نہیں ملی ہے لیکن وہ جو کوئی بھی ہو گی کم از کم زینب ہاشم ہرگز نہیں ہو گی۔ اتنے واضح انکار کے بعد بھی میری امی اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہوئیں۔ ان کا ہونے والا شوہر شادی سے پہلے ہی انہیں قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے انہیں اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ اگر امی بھی انکار کر دیں تو دادی مان جائیں گی مگر امی نے انکار نہ کر کے انہیں اس مشکل میں ڈالا کہ وہ شادی کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ دادی کی وجہ سے مجبوراً قائم ہونے والا یہ رشتہ جب تک ہی چلا جب تک کہ دادی زندہ رہیں۔ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادی کے انتقال کے فوراً بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ جس کمپنی میں جاب کر رہے تھے وہاں کے مالکوں میں سے کسی کی بیٹی سے۔ وہ اس دنیا میں پہنچ گئے تھے جو ان کی دنیا تھی۔ جہاں نہ تب توفیق اور امام ایمن کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گئے انہوں نے مجھے اور امی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ امی سے اپنے باپ کے بارے میں یہ ساری باتیں سن لینے کے باوجود بھی وہ میرے لیے زندہ نہیں ہو گئے تھے۔

اور زندگی کے اتنے برسوں بعد وہ اچانک میرے لیے زندہ ہو گئے ہیں تو مجھے وہ سارے تکلیف دہ پچھ یاد آنے لگے ہیں۔ میرے باپ کی زندگی میں نہ کل میری کوئی اہمیت تھی اور نہ آج ہے۔ اگر ہوتی تو وہ امی کو اور مجھے یوں تو نہ چھوڑتے۔ امی سے رشتہ چاہے مجبوراً جوڑا تھا تب بھی اور کسی کی خاطر نہ سہی صرف اپنی اولاد کی خاطر ہی اسے نباہ تو سکتے تھے۔ وہ میرے پیدا ہونے پر حیدر آباد گئے تو انہوں نے بیٹی کی پیدائش پر بیوی کو اپنی دوسری شادی کی خبر تحفے کے طور پر دی۔ انہوں نے یہاں پر تو کبھی کسی کو بتایا بھی نہیں ہو گا کہ ان کی حیدر آباد میں ایک اور بیوی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ امی کے خط کے ذریعے آپ لوگوں کو پتا چلا ہو گا کہ توفیق کمال کی کوئی بیٹی بھی ہے۔"

وہ اپنی بات کے اختتام پر طنزیہ انداز میں ہنسی۔ اس نے بہت بے دردی سے اپنے آنسو بھی صاف کر لیے تھے۔

"انہوں نے اس بارے میں بھی کوئی بات کسی سے نہیں چھپائی۔ ہم سب شروع سے جانتے تھے کہ الماس آپی کے ساتھ ان کی دوسری شادی ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا تھا کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو کیوں چھوڑا یہ سب کم از کم میں تو نہیں جانتا تھا اور مجھے ان کے ماضی کو جاننے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔" وہ اس کے پاس سے ہٹ کر واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تمہارے یہاں آنے کے بعد میں نے اس بارے میں ضرور سوچا تھا مگر توفیق بھائی سے ان کی اتنی ذاتی باتیں پوچھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا لیکن الماس آپی دس پندرہ دن پہلے خود ہی میرے ساتھ اس موضوع پر باتیں کرنے لگیں تو میں نے ان سے بعض باتیں پوچھی تھیں۔" وہ بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ "پتا نہیں مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہیے یا نہیں کیونکہ میرے خیال سے تو یہ بات خود تمہاری امی کو تمہیں بتانی چاہیے تھی۔"

"توفیق بھائی نے الماس آپی سے شادی کے چند مہینوں بعد ہی تمہاری امی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ اس رشتے کو مزید قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے جب کہ تمہاری امی طلاق نہیں چاہتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں طلاق دینے کے بعد خود ان کی کسی دوسری جگہ شادی کروا دیں اور اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں مگر تمہاری امی نے ان ساری باتوں سے انکار کر دیا تھا۔ وہ طلاق کے لیے اس شرط پر راضی ہوئی تھیں کہ پھر وہ زندگی بھر اپنی بیٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے اور یہ کوئی وقتی جوش یا غصہ نہیں تھا۔

توفیق بھائی نے بعد میں تم سے ملنے کی کوشش کی تو انہوں نے انہیں اپنی شرط یاد دلا کر ملنے سے روک دیا۔ تمہارے خرچے کے لیے رقم بھیجی تو انہوں نے وہ واپس کر دی۔ میں توفیق بھائی کی کوئی حمایت یا طرف داری نہیں کر رہا۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ بالکل ٹھیک تھے اور تمہاری امی غلط۔ وہ یقیناً غلط تھے مگر تم اس الزام سے تو کم از کم انہیں بری کر دو کہ انہوں نے زندگی میں کبھی تمہیں کوئی آسائش دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ محبت چاہے تمہیں نہ دے سکے تم سے ملنے چاہے نہ آتے لیکن تمہیں پابندی سے تمہارے اخراجات کے لیے رقم ضرور بھیجتے لیکن تمہاری امی نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ تم سچائی اور ایمان داری سے تجزیہ کرو تو توفیق بھائی کے ساتھ ساتھ وہ بھی بہت سی باتوں کے لیے قصوروار ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک ایسے انسان سے شادی کی جو انہیں کسی بھی قیمت پر قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس شادی میں تمہاری دادی کے ساتھ ساتھ تمہاری امی بھی قصوروار تھیں۔ ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ انہوں نے تمہیں تمہارے باپ سے دور کر دیا۔ توفیق بھائی چاہے دنیا دکھاوے کو یا رسماً ہی بیٹی کی خیر خبر رکھنا چاہتے تھے انہیں توفیق بھائی کو ایسا کرنے سے روکنا نہیں چاہیے تھا۔

تمہارا حق تھا کہ تم اچھی زندگی گزارتیں' باپ کا پیسا استعمال کرتیں' باپ سے ملتیں' توفیق بھائی تم سے اور تم ان سے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تو آج تم دونوں کے بیچ یہ دوری اور اجنبیت نہ ہوتی۔ ان کی لڑائی اپنے شوہر کے ساتھ تھی اور ماں ہو کر جائز تھی تب بھی انہوں نے تمہیں تمہارے حقوق سے محروم کر کے اچھا نہیں کیا۔" وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ امی نے اتنی بڑی بات اس سے چھپائی۔ انہوں نے اسے سب کچھ بتایا مگر یہ نہیں بتایا کہ توفیق کمال اب ان کے شوہر نہیں ہیں۔

"تم اس وقت شاک میں ہو۔ میں باقی باتیں تم سے بعد میں کروں گا۔" وہ ایک دم ہی صوفے سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر جا رہا تھا جب کہ وہ ویسی کی ویسی بیٹھی تھی۔

CamScanner

"تو آپ اتنی شدید محبت کرتی تھیں توفیق کمال سے۔" اس نے گہری سانس لی۔

اس کے تصور میں امی کے آخری دنوں کے وہ سب مناظر گھومنے لگے جب وہ بیڈ پر لیٹ کر گھنٹوں اپنی شادی کی تصویروں کو دیکھتی رہا کرتی تھیں۔ توفیق کمال کے ساتھ ان کی یک طرفہ محبت اتنی شدید تھی کہ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک خود اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں طلاق دے چکے ہیں۔

کیا محبت ایسی چیز کا نام ہے جو انسان کو عقل اور شعور کے بجائے سچائیوں سے فرار کا راستہ دکھائے؟ انہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا جو ان کے لیے نہیں بنا تھا۔ انہوں نے خود اپنے لیے کھائی کا انتخاب کیا تھا۔ زندگی کو خود اپنے لیے مشکل بنایا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ شخص ان کا کبھی نہیں ہو سکتا پھر بھی انہوں نے سچائی سے منہ موڑ لیا۔

اسے آج سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسے اپنی ماں ایک نارمل عورت کیوں نہیں لگتی تھی۔ وہ کبھی بیٹھے بیٹھے مسکرایا کرتیں اور کبھی اچانک ہی بغیر کسی بات کے رونا شروع کر دیتیں۔ وہ لوگوں سے نہیں ملتی تھیں، وہ کہیں جاتی نہیں تھیں اس خوف سے کہ کہیں کوئی ان سے ایسا سوال نہ کر لے جو ان کی خیالی دنیا کو تباہ کر ڈالے۔ اپنی زندگی کے آخری دن۔ وہ دن جب وہ انتہائی تکلیف میں تھیں تب بھی انہوں نے اس سے اپنی شادی کی البم نکلوا کر دیکھی تھی۔ وہ تصویروں میں خود کو توفیق کمال کے برابر میں بیٹھا دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

اس روز اسے امی پر یہ سوچ کر غصہ آیا تھا کہ وہ اس بے حس اور ظالم انسان سے اب بھی محبت کرتی ہیں لیکن آج اسے ان پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اب اپنی مری ہوئی ماں پر غصہ کر کے کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب انہیں کبھی واپس نہیں آنا تھا جو وہ ان سے لڑ سکتی۔ یہ پوچھ سکتی کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ کس کو الزام دے؟ اپنے باپ کو کہ اس نے اس کی ماں کو طلاق کیوں دی؟ یا پھر اپنی ماں کو جس نے اسے باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور وہ بیڈ پر لیٹ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

رشیدہ نے اسے حیدر کے فون کا بتایا تھا۔ وہ بات کرنے سے انکار کر کے بیڈ پر ویسے ہی لیٹی رہی جیسے دوپہر سے لیٹی تھی۔

"کہہ دو وہ سو گئی ہیں۔" وہ اس کا جواب سن کر کمرے سے نکل گئی لیکن صرف دو منٹ بعد ہی وہ کورڈلیس ہاتھ میں لیے واپس کمرے میں آ گئی۔

"وہ مجھ پر ناراض ہو رہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ نو بجے کوئی سونے کا ٹائم نہیں ہوتا۔ میری بات کرائو۔" اس نے حیدر کی کہی بات دہراتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ کورڈلیس اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"ہیلو۔" اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا وہ اس وقت کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کے سو جانے والے جھوٹ کا ذکر کیے بغیر اس کی خیریت پوچھنے لگا۔

"جی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"تم نے کھانا کھایا؟"

"نہیں۔" اس نے پھر یک لفظی جواب دیا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے۔ نو بج چکے ہیں تم نے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ جاؤ جا کر کھانا کھاؤ۔" وہ جواباً خاموش رہی تھی۔

"آئی ایم سوری ام ایمن۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم نصیحتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہو لیکن پھر بھی میں تمہیں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کے بعد اس نے اس کی سنجیدہ آواز سنی۔

"بہت سے دکھ ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں ملنے ہوتے ہیں۔ بعض سچائیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ چاہے ہمیں کتنی بھی ناگوار لگیں ہمیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ انسان ہر وقت خود پر ترس کھاتا رہے اپنی زندگی میں آنے والے دکھوں کے بارے میں سوچتا رہے تو وہ دکھ اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کی زندگی میں اگر خوشیاں آتی بھی ہیں تو وہ انہیں دیکھ نہیں پاتا۔

تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے یہ سوچنا چھوڑ دو ام ایمن! جو کچھ جیسا ہے اسے ویسا ہی قبول کر لو۔ ماضی کو بھول کر حال میں جینا سیکھو۔ کیا ساری زندگی تم یونہی گوشہ نشینی اختیار کرتی رہو گی؟" ہمیشہ کی طرح اس کے لفظ دل پر اثر کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ الجھی گئی تھی۔

"آپ میری اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟" اس نے یہ سوال اس سے دوپہر میں بھی پوچھا تھا لیکن اس وقت اس کے انداز میں دوپہر کی طرح کا غصہ نہیں بلکہ ایک الجھن سی تھی۔ وہ جواباً ہنسا تھا۔

"ہاں! تمہارے اس سوال کا جواب تو مجھے دینا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں جواب دوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ام ایمن! جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں میں ان سے دوستی کر لیتا ہوں۔ ان کا خیال رکھتا ہوں۔ مجھے آؤٹ آف دی وے جا کر بھی ان کی مدد کرنا پڑے تو کرتا ہوں۔ کسی بھی مشکل اور پریشانی میں میں اپنے دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ میرے سب دوست میرے ہم عمر ہیں مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں صرف اپنے ہم عمروں ہی سے دوستی کروں۔ میں ام ایمن سے بھی دوستی کر سکتا ہوں۔" وہ جواباً خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

"تمہیں اگر میں نے اپنی دوست نہیں سمجھا ہوتا تو تم سے کبھی اپنی ممی کے بارے میں کوئی بات نہ کی ہوتی۔ تمہیں یاد ہے اس رات جب تم سوئمنگ پول کے پاس بیٹھی تھیں میں تمہارے پاس آیا تھا میں نے تم سے اپنی ممی کی باتیں کی تھیں جب کہ میں کبھی کسی سے ممی کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ سوائے لی لی، ماریہ اور اپنے انتہائی قریبی دوستوں کے اس لیے کہ ان کے بارے میں بات کرتے وقت میں وہی اٹھارہ سال کا جذباتی سا بچہ بن جاتا ہوں پھر میری آنکھوں میں آنسو بھی آنے لگتے ہیں اور سوائے اپنے قریبی دوستوں کے کسی کے بھی سامنے یوں کمزور پڑنا اور جذباتی ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہیں پہلے روز سے دوست سمجھتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ تم مجھے اسی طرح اچھی لگتی ہو جیسے اپنے سارے دوست اچھے لگتے ہیں۔"

CamScanner

"ہم دوست کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔" اس کی سب باتوں پر یقین کر لینے کے باوجود وہ دوستی والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا احساسِ کمتری ایک مرتبہ پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

"خبردار کوئی فضول بات تم میرے ساتھ ہرگز مت کرنا۔ تم صرف مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں میری دوستی قبول ہے یا نہیں؟" وہ ناراضی سے بولا۔

"ہاں لیکن......"

"ہاں یا نہیں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر دوٹوک انداز میں بولا۔

"ہاں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے "ہاں" نکلا تھا۔

"میں الماس توفیق کا رشتہ دار ہوں یہ بات جاننے کے باوجود بھی؟" اس نے اس کی کہی ایک بات یاد دلائی۔ "ہاں۔" اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا کہ اسے اس شخص پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

"ویسے وہ میری رشتہ دار ہیں نہیں۔" اس کا جواب سنتے ہی اس نے کہا۔ "تمہاری اس بات پر کہ مجھے الماس توفیق کے کسی رشتے دار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا مجھے بہت غصہ آیا تھا۔ کسی دوسرے انسان کی اچھائی یا برائی کا ذمہ دار میں کیوں ٹھہرایا جاؤں اگر میرا کوئی رشتہ دار یا دوست تمہیں ناپسند ہے تو تم اس کی وجہ سے مجھے بھی ناپسند کرنے لگو گی۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہارے ساتھ ان کا جو رشتہ ہے تو اس حوالے سے تم انہیں ناپسند کرنے میں حق بجانب ہو لیکن میں انہیں ان کی بہت سی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں۔ ہماری آپس میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ یہ بات تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری الماس آپی کے ساتھ دوستی پر تمہیں کوئی بدگمانی نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری فیملیز میں شروع سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ہماری کمپنی آج جہاں ہے اس میں توفیق بھائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اسے اس مقام تک پہنچانے کے لیے دن رات محنت کی ہے۔ میں دس گیارہ سالوں سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ جب میں امریکہ سے پڑھ کر آیا تو میرے پاس اعلیٰ تعلیم تھی خود پر بھروسا اور یقین تھا لیکن کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے بزنس کے سب اسرار و رموز توفیق بھائی سے سیکھے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی ذہین انسان ہیں۔" اس نے بہت تفصیل کے ساتھ اسے توفیق کمال اور الماس توفیق کے بارے میں اپنی پسندیدگی کی وجوہات سے آگاہ کیا۔

"آج کے لیے اتنی باتیں کافی ہیں۔ اب تم جا کر کھانا کھاؤ اور کھانے کے بعد سکون سے بیٹھ کر فارم فل کرو۔ میں فارم ڈرائنگ روم میں صوفے پر رکھا ہی چھوڑ آیا تھا۔ کچھ پوچھنا ہو تو فون کر کے پوچھ لینا میں ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک تو جاگتا ہوں۔"

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں آئی اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھونے لگی۔ کئی گھنٹوں تک روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بالکل سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے سر میں ابھی بھی

درد ہو رہا تھا لیکن اب وہ کچھ بھی سوچے بغیر صرف کھانا کھانا چاہتی تھی۔ کسی ملازم سے کہنے کے بجائے وہ خود کچن میں آ گئی۔ اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے اور ایک سینڈوچ بنایا اور کھانے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ زبردستی نہیں بلکہ اپنی خوشی سے کھا رہی ہے۔ کتنے دنوں بعد آج اس نے بھوک لگنے کے احساس کو محسوس کیا تھا۔ ایسا کس طرح ہو گیا تھا؟ زندگی میں جو دکھ تھے وہ کہیں غائب تو نہیں ہو گئے تھے۔ وہ چائے کا کپ خالی کر کے اٹھی تو اس کے قدم خود بخود ڈرائنگ روم کی طرف اٹھنے لگے۔ چند منٹوں بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھی فارم بھر رہی تھی۔

اس کے کانوں میں ایک یقین سے بھری آواز گونج رہی تھی۔ "تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ تم واقعی ان عا کے جیسی غیر معمولی ذہین ہو۔" اس کے ہاتھ تیزی سے فارم بھرنے لگے تھے۔ اس سارے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے حیدر کا موبائل نمبر ملایا۔ دوسری طرف فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"میں نے فارم فل کر لیا ہے۔" اسے ہیلو کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے جلدی سے کہا۔

"بہت جلدی کر لیا تم نے 'شاباش'۔" اس نے جواباً یوں تعریف کی جیسے فارم بھر لینا بھی کوئی مشکل کام تھا۔

"میں نے Order of preference میں اکنامکس کو سب سے پہلے لکھا ہے۔" اس کے پوچھے بغیر اس نے خود بتایا۔

"یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ اصل میں میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہا اس لیے نہیں تھا کہ تم اپنی مرضی سے مضمون کا انتخاب کرو۔"

"میں اب کل ہی فارم سبمٹ کروا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے یہ کہہ کر گویا اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

"تم نے فارم منگوا لیا؟" توفیق کمال کو دو روز بعد ناشتے کی میز پر اس سے یہ بات پوچھنے کا خیال آیا تھا۔

"جی۔" اس نے ان کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ یہ نہیں بتایا کہ میں ڈرائیور کے ساتھ جا کر فارم جمع بھی کروا آئی ہوں۔

توفیق کمال اور الماس دونوں آفس جا چکے تھے جب کہ وہ میز پر ہی بیٹھی حیدر کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو یاد کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آج ہی پی پی سے ملنے چلی جائے اور حیدر کی منتخب کردہ کتابیں لے آئے۔ اپنی اس سوچ کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تھی۔

ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو انہوں نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا۔ وہ آج کتنے دنوں بعد اس گھر میں آئی تھی لیکن یہاں آنے پر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی رہی۔ زیادہ وہی بول رہی تھیں، ایمن انہیں سن رہی تھی۔ انہیں سننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ انہوں نے لنچ کا اس کے لیے خاص اہتمام کروایا ہوا تھا۔ لنچ کے بعد ان کا کوئی فون آ گیا اور وہ فون پر بات کرنے لگیں تو وہ لاؤنج سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اسٹڈی میں آ گئی۔ سامنے کی میز پر اسے پانچ چھ کتابیں بھی نظر آ گئیں۔ Micro Economic اور Macro Economic پر مستند ترین کتابوں کے

وہ بالکل نئے ایڈیشنز تھے۔ کتابیں اٹھا کر وہ واپس لاؤنج میں آ گئی۔ جب تک پی پی فون پر بات کرتی رہیں وہ ایک ایک کر کے ساری کتابیں دیکھتی رہی۔ فون پر گفتگو ختم کر لینے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

❋❋❋

اس کا ارادہ تھا کہ حیدر جیکب آباد سے واپس آ جائے تو وہ اسے کتابوں کے لیے شکریہ کا فون کرے گی لیکن جب پی پی سے مل کر آنے کے پانچویں روز اس نے ان کے گھر پر فون کیا تو پی پی سے پتا چلا کہ وہ فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔

"لیکن وہ تو جیکب آباد گئے ہوئے تھے؟" وہ تھوڑی سی حیران ہوئی تھی۔

"ہاں وہاں سے تو وہ اسی دن واپس آ گیا تھا جب تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اب تو اسے فرینکفرٹ گئے ہوئے بھی دو دن ہو گئے ہیں۔" کچھ دیر پی پی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اسے اب توفیق کمال اور حیدر مسعود کے ہر وقت حالتِ سفر میں رہنے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں اپنے پاسپورٹ بھی ہر وقت اپنے بریف کیس ہی میں رکھتے ہوں گے۔ رات کو وہ حیدر کے یہاں سے لائی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب اس کا فون آیا۔ "گیس کرو میں تمہیں کہاں سے فون کر رہا ہوں؟"

"فرینکفرٹ سے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس کے جواب پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"آپ حیران ہوئے؟"

"نہیں حیران تو نہیں ہوا۔ تمہیں شاید توفیق بھائی سے پتا چلا ہوگا یا پھر پی پی سے لیکن تمہاری اپنے بارے میں معلومات مجھے اچھی لگیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا

"مجھے یہاں آنا تو ہفتہ دس دن بعد تھا لیکن اچانک کچھ ایسے ضروری کام نکل آئے کہ مجھے فوراً ہی آنا پڑ گیا۔ جلدی میں آیا اسی لیے تمہیں فون بھی نہیں کر سکا۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"آپ اتنا زیادہ سفر کرتے ہیں اسے انجوائے کرتے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں بہت زیادہ میں اپنے کام کو انجوائے کرتا ہوں۔ آپ جس بھی پروفیشن میں ہوں جب تک اپنے کام کو انجوائے نہیں کریں گے اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اپنے لیے اس فیلڈ کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں دلچسپی ہو۔" وہ اس کے جواب پر کچھ الجھی تھی۔

"یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ ہمیں کس کام میں دلچسپی ہے؟"

"ارے بابا! تمہیں فی الحال اس بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اکنامکس میں ماسٹرز کرنے کا سوچا ہے اور بالکل ٹھیک سوچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا ایڈمیشن بھی ہو جائے گا۔"

"میں نے تو اکنامکس یونہی لکھ دیا تھا بغیر سوچے سمجھے۔ آپ زبردستی مجھے ذہین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ بی اے میں بالکل اتفاقاً میری اتنی اچھی پوزیشن آ گئی تھی۔"

وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کی اپنے بارے میں رائے بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو پھر اتفاقاً تمہارا ایڈمیشن بھی ہو جائے گا اور اتفاقاً ہی تم اکنامکس میں ایم اے بھی کر لوگی۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم نے بکس دیکھیں؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

"جی ابھی میں وہی پڑھ رہی تھی۔"

"جاؤ پھر تم اسٹڈی کرو۔ میں پانچ چھ روز میں واپس آ جاؤں گا۔" اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

❋❋❋

جس روز داخلہ لسٹ لگنی تھی اس روز وہ بہت پریشان تھی۔ اسے لسٹ دیکھنے کے لیے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ "تم لسٹ دیکھ آئیں۔" شام چار بجے حیدر کا فون آیا تھا۔

"نہیں۔" وہ اس جواب پر کتنا چڑا ہوگا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

"تمہارے بارے میں میرا کوئی اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ مجھے اسی جواب کی امید تھی جو اطلاع تم مجھے دیتیں وہ مجھے تمہیں دینی پڑ رہی ہے۔ ہو گیا ہے تمہارا ایڈمیشن تمہاری ساری منفی سوچوں کے باوجود۔ اب اس وقت مجھے تم پر غصہ اتنا آ رہا ہے اس لیے میں تمہیں مبارک باد بھی نہیں دے رہا۔" وہ اس کے غصے پر دھیان دیے بغیر اس اطلاع پر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"واقعی؟" اسے ذرا سا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"آپ خود گئے تھے یا آپ نے کسی کو بھیجا تھا۔" وہ شاید یہ تصدیق چاہتی تھی کہ لسٹ میں اس کا نام اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

"نہ گیا تھا نہ کسی کو بھیجا تھا۔ میں نے فون پر پتا کروایا ہے۔" وہ اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اتنا معمولی سا کام وہ ایک فون کال کے ذریعے ہی کر سکتا ہے اس کے لیے خود جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"خوش ہو؟"

"جی۔" اس کے پوچھنے پر وہ فوراً بولی۔

"میں نے توفیق بھائی کو بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے بلکہ وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوئے ہیں۔ تم نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ تم نے کس ڈیپارٹمنٹ میں داخلے کے لیے اپلائی کیا ہے؟"

"وہ اس بات پر حیران نہیں ہوئے کہ آپ کو میرے ایڈمیشن کا کیسے پتا چل گیا؟" وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر جلدی سے بولی۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ حیران کیوں ہوں گے؟ انہیں ہماری دوستی کا پتا ہے بلکہ بہت پہلے سے پتا ہے۔ جب تم ہمارے گھر پر رہ رہی تھیں تب ہی امریکہ سے توفیق بھائی کا فون آنے پر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی بیٹی کی بالکل فکر نہ کریں۔ اس کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی ہو چکی ہے اور اپنے دوستوں کا میں خود بہت اچھی طرح خیال رکھتا ہوں۔" وہ اس کی حیرت پر ہنستے ہوئے بولا۔

"لیکن تب تو ہماری دوستی نہیں ہوئی تھی۔"

"تمہاری طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ میری طرف سے ہو گئی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یونہی اخلاقاً تمہیں چائے اور کافی پلا کر چلایا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کے علاوہ اس طرح کی مہربانیاں میں کسی کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

❀ ❀ ❀

حیدر نے اس سے کہا تھا کہ اس کے باپ کو اس کے ایڈمیشن کا سن کر خوشی ہوئی ہے لیکن اسے تو وہ خوش نہیں لگے تھے۔ ان کے چہرے پر وہ رونق خوشی سے ملتا جلتا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کی ہمیشہ کی طرح ان سے کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بس یہ پوچھا۔

"کلاسز کب سے شروع ہو رہی ہیں تمہاری؟" اس نے پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں تاریخ بتا دی۔

کھانے کے بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر ایک کافی بڑی رقم اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"کپڑے بنالینا اور بھی یونیورسٹی جانے کے لیے کوئی چیز خریدنی ہو تو خرید لینا۔"

ان کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اس نے حیدر کی اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ وہ اس کے ایڈمیشن پر خوش ہیں۔

"تمہیں یونیورسٹی میں اپنی ہی طرح کی بہت ساری ڈری، سہمی اور گھبرائی ہوئی لڑکیاں نظر آئیں گی۔ تم ان میں سے کسی بھی ایک گھبرائی ہوئی لڑکی کا انتخاب کر لینا۔ اکیلے گھبرانے اور بوکھلانے کے مقابلے میں کسی دوسرے کے ساتھ مل کر گھبرانا اور بوکھلانا زیادہ بہتر رہے گا۔"

اپنے سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اسے حیدر کی کہی بات یاد آئی۔ رات فون پر اس نے اسے پہلے دن یونیورسٹی جانے کے حوالے سے کافی سارے مشورے دیے تھے۔ اس کی شگفتہ سے انداز میں کی جانے والی یہ بات یاد کر کے اس وقت اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے رات اسی طرح کی بہت ساری اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اس کی ٹینشن کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعض لڑکیاں اسے اپنی ہی طرح نروس نظر آ رہی تھیں اور بعض بہت مطمئن اور پراعتماد۔

جس لڑکی کو وہ اپنے سے کچھ دور کھڑا دیکھ رہی تھی وہ اسے اپنی طرح نروس تو نہیں لگی تھی لیکن وہ اسے کچھ سادہ اور خوش مزاج ضرور لگی تھی اسی لیے وہ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے پاس آ گئی۔

"ہیلو۔" ایمن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ام ایمن ہوں۔" اس نے جواباً ہیلو کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ اس طرح کبھی کسی سے بات چیت کرنے یا دوستی کرنے میں پہل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صرف اور صرف حیدر کے سمجھانے کا اثر تھا۔

"اور میں رامین اخلاق ہوں۔ سینٹ جوزف سے گریجویشن کیا ہے۔ کالج تک ہم پانچ دوستوں کا گروپ تھا۔ دو نے بی اے کرتے ہی بیاہ کروا لیا اور باقی دو دوستوں نے دوسرے ڈپارٹمنٹس میں ایڈمیشن لے لیا۔ یوں اپنے گروپ کے ٹوٹنے کی وجہ سے اس وقت اکیلی کھڑی ہوں۔ سوری کھڑی تھی۔" وہ اس کے تعارف کے دلچسپ انداز پر ہنس پڑی تھی۔

"میرے بابا نے زبردستی مجھے یہاں دھکیلا ہے۔ ورنہ میرا ارادہ انگلش میں ایم اے کرنے کا تھا۔ بابا نے کہا تمہیں لٹریچر وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' تمہاری سہیلیاں وہاں ایڈمیشن لے رہی ہیں اس لیے تم وہاں جانا چاہتی ہو۔" خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باتونی بھی تھی اور ایمن کو اس کا یہ انداز اچھا لگ رہا تھا۔

"میری ایک دوست بھی بن گئی ہے رامین۔ رامین اخلاق نام ہے اس کا۔ اتنی اچھی ہے وہ اتنی مزے کی باتیں کرتی ہے ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آج ہم پہلی مرتبہ ملے ہیں۔" رات کو وہ حیدر کو فون پر اپنے یونیورسٹی کے پہلے دن کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ بہت دلچسپی سے اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

"تمہیں مزا آیا؟ تم نے اپنا یونیورسٹی کا پہلا دن انجوائے کیا؟"

"ہاں بہت زیادہ۔" وہ اس کے استفسار پر سچائی سے بولی۔

"مجھے پڑھائی میں کوئی مشکل ہو تو آپ سے پوچھ سکتی ہوں؟"

"بالکل پوچھ سکتی ہو۔ جس وقت دل چاہے پوچھ سکتی ہو۔" اس کے سوال کا اس نے وہی جواب دیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔

❀ ❀ ❀

اسے یونیورسٹی جاتے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے والا تھا جب اس روز ناشتے کی میز پر توفیق کمال نے اپنے معمول کے جملوں میں ایک جملے کا اضافہ کر کے اس کی پڑھائی کی بابت دریافت کیا۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

"جی ٹھیک جا رہی ہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دے دیا تھا۔ اس ایک مہینے کے دوران اس کی رامین سے کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی کو پوری سنجیدگی کے ساتھ لے رہی تھی۔ رامین بھی پڑھائی کے معاملے میں کافی سنجیدہ تھی۔ وہ دونوں کوئی پیریڈ بنک نہیں کرتی تھیں۔

وہ لیکچر کا کوئی پوائنٹ مس نہیں کرتی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی اس کے پاس دوسری کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی سوائے اس کے کہ وہ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرے اور پھر پڑھنے بیٹھ جائے۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی شام کے بعد کا سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی لیکن اب پہلے کی طرح اس کے پاس بے کار بیٹھے یا کوئی دل دکھانے والی بات یاد کرنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ اور الماس بیٹھی تھیں۔ توفیق کمال ابھی آفس کے لیے نکلے تھے۔ وہ خود بھی جلدی جلدی اپنی چائے ختم کر رہی تھی کہ اسی وقت ممی نے اسے حیدر کے فون کے بارے میں بتایا۔ تین دن سے وہ کراچی میں نہیں تھا اور اس دوران ان کی آپس میں بات نہیں ہوئی تھی۔

"آج تمہارا لاسٹ پیریڈ کب ختم ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ تم یونیورسٹی سے کس وقت فارغ ہو گی؟" اس کے سوال پر حیران ہوتے ہوئے اس نے وقت بتا دیا۔

"ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ بجے میں تمہیں یونیورسٹی سے پک کروں گا۔ ڈرائیور کو منع کر دینا"

"کیوں؟" اس نے اپنی حیرت کا واضح اظہار کیا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری کام ہے۔ وہ میں تمہیں دوپہر میں ہی بتاؤں گا۔" اس کا انداز بڑا پراسرار سا تھا۔ وہ

ابھی اس سے مزید کچھ پوچھ بھی نہیں پائی تھی کہ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ کافی دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ کیا بات ہو سکتی ہے مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یونیورسٹی میں بھی سارا وقت وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ حیدر کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے پھر اسے اپنی اس کام والی سوچ پر ہنسی آنے لگی۔ وہ کب سے اس قابل ہو گئی تھی کہ حیدر مسعود کو اس سے ضروری کام پڑنے لگے۔ البتہ وہ خود ہر کام کے لیے اسی کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق ایک بجے آ گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر ابھی اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر مایوسی سے بولا۔

"تم آج یونیورسٹی کچھ ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں آ سکتی تھیں؟" اس نے چونک کر اپنے لباس کی طرف دیکھا۔ وہ خود لباس کے معاملے میں بہت محتاط رہا کرتی تھی۔

"آپ نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ آپ مجھے بتا دیجیے کہ کہاں جانا ہے تو میں اس لحاظ سے ڈریس اپ ہو جاتی۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"مجھے تو بتانا نہیں تھا۔" وہ بہت تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"یہاں پر کیا کوئی فنکشن ہے؟" ایک ہوٹل کے سامنے اترنے کے لیے کہا تو وہ گاڑی سے اترنے کے بجائے سوالیہ انداز میں بولی۔

"ہاں برتھ ڈے پارٹی ہے۔" وہ مطمئن سے انداز میں کہتا ہوا گاڑی سے اترا۔

"کس کی؟" وہ ناراضی سے بولی۔ اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بن بلائے اسے کسی پارٹی میں لے جائے۔ "نام ایمن جانتی ہو گی تم اسے۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا گفٹ نکال لیا۔

وہ حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی سالگرہ کا دن یاد نہیں تھا لیکن اس نے اس دن کو زندگی میں کبھی کسی خاص انداز میں سیلیبریٹ نہیں کیا تھا۔

بہت دن پہلے شاید اس سے فون پر بات کرتے ہوئے یونہی کوئی ذکر نکلنے پر اس نے اسے اپنی ڈیٹ آف برتھ بتائی تھی لیکن وہ اس سے یہ توقع نہیں رکھتی تھی کہ وہ آج کے دن کو یاد رکھے گا۔ وہ دونوں ہوٹل کے اندر آ گئے تھے۔ اس کی حیرت خوشی میں بدل چکی تھی اور یہ خوشی جس نے دی تھی اس کا شکریہ تو ادا کرنا ہی تھا۔

"شکریہ! آپ نے میری سالگرہ کا دن یاد رکھا اور..."

"اور یہ کہ اگر تم نے بھی میری سالگرہ کا دن یاد رکھا تو میں تمہارا شکریہ کبھی ادا نہیں کروں گا۔ مجھے دوستی میں شکریہ اور سوری سے زیادہ برے الفاظ کوئی نہیں لگتے۔ چلو جلدی سے کاٹو۔" اس نے چھری اور کیک کی طرف اشارہ کیا جو ویٹر لے کر آیا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے ٹین ایج سے نکلنا۔ خوشی ہو رہی ہو گی کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔" ایمن نے کیک کا ایک پیس کاٹ کر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس کی شوخ آواز سنی۔

"ابھی تو اچھا لگ رہا ہے۔ ایک دو سال اور اچھا لگے گا۔ اس کے بعد پھر میری عمر بڑھنا رک جائے گی۔"

اس نے پلیٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ وہ اس کے جواب کو انجوائے کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ وہ دونوں کیک کھا چکے تو تھوڑی ہی دیر میں ویٹر نے کھانا سرو کر دیا تھا۔

"میں نے تمہاری پڑھائی کا حال احوال تو پوچھا ہی نہیں۔" اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پڑھائی بس ٹھیک ہی ہے۔ ایسا ابھی تک کچھ نہیں ہوا جیسی آپ میری تعریفیں کرتے ہیں۔ میرے کسی بھی ٹیچر کو ڈھنگ سے میرا نام بھی یاد نہیں ہے۔ آپ کے علاوہ صرف رامین میری تعریف کرتی ہے بلکہ میری نہیں میرے لیکچرز کو فوٹو کاپی کروا کر اپنے پاس اسٹڈی کرنے کے لیے رکھ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈپارٹمنٹ میں تو کیا کلاس میں بھی کوئی مجھے نہیں جانتا۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ جب میں پڑھائی میں ایسا کوئی غیر معمولی کارنامہ سر انجام نہیں دوں گی جیسی آپ کو امید ہے تو آپ کو کتنا افسوس ہو گا۔" فروٹ یوگرٹ کو انجوائے کرتے ہوئے اس نے تفصیل جواب دیا۔

"تم میرے افسوس کے لیے زیادہ افسوس مت کرو۔ اگر میری اوپینین کوئی غلط ہو گی تو میں تمہارے سامنے بیٹھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

"ایک بات تو بتایئے۔ جس طرح آپ کو میری ذاتی زندگی کی ہر بات پتا ہے اس طرح مجھے آپ کی کوئی بات نہیں معلوم۔" وہ بغیر جھجکے بولی۔

"تم میرے گھر میں رہ چکی ہو پھر بھی یہ بات کہہ رہی ہو۔ تم میری روٹین سے واقف ہو میرے گھر کے افراد سے واقف ہو۔ اس کے علاوہ میری ذاتی زندگی میں ایسا کچھ نہیں جو تم نہ جانتی ہو۔ تمہیں میری شادی کے بارے میں بھی ضرور پتا ہو گا۔ بی بی نے ضرور تم سے اس بارے میں کوئی نہ کوئی ذکر کیا ہو گا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"انہوں نے ایک بار ذکر کیا تھا اور میں اس بات پر حیران ہوتی ہوں کہ آپ نے کبھی اپنی مسز کا ذکر نہیں کیا۔"

"ہماری طلاق... ہو چکی ہے۔" اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

وہ ایسے کسی جواب کی امید نہیں کر رہی تھی۔ اپنے ذہن میں اس بارے میں اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید کسی وجہ سے اس میں اور اس کی بیوی میں لڑائی ہے۔ اسے جواب میں افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تھا یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی اس لیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"تم رک کیوں گئیں۔ کھانا کھاؤ۔" وہ جیسے اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے بہت عجیب سا لگا۔ جب وہ اسے اپنا دوست کہتا ہے تو پھر اسے اس کو ساری بات بتانی چاہیے تھی۔ اس نے تو ایک مختصر سا جملہ بول کر بات ہی ختم کر دی تھی۔ وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی لیکن اب اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی ہو؟"

CamScanner

"آپ نے میری پہلی بات کا گول سا جواب دے دیا ہے جیسے میں کوئی دوسری بات پوچھوں۔" وہ ناراضی سے بولی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"میری شادی میری کزن جمیلہ کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے ہماری آپس میں بہت اچھی دوستی تھی۔ پانچ سال پہلے ہماری شادی ہوئی تھی بدقسمتی سے یہ شادی ایک سال سے زیادہ چل نہیں سکی۔ اب اس شادی کے ختم ہونے میں ہم دونوں میں سے کس کا قصور تھا اس بارے میں میں واقعی کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ جب دو افراد الگ ہوتے ہیں تو ہمیشہ اس علیحدگی کا ذمہ دار دوسرے فرد کو ٹھہراتے ہیں۔ میں تمہیں ساری بات جس طرح بتاؤں گا تو اس میں لازمی خود کو درست اور اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ جبکہ شاید حقیقت یہ نہ ہو۔ اپنے طور پر میں خود کو حق پر سمجھتا ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ غلطی میری ہی ہو۔ میرے لیے سچائی یہ ہے کہ جمیلہ بابر چار سال پہلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل چکی ہے۔

"اب اپنے اس پھولے ہوئے منہ کو ٹھیک کرو اور جلدی سے کھانا ختم کرو۔ مجھے واپس آفس بھی جانا ہے۔" اس کے کہنے پر وہ دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

اس نے دوستی کا ذکر کیا تھا لیکن محبت کا نہیں۔ کیا اسے جمیلہ بابر سے محبت بھی تھی؟ وہ اس سے یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی۔ واپسی میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے تین چار کیسٹس اس کے ہاتھ میں پکڑائے۔

"ان میں سے جو تمہیں پسند ہے وہ لگاؤ۔" وہ ایک کیسٹ منتخب کرکے لگانے لگی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ام ایمن۔" اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا نام بہت خوب صورت ہے مگر تھوڑا سا لمبا ہے۔ اگر میں اسے کچھ مختصر کردوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟" اس نے ایمن کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو سب ہی ایمن کہتے ہیں۔ آپ کے کہنے پر مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔" وہ جواباً حیرت سے بولی۔

"ایمن نہیں ایما۔ مجھے یہ کہنا اچھا لگے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیسا لگا؟"

"اچھا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس نے گاڑی اس کے گھر کے سامنے لا کر روک دی۔

"میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کروں گی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہے۔ میں اس دن کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" گاڑی سے اترنے سے پہلے وہ اس سے بولی۔ وہ جواباً صرف مسکرا دیا۔

⊛ ⊛ ⊛

اس کے پہلے سمسٹر کے ایگزامز شروع ہوگئے تھے۔ اس کی پڑھائی کا دورانیہ پہلے سے بڑھ گیا۔ پڑھتے ہوئے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو وہ بے جھجک حیدر کو فون کرلیا کرتی تھی۔ وہ پہلا پیپر دے کر گھر آئی تو ابھی اس نے صرف اپنا بیگ اور فائل ڈرائنگ ٹیبل پر رکھے تھے کہ حیدر کا فون آگیا۔ وہ اس کے پیپر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ صرف یہ نہیں کہ پیپر اچھا ہوا یا برا۔ اس نے پوری تفصیل سے پیپر میں آنے والے سوالات کے بارے

میں پوچھا۔ پھر صرف اس پہلے پیپر میں ہی نہیں اس نے تمام پیپرز میں اسی طرح فون کرکے پیپر کے بارے میں پوچھا۔

اسے کچھ چیزیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک دماغ سوزی کرنے کے بعد اس نے حیدر کو فون کرنے کا سوچا۔

"ہیلو ایما۔" اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔ "توفیق کمال کے گھر کا نمبر دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت فون کرنے والی شخصیت کون ہے۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" اسے کچھ شور سنائی دے رہا تھا۔

"میں اس وقت ایک ڈنر میں آیا ہوا ہوں۔ اچھا تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔" اسے جواب دیتے ہوئے اس نے اپنے پاس موجود کسی شخص سے "ایکسکیوزمی" میں تھوڑی دیر میں آپ کو جوائن کرتا ہوں۔" کہا وہ شاید اس سے بات کرنے کے لیے کسی الگ جگہ پر آگیا تھا۔

"ہاں اب بولو۔" اس نے چند سیکنڈز بعد اس کی آواز سنی۔

"مجھے آپ سے ایک دو چیزیں پوچھنی تھیں۔ لیکن ابھی تو آپ مصروف ہیں۔ میں بعد میں پوچھ لوں گی۔" وہ اپنا جملہ تیزی سے مکمل کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ وہ جلدی سے بولا

"یہاں پر کھانا شروع ہوچکا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر اور لگے گی پھر میں تمہارے پاس گھر پر ہی آجاتا ہوں۔"

"آپ پلیز میری وجہ سے۔" وہ بے ساختہ بولی لیکن اس نے ناراضی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ابھی ساڑھے دس بجے ہیں میں گیارہ بجے تک آجاتا ہوں۔" وہ بات ختم کرچکا تھا جبکہ وہ اپنی وجہ سے اسے ڈسٹرب کرنے پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنی بک، نیچرنوٹ بک اور فائل لے کر وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے تب وہ آگیا۔

"آپ میری وجہ سے ڈنر چھوڑ کر آئے ہیں نا؟" وہ کچھ شرمندگی سے بولی۔

"دیکھو دیر بہت ہوگئی ہے۔ ادھر ادھر کی فالتو باتوں کے بجائے جلدی سے کام کی بات پوچھو۔" صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے تحکمیہ انداز میں اسے ٹوکا۔ اس نے فوٹو اسٹیٹ ہوئے تین چار ٹائپ شدہ کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔

"ہمیں ہمارے ٹیچرز میں سے ہی یہ سبجیکٹ پڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے آخری کلاس میں یہ پیپرز ساری کلاس میں تقسیم کروائے تھے یہ کہہ کر کہ جو ان پر ہوم ورک کرنا چاہے کرلے اور جو نہ کرنا چاہے تو رہنے دے۔" جتنی دیر وہ سوالات پر نظریں ڈالتا رہا وہ اسے یہ ساری بات بتاتی رہی۔

"تم نے کچھ خود سے حل کرنے کی کوشش کی؟"

اس نے ان صفحوں پر سے نظریں ہٹا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں میں نے یہ سارے کے سارے سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ میں میں اٹک گئی ہوں اور جو پانچ

CamScanner

"پھر میں نے حل کر بھی لیے ہیں تو یہ کیسے کنفرم کروں کہ میں نے ٹھیک کیا ہے۔" ٹیبل پر سے فائل اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے اس نے بتایا اس نے فائل کھول لی تھی۔

"تم نے سارے سوال ٹھیک کیے ہیں۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"آپ نے اتنی جلدی دیکھ بھی لیا۔ صحیح طرح سے دیکھیں۔ شاید میں نے کوئی غلطی کی ہو۔ میری کیلکولیشن چیک کرلیں۔"

"میں نے صحیح طرح سے دیکھا ہے۔ سارے سوال ٹھیک ہیں۔ اب تم وہ پوچھو جو تم سے ہو نہیں پا رہا ہے۔" وہ اس بچگانہ انداز پر مسکراتے ہوئے بولا۔

اسی وقت توفیق کمال بھی آگئے تھے۔

"ان محترمہ کو کچھ چیزیں سمجھنا تھیں۔ میں نے سوچا کہ فون پر اتنی لمبی بات کرنے سے بہتر ہے کہ خود ہی آجاؤں۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایمن کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ابھی لاؤنج میں داخل ہوتے وقت میں نے سنا تھا سپر پوزیشن چارج اور بیک ویلیو کی کچھ بات ہو رہی تھی۔" وہ خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"تم نے حیدر سے چائے کافی کو پوچھا؟" وہ اچانک اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی وہ۔" وہ ان کے سامنے بول کیوں نہیں پاتی۔

اسے خود پر سخت غصہ آیا۔

"پوچھا تھا انہوں نے۔ میں نے منع کر دیا۔ ابھی تو ایک ڈنر سے آرہا ہوں' چائے کافی کسی چیز کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔ تم لوگ اپنی گفتگو جاری رکھو۔" وہ متانت سے کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔

"آپ کو ان سے ڈر نہیں لگتا؟" ان کے جاتے ہی اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈر؟ کیوں بھئی توفیق بھائی کوئی جن بھوت تو نہیں جن سے ڈرا جائے۔ اچھے خاصے ہینڈسم ہیں۔" فائل دوبارہ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ میں شاید ان سے کبھی بھی بات نہیں کر سکتی۔"

"کن سے؟" اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کن سے بھئی؟ نام لے کر بتاؤ کس کی بات کر رہی ہو۔ یہ ان سے ان سے کیا ہوتا ہے۔" اس کی آواز میں اب غصہ اور ناپسندیدگی بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ اس سے نظریں چرا کر یک دم خاموش ہوگئی تھی۔

"تمہاری یہ بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔" اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ناراضی کا واضح اظہار کیا۔

"مجھ سے بولا ہی نہیں جاتا۔ میں نے کبھی ان کے لیے ایسا کوئی لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔"

"نہیں کیا تو اب کرو اور بولا کیوں نہیں جاتا' تم ابھی میرے سامنے بولو۔" وہ ڈپٹنے والے انداز میں بولا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"کیا کہہ رہا ہوں میں تم سے ایمن؟" اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

"میں اب انہیں پاپا بولا کروں گی۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس لفظ کے بولنے سے انہیں کوئی فرق پڑے گا یا یہ کہ میں ان سے قریب ہو جاؤں گی تو یقین کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی گود میں گرے۔

"جاؤ پانی پی کر اور منہ دھو کر آؤ۔" وہ ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ اس کے کہنے پر وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئی پانچ منٹ بعد واپس آئی تو وہ پہلے والے موڈ میں اسے سوالات سمجھانے لگا تھا۔

"بہت جلدی بات سمجھ لیتی ہو تم۔" وہ آدھے گھنٹے میں اس کے دس اٹکے ہوئے سوالات کے حل بتانے کے بعد مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہاری جگہ کوئی عام اسٹوڈنٹ ہوتا تو اتنی مشکل بات اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ تمہارے ساتھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔" صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس نے اس کی تعریف کی تو وہ اس کی تعریف پر قصداً مسکرائی۔

"تمہاری ہنسی جتنی خوب صورت ہے۔ تمہارا رونا اتنا ہی بدصورت ہے' تم روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" اپنا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔

* * *

اسے ایگزامز سے فارغ ہوئے دوسرا دن تھا جب صبح صبح حیدر کا فون آگیا۔

"چھٹیوں میں کیا کر رہی ہو؟" سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔

"ابھی تو امتحان کی تھکن اتار رہی ہوں۔" اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

"تھکن اتارنے کے لیے دو دن کافی ہیں۔ اب جولائی کے آخری میں تمہاری کلاسز شروع ہوں گی۔ اتنے دن گھر پر فارغ رہ کر کیا کروگی۔ IBA والے بزنس کمیونیکیشن کا شارٹ کورس کروا رہے ہیں۔ وہاں ایڈمیشن لے لو۔ آج ہی ڈرائیور کو بھیج کر فارم منگوالو۔" وہ اس کے اس نئے حکم پر شپٹائی تھی۔

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں آپ وہاں سے کورس کر رہی ہیں۔ یہ میرا آپ کو مشورہ نہیں حکم ہے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہتے ہوئے بات ختم کر دی تھی۔

اس نے فارم جمع کروا دیا تو حیدر نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ "تم گھر پر فارغ رہ کر اوٹ پٹانگ باتیں سوچتیں اس لیے میں نے یہ کورس کرنے کو کہا ہے۔ پھر وہاں جانے میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم بہت کچھ سیکھو گی۔"

ہفتے میں تین دن اس کی کلاسز ہوتی تھیں۔ جس روز اس کی پہلی کلاس تھی اس نے ناشتے کی میز پر بہت مشکلوں سے خود میں اتنی ہمت پیدا کی تھی کہ توفیق کمال کو اپنے کورس کے متعلق بتا سکے۔

"ویری گڈ۔" انہوں نے میز پر سے اٹھتے ہوئے سرسری سے انداز میں شاباشی دے دی۔

"اچھی بات ہے۔ گھر پر فارغ رہنے سے کچھ سیکھ لینا اچھا ہے۔" اس مختصری گفتگو کے فوراً بعد وہ ڈائننگ

CamScanner

روم سے نکل گئے تھے۔

اتنے مہینے یونیورسٹی جاتے رہنے سے اس میں تھوڑا بہت اعتماد آ گیا تھا اسی لیے وہ کورس اٹینڈ کرتے ہوئے اتنا نہیں گھبرائی تھی جتنی خود اسے توقع تھی۔ ہاں وہ اس وقت بہت گھبرائی تھی جب پانچویں کلاس میں ان کے ٹیچر نے انہیں پبلک اسپیکنگ سے متعلق تمام اہم نکات سمجھانے کے بعد تمام اسٹوڈنٹس کو اگلی کلاس میں ساری کلاس کے سامنے تقریر کرنے کے لیے کہا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر نروس ہوتی رہی کہ یہ تقریر اس کے بس کی بات نہیں۔

لیکن وہ بولی تھی۔ اپنے اس یقین کے باوجود کہ میں ایک لفظ بھی نہیں بول پاؤں گی وہ بولی تھی۔ اس ایک مہینے کے کورس میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ بہت سے نئے لوگوں سے ملی تھی۔ وہ بزنس رائٹنگ اور اورل کمیونیکیشن کی بہت ساری ٹیکنیکس سے واقف ہوئی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی میں ان لوگوں کے سیکنڈ سمسٹر کی کلاسز شروع ہوئی تو جب تک ان لوگوں کو اپنے دو سبجیکٹس کے مارکس پتا چل چکے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ اس کے، لیلیٰ اور فراز کے نمبروں میں خاص فرق نہیں تھا۔ لیلیٰ اور فراز اس کی کلاس کے دو بہترین اسٹوڈنٹ تھے۔

وہ آفس میں اپنی میز کے آگے بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا جب اس کے موبائل پر ایمن کی کال آئی۔ وہ کال ریسیو کرنے سے پہلے اس کی آواز سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا کیونکہ موبائل پر آنے والا نمبر توفیق کمال کے گھر کا نہیں تھا۔

"کہاں سے فون کر رہی ہو؟" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

"یونیورسٹی سے۔ گھر پہنچنے تک میں صبر کر ہی نہیں سکتی تھی۔" وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے کیوں فون کیا ہے۔ وہ بھی صبح گیارہ بجے اور یونیورسٹی سے؟" وہ اپنی خوشی کسی بھی طرح چھپا نہیں پا رہی تھی۔

"نہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم ہی بتا دو۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر لہجہ مکمل طور پر سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔" خوشی اور ایکسائٹمنٹ کی وجہ سے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"اچھا؟" وہ حیران ہوا۔ "ایسا کیسے ہو گیا۔ میں تو اپنے سارے اندازوں اور پیشن گوئیوں پر شرمندہ ہونے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔" وہ بڑی سنجیدگی سے اسے چھیڑ رہا تھا۔

"دو سبجیکٹس کے مارکس آنے رہ گئے تھے۔ وہ بھی ابھی پتا چلے ہیں اور ان دونوں میں میرے مارکس سب سے زیادہ ہیں۔ دوسری پوزیشن لیلیٰ کی آئی ہے۔ اس کے مجھ سے پانچ نمبر کم ہیں۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ لینے کے باوجود باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔

"کتنی پرسنٹیج بنی تمہاری رٹا لگانے کے بعد اتنا تو پوزیشن لے آنے پر۔" وہ اتنی آسانی سے اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

یونیورسٹی سے گھر آنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھو کر صرف کپڑے ہی بدلے تھے کہ وہ آ گیا۔ اس کے اندر آنے سے پہلے وہ خود بھاگتی ہوئی باہر پورچ میں آ گئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر موجود خوشیوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"چلو کہیں باہر لنچ کر کے اس خوشی کو سیلیبریٹ کرتے ہیں۔" اس کے کہنے پر وہ فوراً گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟ اب یقین آ رہا ہے میری باتوں پر یا ابھی بھی نہیں آ رہا؟" گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ابھی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا۔ کلاس میں بھی سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بعض لڑکے تو میرا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ام ایمن کون سی لڑکی ہے۔" وہ جوش و خروش سے اسے آج یونیورسٹی میں ملنے والے اعزازی سلوک کی تفصیلات سنا رہی تھی۔

"کبھی میرے تعریف کرنے پر ایسے خوش نہیں ہوئیں۔ کوئی دوسرا تعریف کرے تو یقین آ جاتا ہے، میں کروں تو وہ جھوٹی اور دل رکھنے والی تعریف ہوتی ہے۔" اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہارا گفٹ میں بھولا نہیں ہوں۔ کل دوں گا تمہیں گفٹ۔" لنچ کرتے ہوئے اس نے ایمن سے کہا۔ اس نے سوفٹ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ خوشی کی زیادتی نے بھوک پیاس سب اڑا دی تھی۔ وہ لنچ کرتے ہوئے حیدر سے سارا وقت "میں بہت خوش ہوں، مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا۔" کہتی رہی تھی اور وہ اس کی بچکانہ سے انداز میں کہی جانے والی ان باتوں کو انجوائے کرتا رہا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

ہیئر ڈریسر کے ہاتھ بڑی مہارت اور احتیاط کے ساتھ اس کے بالوں کی کٹنگ میں مصروف تھے۔ وہ یونیورسٹی سے آ کر کھانا کھانے کے بعد سونے کا ارادہ رکھتی تھی کہ حیدر کا فون آ گیا۔

"میں تمہیں تمہارا گفٹ دینے آ رہا ہوں۔ میں آفس سے نکل چکا ہوں اس وقت راستے میں ہوں۔" دس منٹ بعد وہ گھر پر موجود تھا۔

"جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔"

"آپ تو گفٹ دینے آئے ہیں؟" وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"وہ گفٹ ایسا ہے کہ چل کر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ تمہیں خود اس کے پاس جانا پڑے گا۔" وہ تجسس سی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس نے گاڑی اس بیوٹی سیلون کے سامنے لا کر روکی اور اس کے چہرے پر چھائی حیرت اور استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"یہ ہے تمہارا گفٹ۔" وہ اپنے والٹ سے پیسے نکالنے لگا۔

"آپ یہ بیوٹی سیلون مجھے گفٹ کر رہے ہیں؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا تھا۔

"جا کر اپنے بالوں کی کٹنگ کرواؤ اور بھی جو کچھ کروا سکتی ہو کرواؤ۔" اس نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے تھے۔

CamScanner

"آپ کیا خیال ہے میں یہ سب کچھ کروالوں۔ تو میں اچانک خوب صورت نظر آنے لگوں گی کیا خوب صورت نظر آنا اتنا ضروری ہے؟ آپ کہتے ہیں میں ذہین ہوں اگر میں واقعی ذہین ہوں تو کیا صرف میرا ذہین ہونا مجھے اچھا ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔" اسے حیدر کی بات بہت بری لگی تھی۔

"خوب صورتی سے متاثر ہونا ہم انسانوں کی فطرت ہے ایبا! ہم خوب صورتی سے متاثر ہوتے ہیں ہمیں خوب صورت چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوتیں۔ تمہیں بارش، تتلیاں، پھول، ہرے بھرے درخت یہ سب اسی لیے اچھے لگتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہوتے ہیں۔ خوب صورت چیزوں ہی کی طرح ہم خوب صورت انسانوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صرف عورتوں ہی کے لیے نہیں میں مردوں کے لیے بھی بات کر رہا ہوں۔ یہ ہر انسان کا حق ہے خود اس کی اپنی ذات پر کہ وہ خود کو اچھی طرح رکھے۔ دیکھو یہ انسانی فطرت ہے اور میں اس بات میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔" وہ اس کی ناراض شکل کو دیکھ کر سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگا تھا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن۔" وہ اپنے انکار کے لیے کچھ مناسب قسم کے الفاظ تلاش کرنے لگی تھی۔

"شاید نہیں میں یقیناً ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اگر مجھ پر بھروسہ ہے تو۔" اس نے بات بھروسے کی کی تھی اور وہ اس شخص سے بڑھ کر کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے پیسے لے لیے تو وہ مطمئن سے انداز میں مسکرایا۔

"میں واپس آفس جا رہا ہوں۔ جس وقت فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا میں تمہیں لینے آ جاؤں گا" اور اب اس وقت اپنے بالوں کی کٹنگ کرواتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی سوچ کے برعکس اور اپنی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام صرف اس کے کہہ دینے پر کرنے کے لیے کیوں تیار ہو جاتی ہے؟ حیدر کو فون کرنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

"یہ میں ہی ہوں؟" اس نے حیرت سے خود کو دیکھا۔

حیدر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے بولا۔

"تم نے خود کو آئینے میں دیکھا؟" اس نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ سر ہلانے والی اس کی مخصوص عادت پر ہنستے ہوئے مزید بولا۔

"کیسی لگیں تم خود کو؟"

"آپ کو کیسی لگی؟" بجائے اس کی بات کا جواب دینے کے اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"ایسی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کل ہی تمہارا کوئی ہینڈسم سا کلاس فیلو تمہیں پرپوز نہ کر دے۔" وہ اس جواب پر بے اختیار مسکرائی تھی۔

"آپ خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بالکل ہوتا ہوں۔" اس نے بغیر جھجکے اعتراف کیا۔

"میں لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں آپ خوبصورت لڑکیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔" وہ اس سوال پر قہقہہ لگا

کر ہنس پڑا تھا۔

"ہوتا ہوں بھئی میں اچھا خاصا حسن پرست ہوں۔"

"پھر آپ کے آفس میں کام کرنے والی سب لڑکیاں بہت خوبصورت ہوں گی۔ خاص طور پر آپ کی سیکرٹری۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کے سوالات کو انجوائے کرتا ہوا مسلسل ہنس رہا تھا۔ "میری سیکرٹری بہت خوبصورت ہے۔ ویسے اسے میں نے نہیں میرے پاپا نے اپائنٹ کیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

❀❀❀

توفیق کمال اور الماس سے اس کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوئی تھی۔ وہ دونوں پچھلے دو دنوں سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ شام کو سات بجے کے قریب ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔ الماس نے اس کی تبدیلی کو فوراً نوٹ کیا تھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو ایمن! کہاں سے کٹنگ کروائی؟" چونکے تو توفیق کمال بھی تھے، لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں تھا۔

اس نے ان کی تعریف پر "شکریہ" کہا۔ الماس کے بارے میں حتمی انداز میں سوچنا اب اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب یہ سوچنے لگی تھی کہ اگر الماس نہ ہوتیں تو کوئی اور ہوتی۔ یہ بات طے تھی کہ توفیق کمال کی زندگی میں زینب بشیر کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

"میرا رزلٹ آ گیا ہے....؟" ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے وہ یہ بات بتا پائی تھی۔

انہوں نے فرائیڈ مشروم کھاتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا.... کب آیا؟"

"کل...."

"ہو گئے سارے پیپر کلیئر؟" ان کے اس سوال نے اس کے سارے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس کے باپ کو اس سے یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ سارے پیپر کلیئر کر لے گی۔ "جی...." اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر پلیٹ پر نظریں جمائے "جی" کہا۔

آگے کوئی بات بتانے کو اب اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"ویری گڈ...." انہوں نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے۔

"اس سمسٹر کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس مختصر گفتگو کے بعد وہ الماس کے ساتھ اپنے بزنس افیئرز ڈسکس کرنے لگے تھے۔

"اگر تم نہیں ہوتے تو میں اپنی خوشیاں اور اپنے آنسو کس کے ساتھ شیئر کرتی۔" اپنے کمرے میں آ کر اس نے حیدر مسعود کے تصور سے کہا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

❀❀❀

بی بی اور الماس ایک ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھیں۔ سات بجے کے قریب اسے رشیدہ سے بی بی کے آنے کے بارے میں پتا چلا تو وہ کیسٹ بند کرتے ان سے ملنے آ گئی۔

"حیدر امریکہ جانے والا ہے۔ ماریہ اور بچوں کے لیے کچھ چیزیں بھیجنا چاہ رہی تھی۔ میں نے سوچا اکیلے شاپنگ سے بہتر ہے الماس کے ساتھ پروگرام بنا لوں۔"

الماس نے بی بی کو کھانے پر روک لیا تھا۔ توفیق کمال کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے

"آپ سیما بھابھی کے فون کا ذکر کر رہی تھیں۔ وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔" الماس کو کھانا کھاتے ہوئے نجانے اپنی اور بی بی کی ادھوری رہ جانے والی کون سی بات یاد آ گئی تھی۔

"میں اس کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ ہم سب کی خیریت ایسے پوچھ رہی تھی جیسے ہمارے بیچ بڑے پیار والے تعلقات ہیں۔ کہنے لگی کہ حیدر اور جمیلہ کا رشتہ ختم ہو جانے سے ہمارے باقی رشتے ختم تو نہیں ہو گئے۔ میں حیدر اور ماریہ کی تائی ہوں' ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ بہت مضبوط اور کبھی ختم نہ ہونے والا۔"

بی بی کی سنجیدگی سے بتائی جانے والی اس بات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ان دونوں کی گفتگو سے زیادہ کھانے میں دلچسپی لے رہی تھی اور اب جمیلہ بابر کے ذکر کے بعد کھانے سے زیادہ اسے ان کی باتوں میں دلچسپی تھی۔ الماس کھانا روک کر بڑے حیرت بھرے انداز میں بی بی کی باتیں سن رہی تھیں۔

"سیما بھابھی کو چار سال گزارنے کے بعد اچانک خونی رشتے کیسے یاد آ گئے؟" ان کا لہجہ طنزیہ سا تھا۔

"جمیلہ کی علیحدگی ہو گئی ہے اپنے دوسرے شوہر سے۔ خود طلاق لی ہے اس نے اس آدمی سے۔ اب تو طلاق ہوئے بھی ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔

میرے پوچھے بغیر سیما خود ہی ساری تفصیلات بتا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ جمیلہ' حیدر سے طلاق لینے پر اب بہت پچھتا رہی ہے۔ حیدر سے الگ ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اسے کتنی شدید محبت کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ لندن سے ہی فون کیا تھا سیما نے۔ کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ جمیلہ کی طرف سے معافیاں' اب حیدر کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ جمیلہ نے خود کو بالکل بدل لیا ہے وغیرہ۔ مختصراً یہ وہ لوگ یہ رشتہ دوبارہ جوڑنا چاہتے ہیں۔" بی بی نے تفصیل سے بتایا۔ الماس بڑی حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کے لیے یقیناً یہ اطلاعات نئی تھیں۔

"آپ نے کیا کہا ان سے؟"

"میں کیا کہتی۔ اب کہنے کو کچھ بچا ہی کہاں ہے۔ کتنے ارمانوں سے ہم جمیلہ کو بیاہ کر لائے تھے۔ اس نے اپنا گھر بسانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں نے تو آخری وقت تک یہی کوشش کی تھی کہ طلاق نہ ہو۔

اپنی بے جا ضد چھوڑ کر اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کرے مگر وہ کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔"

بی بی کے لہجے میں افسردگی کی واضح جھلک تھی۔

"آپ نے حیدر کو بتایا سیما بھابھی کے فون کے بارے میں؟" الماس نے بریانی کی ڈش بی بی کے آگے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تھا..... اس نے نہ کسی حیرت کا اظہار کیا نہ غصے کا۔ میں اسے تفصیل سے سیما کی ساری باتیں بتانے لگی تو اس نے تھوڑی سی بات سننے کے بعد ہی "بی بی میں بور ہو رہا ہوں' پلیز کسی اور ٹاپک پر بات کریں۔" کہہ

کر مجھے چپ کروا دیا۔ میں نے جب اس بات پر غصے کا اظہار کیا کہ وہ میری بات میں دلچسپی کیوں نہیں لے رہا تو پتا چلا کہ اسے یہ سب کچھ کافی پہلے سے معلوم ہے۔

حیدر سے مایوس ہونے کے بعد ہی سیما نے مجھے فون کیا ہے۔"

"بہت رازداری برتنے لگا ہے حیدر۔ ہم میں سے کسی کو خبر کیا بتانا اس نے آپ سے بھی ذکر نہیں کیا۔ چھ سات مہینوں سے اتنی بڑی بات چھپائے بیٹھا ہے۔" الماس نے ان کی بات پر سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

"رازداری ہے یا جو بھی ہے' لیکن مجھے حیدر کی یہ عادت سخت ناپسند ہے۔ اب مجھ سے بھی اگر وہ اپنی باتیں شیئر نہیں کرے گا تو پھر کس سے کرے گا۔ میرے ناراض ہونے پر جھٹ ہنستے ہوئے لاپروائی سے کہنے لگا۔

"آپ کو ذرا ذرا سی بات پر ٹینشن لینے کی عادت ہے۔ جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہماری زندگی سے نکل چکے ہیں ان کے متعلق سوچنا اور پریشان ہونا انتہائی فضول کام ہے۔" پھر میری سرخی دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے جمیلہ اور سیما کی فون کالز کے بارے میں بتایا۔

"حیدر جیسا شاندار مرد جس عورت کو ملے اور وہ اس کی قدر نہ کرے اسے پھر یونہی پچھتانا چاہیے۔ اب اس کے پیچھے آ رہی ہے۔ معافیاں مانگ رہی ہے' تب تو اسے حیدر بہت کمتر دکھنے لگا تھا۔" الماس نے جمیلہ کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار کیا۔

"ویسے حیدر نے اپنی شادی کے بارے میں آخر کیا سوچا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تو بات ہنسی مذاق میں ختم کر دیتا ہے۔ میرے حساب سے اب اسے شادی کر لینی چاہیے۔" انہوں نے بی بی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں۔ مگر وہ میری بات پر دھیان دے تب نا۔ اب پہلی شادی ناکام ہو گئی ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دوبارہ شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ جائے۔ مجھے تو اب ایسا لگنے لگا ہے کہ میں اس کے بچوں کو کھلانے کی حسرت لیے ہی اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

"اللہ نہ کرے' کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بی بی! ابھی آپ کو بہت سال زندہ رہنا ہے۔ اب یہ بندہ اتنا مشکل ہے کہ کوئی عام لڑکی تو اسے متاثر کر ہی نہیں سکتی لیکن آپ فکر مت کریں کہیں نہ کہیں تو ہوگی وہ خاص لڑکی! جو اس کے معیار پر پوری اترے گی۔" الماس نے مسکراتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا تو وہ بھی جواباً مسکرا دیں۔

"ہماری باتیں ایمن کو بور کر رہی ہیں۔ ہم اپنی باتوں میں لگ گئے اور وہ اتنی دیر سے چپ بیٹھی ہے۔" بی بی ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"نہیں میں بور نہیں ہو رہی۔" اس کے ذہن میں خاص لڑکی کا لفظ گردش کر رہا تھا لیکن پھر بھی اخلاقاً مسکرائی تھی۔ بی بی نے اب اس سے باتیں شروع کر دی تھیں۔

❀ ❀ ❀

"تمہاری فرسٹ پوزیشن آئی ہے' تم نے بتایا بھی نہیں۔" انہیں یہ بات کہاں سے پتا چلی ہوگی' وہ جانتی تھی اسی لیے چونکی نہیں تھی۔ الماس نے بھی چونک کر اخبار سے نظریں اٹھائیں۔

CamScanner

"مجھے یاد نہیں رہا۔" شکوے شکایت کرنے والا کوئی حق اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ شرمندہ سے لہجے میں سر جھکا کر وہ یہی جواب دے سکی۔

وہ شاید ابھی اس بارے میں مزید کوئی بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اسی وقت ان کے موبائل پر کال آ گئی۔ یہ کال نہ آتی تو شاید وہ اسے ایک آدھ جملہ عنایت کر دیتے۔ الیاس نے البتہ اسے بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی تھی۔

"بہت مبارک ہو ایمن! اتنی خوشی کی خبر اتنے دنوں سے چھپائے بیٹھی ہو۔" اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے انہیں "تھینک یو" کہا۔

اس کے پاس اب سوچنے اور کرنے کے لیے دوسرے بہت سے کام تھے۔ فرسٹ سمسٹر میں آنے والی پہلی پوزیشن کو اسے برقرار رکھنا تھا۔ اس کے لیے اب وہ پچھلے سمسٹر سے بھی زیادہ محنت کر رہی تھی۔ اس کے لیکچرز اور اس کے نوٹس کی کلاس میں بہت اہمیت ہو گئی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

اس کے تھرڈ سمسٹر کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر نقوی نے ان لوگوں کو اسائنمنٹ دیا تھا۔ امریکہ سے Ph.D کر کے آئے ہوئے اپنے ان پروفیسر کو وہ نئے سمسٹر کے آغاز ہی میں اپنی کارکردگی سے متاثر کرنا چاہتی تھی۔

بعض چیزوں کے بارے میں وہ حیدر سے مدد لینا چاہتی تھی اور اسی لیے اس رات اس نے حیدر کو فون کیا تھا۔ "قصہ مختصر یہ کہ ساری محنت ڈاکٹر صاحب کو متاثر کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ وہ نئے سمسٹر کی ابتدا ہی سے مس ام ایمن کی ذہانت اور قابلیت سے بری طرح امپریس ہو جائیں۔ تمہیں اپنی تعریفیں سننے کا زیادہ شوق نہیں ہوتا جا رہا؟" وہ اسے شرارتی سے لہجے میں چھیڑ رہا تھا۔

"کیا برائی ہے اس میں۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ تعریف سننا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ اب یہ فرمایئے کہ میری خدمات آپ کو کب درکار ہیں۔ کیونکہ اتنی لمبی چوڑی تفصیلات فون پر نہیں ہو سکتیں۔" وہ جواباً گویا ہوا۔

"میں کل شام کو آپ کے گھر آ جاتی ہوں۔"

اس نے جلدی سے کہا۔

"کل تو ناممکن ہے' کل رات آٹھ بجے کی فلائٹ ہے۔ اسلام آباد جا رہا ہوں میں۔"

"اوہ۔" وہ تھوڑی مایوس ہوئی تھی۔ "واپس کب آئیں گے؟"

"شاید ایک ہفتہ لگ جائے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"تب تک اسائنمنٹ جمع کرانے کی ڈیٹ بھی گزر چکی ہوگی۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"تم کل یونیورسٹی سے میرے آفس آ جاؤ۔ ڈیڑھ سے ڈھائی کا لنچ ٹائم ہوگا۔ اس دوران میں اپنا کوئی اپائنٹمنٹ نہیں رکھوں گا۔ ایک گھنٹہ کافی ہے نا تمہارے مسئلے کے لیے؟" اس نے فوراً ہی یہ حل پیش کیا وہ جواب

میں فوراً کچھ نہیں کہہ سکی۔ وہ صرف حیدر مسعود کا آفس تو نہیں تھا۔ وہاں تو فیض کمال اور الیاس توفیق بھی تو ہوں گے۔ وہ آفس جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

"لیکن میں....."

"کوئی لیکن ویکن نہیں' تم کل آفس آ رہی ہو۔ پھر اگر تمہارے اسائنمنٹ اچھا نہیں بنا اور ڈاکٹر نقوی تم سے امپریس نہیں ہوئے تو تم سارا الزام میرے سر ڈال دو گی کہ میں نے مدد نہیں کی تھی اس لیے تم ڈاکٹر صاحب کو متاثر کرنے کے لیے۔ اتنے شاندار موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے مذاق کر رہا تھا۔

"ٹھیک ڈیڑھ بجے پہنچ جانا۔" اس نے فون بند کر دیا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

آفس کے بارے میں اس نے جیسا سوچا تھا' وہ اس سے بھی بڑھ کر شاندار تھا۔ وہ چند لمحوں تک آنکھیں حیرت سے وا کیے ریسپشن لابی میں کھڑی رہی تھی۔ وہاں کی سجاوٹ بہترین تھی۔

اس کی سیکرٹری کمپیوٹر پر کام کرنے میں خاصی مگن تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ نے ہلکا سا شور پیدا کیا تو اس کی سیکرٹری سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

"میں ام ایمن ہوں' مجھے....." اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ خیر مقدمی انداز میں مسکراتے ہوئے فوراً بولی۔

"سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے دائیں سمت اس کی رہنمائی کی۔

"تشریف لایئے محترمہ ویسے آپ تین منٹ لیٹ ہیں۔" وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھا تھا۔

"میں ڈیڑھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب پہنچ گئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا آفس میں آ کر آپ سے ملنا اتنا مشکل کام ہے۔ لفٹ میں جاؤ۔ اس سے پوچھو۔ اس سے معلوم کرو۔" وہ کرسیوں میں سے ایک پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ وہ اس کے جواب پر ہنستا ہوا واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"آج گرمی کتنی ہے؟" وہ اب سکون سے اس آرام دہ آفس میں بیٹھی تو یونیورسٹی میں بھگتنے والی گرمی یاد آ گئی۔ "پیاس لگ رہی ہے؟ کچھ پیو گی؟" اس نے پوچھا

"پلیز' پیاس کے مارے برا حال ہے۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے لیمن ایڈ منگواتا ہوں۔" اس نے واش روم کی طرف اشارہ کیا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

فریش ہونے کے بعد لیمن ایڈ کا ٹھنڈا ٹھار گلاس وہ تین گھونٹ میں ہی خالی کر گئی۔

"اب جلدی سے پوچھنا شروع ہو جاؤ' تمہیں کیا پوچھنا ہے۔" وہ توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ اس نے اپنی فائل کھولی' پین ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ لنچ نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں....." وہ اس کے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

CamScanner

"آج نہیں کریں گے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔
"کروں گا۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہا۔
اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو احساس ہوا کہ وقت کم ہے اور پوچھنا بہت کچھ ہے۔ اس لیے فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر حیدر تو نہیں البتہ وہ ضرور چونکی تھی۔ ملازم ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر آیا تھا۔ ان دونوں پر نظر ڈالے بغیر وہ دوسرے کونے پر رکھے صوفوں کے درمیان میں موجود میز پر کھانا سرو کر رہا تھا۔
"آ جاؤ ایمن! اب باقی جو کچھ بھی پوچھنا ہے وہ کھانا کھاتے ہوئے پوچھ لو۔" اپنی سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی دیر سے پیروں میں سے سینڈلز اتار کر بیٹھی ہوئی تھی۔
اب بھی حیدر کے کہنے پر کرسی سے اٹھی تو سینڈلز پہننے کی زحمت کیے بغیر کارپٹ پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے دوسرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔
"وہ کراچی اسٹاک ایکسچینج سے متعلق ملنے والے اپنے اسائنمنٹ کے بارے میں اس سے سوالات کرنے میں مصروف تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر حیدر اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔
"مسز ولیم کا فون آیا لندن سے؟" توفیق پوچھ رہے تھے۔
وہ توفیق کمال کو دیکھ کر نروس سی ہو گئی تھی۔
ایمن کو یہاں بیٹھا دیکھ کر بالکل نہیں چونکے تھے۔
"ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔ بات ہو گئی ہے میری ان سے۔"
حیدر نے ان کے سوال کا سنجیدگی سے جواب دیا۔
"چلو یہ اچھا ہو گیا اس فون کا مجھے بہت انتظار تھا۔" وہ شاید یہی پوچھنے آئے تھے کیونکہ یہ پوچھتے ہی وہ دروازے کی طرف پلٹے تھے۔
"آپ نے لنچ کر لیا توفیق بھائی؟" حیدر کے پوچھنے پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
"فرصت کہاں ملی۔"
"دس منٹ نکال لیں اپنی مصروفیت میں سے۔ کھانا کھانے میں اس سے زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔" حیدر اصرار کرنے لگا تو اس نے حیرت اور رشک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ توفیق کمال کو لنچ پر روک رہا تھا۔ کیا وہ کسی کو اپنے ساتھ اس بے تکلفی کی اجازت بھی دیتے ہیں؟
"پلیز..... آ جائیے نا....." اس کے اتنے زیادہ اصرار پر انہیں اپنے انکار سے دستبردار ہونا ہی پڑا تھا۔ انہیں کھانے کے لیے بیٹھتا دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔
"ایمن کو اپنے اسائنمنٹ میں کچھ پرابلم تھی۔ میں نے کہا تم آفس ہی آ جاؤ پھر رات کو تو میں ترکی جا رہا ہوں۔" وہ انہیں ان کی بیٹی کی یہاں موجودگی کی وجہ سے آگاہ کر رہا تھا اور بیٹی اپنے خوب لمبے اور کارپٹ کو چھوتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے اپنے ننگے پیروں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے یہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت پر ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس ہلکی سی مسکراہٹ کو انہوں نے فوراً چھپا بھی لیا تھا۔ حیدر نے ایمن کی دوپٹے والی حرکت کو بھی دیکھا تھا اور توفیق کمال کی مسکراہٹ کو بھی۔
"لنچ کے بعد مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ جلدی پوچھو تمہیں کیا پوچھنا تھا۔" اس نے سر جھکا کر بیٹھی ہوئی ایمن سے کہا۔ وہ اب کچھ پوچھتی تو کیا۔ وہ تو کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔
وہ ایمن کو جواب میں خاموش دیکھ کر خود ہی کراچی اسٹاک ایکسچینج کی مجموعی صورت حال پر تبصرہ کرنے لگا۔
اس بارے میں اسائنمنٹ ہی کی وجہ سے اس نے اتنی زیادہ اسٹڈی کی تھی کہ ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۰۲ء کے سالوں کے دوران سارے اعداد و شمار اسے زبانی یاد تھے اور حیدر کے غلط تعداد بتانے پر بے اختیار اس کے منہ سے صحیح جواب نکلا تھا۔
"دیکھیں توفیق بھائی! اس نے پچھلے پانچ سالوں کی کراچی اسٹاک ایکسچینج کی ساری ہسٹری حفظ کر رکھی ہے۔ مجھے آپ کی اس جینئس بیٹی سے ڈر لگتا ہے اس کے رٹے اتنے زبردست ہوتے ہیں' مجال ہے کوئی figure ادھر سے ادھر ہو جائے۔" وہ سر جھکا کر اپنی پلیٹ میں پالک چیز ڈالتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ حیدر مسعود کے کہنے پر آج اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اگر سر اٹھا کر توفیق کمال کی طرف دیکھ لیتی تو اسے اس پل ان کے چہرے پر موجود فخریہ مسکراہٹ نظر آ جاتی۔
"یہ فائل دیکھیں نا۔"
انہوں نے اپنی پلیٹ میز پر رکھ کر فائل حیدر کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ وہ چار سیکنڈز اس پر نظریں دوڑانے کے بعد انہوں نے فائل بند کر کے دوبارہ میز پر رکھ دی۔
"ایمن کی ہینڈ رائٹنگ آپ سے کتنی ملتی ہے۔ آپ نے نوٹ کی یہ بات توفیق بھائی۔" وہ چکن کا باؤل ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
"ہاں' پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اپنا ہی لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔" نوالہ اس کے حلق میں پھنسا تھا۔
حیدر نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔
"یہ کسی کی تعریف بھی کرتے ہیں؟ اور کسی بھی کون ام ایمن....."
وہ اس کی حیرت سے بے نیاز ایک بار پھر اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔
ان کے جانے کے بعد وہ جیسے اس پر برس پڑی۔
"اتنے فضول لگ رہے تھے آپ ان کے سامنے زبردستی میری تعریفیں کرتے ہوئے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے رشتے کے لیے آنے والوں سے لڑکیوں کی مائیں اپنی پھوہڑ اور بدسلیقہ بیٹیوں کی جھوٹی اور بے تکی تعریفیں کرتی ہیں۔"
"تم مثال تو کچھ ڈھنگ کی دے دیا کرو۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
⊛⊛⊛

CamScanner

سائرہ توفیق چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔

الماس نے کئی دن پہلے سے بیٹے کے آنے کی خوشی منانی شروع کر دی تھی۔ وہ پچھلے دو دنوں سے نہ آفس گئی تھیں اور نہ کہیں اور توفیق کمال سے بھی وہ بزنس یا کسی اور بات کے بجائے صرف اپنے بیٹے ہی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

اس نے نوٹ کیا کہ توفیق کمال بظاہر بیٹے کی آمد پر کسی خوشی یا جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے لیکن درحقیقت وہ بھی اس کی آمد پر کافی خوش تھے۔ ان کی بیٹے سے والہانہ محبت اس بات سے ظاہر ہو رہی تھی کہ آج انہوں نے اپنا ایک اہم بزنس ڈنر بیٹے کی آمد کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیٹے کو ایئرپورٹ لینے خود جا رہے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹی تو اسے رونا آنے لگا۔ وہ کچھ بھی کر لے کبھی اس لڑکے کی برابری نہیں کر سکے گی۔

صبح توفیق کمال معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر موجود تھے جب کہ الماس اور سائرہ موجود نہیں تھے۔

یونیورسٹی سے دو بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ سٹنگ روم سے گزرتے ہوئے اسے ڈائننگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً کھانا کھایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ ابھی الماری سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔" وہ یہ سمجھ کر کہ رشیدہ ہو گی بے نیازی سے بولی۔

"السلام علیکم۔" وہ اس آواز پر بے اختیار چونک کر مڑی۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟" وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ توفیق کمال کی جوانی کا مجسم روپ۔

"آ جایئے۔" وہ خشک سے انداز میں بولی۔ ایک رسمی سی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر نہیں آ پائی تھی۔

"میں سائرہ ہوں۔" اس کے چہرے پر بے تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔

"اور آپ ام ایمن۔" وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔ بارہ بجے میں سو کر اٹھا تو پتا چلا آپ یونیورسٹی گئی ہوئی ہیں۔ اب بڑی زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ آپ آ جائیں پھر ساتھ کھانا کھائیں گے۔ مما کو بھی میں نے بھوکا بٹھایا ہوا ہے۔"

وہ اس بے تکلفانہ اور اپنائیت بھرے انداز سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھی۔

"آئی ایم سوری میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکوں گی۔ مجھے ابھی نہانا ہے اور ویسے بھی میں نے یونیورسٹی میں سینڈوچ کھا لیے تھے اس لیے اب کھانا شاید ہی کھاؤں۔" وہ رکھائی سے کہہ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک نظر مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی نظر آ رہا تھا۔

وہ سر جھٹکتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

وہ رات تک اپنے کمرے میں ہی رہی حالانکہ اب وہ پہلے کی طرح سارا وقت کمرے میں نہیں رہا کرتی تھی۔ رات کو کھانے کے لیے وہ ٹیبل پر آئی تو توفیق کمال بیٹے سے اس کی پڑھائی سے متعلق گفتگو کرتے

نظر آئے۔ وہ ان کے سوالات کے بہت محتاط ہو کر اور بڑی سنجیدگی سے جواب دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ ان سے تھوڑا سا خائف بھی نظر آ رہا تھا۔

الماس باپ اور بیٹے کی اس گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ سب سے پہلے میز پر سے توفیق کمال اٹھے تھے۔

ان کے ڈائننگ روم سے نکلتے ہی سائرہ نے گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر ایک دم پرسکون سا ہو گیا تھا۔

"آپ کو ہمارے کلف لگے پاپا سے ڈر لگتا ہے ایمن؟" وہ اب سکون سے بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔

"سائرہ۔" الماس نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا۔

"کیا مما! میں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو آپ پر اور حیدر بھائی پر رشک آتا ہے جو ان سے اتنی بے تکلفی سے بات کر لیتے ہیں۔" اس کے انداز میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

"پاپا نے کبھی مجھے نہیں ڈانٹا ان کا صرف گھور کر دیکھنا ہی میرے لیے کافی ہوتا ہے۔ پتا ایمن! جب وہ اپنی براؤن کلر کی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید بڑا کرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھتے ہیں تو میرا دل تیز تیز دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں حالانکہ میں اور کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ آپ کہیں پر بھی مجھے کھڑا کر دیں۔" وہ بڑے مزے سے کھانا کھاتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔ الماس بیٹے کے اس بچکانہ سے انداز پر مبہم سا مسکرائی تھیں۔

"آپ اکنامکس میں ماسٹرز کر رہی ہیں نا؟" وہ اس کی وہ پھیکی بے گانگی کو دیکھ لینے کے باوجود بھی اس کے ساتھ باتیں کرنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواباً صرف سر ہلایا تھا۔

"سنا ہے فرسٹ پوزیشن لانے کے سلسلے میں آپ نے خاصا اچھا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ آپ کا ایم اے کا آخری سمسٹر ہے اور پچھلے تینوں سمسٹرز میں آپ نے اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔" پتا نہیں اسے توفیق کمال نے یہ بات بتائی تھی یا الماس نے۔ تکلفاً تھوڑا سا مسکراتے ہوئے اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ کھانا ختم کر چکی تھی اس لیے اپنی پلیٹ ہٹاتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

توفیق کمال اب اس سے اس کی پڑھائی کے متعلق پہلے سے زیادہ گفتگو کرنے لگے تھے اور یہ تبدیلی ان میں اس روز سے آئی تھی جب انہوں نے حیدر کے آفس میں اس کا اسائنمنٹ دیکھا تھا۔ وہ اب اس کے رزلٹ سے متعلق خود پوچھتے تھے۔ انہوں نے براہ راست اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ وہ کسی حد تک اپنے باپ کو اپنی ذہانت سے متاثر کرنے میں ضرور کامیاب ہو چکی ہے۔ ماسٹرز کرنے کے بعد اس کا آئی بی اے کے ایوننگ پروگرام میں ایم بی اے کرنے کا ارادہ تھا۔ اپنے اس ارادے کو اس نے حیدر کے ساتھ ڈسکس کیا تو اس نے اسے بہت سراہا تھا۔ اسے اب اپنے بارے میں یہ یقین تھا کہ وہ IBA کا aptitude test بڑی آسانی سے کلیئر کر سکتی ہے نہ صرف ٹیسٹ کلیئر کر سکتی ہے بلکہ وہاں سے نہایت شاندار طریقے سے ایم بی اے بھی کر سکتی ہے۔

⊛ ⊛ ⊛

CS CamScanner

اگلے روز وہ یونیورسٹی سے آئی تو سائز سٹنگ روم میں کھڑا نظر آیا۔

"میں آپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مما کو آفس میں کچھ ضروری کام تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آفس چلی گئی ہیں۔ اکیلے کھانا کھانے کا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز آپ کل کی طرح یہ مت کہیے گا کہ یونیورسٹی میں سینڈوچ کھا لیے تھے اس لیے کھانا نہیں کھائیں گی اور اگر کھا بھی لیے ہیں تو بھی میری خاطر ڈائننگ ٹیبل پر آ جائیں۔" اس کا اس لڑکے سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جو وہ اس کی خاطر کوئی کام کرتی۔ پتا نہیں اسے ایمن کے چہرے پر موجود بے گانگی اور اجنبیت نظر کیوں نہیں آئی تھی۔

"سائز آپ۔" اس نے اپنے اندر کی کڑواہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے تاثر سا لہجہ اپنانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اٹھا۔

"آپ؟ آپ مجھے آپ کہہ رہی ہیں۔ آپ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہیں۔ میں تو احترام میں آپ جناب کر رہا ہوں آپ مجھے کس خوشی میں آپ کہہ رہی ہیں۔" وہ اس ڈھیٹ لڑکے سے بری طرح چڑ رہی تھی۔ اب یہ لڑکا کیوں بلاوجہ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ وہ کسی بداخلاقی یا بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے کچھ سوچ کر ہاتھ منہ دھو کر اس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔

"اس گھر میں یہ قدر ہے میری' کسی کو میری کچھ پروا ہی نہیں ہے حالانکہ صرف تین دنوں کے لیے میں کراچی آیا ہوں پھر بھی نہ پاپا نہ مما اور نہ ہی آپ' میری خاطر چار دن چھٹی کرنے کو تیار ہیں۔" کھانا کھاتے ہوئے وہ دکھ بھری شکل بنا کر اس سے بولا۔ وہ اس بات پر کیا کہتی سو خاموشی سے ایک نظر اس پر ڈال کر کھانا کھاتی رہی۔

"حیدر بھائی نے تو بتایا تھا کہ آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں مگر میں تو جب سے آیا ہوں آپ کو خاموش ہی دیکھ رہا ہوں۔" حیدر کے ذکر پر اس نے چونک کر سائز کو دیکھا۔ وہ اس کے چونکنے پر مسکرایا۔

"حیدر بھائی بوسٹن آئے تھے۔ تب انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کی تھیں۔ مجھے پتا ہے آپ دونوں کی بہت اچھی دوستی ہے۔ انہوں نے آپ کی بہت تعریفیں کی تھیں مجھ سے۔ وہ آپ کو ایما کہتے ہیں مجھے یہ بھی پتا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری بہن صاحبہ بہت آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں تو ملنے سے پہلے ہی آپ سے امپریس ہو گیا تھا کیونکہ حیدر بھائی یونہی کسی کی تعریف نہیں کرتے۔" وہ بڑی سادگی سے اسے حیدر کی ساری باتیں بتا رہا تھا۔

"آپ کی اتنی زیادہ تعریفیں سننے کے بعد میرا آپ سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں آپ نے کبھی کسی بہن یا بھائی کی کمی محسوس کی ہے یا نہیں۔ میں نے تو بہت کی ہے۔ پاپا کی اپنی بزنس کی مصروفیات ہوتی تھیں اور مما سے انڈر اسٹینڈنگ کے باوجود میں بہت سی باتیں ان سے نہیں کر پاتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میرا کوئی بھائی یا بہن ہوتا تو مجھے گھر میں تنہائی کا احساس تو نہ ہوتا۔ میں نے ماریہ کو دیکھا ہے وہ حیدر بھائی سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میری بھی کوئی بہن ہوتی تو وہ بھی مجھ سے یونہی پیار کرتی۔" توفیق کمال کا بیٹا' ان کا ولی عہد محبت اور پیار کی باتیں کر رہا تھا۔ اسے بے تحاشا حیرت ہوئی۔ وہ اس بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر

موضوع تبدیل کر کے اس سے اس کی پڑھائی سے متعلق رسمی سے انداز میں گفتگو کرنے لگی تھی۔ وہ اس کے موضوع تبدیل کر دینے پر کچھ مایوس سا نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ اس سے اپنی بے تکلفی کے جواب میں ایسی ہی بے تکلفی کی امید رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اس سے معذرت کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ آنے والے دنوں میں بھی سائز کا اس کے ساتھ یہی انداز رہا تھا۔ اس کے دن کا بیشتر وقت اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے ملانے میں گزر رہا تھا لیکن جس وقت بھی وہ گھر پر ہوتا تو ایمان کے بعد اس کی توجہ کا مرکز وہی ہوا کرتی تھی۔ وہ رات کو اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہی ہوتی وہ دروازہ تھپتھپا کے اندر آ جاتا۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ جاتا۔ اندر آ جانے کے بعد وہ ڈسٹرب ہونے والی بات پر بھلا کیا کہتی۔ پھر کافی دیر تک بیٹھ کر وہ اس کا سر کھاتا رہتا۔ وہ ہر ممکن حد تک اپنی کوشش یہی رکھتی تھی کہ بظاہر کسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیے بغیر اس سے فاصلہ برقرار رکھے۔

ان آٹھ دس دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سائز ایک سادہ اور مخلص سا لڑکا تھا۔ اس میں معصومیت تھی ابھی تک اس کا بچپن مکمل طور پر رخصت نہیں ہوا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ امریکہ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے گیا ہوا ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود وہ فاصلہ ہی رکھنا چاہتی تھی۔

آج اس کی یونیورسٹی کی چھٹی تھی اسی لیے وہ تھوڑا دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ توفیق کمال اور ایمان آفس جا چکے تھے اور سائز شاید گھر پر ہی تھا۔ وہ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر ابھی کچھ پڑھنے کا موڈ بنا ہی رہی تھی کہ رشیدہ بھاگی ہوئی اس کے کمرے میں آئی۔

"سائز بابا کو پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اپنے کمرے میں کارپٹ پر بے ہوش پڑے ہیں۔" رائٹنگ ٹیبل سے کتاب اٹھاتے اس کے ہاتھ بے ساختہ رک گئے تھے۔ رشیدہ سے مزید کچھ پوچھے بغیر وہ تیزی سے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

"ابھی دس پندرہ منٹ پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑے تھے۔ میں کمرے میں ناشتے کا پوچھنے گئی تو کہنے لگے کہ میں نہانے جا رہا ہوں۔ دس منٹ بعد ناشتہ کمرے ہی میں لے آنا۔ اس وقت تو طبیعت بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ مجھ سے انہوں نے بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ آفس چلی گئیں۔ پھر آپ کا بھی پوچھا تھا۔" رشیدہ اسے یہ ساری باتیں ہانپتے کانپتے بتاتی رہی تھی۔

اندر آتے ہی وہ سائز کو کارپٹ پر اوندھے منہ گرا دیکھ کر بری طرح ڈر گئی۔ تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھی اور کارپٹ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

"سائز اٹھو۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔" اس کے لمبے چوڑے وجود کو وہ بڑی مشکلوں سے سیدھا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

"سائز آنکھیں کھولو۔" وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی مگر اس کے بے حس و حرکت وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گیلے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ باتھ روم سے نہا کر نکلتے ہی اسے چکر آیا تھا یا پتا نہیں کیا ہوا تھا۔

"پانی لاؤ۔" اس نے رشیدہ سے کہا۔ وہ فوراً گلاس میں پانی لے آئی تھی۔

"سائرہ اٹھو۔" اس کا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالتے ہوئے اس کے کندھے اور چہرے کو زور زور سے ہلا کر اسے آوازیں بھی دے رہی تھی مگر وہ بے خبر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

"ڈاکٹر کو فون کرو بلکہ تم مت کرو زین محمد سے کہو۔ جلدی سے فوراً جاؤ۔" اس نے چلاتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔ وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔

"سائرہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ پلیز آنکھیں کھولو۔" اسے اس حالت میں دیکھ کر اسے رونا آنے لگا تھا۔

"سائرہ!"

"جی۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔ وہ بری طرح چونکی تھی۔

"سائرہ تم ٹھیک ہو؟" روہانسے لہجے میں اس نے بے یقینی سے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔" مسکراتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک پل کو اس نے حیرت سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور پھر اگلے پل اس کا غصے سے برا حال تھا۔ ابھی وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ زین محمد اور رشیدہ ایک ساتھ کمرے میں آئی۔

"ممی نے فون کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک میں آ رہا ہوں اس وقت تک ......" زین محمد سائرہ کو آنکھیں کھول کر لیٹا ہوا دیکھ کر یک دم خاموش ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب کو ایک کال اور کر دیجیے زین محمد! ان سے کہیے کہ مریض اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رشیدہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے سائرہ کو دیکھ رہی تھی جب کہ زین محمد کی سمجھ میں شاید ساری بات آ گئی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے مسکراتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"تم بھی جاؤ بلکہ میرے لیے ناشتہ لاؤ۔" اس نے اپنے ماتھے پر بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔ رشیدہ کے نکلتے ہی وہ بھی ایک جھٹکے سے کارپٹ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کارپٹ پر بیٹھا کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟ پہلی دفعہ میرے کمرے میں آئی ہیں تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔" اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ اس نے سر گھما کر ایک نظر سائرہ کو دیکھا۔ وہ چہرے پر شریر سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا غصے سے دماغ کھول رہا تھا مگر وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اب آپ کتنا بھی غصہ دکھا لیں تھوڑی دیر پہلے آپ یہ بات مجھے بتا چکی ہیں کہ آپ میری پروا کرتی ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو آپ کو فرق پڑے گا۔" وہ تیزی سے اٹھا اور اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکلنے سے روک لیا۔ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگایا۔

"اب اگر آپ جیسی دبلی پتلی نازک سی لڑکی مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہو جائے تو میرے لیے تو ڈوب مرنے ہی کا مقام ہو گا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"دیکھیں! میں مانتا ہوں یہ مذاق تھوڑا سا بے ہودہ تھا مگر میں کیا کرتا۔ میرے واپس جانے میں صرف دس دن رہ گئے ہیں اور آپ مجھے خود سے قریب ہی نہیں ہونے دے رہی تھیں۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

"میں حیدر بھائی سے سخت جیلس ہو رہا تھا۔ میری بہن مجھ سے آپ آپ کر کے رسمی انداز میں بات کرتی ہے اور حیدر بھائی سے اس کی دوستی ہے۔ یہ کوئی انصاف ہے۔ بہن میری، دوست حیدر بھائی کی! میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا تھا ایمن! یقین کریں میں بہت اچھا لڑکا ہوں۔ لڑکیاں مجھے بہت پسند کرتی ہیں۔ کچھ کو میں بہت ہینڈسم اور چارمنگ بھی لگتا ہوں۔ آپ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہیں جو مجھ سے ذرا سا بھی متاثر نہیں ہوئیں۔" باوجود غصے کے وہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر اس نے طمانیت بھری سانس لی تھی۔

"دوستی کرنے کے لیے یہ ایکٹنگ کرنی ضروری تھی؟" اس نے ناراضی سے اسے گھورا۔

"مجھے اور کوئی طریقہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رات ہی یہ بات میرے ذہن میں آئی اور صبح ہی مجھے موقع بھی مل گیا۔ دراصل میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ آپ جتنی لاتعلق نظر آتی ہیں حقیقت میں ایسی ہیں یا نہیں اور مجھے جواب مل گیا کہ آپ ایسی نہیں ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

"ہماری مائیں الگ ہیں مگر ہمارے پاپا تو ایک ہیں۔ ہم پاپا کو شیئر کرتے ہیں ایمن! پاپا سے جو رشتہ آپ کا ہے وہی میرا بھی تو ہے۔ آپ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ آپ کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا تو کہیں بھی کوئی قصور نہیں۔

میں آپ کی سب تکلیفوں کے لیے دکھ محسوس کرتا ہوں ایمن! پچھلی دفعہ جب ممّا پاپا کے امریکہ آنے پر میں نے آپ کا ذکر سنا تو میں بہت حیران ہوا تھا کہ اچانک میری بہن کہاں سے نکل آئی۔ ممّا پاپا نے مجھے یہ بات کبھی نہیں بتائی تھی۔ شروع میں جب میں نے آپ کے بارے میں سنا تو مجھے یہ بات بہت بری لگی تھی۔ کہیں سے کوئی لڑکی اچانک نکل آئی میرے پاپا کو میرے ساتھ شیئر کرنے کے لیے۔ پھر جب حیدر بھائی بوسٹن آئے اور انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں باتیں کیں تو مجھے پتا چلا کہ آپ کے ساتھ کتنی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ بچپن میں پاپا کی چاہت اور توجہ مجھے ملی اس پر آپ کا بھی حق تھا لیکن ایمن! اتنا تو آپ بھی مانیں گی کہ آپ کے ساتھ جو کچھ بھی غلط ہوا اس کے لیے میں ہرگز قصوروار نہیں۔" وہ اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا اس میں سائرہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اپنے نصیب کی محرومیوں کا شکوہ اس سے نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ کو میری ایکٹنگ کیسی لگی؟ یہ بات تو آپ مانیں گی کہ میں بہت زبردست ایکٹر ہوں۔ میں اپنے اسکول میں ڈراموں میں حصہ لیتا تھا تو ہمیشہ بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ مجھے ہی ملتا تھا۔" وہ اس کی شرارت بھری فخریہ مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تمہاری ایکٹنگ بہت اچھی تھی۔ خوب اچھی طرح تم نے مجھے الو بنایا ہے۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ شک نہیں ہوا کہ تم ایکٹنگ کر رہے ہو۔" اسی وقت رشیدہ دروازہ ناک کرتے ہوئے ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تھی۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں بیٹھیں ناں۔" وہ اسے اٹھتا دیکھ کر بولا۔

"تم ناشتہ کرو مجھے اپنے نوٹس بنانے ہیں۔"

"پتا ہے مجھے آپ بہت پڑھاکو ہیں۔ دس دن بعد میں چلا جاؤں گا تو خوب دل بھر کر پڑھائیاں کر لیجیے گا۔ یہ تھوڑے سے دن اگر آپ مجھے کمپنی دے دیں تو آپ کی پڑھائی کا اتنا زیادہ حرج بھی نہیں ہوگا۔" وہ شکوہ کرنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا تو وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"آج رات چلیں گی ناں آپ حیدر بھائی کے گھر پر۔ بی بی نے آج ہم لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ ویسے اس دعوت کا مہمان خصوصی میں ہوں۔" وہ آملیٹ کھاتے ہوئے اس سے بولا۔ وہ اس ڈنر کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی۔ کل اس کے سامنے ہی الماس نے توفیق کمال کو بی بی کے فون کے بارے میں بتایا تھا۔ "بی بی نے کہا ہے کہ ایمن بھی ضرور آئے۔" الماس نے اسے بی بی کی اس سے متعلق کہی جانے والی بات بتائی تھی۔ اگر بی بی نے الگ سے اس کا نام نہ بھی لیا ہوتا تب بھی وہ ان کے گھر ضرور جاتی۔ وہاں کے مکینوں کے لیے اسے الگ سے بطور خاص کسی دعوت نامے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

٭٭٭

"حیدر بھائی! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ آہستہ آہستہ پاپا جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔ اتنی دیر سے آپ مسلسل میری یونیورسٹی، پروفیسرز اور پڑھائی سے متعلق باتیں کیے جا رہے ہیں۔" ڈنر کے بعد بی بی، توفیق کمال اور الماس لاؤنج میں بیٹھ کر کافی پینے لگے تھے جب کہ یہ تینوں سائر کی فرمائش پر لان میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ بہت ہنگامہ پرور اور ہلے گلے کا شوقین تھا۔ سنجیدہ گفتگو زیادہ دیر تک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حیدر اس کے شکوے پر کافی کا سپ لیتے ہوئے مسکرایا۔

"ایک تو مجھے آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے اور آپ نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کروائی۔ میں نے آتے ہی اگلے دن فون کیا تو پتا چلا کہ جناب کسی سیمینار یا کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گئے ہوئے ہیں اور آج جب اتنے دنوں بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے تو بالکل پاپا والی ٹون میں میری اسٹڈیز کا حال احوال دریافت کر رہے ہیں۔" وہ کافی پیتے ہوئے خاموشی سے سائر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آ رہی تھی کہ اپنے باپ سے متعلق صرف وہی حیدر مسعود سے گلے شکوے نہیں کرتی۔ سائر بھی یقیناً اس سے اپنے دکھڑے رو لیتا ہے۔

"کل سنڈے ہے اور میں بالکل فارغ بھی ہوں۔ کل کا سارا دن میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"پکنک پر چلتے ہیں حیدر بھائی! میں، آپ اور ایمن بس ہم تینوں۔"

"لگتا ہے بھائی بہن میں بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے؟" اس نے یہ بات ان لوگوں کے یہاں آتے ہی نوٹ کر لی تھی مگر بولا کچھ نہیں تھا۔ سائر اس کی بات سن کر ایمن پر ایک شرارت بھری نگاہ ڈال کر مسکرایا۔

"ایسے ہی دوستی نہیں ہو گئی۔ اس کے لیے مجھے کافی محنت کرنی پڑی ہے۔" وہ اس کے احتجاج کے باوجود

ہنس ہنس کر حیدر کو صبح کی ساری بات بتا رہا تھا۔

"ان کی شکل دیکھنے والی تھی حیدر بھائی!"

"سائر! اٹھو میرے بھیا میرے چندا۔"

"جی نہیں میرے بھیا اور میرے چندا میں نے نہیں کہا تھا۔" وہ اس جھوٹ پر احتجاجاً چلائی تھی۔

"اب تھوڑا بہت تو اپنی طرف سے اضافہ کروں گا ناں۔" حیدر اور سائر اس واقعہ کا مزہ لیتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے چند سیکنڈز بعد وہ بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئی تھی۔

وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو سائر لاؤنج میں بالکل تیار بیٹھا نظر آیا۔ وہ لوگ کافی صبح گھر سے نکل رہے تھے۔ حیدر کے ساتھ ان لوگوں کا یہ پروگرام طے ہوا تھا کہ وہ لوگ ناشتہ بھی ساحل پر پہنچ کر کریں گے ٹھیک سات بجے حیدر کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ کسی ملازم کے آ کر اطلاع دینے سے پہلے ہی وہ دونوں باہر نکل آئے۔ لان میں توفیق کمال واک کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہ دونوں گیٹ سے باہر نکل آئے۔ حیدر گاڑی میں بیٹھا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ آگے بیٹھ جائیں۔ اب بڑی بہن کا کچھ تو احترام کرنا پڑے گا۔"

"ایک منٹ رکو۔" حیدر کے کہنے پر وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے پاس آیا اور گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں پکڑا کر بولا۔

"تم ڈرائیو کرو ذرا میں دیکھوں تو سہی تمہاری ڈرائیونگ کیسی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی۔ حیدر ہی کے کہنے پر اس نے تین چار مہینے پہلے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔

"ہم کب پہنچیں گے حیدر بھائی؟ مجھے تو بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھوک کا شور مچا رہا تھا۔

"دیکھو تمہاری بہن صاحبہ آج ہی کی تاریخ میں ہمیں پہنچا دیں تو۔" وہ اس کی ضرورت سے زیادہ محتاط ڈرائیونگ پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے کار ریسنگ میں حصہ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ فاسٹ ڈرائیونگ کرنی ہے تو آپ دونوں میں سے کوئی کیوں نہیں گاڑی چلا لیتا۔" اس نے گاڑی سڑک کے کنارے پر روک دی تھی۔

"دیکھا تم نے اپیا کو ناراض کر دیا ناں سائر۔"

"سائر نے نہیں آپ نے۔" اس نے تصحیح کی۔ "آپ دونوں کے جھگڑے میں گاڑی جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے بھی گئی۔"

"بیٹھیے آپ ایمن! اسٹیئرنگ میرے حوالے کیجیے۔ آپ لوگوں کو آدھے گھنٹے میں منزل پر پہنچا دوں تو میرا نام سائر توفیق نہیں۔" سائر کے جوشیلے انداز کو سننے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر پیچھے بیٹھ گئی۔

"ہم کب پہنچیں گے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" کہہ کر سائر کو مزید جوش دلا رہی تھی۔

CamScanner

ناشتہ ان لوگوں نے بہت ہلکا پھلکا کیا تھا۔ چیز سینڈوچز' فروٹ کیک اور چائے۔ ان لوگوں کا باربی کیو کا ارادہ تھا اس لیے ناشتے کے لیے زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔

ناشتے کے بعد سائرہ نے لباس تبدیل کر کے شارٹس اور ٹی شرٹ پہن لی تھی۔ وہ باقاعدہ سوئمنگ کے موڈ میں تھا جب کہ حیدر نے صرف اپنی جینز کو تھوڑا سا موڑ لیا تھا۔ سائرہ سوئمنگ کرتا ہوا کافی آگے چلا گیا تھا وہ دونوں پانی میں اس حد تک آگے آئے تھے کہ بس ان کے پیر ٹخنوں تک پانی میں بھیگ رہے تھے۔

"تمہیں سائرہ کیسا لگا ایمن؟"

"بہت اچھا' جیسا میرے ذہن میں تھا۔ وہ اس سے بہت مختلف ہے۔" اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوری سچائی سے جواب دیا۔

"آپ اس سے میری خوب تعریفیں کر کے آئے تھے نا؟" وہ اس سوال پر ہنسا۔

"اب خدا کے لیے تم کوئی بے تکی مثال مت دینا۔ کسی سے تمہاری تعریف کروں تو تم ناراض ہو کر اچھائی بے تکی مثالیں دیتی ہو۔" وہ جس بات کو یاد دلا رہا تھا اسے یاد کر کے وہ خود بھی ہنسنے لگی تھی۔ سائرہ سوئمنگ کرتا ہوا واپس ان لوگوں کے پاس آ گیا تھا۔ "آپ دونوں پکنک پر آئے ہیں یا کوئی سنجیدہ قسم کے مذاکرات کرنے؟"

"ہم تمہاری برائیاں کر رہے تھے۔" اس نے سائرہ کو چڑایا۔

"آپ دونوں سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "آ جائیں نا پانی میں۔" وہ ان دونوں سے بولا۔

"آپ دونوں جائیں' مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے آگے جانے سے فوراً انکار کر دیا تھا۔

"ڈر؟ وہ وہ بھی ہم تیراکوں کی موجودگی میں؟ بے فکر رہیں' ہم آپ کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔" سائرہ نے ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پانی میں آگے لے جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"سائرہ پلیز' مجھے واقعی ڈر لگتا ہے۔" اس نے چلا کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اچھا ہے اس طرح آج آپ کا یہ ڈر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔" وہ بے فکرے انداز میں بولا۔ حیدر چلتا ہوا ان لوگوں تک پہنچ گیا۔

"ایسا لگ رہا ہے تم اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔" اس کا دوسرا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ سائرہ سے بولا۔ اس کے ہاتھ پکڑتے ہی اس نے چیخنا بند کر دیا تھا۔ پانی سے ڈر ابھی بھی لگ رہا تھا مگر دل میں اچانک ہی یہ اطمینان ابھرا تھا کہ اب میں ڈوبوں گی نہیں' مجھے کوئی چوٹ نہیں لگے گی۔ سائرہ اس کی اغوا والی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"واپس چلو ورنہ یہ محترمہ چیخنے کے ساتھ ساتھ یہیں کھڑے ہو کر رونا بھی شروع کر دیں گی۔" حیدر نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔

"آپ واقعی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتی ہیں؟" اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں کوئی نہیں رو رہی ہوں۔ بس سمندر میں آگے جاتے ہوئے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔ وہ لوگ واپس مڑ گئے تھے۔ جہاں پر پانی بہت گہرا نہیں تھا اور بس چھوٹی چھوٹی سی لہریں آ کر اس کے ٹخنوں کو چھو رہی تھیں وہاں آ کر حیدر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ اسے بتائے کہ اس کے ہاتھ پکڑنے پر اسے کس طرح کے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ اس کا دل یہ بھی چاہا تھا کہ کاش وہ یہ ہاتھ کبھی نہ چھوڑتا' اسی طرح پکڑے رہتا' ہمیشہ' ساری زندگی' اپنی اس سوچ پر اس نے گھبرا کر سر کو مزید جھکا لیا تھا۔ سائرہ نے ابھی بھی اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ پانی سے باہر خشکی پر آ گئے تھے تب بھی سائرہ نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

"لگتا ہے میں نے واقعی آپ کو بہت ڈرا دیا ہے۔ سوری ایمن! مجھے اندازہ نہیں تھا آپ پانی سے اتنا ڈرتی ہیں۔" وہ اس کی خاموشی کو اس کا خوف اور ناراضی سمجھ کر شرمندگی سے بولا۔ وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ ڈرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اس ایڈونچر کو انجوائے بھی کیا ہے۔" اس کی بات نے اس کے چہرے پر سے شرمندگی کے آثار فوراً مٹا دیے تھے۔ باربی کیو کے لیے تکے اور گوشت پر مسالے لگا کر وہ لوگ گھر سے لائے تھے۔ اب صرف تیاری کے آخری مراحل طے کرتے ہوئے تکے اور کباب بھونتے اور کھانے کا کام کیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ چٹائی بچھا کر ذرا چھاؤں والی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سائرہ صرف شور مچا رہا تھا جب کہ حیدر اور ایمن دوسرے کونے پر بیٹھ کر کباب تیار کرنے اور انہیں گرل پر سے اتار اتار کر پلیٹ میں ڈالنے میں مصروف تھے۔

وہ اس کے لیے اسپرائٹ کا کین کھول رہی تھی جب ان کے بالکل قریب ایک خوب صورت نسوانی آواز ابھری۔

"ہیلو۔" ان دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر آنے والی شخصیت کی طرف دیکھا تھا۔

"ہیلو۔" حیدر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا کباب منہ میں لے جاتے ہوئے جواباً ہیلو کہہ دیا تھا۔ اس نے چونک کر حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں کوئی مختلف بات تھی جسے وہ فوری طور پر کوئی نام نہیں دے پائی تھی۔

"کیسے ہو حیدر؟" وہ کوئی دیرینہ شناسا تھی کیونکہ اس کا لہجہ حد درجہ بے تکلفی اور قربت کا اظہار کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اسپرائٹ کا کین ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اس نے اخلاقاً بھی ان محترمہ کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"سائرہ تو تم بھی یہاں موجود ہیں۔ گویا کہ بڑے اہتمام سے پکنک منائی جا رہی ہے۔" ایمن نے گردن موڑ کر سائرہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی پلیٹ اور کین چٹائی پر رکھ کر کچھ کنفیوز سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے

تاثرات تھے جیسے وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے ان خاتون سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔

"اسلام علیکم۔" بلا ٓخر اس نے کچھ سوچتے ہوئے انہیں سلام کر لیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ بالکل اپنے پاپا جیسے لگنے لگے ہو سارا زان ہی کی طرح ہینڈسم۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں مسکرائی تھی۔ سائرہ جواباً مسکرایا نہیں تھا۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں حیدر کو دیکھنے لگا تھا۔ ایسے جیسے اس کے چہرے پر موجود تاثرات کو دیکھ کر وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اسے ان محترمہ سے بات کرنی چاہیے یا نہیں۔

"جمیلہ بابر؟" سائرہ کی کنفیوژن اور پریشانی نے اسے یہ بات سمجھنے میں مدد دی تھی۔ اس نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بلا کی خوب صورت تھی۔ اس کے شہد رنگ کے سلکی اور گھنے بال کمر تک آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا اس کے چہرے کی رنگت بے تحاشا سفید تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر موجود ڈمپل نے اس کی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے میک اپ شاید بالکل بھی نہیں کیا تھا۔ اسے میک اپ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"میں اپنی فرینڈز کے ساتھ پکنک پر آئی ہوں۔ اتفاق سے ابھی میری تم پر نظر پڑ گئی اور میں یہاں آ گئی۔" وہ حیدر سے کہتے ہوئے بے تکلفی سے چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اسے جیسے یہ بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس کی آمد کو یہاں کچھ خاص پسند نہیں کیا گیا۔

"تم لوگ یہاں باربی کیو کر رہے ہو۔ یہ ہے پکنک کا صحیح مزا اور میری فرینڈز ڈاتی بور چیزیں اٹھا لائی ہیں۔ کچھ پکائیں اور پھر کھائیں اس میں ہی پکنک کی اصل خوب صورتی ہے۔" وہ مخاطب حیدر اور سائرہ سے تھی لیکن دیکھ ایمن کو رہی تھی۔ اسے جمیلہ بابر کی نگاہوں سے بہت خوف آ رہا تھا۔ حیدر، جمیلہ کی طرف دیکھنے یا اسے توجہ دینے کے بجائے اسپرائٹ پینے میں مصروف تھا۔

"آپ کی تعریف؟"

"میں ام ایمن ہوں۔" ایک نظر حیدر پر ڈالنے کے بعد یہ دیکھ کر وہ جمیلہ سے اس کا تعارف کروانے کے موڈ میں نہیں اس نے اپنا نام بتا دیا تھا۔ وہ جواباً بڑی بے ساختگی سے ہنسی تھی۔

"آپ ام ایمن ہیں۔ افسوس میں اخبار زیادہ پابندی سے پڑھ نہیں پاتی' اس لیے آپ سے واقف نہیں ہوں۔" اس کا مزاحیہ سا لہجہ بظاہر دوستانہ تھا مگر اس میں چھپی طنز یہ کاٹ وہ بہت اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ وہ جواب میں کوئی ٹھیک ٹھاک کرارا سا جملہ اس کی طرف اچھال سکتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ جمیلہ بابر تھی اور ایمن نہیں جانتی تھی کہ اسے اس عورت سے کس انداز میں بات کرنی چاہیے۔ کہیں اس کے بدتمیزی سے جواب دینے پر حیدر برا نہ مان جائے۔ حیدر نے ایک دم ہی ہاتھ میں پکڑا کین زمین پر رکھ دیا تھا۔

"یہ میری دوست ہے۔ بس اتنا تعارف کافی ہے یا مزید کچھ اور بھی جاننا ہے؟" اس کے لہجے میں اب ناپسندیدگی واضح طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ ایمن کے تعارف میں اس نے توفیق کمال اور سائرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید وہ گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تم تو برا مان گئے حیدر! میں یونہی مذاق کر رہی تھی۔" وہ کھلکھلائی تھی۔

"تم لوگ اخلاقاً بھی مجھے کھانے میں شریک نہیں کر رہے تو میرا خیال ہے اب مجھے اٹھ جانا چاہیے۔" وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر حیدر سے بولی۔ سائرہ ان لوگوں سے تو سلے پر بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ جمیلہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس گئی۔

"ہائے ہینڈسم! کے پھر ملیں گے۔ ابھی تو میں کراچی ہی میں ہوں۔ فی الحال لندن واپس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سائرہ ہونق انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سائرہ سے ہاتھ ملا کر وہ اس کے پاس آ گئی۔

"خدا حافظ مس ام ایمن!" ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"خدا حافظ مس جمیلہ بابر!" وہ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر ہنسی۔

"لگتا ہے حیدر نے میرا خوب اچھی طرح تعارف کروا رکھا ہے۔" اس نے مسکرا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"اچھا حیدر! میں چلتی ہوں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کباب کھاتے ہوئے گردن ہلا کر اس کی بات کا جواب دے دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ تین منٹ ان لوگوں کے درمیان بالکل خاموشی رہی تھی۔

"کچپ دینا سائرہ!" حیدر نے اپنی پلیٹ سے ایک سیکنڈ کے لیے توجہ ہٹا کر سائرہ کو دیکھا۔ "ارے تم دونوں کو کیا ہوا بھئی!" وہ ان دونوں کی خاموشی پر حیران ہوا تھا۔

"کھاؤ بھئی ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تمہیں کیا ہوا ہے ایمن! تھوڑی دیر پہلے تو بھوک بھوک چلا رہی تھیں۔" اسے جیسے کچھ دیر پہلے ہونے والے سین سے کوئی فرق پڑا ہی نہیں تھا۔ سائرہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"حیدر بھائی! جمیلہ آپی۔" وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچایا۔

"میں نے تو سنا تھا انہوں نے دوسری شادی۔" وہ پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔" وہ اپنی پلیٹ میں کیچپ ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

"پھر اب یہ؟ اور انہیں ہو کیا گیا ہے' یہ اس طرح سے تو بات نہیں کرتی تھیں۔"

"چھوڑو یار اس فضول ٹاپک کو۔ میں اس وقت نہ خود بور ہونے کے موڈ میں ہوں اور نہ تم دونوں کو بور کرنا چاہتا ہوں۔ جمیلہ کی کوئی بات اگر تم دونوں میں سے کسی کو بری لگی ہے تو اس کے لیے میں سوری کہہ رہا ہوں۔" یہ کہتے وقت اس نے سائرہ سے زیادہ ایمن کی طرف دیکھا تھا۔ وہ لوگ دوبارہ سے کھانے پینے میں مصروف ہو گئے تھے مگر وہ اب کوشش کے باوجود بھی اس پکنک کو انجوائے نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ جمیلہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتا؟ جمیلہ سے اس کی شادی کس کی پسند سے ہوئی تھی؟ یقیناً اس کی پسند سے ہوئی ہوگی۔ پسند کر کے یا محبت کر کے؟ وہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق سمجھتی تھی اور محبت کا صرف لفظ سوچ کر ہی اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کتنا اہم تھا یہ سوال اس کے لیے کہ حیدر مسعود نے زندگی میں کبھی جمیلہ بابر سے محبت کی تھی یا نہیں۔

وہ لوگ چار بجے تک وہاں پر رہے اور واپسی میں وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

رات کو سائرہ اس کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ”اگر آپ میرے آنے سے ڈسٹرب بھی ہوئی ہیں تب بھی میں جاؤں گا نہیں۔ اس لیے کہ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ مما اپنے بیڈ روم میں جا چکی ہیں لہٰذا اب میں آپ کا سر کھاؤں گا۔“ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی لیکن نیند اسے خود بھی بالکل نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے بیڈ پر ہی چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آج کی پکنک اچھی رہی نا ایمن؟“ وہ اپنی گود میں تکیہ رکھ کر بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ ”آپ نے جمیلہ آپی کو کیسے پہچانا تھا؟ اچھا سمجھ گیا ضرور آپ نے ان کی کوئی تصویر دیکھی ہوگی۔“ اپنے سوال کا اس نے خود ہی جواب تلاش کر لیا تھا۔

”ان دونوں کی شادی کیسے ہوئی تھی سائرہ! میرا مطلب ہے حیدر اور جمیلہ کی۔“ یہ سوال اس طرح کرنا چاہتی تھی کہ اس میں صرف تجسس اور حیرت کا اظہار ہوتا ہو۔ وہ اس کے سوال پر مسکرایا۔

”آپ آج ان سے پہلی مرتبہ ملی ہیں اس لیے اس بات پر حیران ہو رہی ہیں کہ حیدر بھائی اور جمیلہ آپی ایک دوسرے سے اتنے مختلف نظر آتے ہیں پھر ان کی شادی کیسے ہوگئی۔ آج پکنک پر مجھے بھی وہ دونوں نارتھ پول اور ساؤتھ پول جیسے دو رنگ رہے تھے۔“ اس نے اس بات پر سکون کا سانس لیا کہ سائرہ نے اس کی اس معاملے میں دلچسپی کو کسی اور انداز میں نہیں لیا تھا۔

”جمیلہ آپی پہلے ایسی نہیں تھیں ایمن! آج ان کے باتیں کرنے کے اسٹائل پر مجھے سخت حیرت ہوئی ہے۔ بہت اچھی بڑی فرینڈلی سی تھیں وہ جمیلہ آپی لندن ہی میں پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ بہت اچھی آرکیٹیکٹ ہیں۔ میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر مجھے تھوڑا بہت یاد ہے جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آئی تھیں۔ حیدر بھائی کے گھر پر وہ لوگ ٹھہرے تھے مما بھی ان لوگوں کو ڈنر وغیرہ پر ضرور انوائٹ کرتی تھیں۔ حیدر بھائی کی جمیلہ آپی سے بہت دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے اکثر گیمز میں وہ دونوں پارٹنر بنتے تھے۔ ان دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی صاف ظاہر ہوتی تھی۔ ان دونوں کی منگنی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس شادی میں دونوں کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود ان دونوں کی پسند بھی شامل تھی۔ حیدر بھائی کی شادی مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اپنی شادی پر بہت خوش تھے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ سب کچھ ٹھیک رہا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ مجھ سے حیدر بھائی نے کبھی یہ ساری باتیں ڈسکس نہیں کیں۔ پھر بھی جتنا میں نے اندازہ لگایا وہ یہ تھا کہ جمیلہ آپی کو حیدر بھائی شادی کے بعد بہت قدامت پسند لگنے لگے تھے۔ وہ ان کے پروفیشن کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جمیلہ آپی اپنی زندگی میں پہلی اہمیت اپنے گھر کو دیں۔ ان کے پروفیشن کا نمبر اس کے بعد آئے۔ جمیلہ آپی ان کے ان خیالات کو ناپسند کرتی تھیں۔ کراچی سے زیادہ ان کا وقت لندن میں گزرتا تھا۔ میرا خیال ہے ان دونوں کے بیچ اختلافات کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ ایک سال کے اندر اندر ان دونوں کے تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے تھے کہ جمیلہ آپی حیدر بھائی سے

شادی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت قرار دینے لگی تھیں۔ وہ حیدر بھائی کی خواہش کے مطابق گھر کو اہمیت دینے پر تو کیا ان کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھیں۔

انہیں آرکیٹیکچر میں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ ملی تو انہوں نے آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی حیدر بھائی سے طلاق کا مطالبہ بھی کر دیا۔ پاپا اس بات پر بہت اپ سیٹ ہوئی تھیں۔ ان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ خود حیدر بھائی بھی اتنی جلد بازی میں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جمیلہ آپی کو کافی سمجھایا تھا۔ ان سے یہ کہا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے آسٹریلیا چلی جائیں مگر طلاق والی بات کو اتنی جلد بازی میں نہ سوچیں۔ وہ دونوں کچھ عرصہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے تو شاید ان کے بیچ موجود اختلافات کچھ کم ہو جائیں شاید سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے مگر جمیلہ آپی سمجھوتہ کرنا چاہتی ہی نہیں تھیں۔ انہیں اپنا کیریئر بنانا تھا بس پھر ایک سال بعد ہی ان کی علیحدگی ہوگئی تھی۔ جمیلہ آپی نے طلاق کے تھوڑے عرصہ بعد ہی شادی کر لی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہی رہ رہی تھیں۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ آج انہیں اتنے سالوں بعد دیکھا ہے تو میں ان کے انداز پر حیران ہوا ہوں۔ مجھے ان کے اسٹائل سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ حیدر بھائی سے دوبارہ تعلق جوڑنا چاہتی ہیں۔ لگتا ہے ان کے اپنے شوہر سے تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں۔ کیا پتا طلاق ہو چکی ہو۔ پوچھوں گا میں مما سے کل یہ بات۔“ وہ اسے ساری بات بتا کر خاموش ہوا تو وہ اس معاملے سے خود کو لاتعلق ظاہر نہیں کر پائی۔

”جمیلہ کی اپنے شوہر سے طلاق ہو چکی ہے۔“ اس کے باخبر ہونے پر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے یہ بات حیدر نے بتائی ہوگی۔

”میں حیدر بھائی جیسا بننا چاہتا ہوں ایمن! ویسے تو پاپا بھی بہت اچھے ہیں مگر ان کی بعض باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں اور حیدر بھائی وہ ایسے ہیں کہ ان جیسا بننے کی خواہش کی جائے۔“ وہ بچپن سے حیدر کو دیکھ رہا تھا وہ اس کی بے شمار خوبیوں سے متاثر تھا۔

”تم ہر کسی کو اپنا اسیر بنا لیتے ہو۔ تم ہر کسی کو خود سے متاثر ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہو تب ہی تو وہ عورت جو اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے تمہیں چھوڑ گئی تھی واپس تمہارے پاس آنا چاہتی ہے کوئی بات ایسی ہے تم میں جو تمہیں سب سے الگ بناتی ہے۔“ سائرہ کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے حیدر مسعود کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ حیدر نے اس سے تمام تر بے تکلفی، دوستی اور اپنائیت کے باوجود اپنے اور اس کے درمیان ایک لکیر کھینچ کر رکھی ہوئی ہے۔ آج جمیلہ سے ملنے کے بعد وہ یہ بات زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ اسے پتا تھا وہ حیدر سے جمیلہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کر پائے گی۔ اس نے اسے بہت سے حق دینے کے باوجود بھی اپنی ذاتی زندگی کی بہت سی باتوں کے بارے میں کوئی حق نہیں دیا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

سائرہ کا آنا اس کے لیے جتنا غیر اہم تھا اس کا جانا اتنا ہی اہم۔ وہ اس کے جانے پر اداس تھی۔ اس کے ہونے سے زندگی میں کتنا خوشگوار سا احساس ہونے لگا تھا۔ ایک خوب صورت سے رشتے کا احساس ان دونوں کے درمیان کے

آٹھ دنوں میں اس نے سائرہ کو بھرپور کمپنی دی تھی۔ وہ دونوں بہت سی جگہوں پر گھومنے گئے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے لنچ اور ڈنر گھر سے باہر ایک ساتھ کیا تھا۔ وہ بوسٹن میں موجود اپنے دوستوں کے لیے کچھ تحائف خریدنا چاہتا تھا وہ اس کے ساتھ بازار بھی گئی تھی تاکہ شاپنگ میں اس کی مدد کر سکے۔ توفیق کمال اور الماس اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے۔ ایمن نے اسے گھر پر ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

"میں آپ کو فون کروں گا تو مجھ سے بات کریں گی؟" توفیق کمال اور الماس پورچ میں جا چکے تھے اور وہ لاؤنج میں کھڑا اس سے وعدے لے رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ جواباً مسکرائی تھی۔ "میری ای میلز کا جواب دیں گی؟" "ہاں۔"

"میرے ساتھ چیٹنگ کیا کریں گی؟ روزانہ نہیں کبھی کبھار؟" وہ اس کے معصومانہ انداز پر ہنسی تھی۔

"نہیں۔" وہ اس کے انکار پر حیران ہوا اسے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ "کبھی کبھار نہیں ہم روزانہ چیٹنگ کیا کریں گے۔" اس کے جواب نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ سائرہ کے لیے اماں ایمن ایک عام سی لڑکی تھی جس سے نہ اسے محبت تھی نہ نفرت اس عام لڑکی کو اس کے لیے خاص بنانے والا حیدر مسعود تھا۔ اس نے سائرہ کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ ایمن اس کی بہن ہے اور اپنی بہن سے اسے محبت کرنی چاہیے۔ اس نے سائرہ کو ایمن کے بارے میں وہ سب کچھ بتایا تھا جس کی بنیاد پر وہ اس سے ملنے سے پہلے ہی اسے پسند کرنے لگا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

پورچ سے نکل کر مرکزی دروازے تک جاتے ہوئے اس کی نظر لان میں بیٹھے ہوئے توفیق کمال اور حیدر پر پڑی تو وہ اندر جانے کے بجائے اس طرف آ گئی۔ وہ دونوں کل رات ہی کولمبو سے واپس آئے تھے۔ حیدر اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے ان دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔ سلام کا جواب ملتے ہی اس کا وہاں سے چلے جانے کا ارادہ تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹھو۔" سلام کا جواب تو ان دونوں نے دیا تھا مگر بیٹھنے کے لیے اسے توفیق کمال نے کہا تھا۔ وہ ان کے بیٹھنے کے لیے کہنے پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ وہ حیرت زدہ اور کچھ نروس سی ان دونوں کے قریب رکھی تیسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے ایگزامز میں کتنے دن رہ گئے ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تین مہینے۔" دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"ایگزامز کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ حیدر بتا رہا تھا تم ایم بی اے کرنا چاہتی ہو۔"

"جی۔" وہ مختصر سا "جی" کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

"حیدر نے اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ تم یونیورسٹی کے بعد روزانہ تین چار گھنٹوں کے لیے آفس آنا شروع کر دو۔ جب تمہارا انٹرسٹ اسی طرف ہے اور آگے تم نے بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے کا ارادہ بھی کیا ہوا ہے تو بہتر ہے تم ابھی سے ہی بزنس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنا بھی شروع کر دو۔ ایگزامز کے بعد تم باقاعدہ آفس جوائن

کر لینا۔ ایم بی اے تو تم ایوننگ میں کرو گی۔" وہ اس پر نظریں جمائے بہت سنجیدگی سے حکمیہ انداز میں اس سے مخاطب تھے۔

"تمہیں گھر بیٹھے جاب آفر ہو رہی ہے ناشکری لڑکی منہ پھاڑ کر اس طرح بیٹھی ہو جیسے پتا نہیں تم سے کیا کہہ دیا گیا ہے۔" حیدر کی آواز نے اسے اس بے یقینی والی کیفیت سے باہر نکالا تھا۔ کیا وہ واقعی اپنے باپ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی یا یہ صرف حیدر کے کہنے پر کیا جا رہا تھا۔ اس کی بے یقینی اور حیرت پر توفیق کمال مسکرائے تھے جب کہ حیدر باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس بات پر اس قدر حیران ہو رہی ہے۔

"بس اب تم جاؤ اور جاتے ہوئے دین محمد سے دو کپ کافی لان میں بھجوانے کا کہتی ہوئی جانا۔" اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ دوبارہ حیدر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ حیرت زدہ سی دین محمد سے کافی کا کہتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

"مجھے پتا ہے آپ ہی نے کی ہو گی پاپا سے میری سفارش۔" اس نے اسی رات حیدر کو فون کیا تھا۔

"محترمہ صاحبہ آپ میری سفارشوں اور تعریفوں کے دور سے نکل چکی ہیں۔ اب تو جو تمہارے رشتے کے لیے آئیں گے ان سے بھی تمہاری تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہاری سب خوبیاں بغیر بتائے ہی ہر ایک کو نظر آتی ہیں۔" وہ جواباً ہنستے ہوئے بولا۔

"توفیق بھائی تین چار روز پہلے میرے ساتھ تمہارے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایمن ماسٹرز کر لے تو میں اسے بزنس کی طرف لے کر آؤں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کا یہی ارادہ ہے تو اسے ابھی سے ہی آفس بلانا شروع کر دیجیے اور کچھ نہ سہی کم از کم ان تین چار گھنٹوں میں وہ آفس کے ماحول کی عادی ہو جائے گی۔ خود کوئی کام چاہے نہ کرے مگر کام ہوتا ہوا تو دیکھے گی۔" وہ سنجیدگی سے اسے ساری بات بتانے لگا۔

"یقین کر لو اس بات کا ایمن! کہ تم توفیق بھائی کو اپنی ذہانت سے کافی زیادہ متاثر کر چکی ہو۔ انہیں تم سے اور سائرہ سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ہماری کمپنی کو اور آگے لے کر جائیں۔"

اس پرسکون اور آرام دہ کمرے کے مکمل خاموشی میں ڈوبے ماحول میں بیٹھ کر اسے غنودگی آنے لگی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر جلدی سے سر اٹھایا۔

"رات میں پڑھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں یونہی ٹی وی پر ایک مووی دیکھنے لگی حالانکہ مووی کچھ خاص بھی نہیں تھی مگر پھر بھی میں نے پوری دیکھی۔ دراصل اس کا ہیرو بہت ہینڈسم تھا بالکل آپ کی طرح۔" اس نے ہنستے ہوئے بہت مزے سے اسے بتایا۔

"کیا کہہ رہی ہو پھر سے کہو میں نے کچھ ٹھیک سے سنا نہیں۔" ٹیبل پر ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ایسی باتیں بار بار نہیں کہی جاتیں۔" اس کے شانِ بے نیازی سے جواب دینے پر وہ کھل کر ہنس دیا۔

CamScanner

"اب میری اتنی اچھی تعریف کر کے تم نے میرا دل خوش کیا ہے تو مجھے تمہارے لیے کچھ اچھے سے لنچ کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔" وہ انٹرکام پر پیون کو اس کے لنچ سے متعلق ہدایات دینے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ایمن نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"یونیورسٹی میں چاٹ کھالی تھی لنچ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔" اسے پتا تھا وہ اس کے ساتھ تکلف نہیں برتتی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔

"پھر اب کام کی باتوں کی طرف آجائیں؟" اس کے پوچھنے پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"سب سے پہلے میں تمہیں کچھ باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔" وہ اب مکمل طور پر سنجیدہ تھا۔

"تمہیں یہاں پر اس طرح سے رہنا ہے کہ تم توفیق کمال کی بیٹی لگو۔"

تم سب سے دوستانہ انداز میں بات کرو مگر اس دوستانہ انداز میں ایک محسوس سا فاصلہ موجود رہنا چاہیے۔ تم یہاں پر آرڈر لینے نہیں آرڈر دینے آئی ہو۔ تمہیں کسی سے متاثر نہیں ہونا تمہیں لوگوں کو خود سے متاثر ہونے پر مجبور کرنا ہے۔" وہ پوری توجہ سے اسے سن رہی تھی۔

"تمہیں کمپنی کے کسی ایک ڈپارٹمنٹ کے بارے میں نہیں بلکہ تمام ڈپارٹمنٹس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ فی الحال میں مارکیٹنگ منیجر اور فنانس منیجر سے تمہیں ملوا رہا ہوں۔ تم ہفتے میں تین دن مارکیٹنگ اور تین دن فنانس منیجر کے ساتھ ہو گی۔ انہیں کام کرتا ہوا دیکھو گی یہ سب کچھ تمہیں بہت مشکل لگے گا۔ بہت سی باتیں تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئیں گی۔ اپنے نوٹس بناتی جاؤ' ہر روز جو کچھ تمہیں سمجھایا اور بتایا جائے اسے اپنے پاس اپنے الفاظ میں نوٹ کرتی رہا کرو۔ یہ نوٹس آگے تمہارے بہت کام آئیں گے۔" وہ اس کے منہ سے ساری تفصیلات سن کر تھوڑی مایوس ہوئی تھی۔

"میں تو سمجھ رہی تھی مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ آپ پتا نہیں مجھے کہاں بھیج رہے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ آپ مجھے کچھ نہیں سکھا رہے۔" وہ اس کے بچوں جیسے انداز میں کیے جانے والے شکوے پر مسکرایا تھا۔ "میں ہر وقت تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں ایمن! تمہارا جب دل چاہے' بے دھڑک میرے پاس آ سکتی ہو لیکن تمہیں تمام بنیادی اور ابتدائی باتیں سیکھنی ہیں اور میرے پاس ظاہر ہے وہ تم کیسے سیکھ سکتی ہو۔"

"آپ نے پاپا سے بھی میری تعریفیں کر کر کے پتا نہیں انہیں میرے بارے میں کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ یونیورسٹی میں پروفیسرز کو متاثر کرنا اور پوزیشنز لینا الگ چیز ہے اور بزنس کے معاملات کو صحیح طرح سمجھنا الگ چیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام ٹاپ آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹس کامیاب ایگزیکٹو بھی ہوتے۔" وہ کل سے دل میں آنے والی اس سوچ کو اس کے سامنے ظاہر کیے بغیر رہ نہیں پائی تھی۔

"تمہیں میں نے منع کیا ہے نا ایسی باتیں کرنے کے لیے۔ تم سے بس جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ باقی یہ فضول باتیں سوچنے کے لیے اپنے چھوٹے سے دماغ پر زیادہ زور مت دو اور تمہارا کیا خیال ہے توفیق بھائی کوئی ننھے سے بچے ہیں جن سے میں کسی کے بھی بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ اسے مان لیں گے۔ وہ بزنس میں میرے

استاد ہیں۔ انہوں نے مجھے کام کرنا سکھایا ہے۔" اسے ڈپٹتا ہوا وہ انٹرکام پر مارکیٹنگ منیجر اور فنانس منیجر کو اندر آنے کے لیے کال کرنے لگا۔

❀❀❀

اسے آفس آتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے آفس جانے کے ساتویں دن توفیق کمال نے گھر میں رات کے کھانے کے دوران اس سے آفس کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کی تھی۔

اس روز آفس آنے پر وہ فنانس ڈپارٹمنٹ جانے سے پہلے حیدر سے ملنے اس کے آفس کی طرف آ گئی۔ حیدر کی اس پر نظر پڑی تو وہ خوشگوار سے انداز میں مسکراتا ہوا فوراً رک گیا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ غیر ملکی لڑکی بھی رک گئی جو حیدر کے ساتھ تھی۔

"السلام علیکم۔" اس کے قریب پہنچ کر اس نے اسے سلام کیا۔ اسے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کا تعارف کروانے لگا۔

"یہ فاطمہ مصطفیٰ ہیں۔ ہمارے نیویارک آفس میں ہماری کمپنی کی جنرل منیجر۔ یوں سمجھو کہ وہاں کا سارا کام تقریباً انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔" وہ اس سنہری بالوں والی غیر ملکی لڑکی کا مسلمانوں والا نام سن کر خاصی حیران ہوئی۔ حیدر اب ایمن کے بارے میں بتانے لگا۔

"اس کا ایک تعارف تو یہ ہے کہ یہ توفیق بھائی کی بیٹی ام ایمن ہے اور دوسرا تعارف یہ ہے کہ یہ میری بہت پیاری دوست ہے۔" ان دونوں نے آپس میں ہاتھ ملاتے ہوئے رسمی قسم کے جملوں کا تبادلہ کیا۔

"تم یقیناً میرے ہی پاس آ رہی تھیں؟" حیدر کے استفسار پر اس نے سر ہلا دیا۔

"آجاؤ پھر' میرا اور فاطمہ کا کافی پینے کا موڈ ہے' تم بھی ہمیں جوائن کر لو۔" وہ ان دونوں کے ساتھ اس کے روم میں آ گئی تھی۔ اندر آنے تک حیدر' فاطمہ کو اس کے متعلق مزید معلومات فراہم کرنے لگا۔

"حیدر! تمہاری فرینڈ بہت پرکشش ہے۔" گو یہ تعریفی جملہ انگریزی میں ادا کیا گیا تھا مگر لہجے کی بے تکلفی آپ اور تم کا فرق ضرور واضح کر دیتی ہے۔ وہ اس بے تکلفانہ انداز پر چونکی تھی۔ حیدر کی جاننے والی تمام لڑکیوں میں یہ اس نے پہلی لڑکی دیکھی تھی جو اگر اس سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی تو جواباً وہ بھی اس سے دوستانہ انداز میں ہی مخاطب تھا۔

"آپ امریکن ہیں؟" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ممی کی طرف سے تو مکمل طور پر امریکن ہوں مگر ڈیڈی کی طرف سے مکمل امریکن نہیں کہلا سکتی۔ میرے ڈیڈی پیدا تو امریکہ ہی میں ہوئے تھے مگر ان کے پیرنٹس کا تعلق انڈیا سے ہے۔ اردو جو تھوڑی بہت سمجھ لیتی ہوں' وہ بھی اس کمپنی کو جوائن کرنے کے بعد ہی ہوا ہے۔ سات سال ہو گئے ہیں مجھے یہاں جاب کرتے ہوئے اور اس دوران چار یا پانچ مرتبہ آفس کے کام سے میرا کراچی آنا ہوا ہے اور اس آنے جانے ہی نے مجھے تھوڑی بہت اردو سکھا دی ہے۔ بولنی تو خیر ابھی بھی نہیں آتی۔" وہ کافی خوش مزاج اور خوش گفتار تھی۔

"حیدر کی اور میری دوستی نیویارک میں ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ بعد میں بھی پھر ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ میں نیویارک میں ایک اور کمپنی میں جاب کر رہی تھی' جب سات سال پہلے حیدر نے مجھے

یہاں جاب کی آفر کی اور میں نے اس کی آفر قبول کر لی۔" کافی پیتے کے دوران وہ اسے اپنی اور حیدر کی دوستی کے بارے میں بتانے لگی۔ اگلے روز وہ ڈنر پر ان کے گھر آئی تھی۔ اسے دی جانے والی مراعات اور پھر توفیق کمال کا اسے اپنے گھر کھانے پر بلانا کمپنی کے لیے اس کی غیر معمولی اہمیت کو بہت اچھی طرح واضح کر رہے تھے۔ کل والے مغربی لباس کے برعکس آج اس نے مکمل طور پر پاکستانی لباس پہن رکھا تھا۔ گرین کلر کے اسٹائلش شلوار قمیص کے ساتھ گرین کلر کا ہی نیٹ کا دوپٹہ جو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ بالوں کو بھی اس نے جُوڑا بنانے کے بجائے انہیں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ میک اپ بھی تھوڑا سا ڈارک کر رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تیاری کو سراہ رہی تھی۔ الماس مسکراتے ہوئے پُرخلوص اور دوستانہ انداز میں اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں جب کہ توفیق کمال کے انداز میں سنجیدگی اور تکلف تھا۔ حیدر کے آفس میں وہ جتنی بے تکلفی سے ملی تھی یہاں وہ اتنی ہی پُرتکلف تھی۔ ڈنر کے دوران اور پھر ڈنر کے بعد چائے پیتے ہوئے بھی ایمن ان لوگوں کے ساتھ موجود رہی تھی۔

فاطمہ کے ساتھ بہت اچھی طرح ملنے اور باتیں کرنے کے باوجود وہ اس سے مل کر خوش نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس بات نے بہت تکلیف پہنچائی تھی کہ اس کے علاوہ بھی کوئی لڑکی ہے جو حیدر کی دوست ہے اور وہ اس لڑکی کو اپنی کمپنی میں بھی لے کر آیا تھا۔ جب میں نے اس کے علاوہ کسی لڑکے کو دوست نہیں بنایا تو اس نے میرے علاوہ کسی لڑکی کو دوست کیوں بنایا۔

وہ فاطمہ سے ملنے کے بعد حیدر سے سخت خفا ہو رہی تھی۔ اگلے تین چار دن اس کی حیدر سے سرے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جلس ہوتے ہوئے یہی سوچا تھا کہ یقیناً وہ فاطمہ کے ساتھ مصروف ہوگا پھر اس کے بعد وہ آٹھ دس روز کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔

⊛⊛⊛

آج یونیورسٹی نہیں جانا تھا اسی لیے وہ صبح ہی آفس آ گئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی لاک کر کے آگے قدم بڑھانے والی تھی کہ اسے حیدر کی گاڑی آتی نظر آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ بے اختیار رک گئی۔ وہ انگلینڈ سے کل شام میں یا رات واپس آیا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر وہ اپنی ساری خفگی بھول گئی تھی۔ اس وقت اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر وہ بس یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ان دس دنوں میں اسے کس قدر یاد کیا ہے وہ اس کے پاس آ گیا تھا۔ "آج صبح ہی آ گئیں؟"

"آج یونیورسٹی نہیں جانا تھا اس لیے۔" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اندر آ گئے۔

مارکیٹنگ منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کبھی وہ اس شخص کو یہ بات بتا پائے گی کہ وہ اس کے لیے کس قدر اہم ہے۔ جب وہ پاس ہوتا ہے تو ہر منظر خوب صورت ہوتا ہے اور جب وہ پاس نہیں ہوتا تو کہیں کوئی خوب صورتی نظر نہیں آتی۔

وہ ایک رپورٹ اسٹڈی کر رہی تھی جب اسے توفیق کمال نے اپنے آفس میں بلایا تھا اس کے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی انہوں نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔

"ساڑھے گیارہ بجے ہمیں ایک میٹنگ میں چلنا ہے۔ ابھی گیارہ بجے ہیں تم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے پارکنگ میں پہنچ جانا۔" وہ حواس باختہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ہمیں؟"

"ہاں ہمیں۔ تم ساتھ میٹنگ میں چل رہی ہو یہی بات بتائی ہے میں نے تمہیں۔ اب تم جاؤ۔"

وہ حواس باختہ اس مشکل کا حل لینے حیدر کے پاس بھاگی آئی تھی۔

"کیا بات ہے ایما! کچھ پریشان لگ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں میں بہت پریشان ہوں۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میٹنگ میں جانے کی بات بتائی۔

"مجھے وہاں پر کیا کرنا ہوگا مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا۔"

"پتا کیسے ہوگا تم کبھی اس طرح کی کسی میٹنگ میں گئی ہو جو تمہیں کچھ معلوم ہوگا۔ توفیق بھائی بھی یہ بات جانتے ہیں انہیں پتا ہے کہ ابھی تم سب کچھ سیکھ رہی ہو اور ان کا تمہیں میٹنگ میں لے کر جانا بھی دراصل تمہارے سیکھنے ہی کا حصہ ہے۔

اس دوران ریفریشمنٹ اور چائے یا کافی وغیرہ سے تم لوگوں کی تواضع کی جائے گی اسے انجوائے کرنا اور واپس آ جانا۔" وہ اس کے گھبرائے ہوئے انداز پر اسے سمجھانے لگا۔

"واپس آتے وقت وہ راستے میں تم سے میٹنگ میں ہونے والی باتوں کے بارے میں سوال کریں گے۔ تم ان کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دے سکو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میٹنگ کے دوران وہاں مکمل طور پر موجود ہو گھبرانا نہیں۔ جو وہ پوچھیں اطمینان سے اس کا جواب دینا۔ اگر جواب غلط بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" اس کے حوصلہ دینے اور سمجھانے سے اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی پھر جیسا اس نے کہا تھا سب کچھ ہوا بھی بالکل ویسا ہی تھا۔

آفس واپس پہنچ کر اس نے اس معرکے کو سر کر لینے پر خود کو شاباش دیتے ہوئے سکون کا سانس لیا اور پھر حیدر کو اپنی ساری کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ دینے اس کے پاس آ گئی۔

"حیدر بزی تو نہیں ہیں؟" اس نے اس کی سیکریٹری سے پوچھا تو وہ جواباً خوش اخلاقی سے بھرپور مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔

"بزی تو ہیں لیکن آپ اندر جا سکتی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہا تھا کہ آپ میٹنگ سے واپس آ گئی ہیں یا نہیں۔" ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا اس نے تو ہمیشہ ہی اپنے کاموں کے دوران بھی اس کی پروا کی تھی اس کا دھیان رکھا تھا لیکن پھر بھی وہ اس بات پر نئے سرے سے خوش ہوئی تھی۔

وہ اپنی سیٹ کے بجائے دوسرے کونے پر رکھے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز پر اس نے لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا اور وہ اس پر کچھ کام کر رہا تھا۔

"کیا کیا ہوا؟ یہ نیا تجربہ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا! میرے حساب سے میری کارکردگی "اے پلس" کی حق دار ہے لیکن یہ آپ سے بات کر لینے کی وجہ سے ہوا ہے! اگر آپ نے مجھے گائیڈ نہ کیا ہوتا تو میرا گریڈ "F" ہوتا۔" وہ اس کی میز کے پاس جا کر رکتے ہوئے جواباً گویا ہوئی۔ وہ بغیر سر اٹھائے ہنس دیا۔

"بیٹھو تم میں ذرا دس منٹ میں اس کام سے فارغ ہو لوں پھر تفصیلی باتیں کرتے ہیں۔" وہ اس کی میز کے سامنے مہمانوں کے لیے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے لگی تھی کہ اچانک اسے ایک شرارت سوجھی۔ وہ بجائے وہاں بیٹھنے کے اس کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد سیٹ کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ اپنی اس بچکانہ حرکت پر محظوظ ہوتے ہوئے ہنسنے لگی۔ اس کی مدہم سی ہنسی اس نے فوراً سنی اور متعجب سے انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

"میں یہاں بیٹھ کر کیسی لگ رہی ہوں؟" "بہت اچھی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میں یہاں تک کب پہنچوں گی؟" اپنے ہاتھوں میں چہرہ ٹکاتے ہوئے اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"تمہاری رفتار دیکھ کر تو لگ رہا ہے دو چار سال میں ہی تم مجھے ہٹا کر یہاں میری جگہ پر بیٹھی ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

"تم نے کام کرنے کا میرا موڈ ختم کروا دیا ناں۔" وہ لیپ ٹاپ کو اسی حالت میں میز پر رکھا چھوڑ کر صوفے پر سے اٹھ کر میز کے پاس آ گیا۔ وہ اسے آتا دیکھ کر اس کی سیٹ پر سے اٹھنے لگی تھی کہ وہ ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فوراً بولا۔

"بیٹھی رہو! اچھی لگ رہی ہو۔" وہ جواباً کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اسی وقت اس کی سیکریٹری نے اسے انٹرکام پر کسی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ریسیور اٹھایا تھا مگر آنے والا پتا نہیں کون تھا جس کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

"ان سے کہیے میں آج سارا دن بزی ہوں۔ ان سے بالکل نہیں مل سکتا۔" اس کا لہجہ کچھ تلخی لیے ہوئے تھا۔ وہ میز کے دوسری طرف رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا۔ حیدر نے بڑی ناگواری سے دروازے کی طرف دیکھا۔

ایمن نے ایک نظر کمرے میں داخل ہوتی جمیلہ کو اور پھر ایک نظر حیدر کو دیکھا۔ جمیلہ نے اندر آنے کے بعد دروازہ واپس زوردار انداز سے بند کیا۔

"تو یہ ہے تمہاری وہ مصروفیت جس کی وجہ سے تم مجھ سے مل نہیں سکتے۔" اس نے ایمن کو ان نگاہوں سے گھورا جیسے اسے کچا چبانے کا ارادہ ہو۔ حیدر بہت غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں بات کرو گے تم مجھ سے؟ تمہیں مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ میں پچھلے پانچ مہینوں سے اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑ کر تمہارے پیچھے خوار ہو رہی ہوں، صرف تمہاری وجہ سے اتنے مہینوں سے کراچی میں ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ مجھ سے بات نہیں کرو گے۔" وہ تیز آواز میں چلائی۔ پلک پر جس جمیلہ بابر کو اس نے دیکھا تھا وہ

آج اس سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

ان دونوں کی اس گفتگو میں اس کی موجودگی بالکل مناسب نہیں تھی۔ وہ سیٹ پر سے اٹھی اور جمیلہ کے قریب سے تیزی سے گزر جانا چاہا کہ اچانک ہی جمیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روک لیا۔ وہ اسے بڑی نفرت سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں تمہاری عمر کا کوئی لڑکا نہیں مل رہا تھا جو اس کے پیچھے پڑی ہو۔ دولت سے اس کی متاثر ہو نہیں سکتیں کیونکہ تمہارے باپ کے پاس خود بہت دولت ہے۔" اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔

"جمیلہ!" حیدر کی آواز کافی بلند تھی۔ "مزید تم کوئی بکواس نہیں کرو گی۔" اس نے حیدر کو اس طرح چلاتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔

"کیوں چپ رہوں میں؟ تمہیں میری باتیں بکواس لگیں یا جو بھی، مگر تمہیں سننا پڑے گا حیدر مسعود! مجھے اس لڑکی کی وجہ سے نظر انداز کر رہے ہو نا تم! اس کی کم عمری اور معصومیت نے تمہیں اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ اپنے سے بارہ تیرہ سال چھوٹی لڑکی سے محبت میں مبتلا ہو تمہاری زندگی میں اب جمیلہ بابر کی....." حیدر کی غراہٹ نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"آگے ایک لفظ مت بولنا جمیلہ!"

شائستہ! آپ اندر آئیے۔" اس نے فوراً انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو اندر بلایا۔ وہ خوف زدہ سے انداز میں ایک سیکنڈ میں اندر آ گئی تھی۔

"میرے..... منع کر دینے کے باوجود یہ محترمہ میرے آفس میں کیوں آئی ہیں؟ یہ میں آپ کو پہلی اور آخری وارننگ دے رہا ہوں، آج کے بعد اگر یہ خاتون کبھی میرے آفس میں آئیں تو میرے پاس آپ کی جاب کی کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔" جمیلہ کا سارا جوش اور غصہ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اگر اب بھی وہ وہاں سے نہیں گئی تو شاید وہ اسے چوکیدار سے دھکے لگوا کر اپنے آفس سے نکال دے گا۔ وہ شکست خوردہ قدموں سے تیزی سے واپس پلٹی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

"آئم سوری سر!" اس کی سیکریٹری کانپتے ہوئے بولی۔

"آپ جا سکتی ہیں۔" اس کے جانے کے بعد وہ ایمن پر نظریں ڈالے بغیر واپس کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اس پل حیدر مسعود کی خاموشی سے خوف محسوس ہوا۔ اس نے ایک گلاس میں پانی نکالا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی کرسی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ پانی پی لیں۔" اس کی آواز پر بھی اس نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا تھا۔

"تم یہاں سے جاؤ۔" اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ "میں اس طرح سے کیسے....."

"میں نے تم سے کہا ہے ناں کہ تم یہاں سے جاؤ۔" اس بار اس کے لہجے میں پہلے سے بھی زیادہ اجنبیت تھی۔

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر پانی کا گلاس میز پر رکھنے کے بعد باہر آ گئی۔ اسے جمیلہ کی کسی بات نے ہرٹ کیا تھا، نہیں لیکن حیدر کی بات نے ضرور کیا تھا۔ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی اور پھر بھی اس نے اسے خشک انداز میں اسے

اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد عجیب سے دکھ نے خود بخود ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

وہ حیدر کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ آفس میں سارا وقت وہ اپنے بلائے جانے کی منتظر رہی۔ شام میں وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ کوریڈور میں ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر اس نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فنانس ڈائریکٹر کے ساتھ گفتگو کرنے لگا جو اس کے ساتھ ہی تھا۔

اس کا دل چاہا وہ وہیں کوریڈور میں زور زور سے رونا شروع کر دے۔ وہ کل کی طرح غصے میں نہیں تھا پھر اس نے اسے اس طرح نظرانداز کیوں کیا۔ اس کی زندگی میں بہت سارے رشتے نہیں تھے جو وہ ایک کی طرف سے توجہ میں کمی آ جانے پر دوسری طرف متوجہ ہو جاتی۔ اس کے پاس بس یہی ایک رشتہ تھا اعتبار کا، دوستی کا۔ زندگی کی سب محرومیوں اور ساری تلخیوں کے ساتھ اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا، صرف اس لیے کہ اس کے پاس خلوص، محبت اور یقین کا ایک انمول رشتہ موجود تھا۔ اس ایک شخص نے دوسرے سب رشتوں کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں خوشیوں کو لے کر آیا تھا۔ اس کی ہر سوچ اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی پھر جب وہ یوں اجنبی اور لاتعلق ہو رہا تھا تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں سے ساری خوشیاں ہی نکل گئی ہوں۔

"میں تم سے سخت نفرت کرتی ہوں حیدر بابر! تم نے ہمارے بیچ یہ دوری اور فاصلہ پیدا کیا ہے۔" وہ ہر روز دن میں کئی مرتبہ حیدر بابر کو نفرت سے یاد کرتی۔ پھر روز وہ اس کے فون کا انتظار کرتی تھی۔

"میرے ساتھ یوں مت کرو حیدر!" وہ ہر رات روتے ہوئے سوتی تھی۔

ایک مہینہ گزر چکا تھا اسے حیدر کی بے رخی اور لاتعلقی کو برداشت کرتے ہوئے۔ اس دوران وہ نیویارک بھی ہو آیا تھا۔ نہ وہ جاتے وقت اس سے ملا تھا، نہ اس نے وہاں سے اسے فون کیا تھا، نہ کوئی ای میل بھیجی تھی اور نہ ہی واپس آنے کے بعد اسے فون کیا تھا۔

"کیا میری زندگی میں آنے والا ہر رشتہ یونہی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔" اس رات روتے ہوئے کتنے شکوے اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

وہ توفیق کمال کے ساتھ کسی ڈنر میں شرکت کر کے ان کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اسے دیکھے، وہ اس کی آواز سنے۔ دین محمد ٹرے میں کافی کے کپس اور ڈرائی فروٹس کی پلیٹ سجائے سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "پاپا کو کافی میں دے آتی ہوں دین محمد!" وہ قصداً مسکرائی۔ وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ پائپ ہاتھ میں لیے وہ بڑی سنجیدگی سے توفیق کمال سے کوئی بات کر رہا تھا۔ ان دونوں نے دروازہ کھول کر اس کے اندر آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بہت مگن تھے۔ اس نے حیدر کو سلام کیا تو

ان دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اور پھر اپنی نظریں فائل پر مرکوز کر دی تھیں۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے مزید وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے اسٹڈی سے باہر آ گئی۔

"جب تم نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے تو اپنے بغیر زندہ رہنا بھی سکھا دو۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہنا بھول گئی ہوں۔" وہ ساری رات شکوے کرتی رہی۔ اس سے بھی، خود سے بھی، اپنی قسمت سے بھی۔ صبح نہ وہ یونیورسٹی گئی تھی اور نہ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر۔ توفیق کمال اور ماما اس کے آفس چلے جانے کے بعد بھی وہ یونہی لیٹی رہی۔ لیٹے لیٹے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور بے خودی کے عالم میں اس کا موبائل نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" اس کی آواز سنتے ہی اس نے گھبرا کر فوراً لائن کاٹ دی تھی۔ اس کے ریسیور واپس رکھتے ہی فون کی بیل بجنی شروع ہوئی۔ آنے والا نمبر حیدر مسعود کا تھا۔

"ہیلو۔" کافی دیر کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا تھا۔

"تم نے بغیر بات کیے فون کیوں بند کر دیا؟" اس کے ہیلو کے جواب میں اس نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔ کتنے دنوں بعد اس نے سلام کا جواب دینے کے علاوہ اس نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ یہ ایک مہینہ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک صدی ہو۔ وہ اس وقت سوائے رونے کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"حیدر صاحب آئے ہیں۔" اسے روتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب دین محمد نے اسے یہ اطلاع دی۔ وہ بے یقینی اور خوشی کے عالم میں اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو اسے دروازے ہی کی طرف دیکھتا ہوا پایا۔

"تم آج یونیورسٹی نہیں گئیں؟" اس کے فون بند کر دینے کے بارے میں کوئی بات کیے بغیر وہ ایک غیر متعلقہ بات پوچھنے لگا۔

"نہیں۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آج تمہاری کلاسز آف تھیں یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"آج کلاسز بھی تھیں اور میری طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہے۔" اس کی بھیگی ہوئی آواز میں ڈھیر سارے شکوے چھپے ہوئے تھے۔

"پھر تم یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں؟ تمہارے امتحانوں میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔ آخری دنوں میں یہ لاپروائی؟" وہ ناراضی سے یوں مخاطب تھا جیسے اس کے نزدیک اس کی پڑھائی سے زیادہ دوسری کوئی چیز اہم نہیں تھی۔ "جس کارکردگی کی میں تم سے توقع کر رہا تھا تم اس کا مظاہرہ نہیں کر رہی ہو۔ تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ بڑی خفگی کے ساتھ اس کی لاپروائیوں اور غلطیوں پر اسے سرزنش کرنے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ہوا تو آپ کو ہے۔" پڑھائی اور آفس سے متعلق اس کی بے موقع بازپرس نے اسے بہت دکھ میں مبتلا کیا تھا۔

CamScanner

"مجھے کیا ہوا ہے؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ مجھ سے کس بات پر ناراض ہیں؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟" وہ خود کو رونے سے مزید روک نہیں پائی تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں اور میں تم سے ناراض ہوں گا بھی کیوں؟" وہ تردیدی انداز میں بولا۔

"جھوٹ مت بولیں آپ اتنے دنوں سے مجھے اگنور کر رہے ہیں' سلام کا جواب دینے کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتے۔ حالانکہ آفس میں اس روز جو کچھ بھی ہوا' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولی۔

"بے وقوف لڑکی! میں تم سے نہ ناراض تھا اور نہ ناراض ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں آیا کیوں۔" اس کے لہجے میں وہی اپنائیت در آئی تھی جس کی وہ عادی تھی۔

"واقعی آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟" اس نے اس اپنائیت بھرے لہجے پر بے یقینی سے پوچھا۔

"ناراض ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ میں کیا پاگل ہوں جو بے وجہ تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

"کبھی کوئی وجہ ہو تب بھی مجھ سے ناراض مت ہویئے گا۔ میری زندگی میں آپ کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے میری پروا ہو۔"

"اس طرح سے نہیں کہتے ایما۔" وہ سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہارے پاس بہت سارے رشتے ہیں۔ تمہارے پاپا ہیں' تمہارا بھائی ہے' ان دونوں سے تمہارا خونی رشتہ ہے۔" اس نے اس کے چہرے پر سے اس کے ہاتھوں کو ہٹا دیا تھا۔

"پاپا.....؟ ہاں وہ ہیں مگر وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ جب تک میں ان کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی' انہیں نہ میری کوئی ضرورت تھی نہ مجھ سے کوئی مطلب۔ میری آؤٹ اسٹینڈنگ کارکردگی اور ذہانت نے انہیں مجھ پر توجہ دینے پر مجبور کیا ہے۔ اب وہ مجھ سے بات بھی کرنے لگے ہیں۔ مجھے اپنے آفس بھی بلانے لگے ہیں کیونکہ میں نے ان کی نظروں میں خود کو اس قابل ثابت کر دیا اور اگر میں ایسا نہ کر پاتی تو کہاں ہوتی؟ اور بھائی' اس سے ملی ہوئی محبت آپ کی مرہون منت ہے' ورنہ میں اس کے لیے ایک عام سی ہی لڑکی تھی۔"

"توفیق بھائی اور سارہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں ایما! اس بارے میں سارے شکوک اپنے دل سے نکال دو اور میں..... میں تو تمہارے ساتھ ہوں ہی۔ ہم کل بھی دوست تھے' ہم آج بھی دوست ہیں اور ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ میں تم سے ناراض نہیں تھا ایما! میں صرف تم سے شرمندہ تھا۔ جمیلہ نے اس روز جو کچھ بھی کہا' میں اس پر تم سے شرمندہ تھا۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بہت آہستگی سے بولا۔

"مجھے ان کی کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ مجھے نہیں پتا آپ کی زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے مگر میری زندگی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کا جو دل چاہے' سوچتی اور کہتی رہیں' میں پروا نہیں کرتی۔" اس نے تیز لہجے میں حیدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"غلطی میری ہے' میں اتنے مہینوں سے اگنور کر کے سمجھ رہا تھا کہ وہ مایوس ہو کر خود ہی واپس چلی جائے گی۔ تم نے پکنک پر دیکھا تھا' میں اس سے کس طرح ملا تھا۔ وہ فون کرتی تھی تو اس کی کال ریسیو نہیں کرتا تھا۔ آفس آتی تو میں ملتا نہیں تھا۔ اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح کرے گی تو میں نظر انداز کرنے والی پالیسی ترک کر کے ذرا سنجیدگی سے اسے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن خیر جو ہونا تھا' وہ تو ہو چکا ہے۔ آگے کے لیے یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تم جمیلہ بابر کے ہاتھوں دوبارہ کبھی کوئی تکلیف نہیں اٹھاؤ گی۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط اور ہموار تھا۔

چند لمحے وہ دونوں یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

"اب میں جاؤں؟" اس نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا دیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

"اب بالکل ٹھیک پڑھائی کرنی ہے' خوب دل لگا کر۔ تمہیں پتا ہے نا میں تمہیں کہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔" پورچ کی طرف آتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

"تم نے ایم بی اے کے لیے Apitude test کی تیاری بھی شروع کر دی تھی' اس کا کیا ہوا؟" اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کر رہی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس نے بغور ایما کی طرف دیکھا۔

"یہ سر جھکا کر 'کر رہی ہوں' کہنے کا مطلب مجھے پتا ہے۔ اگلی بار میں تم سے یہ سوال پوچھوں تو کوشش کرنا میری طرف دیکھ کر جواب دے سکو۔ ابھی نیویارک سے آتے ہی عابد صاحب نے تمہارے بارے میں مجھے کافی تفصیلی اور مایوس کن رپورٹ دی ہے۔ بیلنس شیٹ میں جو تم نے گڑبڑ کی تھی' وہ انہوں نے مجھے دکھائی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مس ایما ذہین ہیں مگر کام میں دلچسپی نہیں لے رہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں سرزنش کر رہا تھا اور وہ سر جھکا کر شرمندگی سے سن رہی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

وہ ایک مرتبہ پھر اپنی پڑھائی اور آفس کی مصروفیات میں مگن ہو گئی تھی۔ جمیلہ کی اس روز کی باتیں' ان کے رد عمل کے طور پر حیدر کا اسے اتنے دنوں تک نظر انداز کرنا' وہ ان تمام باتوں کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔

وہ پھر اس کے ساتھ ویسا ہی ہو چکا تھا جیسے پہلے تھا تو وہ بھی پچھلی کسی بات کے بارے میں سوچ کر خود کو مزید دکھ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے امتحانوں میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہو چکی تھی۔ توفیق کمال کئی مرتبہ اسے اپنے ساتھ مختلف میٹنگز میں لے جا چکے تھے۔ وہ اب میٹنگز میں پورے اعتماد کے ساتھ جاتی تھی۔ اسے وہاں جا کر صرف خاموش بیٹھنا ہوتا تھا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ امتحانوں سے چند دن پہلے ہی سے اس نے آفس آنا چھوڑ دیا تھا اور پھر امتحانوں کے دوران بھی وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ حیدر سے بھی فون کی حد تک ہی رابطہ تھا۔ امتحانوں کے بعد اس نے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر آفس جوائن کر لیا تھا۔ اس کے سیکھنے کی رفتار سے توفیق کمال بہت مطمئن تھے۔ ایک دو بار انہوں نے سرسری سے انداز میں اس کی یہ کہہ کر تعریف بھی کی تھی کہ وہ کام سیکھنے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ اول تو ان کے منہ

CamScanner

سے اتفاقاً ہی کسی کے لیے کوئی تعریفی جملہ نکلتا تھا اور اگر یہ اتفاق ہو ہی جاتا تھا تو پھر جس کی تعریف کی گئی ہوتی تھی وہ سو فیصد اس تعریف کا حقدار ہوتا تھا۔ اس کا ایم بی اے کے رجحان ٹیسٹ کا رزلٹ اس کے ماسٹرز کے رزلٹ سے پہلے آ چکا تھا۔ توقع کے عین مطابق وہ وہاں پر داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ حیدر نے پھول اور کارڈ دے کر اسے اس کامیابی پر مبارکباد دی جبکہ توفیق کمال کے اس کے ساتھ رویے میں پہلے سے بھی زیادہ تبدیلی آ گئی تھی۔

٭٭٭

وہ آفس میں تھی جب رامین نے اسے یونیورسٹی سے فون کر کے رزلٹ کے بارے میں بتایا۔ وہ اس سے بات کر کے بھاگتی ہوئی حیدر کے پاس آئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے۔"

"پہلے سانس بحال کرو پھر بولنا۔ مجھے تمہاری بات سنے بغیر کہیں نہیں جانا۔" اس نے اسے فوراً ٹوکا۔

"ابھی رامین کا فون آیا تھا۔ ہمارا رزلٹ آ گیا۔" حیدر کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

"کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا مجھے کہ یہی بات ہو گی۔ ویسے تو مجھے پتا ہے کہ کیا ہوا ہو گا پھر بھی میں یہ بات تمہارے منہ سے سننا پسند کروں گا۔" وہ اتنی دیر میں اپنی سانسیں ہموار کر چکی تھی اس لیے اس بار بہت سکون اور اطمینان سے اسے جواب دیا۔

"میں نے صرف اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن نہیں لی ہے بلکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی میری پہلی پوزیشن ہے۔ اور پوری فیکلٹی میں میری دوسری پوزیشن ہے۔"

وہ جواباً بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

"مجھے تم سے اسی کارنامے کی توقع تھی جب ہی تو میں نے تمہارے لیے گفٹ بھی پہلے ہی سے خرید کر رکھا ہوا ہے۔ افسوس وہ گھر پر رکھا ہے۔ ورنہ میں ابھی تمہیں دیتا۔" وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر آتی خوشی تھی جتنی خود ایمن کے چہرے پر بھی نہیں تھی۔

"تم نے توفیق بھائی کو بتایا؟" وہ اس سے گفٹ کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی بولا۔

"نہیں میں نے ابھی اور کسی کو نہیں بتایا۔" اس کے حساب سے حیدر مسعود کے لیے یہ بات بہت خوشی اور فخر کا باعث ہونی چاہیے تھی کہ وہ اسے اپنی زندگی میں کسی بھی دوسرے فرد سے زیادہ اہمیت دیتی ہے مگر وہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں سب سے پہلے توفیق بھائی کو بتانا چاہیے تھا ہماری کامیابیوں کے بارے میں جاننے کا سب سے پہلا حق ہمارے والدین کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان سے زیادہ ہماری کامیابیوں پر دوسرا کوئی بھی شخص خوش نہیں ہو سکتا۔" اسے حیدر کی یہ بے موقع نصیحت بالکل نہیں بھائی تھی مگر وہ اس سے اختلاف کر کے اپنا اور اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"جاؤ جا کر توفیق بھائی کو بتا کر آؤ۔ دیکھنا وہ کس قدر خوش ہوں گے۔ میں آفس میں ہی ہوں۔ انہیں بتا کر میرے پاس آ جانا۔ پھر ہم ساتھ بیٹھ کر اس خوشی کو سیلیبریٹ کریں گے۔" وہ بہت بردباری سے سمجھا کر دھیمے سے مسکرایا۔

"جلدی سے جاؤ۔ شاباش....." وہاں جانے پر ان کی سیکرٹری سے پتا چلا کہ اس وقت ان کے پاس کچھ غیر ملکی مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ اس نے ان سے انٹرکام پر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"بولو ایمن....." اس کی آواز سن کر انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرا رزلٹ آ گیا ہے اور میں....." وہ جواباً سنجیدگی سے انہیں یہ خبر دینے لگی تھی کہ وہ بے ساختگی سے اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"رزلٹ کی خبر انٹرکام پر دے رہی ہو۔ اندر آ جاؤ۔" وہ اس جواب کی امید نہیں کر رہی تھی اسی لیے حیران سی اندر آ گئی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ ام ایمن۔" انہوں نے سامنے بیٹھے تینوں افراد سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا ہوا؟" وہ اپنے مہمانوں سے نظریں ہٹا کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

"میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ پوزیشن لی ہے اور پوری فیکلٹی میں دوسری۔" وہ انہیں بہت سنجیدہ انداز میں یہ خبر سنا رہی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر اس انداز میں مسکرائے تھے جیسے انہیں اس سے یہی اطلاع ملنے کی امید تھی۔ ان کی مسکراہٹ فخریہ تھی۔ اس نے ان کے چہرے پر اپنے لیے یہ مسکراہٹ پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ اپنے مہمانوں کو انگریزی میں وہ بات بتانے لگے تھے جو اس نے ابھی ان سے اردو میں کہی تھی۔

"بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔" ان میں ایک نے فوراً مسکراتے ہوئے انہیں مبارک باد دی۔

"شکریہ....." وہ جواباً خوشگوار انداز میں مسکرا دیے۔

"میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ بہت محنتی اور قابل۔ میں اس سے ایسے ہی رزلٹ کی امید کر رہا تھا۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے فخر اور محبت تھی۔

"میری بیٹی" انہوں نے اس انداز میں کہا تھا جیسے ام ایمن کا ان کی بیٹی ہونا ان کے لیے بہت خوشی اور مسرت کا باعث ہے۔ پہلی مرتبہ وہ اتنے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔ وہ زینب کے ہاتھوں پرورش پانے کے باوجود ہو بہو اپنے باپ جیسی ہے۔ توفیق کمال جیسی۔ انہیں اپنے بزنس کے ان معاملات میں اب قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی جن پر وہ اس کے آنے سے پہلے تک اپنے غیر ملکی مہمانوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے لیے اس وقت اہم تھی ام ایمن۔ ان کی بیٹی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"مجھے تم پر فخر ہے ایمن!" ان کی نگاہیں اس سے یہ بات کہہ رہی تھیں۔ اگر آج امی زندہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس رکھی کرسی پر بٹھا لیا تھا۔ وہ توفیق کمال کے برابر بیٹھی تھی۔

"پرسوں ایک شاندار سی پارٹی رکھ رہا ہوں میں ایمن! تم اپنے سب دوستوں کو انوائیٹ کر لو۔ تمہاری

CamScanner

کامیابی کو میں بہت اچھی طرح سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہوں۔ پارٹی میں پہننے کے لیے بہت خوب صورت سا ڈریس آج ہی خرید لاؤ اور آفس سے چھٹی کر کے اپنے فرینڈز کے ساتھ آج کے دن کو اچھی طرح انجوائے کرو۔" انہوں نے اپنے والٹ میں سے بہت سارے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ خود بھی جواباً مسکرا دی۔ وہ اسے اپنے سے بہت دور اور بہت بلندی پر کھڑے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ان کے برابر میں کھڑی تھی۔ توفیق کمال کی بیٹی ام ایمن پورے فخر کے ساتھ اپنے باپ کے برابر میں کھڑی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

فنکشن کے لیے اس نے اپنی تیاری پر بھرپور توجہ دی تھی۔ بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد اس نے اپنے لیے لباس خریدا۔ وہ اپنے بیوٹی سیلون سے پارٹی میک اپ کروا کر آئی تھی۔ اتنا مکمل میک اپ اس نے پہلی مرتبہ کیا تھا اس لیے خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

بائیں ہاتھ میں خود ڈھیر ساری کانچ کی سیاہ اور سرخ چوڑیاں پہنی تھیں جب کہ دائیں ہاتھ میں حیدر کا گفٹ میں دیا ہوا قیمتی بریسلٹ پہنا تھا۔ گولڈ کا بے حد خوب صورت اور بیش قیمت بریسلٹ اس نے ایمن کو پرسوں رات پی پی کے ساتھ ان کے گھر پر آ کر دیا تھا۔

وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو سب سے پہلے الماس سے اس کا سامنا ہوا۔ انہوں نے بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

"سائرہ کا فون آیا تھا۔ بہت اداس ہو رہا تھا کہ میں آپ سب سے اتنا دور ہوں کہ چاہنے کے باوجود اس پارٹی میں شرکت نہیں کر سکتا۔"

"میرے پاس بھی اس کی E-mail آئی ہے۔ ایمن! میں آپ کے پاس اڑ کر آنا چاہتا ہوں' کاش میرے پر ہوتے۔" وہ مسکراتے ہوئے انہیں سائرہ کی میل کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

توفیق کمال نے پارٹی کے انتظامات بہت شاندار کروائے تھے۔ انہوں نے پارٹی میں اپنے تمام دوستوں اور دیگر احباب کو مدعو کیا تھا۔

اور ایک بڑی تعداد ایسے دوستوں اور ان کی فیملیز کی بھی تھی جن سے وہ پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔

"یہ جاوید غیاث ہیں۔ بزنس کے حوالے سے تو ہمارا آپس میں تعلق ہے ہی مگر بزنس سے علاوہ بھی ہم آپس میں بہت اچھے دوست ہیں۔ یہ ان کی مسز ہیں اور یہ ان کا بیٹا ہے شہیر جاوید۔" انہوں نے اپنے ایک دوست اور اس کی فیملی کا استقبال کرتے ہوئے اس کا ان لوگوں سے تعارف کروایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ ان کی بیگم نے ایمن کے ہاتھ میں گفٹ دیتے ہوئے اسے پیار کیا اور دی۔

"آخر بیٹی کس کی ہے۔ اسے اسی طرح کا کوئی غیر معمولی کام ہی کر کے دکھانا تھا۔" جاوید غیاث نے ہنستے ہوئے اپنی بیگم سے کہا۔

توفیق کمال اس تعریف پر خوش دلی سے مسکرائے۔

شہیر جاوید کی خود پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پڑنے والی نگاہوں کو اس نے محسوس کیا تھا اور اسے اس بات پر کچھ

خاص حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت پارٹی میں موجود بہت سارے لوگ اسے بہت توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ توفیق کمال کی بیٹی تھی' وہ بے تحاشا ذہین تھی۔ اور وہ آج بے حد خوبصورت بھی لگ رہی تھی۔

وہ دامن وغیرہ کی باتوں پر مسکراتے ہوئے آگے بڑھی تو سوفٹ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں لیے شہیر اس کے پاس آ گیا۔ وہ اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر اخلاقاً مسکرائی۔

"انکل بتا رہے ہیں کہ آپ MBA کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ نے باقاعدہ ان کا آفس بھی جوائن کر لیا ہے؟" اس کا استفہامیہ انداز شائستگی لیے ہوئے تھا۔

"جی....." وہ مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئی۔

"دیکھنے سے لگتا نہیں ہے اصل میں ہمارے ہاں بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ پڑھنے کی طرف لڑکیاں ذرا کم ہی جاتی ہیں۔ شاید یہ ٹیکنیکس انہیں مشکل لگتے ہیں۔" وہ جواباً ہلکے انداز میں مسکرائی۔

"آپ بہت کم بولتی ہیں' ویسے کہا بھی یہی جاتا ہے کہ ذہین لوگ بولتے کم ہیں سوچتے زیادہ ہیں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟" اس نے اپنے بارے میں اسے مزید کوئی تبصرہ کرنے کا موقع دیے بغیر اس سے پوچھا۔

"میں اپنے بڑے تینوں بھائیوں کی طرح ڈیڈی کے ساتھ ہمارے فیملی بزنس میں شامل ہوں۔ ایک سال ہوا مجھے بزنس میں آئے ہوئے۔ اس سے پہلے لندن پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ابھی تک یہاں کے کاروباری طور طریقوں کے مطابق خود کو زیادہ اچھی طرح ڈھال نہیں سکا۔ ڈیڈی پچھلے ایک سال سے مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کاروباری دوستوں کو وقتاً فوقتاً اپنے پاس لنچ اور ڈنرز وغیرہ کے لیے مدعو کرتے رہنا چاہیے اور ان کی طرف سے دی گئی پارٹیوں اور ڈنرز میں بھی لازمی طور پر شرکت کرنی چاہیے۔" وہ اسے جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔

"لیکن آپ کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آ رہی۔" وہ جواباً گویا ہوئی۔

"بالکل نہیں آ رہی۔ آج یہاں بھی ڈیڈی کے کہنے پر بغیر موڈ کے آیا تھا۔ لیکن اب آنے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ آج یہاں نہ آتا تو بہت بڑی غلطی کرتا۔ شاید اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔" وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"پاپا کی دی ہوئی پارٹیز ہمیشہ ہی شاندار ہوتی ہیں۔" وہ پُراعتماد انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے معنی خیز انداز اور نگاہوں پر نروس ہونے یا اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"معاف کیجیے گا میں ذرا باقی مہمانوں سے مل لوں۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بول کر گفتگو کو طول دینے کی کوشش کرتا وہ شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی' وہ سب لوگوں سے مل رہی تھی۔ باتیں کر رہی تھی۔ مگر اس کی نگاہیں بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔

حیدر اور پی پی کو اندر آتے دیکھ کر اس کا انتظار تو ختم ہو گیا مگر ساتھ ہی ناراضی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے

لیا۔ "اتنی دیر سے آئے ہیں آپ لوگ۔ میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔"

"میں بالکل ٹھیک ٹائم پر تیار ہو گئی تھی پیچھا! حیدر کا ایک فون آ گیا تھا۔ بس اسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ ویسے اگر تم حیدر سے دیر ہونے پر لڑنا چاہتی ہو تو ضرور لڑو کیونکہ دیر اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔" بی بی نے اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے گفٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بالکل نازک سی گڑیا جیسی۔"

بی بی کی تعریف پر وہ مسکرا دی۔

الماس نے بی بی اور حیدر کی طرف دیکھ لیا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے فوراً ان لوگوں کے استقبال کے لیے چلی آ گئیں۔ الماس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ توفیق کمال نے بھی انہیں دیکھ لیا۔ حیدر اور بی بی ان کے لیے جتنے خاص الماس تھے تو ان کا تو انہیں والہانہ انداز میں اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرنا ہی تھا۔ حیدر سب لوگوں سے ملنے ملانے میں مصروف ہو گیا۔

اسے اس کے اس درجہ سوشل ہونے پر سخت طیش آ رہا تھا۔ کھانے کے وقت وہ تنہا نظر آیا تو وہ اس کے پاس پہنچی۔ "اب اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"بتایا تو تھا تمہیں بی بی نے میرا فون آ گیا تھا۔" وہ اس کے غصے کے جواب میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"ایک تو اتنی دیر سے آئے ہیں اور مجھ سے بالکل بھی بات نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ میری تعریف بھی نہیں کی ہے۔"

"تعریف کس بات کی؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ کھانا تم نے نہیں پکایا۔" وہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر قید کرتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"آج سب نے میری تعریف کی ہے سوائے آپ کے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے اسی روٹھے لہجے میں بولی۔

"یہ پہلی مرتبہ پتا چلا کر تعریف اس طرح زبردستی خود اپنے منہ سے کہہ کر بھی کروائی جاتی ہے۔" وہ نگاہوں میں محظوظ سی مسکراہٹ لیے اسے چھیڑنے لگا۔

"اتنے سارے تعریفی جملے تو تم سن چکی ہو گی۔ میرے بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ اچھی لگ رہی ہو، پیاری لگ رہی ہو، بہت خوب صورت لگ رہی ہو اور اسی نوعیت کے دیگر ڈھیر سارے جملے۔ میں تو اتنی دیر سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ مس الماس مرکز نگاہ بنی ہوئی ہیں۔" وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تو اس نے قدرے سنجیدگی اختیار کر کے کہا۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ دوسروں کی تعریف اور اس کی تعریف اس کے لیے ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا جملہ بھی کہتا جو پہلے وہ سن چکی ہوتی، تب بھی اس کے منہ سے سن کر وہ بالکل نیا اور بے حد خوبصورت لگتا۔

"آپ نے یہ دیکھا؟" اس نے اپنا بریسلٹ والا ہاتھ اسے دکھایا۔

"بالکل دیکھ چکا ہوں اور مسلسل یہ بات سوچ رہا ہوں کہ جب میں نے اسے خریدا تھا تو اس وقت تو یہ اتنا

خوبصورت نہیں لگ رہا تھا جتنا آج لگ رہا ہے۔" وہ اپنے جملے کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "بس اب خوش ہو گئی ہو، میں نے تمہاری تعریف۔ اب اس محفل میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے تمہاری تعریف نہ کی ہو۔"

وہ اس کے مذاق کو انجوائے کرتے ہوئے خود بھی ہنس پڑی۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی چوڑیاں اتارنے میں مصروف تھی کہ توفیق کمال پہلی مرتبہ اس کے کمرے میں چلے آئے۔ اور انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر اس کی ایسی حالت ہوئی تھی جیسے کسی غریب کی کٹیا میں کسی ملک کا بادشاہ آ جائے۔

"پاپا آپ.....؟" بوکھلائے ہوئے انداز میں وہ کچھ نہیں پا رہی تھی کہ ان سے کیا کہے۔ ان کے لبوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔

"یہ تمہارا گفٹ ہے۔" انہوں نے ایک خوبصورت سی چین میں لگی گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی۔

"تمہاری گاڑی شام سے ہی پورچ میں کھڑی ہے۔ شاید تم نے نوٹ نہیں کیا۔" وہ اس کی حیرت کے جواب میں اسی مسکراہٹ سمیت گویا ہوئے۔

"تھینک یو پاپا۔" اس نے چابی ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"مجھے تم سے بہت ساری امیدیں ہیں۔ اب MBA بھی اسی شاندار طریقے سے کرنا جیسے ایم اے کیا ہے۔ میں نے جب IBA سے MBA کیا تھا تو میری فرسٹ پوزیشن آئی تھی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی بھی اس تاریخ کو دہرائے۔" وہ جواباً پر عزم انداز میں مسکرا دی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑے مگر جیسے انہیں اچانک ہی کوئی بات یاد آ گئی۔ "تم آج بہت اچھی لگ رہی تھیں۔" ان کے منہ سے نکلی یہ تعریف اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ ایک عجیب سی بچکانہ خواہش اس کے دل میں مچلی تھی۔ ان کے گلے لگ جانے کی خواہش۔ ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے کی خواہش۔

مجھے اتنے عرصے تک کیوں بھولے رہے؟ یہ شکوہ کرنے کی خواہش۔ مگر وہ اپنی اس بچکانہ خواہش پر عمل نہیں کر سکی تھی۔

وہ کتنا بھی خود سے جھوٹ بولتی کہ اسے توفیق کمال سے محبت نہیں۔ مگر اس سچ کو اس لمحہ جھٹلا نہیں پا رہی تھی کہ اس کے لیے توفیق کمال بہت اہم ہیں۔

وہ جس طرح اپنی ماں کے ابنارمل رویوں کے باوجود ان سے محبت کرتی تھی اسی طرح باپ کے غیر جذباتی اور خشک انداز کے باوجود ان سے بھی محبت کرتی تھی۔

انہیں اپنے کمرے تک لانے میں اسے ڈھائی سال لگے تھے اور یہ وہ جانتی تھی کہ صرف ڈھائی سال کیا، وہ ڈھائی سو سالوں تک بھی ان کی آمد کی منتظر رہتی۔ وہ تب بھی اس کے پاس نہ آتے اگر حیدر مسعود اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے قدم بقدم چلنا سکھاتا ہوا اس مقام تک لے کر آیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے

برابر میں کھڑی ہو سکے ورنہ وہ تو آج بھی وہی ام ایمن ہوتی جو لوگوں سے بات نہیں کر سکتی تھی جسے خود پر اپنی صلاحیتوں پر ذرا بھی بھروسہ نہیں تھا۔

وہ اس شخص کو کیا نام دے۔ اپنا دوست' اپنا محسن' اپنا سچا خیر خواہ یا وہ شخص جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے سب کچھ تھا۔

⊛⊛⊛

شام میں وہ نہا کر گیلے بال سکھانے اور ٹھنڈی ہوا میں کچھ دیر کھڑے ہونے کے لیے ٹیرس پر آ گئی۔ لان پر نگاہ پڑی تو وہاں لان چیئرز پر توفیق کمال اور الماس کے ساتھ حیدر بیٹھا نظر آیا۔ اسے پتا تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بزنس سے ہی متعلق ہوگی۔ وہ اب پورے اعتماد کے ساتھ ان کی کاروباری گفتگو میں بھی شریک ہو سکتی تھی اس لیے اس نے لان میں جانے کا فیصلہ کیا۔

"کیسے گزرے صبح کے پل؟" اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

رشیدہ نے سب کے آگے چائے کے کپ رکھ دیے تھے۔

"ایمن کے لیے دو جگہوں سے پرپوزلز آئے ہیں۔" چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے حیدر کو بتایا۔ بزنس کے بارے میں باتیں کرتے کرتے انہوں نے یک دم ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ الماس کے چہرے پر ایسی حیرت نظر آ رہی تھی جیسے وہ اس بات سے لاعلم تھیں۔

"اچھا کہاں سے؟" سینڈوچ کھاتے ہوئے اس نے مطمئن سے انداز میں پوچھا۔

"کل پارٹی ہی میں پسند کیا ہے انہوں نے ایمن کو۔ آج صبح دس بجے جاوید غیاث کا فون آیا تھا۔ شہیر کے لیے وہ ایمن کے رشتے کی بات کر رہے تھے پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے ارسلان خان کا فون آیا وہ بھی اپنے بیٹے کے لیے ایمن کا رشتہ چاہ رہے ہیں۔" توفیق کمال نے سنجیدگی سے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ ویسے جیسی یہ کل لگ رہی تھی اس حساب سے دو رشتے بہت کم ہیں۔ میرا خیال تھا کم از کم آٹھ دس رشتے تو ضرور آئیں گے۔" وہ ایک شوخ سی نگاہ ایمن پر ڈال کر ہنسا۔ توفیق کمال جواباً مسکرا دیے جبکہ الماس مسکراتے ہوئے بولیں۔

"تمہارا اندازہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ مجھ سے بھی رات پارٹی میں کافی لوگوں نے ایمن کے بارے میں پوچھا تھا۔ رشتے کی بات تو خیر مجھ سے کسی نے نہیں کی مگر ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ ضرور پوچھا کہ ایمن کی کہیں منگنی یا بات تو طے نہیں ہوگی۔"

"پھر تو توفیق بھائی! آپ مزید پرپوزلز کے لیے تیار رہیے۔ میرا خیال ہے سارے رشتے منظر عام پر آ جائیں پھر اس بارے میں غور و فکر کیجئے گا۔" وہ توفیق کمال کی دی ہوئی اطلاع پر سکتے میں نہیں آئی تھی حیدر مسعود کی خوشی اور اطمینان کو دیکھ کر سکتے میں آ گئی تھی وہ اس بات پر اتنا خوش کس طرح ہو سکتا تھا۔

"فی الحال جو دونوں پرپوزلز آئے ہیں ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" توفیق کمال نے بڑی سنجیدگی سے حیدر سے دریافت کیا۔

"ویسے تو اس معاملے میں ایمن کی رائے اور اس کی مرضی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے پھر بھی چونکہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو میرا خیال ہے شہیر جاوید کا رشتہ ایمن کے لیے بہترین ہے۔ ارسلان کا بیٹا پکا بزنس مین ہے۔ ہر وقت دو اور دو چار کرنے والا۔ جبکہ شہیر ایسا نہیں ہے۔ بزنس میں ہونے کے باوجود بہت زیادہ کاروباری ذہنیت نہیں رکھتا۔ ایمن کسی خشک مزاج بزنس مین کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔

پچھلے سال جب میں لندن گیا' تب وہ وہیں پر تھا وہاں دو تین جگہوں پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میری اس سے گفتگو ہوئی تھی اور اس گفتگو نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کی سوچ کافی پختہ ہے۔ ویسے جاوید صاحب کے گھر کے ماحول کے بارے میں تو میں زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا۔ آپ کی ان سے زیادہ دوستی ہے' اس بارے میں آپ کو زیادہ بہتر معلوم ہوگا۔ میں تو انہیں صرف بزنس ہی کے حوالے سے جانتا ہوں لیکن اگر صرف شہیر کے بارے میں، میں بات کروں تو وہ لڑکا مجھے بہت پسند ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کی عمر میں تین چار سال سے زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ دونوں ہم عمر ہوں تو آپس میں انڈر اسٹینڈنگ آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ایک ہی ایج گروپ میں ہونے کی وجہ سے دونوں کی سوچ اور زندگی کے بارے میں نظریات کسی حد تک ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔" حیدر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ان کے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

"مجھے بھی جاوید کی فیملی بہت پسند ہے۔ شہیر کے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے جو تمہاری ہے۔" توفیق کمال نے اسے جواب دیا۔

"آپ ایسا کر لیں نا توفیق بھائی! کہ جاوید صاحب کی فیملی کو کسی دن ڈنر پر انوائٹ کر لیں۔ یہ اسے دیکھ لے سمجھ لے اور سب سے بڑی بات کہ پسند کر لے پھر ہی آگے کے بارے میں سوچیے گا۔" وہ انہیں جواب دیتا ہوا ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ حیدر مسعود کی مسکراہٹ جو اسے بے حد پسند تھی آج ایک دم ہی ناقابل برداشت لگنے لگی۔ وہ اتنا خوش کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا اسے اس خبر نے ذرا سی بھی تکلیف نہیں دی کہ ایمن کی زندگی میں ایک دوسرا مرد آنے والا ہے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم! ہم دونوں اسلام آباد ہو آئیں پھر کسی دن میں جاوید کو اس کی فیملی کے ساتھ گھر پر انوائٹ کر لوں گا۔" وہ لوگ اب دوبارہ بزنس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اس نے اپنی ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کو ایک گھونٹ میں ختم کیا۔ سینڈوچ کو بے دلی سے حلق سے نیچے اتارا اور پھر اپنا کپ ٹیبل پر رکھ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ رو رہی تھی' وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ صرف یہ سوچ کر ہی اسے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں کہ اس کی زندگی میں حیدر مسعود کے علاوہ دوسرا کوئی شخص بھی آ سکتا ہے۔ وہ رات کے کھانے کے لیے بھی باہر نہیں گئی' وہ ساری رات جاگتی اور بہت کچھ سوچتی رہی تھی۔

⊛⊛⊛

توفیق کمال کو اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد چلے جانا تھا۔ وہ ان کے جانے سے پہلے ہی شہیر والی مصیبت سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ صبح وہ ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے

تھے۔ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونک گئے تھے۔

"پاپا! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میرا مطلب ہے جب تک میں ایم بی اے نہ کرلوں اس وقت تک۔" سلام کرکے فوراً بعد اس نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات ان سے کہی۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے حیرت یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"ویسے ابھی اگر میں تمہاری انگیجمنٹ کردوں اور شادی ایم بی اے کے بعد تو؟"

"نہیں انگیجمنٹ بھی نہیں۔ ابھی میں اس طرح کے کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مجھے پڑھنا ہے پھر آفس میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ شادی وغیرہ کے بارے میں دو تین سال بعد بھی تو سوچا جا سکتا ہے۔" وہ جتنے اعتماد سے ان کے ساتھ بات کررہی تھی اس پر خود اسے بھی حیرت ہورہی تھی۔ اس کے انکار پر ان کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دو تین سالوں بعد جب تم شادی کے بارے میں سوچنے لگو تو مجھے بتادینا اور اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو وہ بھی بے خوف و بے جھجک مجھے بتادینا۔ تمہاری شادی تمہاری پسند سے کرنے پر مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ان کے جواب نے اس کی ایک مشکل تو آسان کردی تھی مگر جہاں اس کی مرضی ہے وہاں اس کی شادی ہوگی کیسے۔ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

حیدر مسعود اور توفیق کمال کی اسلام آباد سے واپسی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایئرپورٹ سے سیدھے آفس ہی آگئے تھے۔ لنچ سے کچھ پہلے توفیق کمال نے اسے اپنے پاس بلایا۔ الماس بھی وہیں تھیں۔ وہ اسے کل آفس میں ہونے والی ایک اہم میٹنگ سے متعلق چند اہم نکات سمجھانا چاہتے تھے۔ وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھی بغور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسی دوران ملازم نے کھانا لگا دیا تو وہ تینوں کھانے کے لیے آکر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"فلائٹ ٹائم پر تھی؟" الماس کے استفسار پر وہ سنجیدگی سے بولے۔

"ہاں فلائٹ ٹائم پر تھی۔ نو بجے ہم لوگ کراچی پہنچ گئے تھے۔" ایمان نے اپنی پلیٹ میں فرائیڈ فش اور بیک ہوئے آلو ڈال لیے۔

"حیدر فاطمہ کے ساتھ شادی کررہا ہے۔" وہ یہ خبر الماس کو سنا رہے تھے مگر الماس کے کسی حیرت بھرے استفسار سے پہلے توفیق کمال اور الماس دونوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر میز پر گری تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ بہت بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"کوئی بات نہیں۔" الماس اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے فوراً بولیں۔

وہ اپنی اس بے اختیارانہ حرکت کے بعد اب کھانا کھائے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں اٹھنا چاہتی تھی اسی لیے توفیق کمال کے دوسری پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑانے پر اس نے فوراً پلیٹ لے لی تھی اور تھوڑے سے چاول بھی اپنی پلیٹ میں ڈال لیے تھے۔

"آپ حیدر کی فاطمہ سے شادی کے بارے میں بات کررہے تھے۔" الماس نے کچھ دیر پہلے ادھوری رہ جانے والی بات کو دوبارہ شروع کیا۔ اسے پتا نہیں کیوں ایسا لگا جیسے الماس نے یہ ذکر جان بوجھ کر دوبارہ چھیڑا ہے۔ وہ پلیٹ پر نظریں مرکوز رکھنے کے باوجود یہ محسوس کررہی تھی کہ الماس کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کررہی تھی مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر ناکام ہورہی ہے۔

"یہ بالکل اچانک کیسے حیدر نے فاطمہ سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ کبھی ذکر تک نہیں کیا اس نے ایسی کسی بات کا۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ فاطمہ بس حیدر کی ایک قریبی دوست ہے۔"

"مجھ سے آج صبح پلین میں حیدر نے یہ بات ڈسکس کی کہ وہ فاطمہ سے عنقریب شادی کرنے والا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ جب جمیلہ سے اس کی علیحدگی ہوئی تھی تو فاطمہ نے خود اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت چونکہ وہ شادی کے لیے سنجیدہ نہیں تھا اس لیے اس نے فاطمہ کو منع کردیا تھا مگر اب وہ اپنی فیملی لائف کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔

بی بی کے لیے بھی بات بہت خوشی کی ہے کہ حیدر شادی کے لیے مان گیا ہے۔ بتا رہا تھا کہ آج کل میں وہ باقاعدہ فاطمہ کو پرپوز کرکے شادی کی تاریخ طے کرے گا۔

ماریہ اور مکرم بچوں کے ساتھ اگلے مہینے پاکستان آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے اُن ہی دنوں کی کوئی تاریخ رکھے گا حیدر۔" انہوں نے الماس کو بڑا مفصل جواب دیا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں موجود چاول ختم کرچکی تھی۔

"میں جاؤں پاپا!" انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بغیر کچھ کہے انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا اور دوبارہ الماس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ ان کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے تیز رفتاری سے چلتے قدموں کا رخ حیدر مسعود کے آفس کی طرف تھا۔

"آجاؤ ایمان!" دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر اسے دیکھ کر اس کے لبوں پر فوراً ہی خیر مقدمی مسکراہٹ آگئی۔

"بیٹھو۔" کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"لنچ کرلیا تم نے؟" اس نے ابھی بھی سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

"آپ فاطمہ کے ساتھ شادی کررہے ہیں؟" اس کے سوال میں غصہ زیادہ تھا یا صدمہ اسے خود نہیں معلوم تھا۔ وہ کی بورڈ اور مانیٹر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"تم مجھے مبارک باد دینے آئی ہو یا ناراض ہونے؟" اس کی یہ آخری آس بھی دم توڑ گئی تھی کہ شاید یہ خبر جھوٹی ہو۔ وہ مسکراتا ہوا اتنا خوش نظر آرہا تھا جیسے شادی کا یہ فیصلہ اس کے لیے بہت خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔

"تمہارے تاثرات تو یہ بتا رہے ہیں کہ تم ناراض ہونے آئی ہو۔ ویسے تمہاری ناراضی ٹھیک بھی ہے۔ مجھے یہ بات سب سے پہلے تمہیں بتانی چاہیے تھی۔ بس باتوں باتوں میں توفیق بھائی سے میں ذکر کر بیٹھا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی ناراضی اور شکایت دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

CamScanner

"آپ فاطمہ سے شادی کس طرح کر سکتے ہیں؟" غصے سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"کیوں نہیں کرسکتا بھئی! اتنی اچھی لڑکی ہے وہ۔ میں اسے اتنے سالوں سے جانتا ہوں۔ تم بھی تو اس سے مل چکی ہو۔ تم بتاؤ کیا وہ میرے لیے مناسب ترین لڑکی نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' مہذب ہے' مسلمان ہے' میری اور اس کی سوچ میں بہت ہم آہنگی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ بی بی کتنے عرصے سے شادی کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں اور میں انہیں ٹال رہا تھا۔ اب میں انہیں مزید ناراض نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی اس عمر میں اب مجھے شادی کر ہی لینی چاہیے۔ آخر بزنس کے جھمیلوں کی وجہ سے اور کتنا اپنی زندگی کے اس اہم ترین معاملے کو ٹالوں گا۔" اس نے اس بار بڑی سنجیدگی اور متانت سے اسے جواب دیا تھا۔

"یہ ساری خوبیاں تو مجھ میں بھی ہیں۔ میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں' مہذب ہوں' مسلمان ہوں' آپ کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔" وہ مشتعل انداز میں بولتے بولتے حیدر کے درمیان میں ٹوک دینے کی وجہ سے چپ ہوگئی تھی۔ "کیا بدتمیزی ہے یہ ایما!" وہ بہت ناراضی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ کی جگہ ناراضی اور ناپسندیدگی نے لے لی تھی۔

"میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہی ہوں۔ اچانک ہی آپ کو شادی کر لینے کا خیال کیسے آ گیا۔ پرسوں پاپا کے ساتھ بیٹھ کر شمیم جاوید کی خوبیاں گنوا رہے تھے اور آج فاطمہ کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ جب آپ کو پتا ہے کہ میں کیسے آدمی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں تو کیا آپ کو نہیں پتا کہ ایسا صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ آپ ہیں۔" اس کی ناراضی نے اس کے غصے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

"بہت فضول اور غلط بات کر رہی ہو تم ایما! تمہیں پتا ہے تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔ تمہیں کسی اور انداز سے دیکھنے کا تو میں کبھی تصور تک نہیں کرسکتا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ بے ہودہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟"

"آپ کو محبت کرنا بے ہودگی لگتا ہوگا مجھے نہیں۔ مجھے پتا ہے آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ صرف جمیلہ کی اس روز کی باتوں کی وجہ سے آپ اپنی محبت سے منکر ہوگئے ہیں۔ اسی نے یہ "عمر میں کتنی چھوٹی" والی بات آپ کے ذہن میں ڈالی تھی۔" وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"دماغ خراب ہوگیا تھا جمیلہ کا اور دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ میرے کس انداز سے تم نے یہ اندازہ لگایا کہ میں تمہارے لیے اس طرح سوچتا ہوں۔ کبھی میں تم سے چھپ کر اکیلے میں نہیں ملا' کبھی میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ تمہیں سب سے چھپا کر رکھنے کا کہوں' کہیں تمہارے ساتھ کہیں گیا یا تم سے ملا تو علی الاعلان۔ جس لہجے میں تم سے اکیلے میں بات کرتا ہوں اسی میں توفیق بھائی' الماس آپا اور بی بی کے سامنے بھی بات کرتا ہوں۔ تم میرے لیے ہمیشہ میری بہت چھوٹی اور پیاری سی دوست رہی ہو۔ جمیلہ کی گندی ذہنیت کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اگر اس کی باتوں نے تمہیں اس سوچ میں مبتلا کیا تھا تو پلیز اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکال دو۔" اس کا لہجہ بہت زیادہ ناراضی اور خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔

"آج کے بعد یہ فضول بات تم میرے ساتھ مت کرنا ایما! تم ابھی بہت چھوٹی اور معصوم ہو۔ پتا نہیں کیسے اس قسم کی فضول اور غلط بات تمہارے ذہن میں آ گئی۔ بہرحال جو بھی ہے' اس بات کو یہیں پر ختم کردو۔ ذرا سوچو اگر توفیق بھائی کو ایسی کسی بات کے بارے میں کچھ علم ہوا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا' تم پر بھی اور مجھ پر بھی۔ وہ کیا سوچیں گے کہ میں ان کی بیٹی سے دوستی کی آڑ میں افیئر چلا رہا تھا۔" وہ اسے یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس سے محبت کر کے ایک بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہے اور اپنے اس گناہ کو اسے سب سے چھپا لینا چاہیے۔ اس کا جوش اشتعال' صدمہ اور رنج میں بدلتا جا رہا تھا۔

وہ اس کی محبت کو حماقت اور بے وقوفی قرار دے کر اسے اس حماقت سے باز رکھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کس بات کا یقین کرے' وہ بات جو پچھلے ڈھائی سالوں سے اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا اس کا یا وہ جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بول رہا تھا۔

"تم یہاں پر بیٹھو ہم آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔" اس کے چہرے پر نجانے کس طرح کے تاثرات ابھرے تھے جنہوں نے حیدر کو اپنا لہجہ نرم اور شیریں کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ دوستانہ اور پرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں تمہاری عمر کا کوئی لڑکا نہیں مل رہا تھا جو اس کے پیچھے پڑی ہو۔" جمیلہ کی آواز ایک دم اس کی سماعتوں میں گونجی تھی۔ کیا واقعی وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ کیا اس کی حیدر مسعود سے محبت یک طرفہ ہے؟ اس نے جمیلہ کی باتوں کو بھی اہمیت نہیں دی تھی مگر اس وقت اسے جمیلہ کا حقارت بھرے انداز میں کہا گیا یہ جملہ نشتر کی طرح چبھا تھا۔

"پلیز بیٹھو ایما!" اس نے بڑی نرمی سے ایک مرتبہ پھر اس سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"میں آپ کی زندگی میں کس جگہ پر ہوں حیدر مسعود؟" وہ آج سارے سچ سن لینا چاہتی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں ایما! یہ کس طرح کے بے وقوفانہ سوالات کر رہی ہو۔ کیا تمہیں نہیں پتا کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔ تم میری اتنی پیاری دوست ہو۔"

"آپ بات کو گھما پھرا کر جواب مت دیں۔ آپ کو پتا ہے میں آپ سے کیا پوچھ رہی ہوں۔ یہ "پیاری دوست" اور "اہم ہو" والی باتوں سے میں مطمئن نہیں ہوسکتی۔ آپ سیدھا اور صاف جواب دیں مجھے۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر دوٹوک انداز میں بولی۔

"ایما! تمہیں کیا....."

"کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟" اس نے انگلی اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے بے لچک انداز میں پوچھا۔ حیدر نے تھک کر ایک گہری سانس لی تھی۔

"نہیں۔" کمرے کی چھت اسے اپنے سر پر آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ اس کے ملبے تلے دبنے سے پہلے اس سے ایک آخری سوال پوچھنا چاہتی تھی اور وہ آخری سوال اس کے لیے اس کی زندگی سے بھی زیادہ اہم تھا۔

CamScanner

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟"
"میں تم سے محبت کرتا ہوں ایما! مگر اس طرح سے نہیں جیسے......"
"کرتے ہیں یا نہیں؟" وہ چھت کو اپنے سر سے چند انچوں کے فاصلے پر دیکھ رہی تھی۔
"نہیں۔" اور چھت اس کے سر پر آ کر گر چکی تھی۔ وہ بے یقینی اور حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اندھا دھند کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ وہ اپنے کیبن میں گاڑی کی چابی اور اپنا بیگ اٹھانے گئی تھی۔ وہ لفٹ کی طرف تیز قدموں سے جا رہی تھی جب اسے اپنے پیچھے کوریڈور میں ایک آواز سنائی دی۔
"ایما!" وہ اس آواز کو زندگی میں دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جنونی انداز میں لفٹ کا بٹن دبا دیا تھا۔ "تم اس طرح سے کہاں جا رہی ہو؟ سکون سے بیٹھ کر ساری بات سمجھنے کی......" لفٹ کا انتظار ترک کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی تھی۔ اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے اس طرح بھاگتے دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔ وہ اس جگہ سے جلد سے جلد دور چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ وہ اس کی طرح بھاگ نہیں رہا تھا اس لیے وہ اس سے خاصا پیچھے تھا۔
"مس ام ایمن! جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں میں ان سے دوستی کر لیتا ہوں ان کی پروا کرتا ہوں ان کا خیال رکھتا ہوں ان کی فکر کرتا ہوں۔" وہ پیچھے سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا اس سے کیا کہہ رہا تھا اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔
"ایما! پلیز تم رک کر میری بات سنو۔"
"تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں تمہاری ہنسی کتنی پیاری ہے۔" وہ سیڑھیاں اتر کر ریسپشن لابی میں آ چکی تھی۔
"جب تمہاری ہنسی اتنی خوب صورت ہے پھر تم ہنسنے میں اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہو۔" وہ پارکنگ میں آ گئی تھی۔
"ابھی تمہیں خود نہیں پتا لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ اگر کوئی تمہیں صحیح سمت میں چلنا سکھا دے تو تم کہاں پہنچو گی۔" اس کے خود تک پہنچنے سے پہلے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔
اس نے گاڑی اپنے گھر کے گیٹ کے باہر ہی روک دی۔ چوکیدار کے گیٹ کھول دینے کے باوجود وہ گاڑی اندر نہیں لائی تھی۔ اس کے گیٹ سے اندر گھستے ہی ایک دوسری گاڑی بھی گیٹ پر آ کر رکی تھی۔
"ایما! رکو۔" وہ دور سے چلایا تھا۔
"میں بھی بہت خوش ہوں ایما! تم اپنے چہرے کے ان خوشی بھرے تاثرات کو سنبھال کر رکھو۔ تمہاری روتی بسورتی شکل سب سے زیادہ میں نے ہی دیکھی ہے۔ تو اب ہنستی اور خوش ہوتی ایما کو بھی سب سے پہلے میں ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔" اسے ہنستی اور خوش ہوتی ہوئی ایما پسند تھی تو وہ اسے روتی ہوئی ایما کی شکل دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ اسے پیچھے پورچ سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ اندھا دھند

سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے وہ کارپٹ پر گر گئی تھی۔ آج ام ایمن کے لیے زندگی میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اسے اپنے تہی رہ جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس بات پر نہیں رو رہی تھی کہ وہ حیدر مسعود کے سامنے اپنی انا اور اپنی عزت نفس گنوا کر آئی ہے بلکہ اس بات پر رو رہی تھی کہ اپنی زندگی میں موجود جس واحد شخص سے وہ یہ امید رکھتی تھی کہ وہ اسے کبھی کوئی دکھ نہیں دے گا آج اس نے اسے دکھ دے دیا تھا۔
دوسروں کے دیے ہوئے دکھوں پر وہ اس کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتی تھی۔ آج جب اس نے دکھ دیا تھا تو وہ کس کے پاس جاتی۔ اس کی زندگی میں تو وہی ایک شخص تھا اپنی خوشیاں شیئر کرنے کے لیے بھی اور دکھوں پر رونے کے لیے بھی۔ حیدر اس کے لیے سب کچھ تھا اس کی کل زندگی اور آج وہ اپنی زندگی گنوا آئی تھی۔

⊛⊛⊛

وہ نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد کمرے سے باہر آ گئی۔ الماس ڈائننگ روم سے نکل رہی تھیں۔ ان کے کندھے پر موجود پرس اور ہاتھوں میں پکڑے موبائل فون اور سن گلاسز بتا رہے تھے کہ وہ آفس جا رہی ہیں۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئیں۔
"تمہاری طبیعت کیسی ہے ام ایمن!"
"ٹھیک ہوں۔" وہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔
"میں اور توفیق تو آفس سے ایک میٹنگ میں اور پھر وہاں سے ایک ڈنر میں چلے گئے تھے پھر کافی رات میں ہماری واپسی ہوئی تھی مگر رشیدہ ابھی مجھے بتا رہی تھی کہ تم کل سارا دن اپنے کمرے میں رہی ہو اور تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔" وہ اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آ گئی تھیں۔
"میرے سر میں درد تھا۔" وہ ٹیبل پر بیٹھ گئی تھی۔
"میں آج آفس نہیں آ سکوں گی آپ پاپا کو بتا دیجیے گا۔ آج میٹنگ میں انہوں نے مجھ سے شریک ہونے کے لیے کہا تھا۔" وہ سلائس پر مکھن لگانے لگی۔ الماس بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے سلائس پر مکھن لگاتی رہی۔
"کیا بات ہوئی ہے ام ایمن! تم حیدر کی شادی کی بات سے ڈسٹرب ہو؟" وہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے ہلکی سی تشویش موجود تھی۔ وہ جواباً چپ رہی۔
"تم نے حیدر سے اس بارے میں کیا کوئی بات کی ہے؟" شاید ساتھ رہتے رہتے انہیں اس سے تھوڑی بہت ہمدردی ہو ہی گئی تھی۔
"صرف تم ہی کو اس خبر سے شاک نہیں پہنچا ایمن! ہمیں بھی شاک پہنچا ہے۔ خاص طور پر توفیق کو۔ انہیں حیدر کس قدر پسند ہے تم جانتی ہو وہ تمہاری اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ حیدر نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں

کی! کبھی ایسا کچھ نہیں کیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ تمہیں کسی اور حوالے سے پسند کرتا ہے مگر مجھے اور توفیق کو لگتا تھا کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔

وہ بہت گہرا اور بہت مشکل پسند ہے اپنے جذبات کو چھپا کر رکھنے والا۔ تمہاری طرف سے تو ہمیں سو فیصد یقین تھا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو مگر اس کی طرف سے بات شک و شبے والی تھی۔ جس طرح اس نے تم سے دوستی کی تھی اور جس طرح وہ تمہارا خیال رکھتا تھا ایسے وہ کبھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس کے باوجود توفیق جیسے ذہین آدمی بھی پورے یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ توفیق کشمکش میں تھے۔ وہ حیدر کی طرف سے کسی واضح اظہار کے منتظر تھے مگر وہ کچھ دلچسپی ظاہر ہی نہیں کر رہا تھا۔ توفیق نے اس اتوار کو حیدر سے باتیں کرتے ہوئے جو اسے تمہارے پرپوزل کے بارے میں بتایا تھا تو جان بوجھ کر بتایا تھا۔ وہ حیدر کا ردعمل جاننا چاہ رہے تھے مگر اس کا ردعمل تو ان کا خلاف توقع تھا کہ توفیق دنگ رہ گئے۔

حیدر کے جانے کے بعد وہ اس بارے میں مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ حیدر کے ردعمل سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اس سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تمہارے لیے یہ سب سہنا آسان نہیں ہے مگر پھر بھی میں تم سے یہی کہوں گی کہ خود کو سنبھالو۔" الماس نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چند سیکنڈز بغور اسے دیکھنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ایک سلائس کھا کر چائے کے دو کپ پیے' اس کے بعد وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ لاؤنج میں آ کر بیٹھنے کے بجائے وہ ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"پلیز سر جلیل سے بات ہو سکتی ہے؟" دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جانے کے بعد اس نے شائستگی سے کہا۔

"میں ان کی اسٹوڈنٹ ہوں ام ایمن!" دو تین منٹ تک اسے انتظار کرنا پڑا تھا۔

"السلام علیکم سر!" اس کے لہجے میں احترام بہت نمایاں تھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں سر! آپ کیسے ہیں؟"

"جی سر رزلٹ آ گیا فرسٹ پوزیشن آئی ہے میری۔" ان کا سوال سننے کے بعد اس نے خوش دلی سے بتایا۔

"آخری سمسٹر میں آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی تھی سر! آپ کے آفس میں گھنٹوں بیٹھ کر بحث و مباحثہ کرنے کی عادت جو ہو گئی تھی ہم لوگوں کو۔" وہ ہولے سے ہنس دی۔

⊛⊛⊛

"کیا بات ہے توفیق بھائی! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" وہ آفس میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلے چار پانچ روز سے وہ اسے بہت الجھے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے۔ حیدر نے انہیں بزنس میں آنے والی مشکلات کی وجہ سے کبھی ٹینشن میں آتے اور الجھتے نہیں دیکھا تھا۔

کل رات وہ دونوں ایک بزنس ڈنر میں شریک تھے اور حیدر نے انہیں وہاں سارے وقت خاموش اور غائب دماغ محسوس کیا تھا۔ وہ کاروباری دوستوں سے اس طرح باتیں نہیں کر رہے تھے جیسے ان کی عادت تھی۔ اگلے ہفتے انہیں اور حیدر کو ایک بہت ہی اہم کنٹریکٹ پر سائن کرنے کے لیے زیورچ جانا تھا مگر اس وقت ان کی مسلسل خاموشی اور بے توجہی اسے الجھا گئی تھی۔ وہ اس کے سوال پر قصداً تھوڑا سا مسکرائے۔

"نہیں' کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے بہت ہفتوں سے مجھے مکمل ریسٹ نہیں مل پا رہا' شاید اس لیے تھک گیا ہوں۔" حیدر نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ پریشان تھے مگر اپنی پریشانی اس سے شیئر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے اس انداز کے بعد مزید اصرار نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ ایک دو دن گھر پر آرام کر لیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ زیورچ ساری تھکن اتار کر جاؤں تو اچھا ہے۔" انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اس کے مشورے سے اتفاق کیا۔

"توفیق بھائی کس بات سے پریشان ہیں الماس آپی!" وہ ان کے پاس سے گفتگو ختم ہونے کے بعد سیدھا الماس کے پاس چلا آیا۔ وہ آنکھوں پر گلاسز لگائے کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھیں۔

"وہ ایمن کی وجہ سے پریشان ہیں۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟" اس کی دی ہوئی خبر نے اسے اندر ہی اندر ڈرا دیا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر کوئی خوف یا تشویش نہیں آنے دی تھی مگر اس کا دل ایک دم ہی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"وہ حیدر آباد واپس جا رہی ہے حیدر!" ان کی اطلاع نے اس کے تیز تیز دھڑکتے ہوئے دل کو نارمل کیا تھا اور جو کچھ بھی تھا' کم از کم وہ ٹھیک تو تھی۔ اس نے بے اختیار دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

"حیدر آباد......؟ مگر وہاں کون ہے' وہ کس کے پاس جا رہی ہے؟" اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیوں جا رہی ہے حالانکہ اصولی طور پر سب سے پہلا سوال یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے۔ الماس نے ایک پل کے لیے خاموشی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سوائے حیرت کے اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اس خبر سے صرف حیران ہوا تھا۔

"یونیورسٹی میں اس کے کوئی پروفیسر تھے ان کا تعلق حیدر آباد سے ہی تھا۔ سات آٹھ مہینے پہلے ان کی ریٹائرمنٹ ہوئی اور وہ واپس اپنے آبائی شہر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے غریب بچوں کو مفت تعلیم دینے کے لیے ایک اسکول کھول لیا ہے۔ ایمن کی اپنے ان پروفیسر کے ساتھ کافی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ وہ وہاں ان کے اسکول میں جاب کرنے کے لیے جا رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ غریب اور مستحق بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ کسی اچھے مقصد کو ساتھ لے کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس کا؟ اگر اسے سوشل ورک کا اتنا شوق ہے تو یہاں پر رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ توفیق بھائی کو اسے روکنا چاہیے۔ وہ اس کے باپ ہیں' اس کی من مانی پر پریشان ہونے کے بجائے انہیں

اسے سختی سے روکنا چاہیے۔" وہ ان کی بات سن کر بہت جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"وہ اسے سختی سے' پیار سے کسی نہ کسی طرح روک لیتے حیدر! اگر وہ انہیں ایسا کوئی حق دیتی تو۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولیں۔

"اس نے ان سے مشورہ نہیں لیا' اجازت طلب نہیں کی۔ اس نے انہیں اطلاع دی ہے۔" وہ خاموشی سے الماس کی بات سن رہا تھا۔

"جب اس کی اپنے پروفیسر سے بات ہو گئی' اس کی جاب پکی ہو گئی۔ حیدر آباد میں رہائش کا انتظام بھی ہو گیا تب اس نے کھانے کی میز پر توفیق کو یہ بتایا کہ وہ اگلے ہفتے حیدر آباد جا رہی ہے۔

توفیق نے آج کل اس سے بات چیت بالکل بند کر دی ہے اور اسے ان کے بات نہ کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔ اتنے سکون سے وہ اپنے جانے کی تیاری کر رہی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب تو اس کے جانے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ آج کل وہ اپنے دوستوں سے مل رہی ہے' اپنی شاپنگ کر رہی ہے۔ توفیق نے اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اس سے کتنی ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں' مگر اب وہ ایک دم ہی سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ توفیق کے ناراض ہونے پر سکون سے کہہ رہی تھی کہ "میں آپ سے ملنے کے لیے کراچی آیا کروں گی' آپ کو پابندی سے فون بھی کروں گی اور اگر آپ کے پاس ٹائم ہو اور آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے ملنے کے لیے آ جایا کیجیے گا۔" وہ ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا ورنہ میں اسے سمجھاتا۔"

وہ اسی کی وجہ سے جا رہی ہے اور وہ یہ بات جانتا بھی ہے پھر بھی کتنے اطمینان سے اسے سمجھا لینے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ الماس نے حیدر مسعود کی طرف رشک سے دیکھا۔

الماس اس کے چہرے پر' اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں پڑھ رہی تھیں۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ اسی لیے آفس نہیں آ رہی۔" وہ پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے بولا۔

"آپ مجھے کافی نہیں پلائیں گی؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"کیوں نہیں' ضرور۔ خالی کافی پیو گے یا کچھ اور بھی منگواؤں۔" اس کے چہرے پر کچھ بھی کھوجنے میں ناکام ہو جانے پر انہوں نے ہار مان لی تھی۔

"نہیں صرف کافی' مگر ہوتی بہت مزیدار چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے انٹر کام پر کافی کے لیے کہنے لگیں۔

ان کے ساتھ کافی پیتے ہوئے ساری کی پڑھائی کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر بیٹھنے کے بعد اس کے چہرے پر سے مصنوعی اطمینان اور سکون کا ملمع اتر گیا تھا اب اس کے چہرے پر پریشانی تھی' بے تحاشا پریشانی۔

"شائستہ تھوڑی دیر تک کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" انٹر کام پر اپنی سیکرٹری کو یہ ہدایت دینے کے بعد وہ سر

دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

یہ زندگی کیا کر رہی تھی۔ خود کو اتنا بے اختیار اور بے بس اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میرے پاس صرف ایک رشتہ ہے' صرف ایک' آپ سے دوستی کا۔ میرے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس رشتے کو مجھ سے مت چھینیں۔" وہ رو رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"ایما..." اس نے گھبرا کر اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "میں آپ کی زندگی میں کس جگہ پر ہوں حیدر مسعود؟" وہ اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کرتے ہیں یا نہیں؟"

"ہاں' کرتا ہوں۔ اول روز سے کرتا ہوں۔ بے حساب کرتا ہوں' اتنی شدید محبت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" وہ زیر لب ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ اس نے اپنا سر میز پر گرا دیا تھا۔

کیوں ہو گئی تھی اسے اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی سے محبت' جس محبت کا وہ کسی کے سامنے اقرار تک نہیں کر سکتا تھا۔ محبت کیسی ہوتی ہے' یہ کتنا بے بس کر دینے والی ہوتی ہے' انسان پر سے اس کے سارے اختیار چھین لینے والی وہ اپنی زندگی کے چونتیس سالوں تک کبھی اس جذبے کو جان ہی نہ سکا۔

کوئی مرد کسی عورت کو اسی وقت پسند کرتا ہے یا اس سے محبت کرتا ہے جب وہ اس کی معیار پر پورا اترتی ہے اور کوئی عورت کسی مرد سے اسی وقت محبت کرنا شروع کرتی ہے جب وہ اس کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد ایسی ہی محبتیں دیکھی تھیں۔ خود اس نے جمیلہ کو شادی کے لیے پسند کیا تھا تو اس کی تمام خوبیوں اور اچھائیوں سے متاثر ہونے کے بعد وہ اسے محبت نہیں مانتا تھا اور جسے وہ محبت مانتا تھا وہ حقیقت میں کہیں نہیں ہوتی' اس بات کا اسے سو فیصد یقین تھا مگر یہ یقین اس روز غلط ثابت ہو گیا جس روز وہ ام ایمن نام کی ایک ڈری سہمی اور گھبرائی ہوئی لڑکی سے حیدر آباد کے ایک پسماندہ محلے کے ایک چھوٹے سے مکان میں ملا۔ وہ وہاں بے دلی سے آیا تھا۔ صرف توفیق کمال کی خاطر۔

اپنی بے زاری توفیق کمال پر ظاہر کیے بغیر وہ اسے لینے چلا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ اس کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دے گا۔ اس نے زندگی کے چونتیس سالوں تک کبھی محبت کو نہیں مانا تھا۔ کبھی اس جذبے پر ایمان نہیں لایا تھا۔

مگر زندگی کے چونتیسویں سال میں اپنے سے بارہ تیرہ سال چھوٹی' کم عمر اور ڈری سہمی سی لڑکی سے محبت میں مبتلا ہونے کے بعد اسے محبت کو ماننا پڑا۔ اس جذبے پر ایمان لانا پڑا۔ وہ عام سی شکل و صورت کی معمولی سی لڑکی اس کی محبت تو کیا دوستی کے قابل بھی نہیں تھی۔

وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بہت عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی اور اپنے آنسو اس سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیسی خواہش ابھری تھی ان لمحوں میں اس کے دل

میں۔اس کے چہرے پر سے سارے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر دینے کی خواہش اپنی کیفیات اس کے لیے بہت حیران کن تھیں۔ایسا نہیں تھا کہ بجیلہ کے زندگی سے نکل جانے کے بعد اس نے کسی دوسری لڑکی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہ تھا۔

اس کی دولت اور اس کی مردانہ وجاہت میں ایسی کشش تھی کہ لڑکیاں خود بخود ہی اس کے پیچھے آتی تھیں۔وہ ان پیچھے آنے والیوں میں سے چند لڑکیوں کے ساتھ کچھ وقت ہنسی خوشی گزار لیا کرتا تھا جو اس کے معیار پر پوری اترتی تھیں۔وہ وقت گزاری کے لیے بھی کسی عام سی لڑکی کا انتخاب نہیں کرتا تھا۔اس لڑکی میں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو اسے چونکاتا' جو اسے متوجہ کرتا' جو اس لڑکی کو غیر معمولی اہمیت دینے پر مجبور کرتا' پھر بھی وہ اسے چونکا رہی تھی۔وہ اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

اس رات کو وہ اسی کی وجہ سے مضطرب تھا۔وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہوگی؟ وہ ٹیرس پر کھڑا تھا۔اسے دروازے سے باہر نکلتے اور سوئمنگ پول کے پاس بیٹھتے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔

اور اس نے اس کے ساتھ کتنی عجیب اور کتنی مختلف بات کی تھی اپنی ممی کے بارے میں۔وہ ممی کے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے تو کیا پاپا اور ماریہ تک کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

مگر اس نے اس انجان لڑکی سے ممی کے بارے میں بات کی تھی اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی ماں ہی کو یاد کر کے اتنی اداس ہے۔وہ رونا چاہتی ہے۔وہ چاہتا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کر کے اس کے سامنے رو لے۔تنہا بیٹھ کر رونے سے کسی کے پاس بیٹھ کر رو لینا شاید اس کے غم کو کچھ کم کر دے۔اس کی سوچ بالکل صحیح ثابت ہوئی تھی۔اس نے ممی کے بارے میں اس سے بات کی تو وہ اس سے ڈرنا اور خوف زدہ ہونا چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ممی کے بارے میں اور پھر اپنی امی کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔وہ جتنی کم عمر تھی اتنی ہی سادہ اور معصوم بھی تھی۔اس سادہ اور معصوم سی لڑکی کے لیے اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔اسے توفیق کمال پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔کیا اپنی بیٹی کو غم کی اس مشکل گھڑی میں تنہا چھوڑ کر انہیں امریکہ چلے جانا زیب دیتا تھا۔وہ توفیق کمال کو بہت پسند کرتا تھا۔ان کی ذہانت' کاروباری سوجھ بوجھ وہ ان سب سے متاثر تھا مگر اس وقت اس لڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے توفیق کمال کو دنیا کا سب سے ظالم اور سفاک انسان سمجھا تھا۔

کیا یہ معصوم سی لڑکی اس سلوک کی حق دار تھی۔کیا باپ کو بیٹی کے پاس خود نہیں جانا چاہیے تھا۔کیا اسے بیٹی کی خاطر اپنا امریکہ جانا ملتوی نہیں کر دینا چاہیے تھا؟ وہ دیکھ رہا تھا کیا اسے ماں کے مرنے کے ساتھ ساتھ باپ کے غائبانہ رویے پر بھی دکھ ہے۔وہ لڑکی اسے کتنی مظلوم' کتنی تنہا اور کتنی اداس لگ رہی تھی۔

وہ اس کے دل سے اس دکھ کو دور کرنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسے لینے کے لیے خود نہیں گیا۔انہوں نے اس کی خاطر اپنا جانا ملتوی نہیں کیا۔اسے اس کے کمرے تک پہنچا کر جب وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹا تو خود اپنے آپ پر حیران تھا۔وہ ایسا نہیں تھا وہ اتنا خوش اخلاق اور اتنا مہربان ہرگز نہیں تھا۔وہ ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتا تھا لیکن اس لڑکی کے لیے وہ اپنے مزاج کے خلاف گیا تھا۔اس نے اس کے ساتھ اتنی ساری باتیں کی تھیں اسے

چائے بنا کر پلائی تھی۔اس کے دل سے غم کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔پھر جتنے دن وہ اس کے گھر رہی اس کا اس کے ساتھ یہی رویہ رہا تھا۔

اسے پتا تھا کہ پاپا' ام ایمن کے ساتھ اس کے غیر معمولی اور دوستانہ انداز کو دیکھ کر اس لیے حیران نہیں ہوتی تھیں کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے اور اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش آ رہا ہے' مگر وہ خود جانتا تھا کہ بات یہ نہیں ہے۔وہ توفیق کمال کی بیٹی ہوتی یا جس کسی کی بھی' اگر اس کا دل یوں اس کی طرف نہ کھنچتا تو وہ کبھی اس کی یوں پروا نہ کرتا۔

وہ بہت ذہین تھی' اگر اسے صحیح ماحول اور صحیح لوگ ملتے تو شاید وہ ایسی نہ ہوتی۔وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے سارا وقت اس کی خوبیاں تلاشتا تھا' جب اس کی کوئی بات اسے مسکرانے پر مجبور کرتی تو اس کی مسکراہٹ دیکھ کر بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ وہ اس چہرے پر سے اس مسکراہٹ کو کبھی نہ مٹنے دے۔

وہ باپ سے ملنے سے پہلے کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔وہ کتنی خوف زدہ تھی۔وہ اس کا خوف دیکھ رہا تھا مگر وہ اسے دور کرنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا اور وہ توفیق کمال بیٹی سے کتنے سرد و سپاٹ انداز میں ملے تھے۔وہ صوفے پر کس طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔باپ کی بے گانگی اور لاتعلقی نے اسے کتنا صدمہ پہنچایا ہے وہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کر لیا کرتے تھے مگر انہیں اپنی بیٹی کے ساتھ تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اسے تو نہیں معلوم کہ یہ سرد اور غیر جذباتی انداز ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔وہ توفیق کمال کو کیسے مجبور کرتا کہ وہ اپنی بیٹی سے محبت کریں' اس کا خیال رکھیں۔اس کے ساتھ وہ رویہ نہ اختیار کریں جو وہ اکثر افراد کے ساتھ کرتے ہیں۔

وہ چپ چاپ بڑے دکھ کے ساتھ اسے اپنے باپ کے ساتھ جاتا دیکھتا رہا تھا۔اگلے دو دن وہ اس کے لیے سوچ سوچ کر مضطرب اور پریشان ہونے سے خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔

کتنی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اسے فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرے۔اس سے باتیں کرے اور تب اس پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ اپنے سے بہت سال چھوٹی لڑکی سے محبت کر بیٹھا ہے۔وہ اس سے ملاقات کے اولین لمحوں سے محبت کر رہا تھا' چاہے یہ بات کتنی بھی ناقابل قبول اور ناقابل یقین ہو مگر سچ یہی تھا وہ اس سچ کو جھٹلا نہیں سکتا تھا جس محبت کے بارے میں اسے یقین تھا کہ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں' وہ اس کے وجود میں ہونے سے آگاہ ہو گیا تھا۔

وہ اس کے خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس رات اپنی ایک دوست کے ساتھ ڈنر کرنے چلا گیا تھا۔پہلی شادی کا ناکام تجربہ اسے دوسری شادی کا فیصلہ کرنے سے روکتا تھا مگر شادی نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بالکل تنہا' سرد اور بے رنگ زندگی گزار رہا تھا۔اس فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئٹ میں وہ اس لڑکی کے ساتھ بالکل تنہا تھا۔وہ بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کی حسین بیٹی جس کا منگیتر امریکہ میں رہتا تھا اور وہ اپنی شادی سے پہلے کا وقت اسی طرح زندگی کو انجوائے کرتے ہوئے گزارنا چاہتی تھی۔پہلے بھی وہ دو مرتبہ اس کے ساتھ یہاں آ چکا تھا تب وہ اپنی مرضی سے آتا تھا اور آج زبردستی صرف ایک خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے لیکن اس خیال سے وہ

وہاں آ کر بھی پیچھا نہیں چھڑا پایا تھا اسے اس بے تحاشا حسین اور بولڈ لڑکی سے گھن آ رہی تھی۔ اسے وہی عام اور بالکل سادہ سی لڑکی یاد آ رہی تھی۔

وہ اب وقت گزاری کے لیے بھی کسی دوسری عورت کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اتنی معصوم اتنی پاکیزہ اتنی خالص اور وہ خود وہ اتنا گھٹیا۔

عورتوں کو خود سے قریب رکھنے کے بعد کیا اس لڑکی سے محبت کا دعویدار ہو سکتا تھا؟ وقت گزاری کے لیے اپنے پیچھے آنے والی ان تمام لڑکیوں سے اس نے پیچھا چھڑا لیا تھا اور وہ ام ایمن اس سے وہ کسی لمحہ پیچھا نہیں چھڑا پاتا تھا وہ اس کے خیالوں میں آتی تھی۔ وہ اس کے تصور میں رہتی تھی مگر یہ محبت جس کا وہ خود سے بھی بہت ڈر ڈر کر اعتراف کرتا تھا اسے وہ کسی کے بھی سامنے ظاہر نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کے سامنے بھی نہیں۔ وہ اتنی کم عمر اتنی معصوم' بالکل ان چھوئی اور خالص اس کا حق تھا کہ اسے اپنے ہی جیسے ایک خالص اور سچے مرد سے محبت ملتی۔

وہ اپنی محبت کو بھی ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ کبھی کسی کو نہیں بتائے گا کہ اس نے زندگی کے اتنے برس گزارنے کے بعد پہلی مرتبہ کسی سے بالکل سچی اور بے غرض محبت کی ہے۔ ام ایمن سے کوئی تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کر کے وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ اس پیاری سی لڑکی کے لیے دعا ضرور کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں سب کچھ اچھا ہو جائے۔

وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ چاہے اس محبت کو وہ کبھی بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا مگر کیا وہ اسے یوں اکیلا چھوڑ دے۔ وہ اس تنہائی اور گھٹن کا شکار ہو کر اگر مر گئی تو وہ خود کو کیسے معاف کر پائے گا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس کی محبت کو اپنے دل میں دفن کر دے گا۔ کہیں بہت گہرائی میں۔ اتنی گہرائی میں جہاں سے کوئی کھوج نہیں پائے گا مگر اب وہ اس سے لاتعلق نہیں رہے گا۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلے گا۔ وہ اسے چلنا سکھائے گا۔ وہ اسے ایسا بنا دے گا کہ توفیق کمال اسے فخر کے ساتھ اپنے برابر کھڑا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اسے زندگی میں سب کچھ ملے گا۔ خوشیاں' سکون' محبتیں۔ باپ کی محبت' بھائی کی محبت' دوستوں کی محبت۔ اس کی سب محرومیاں دور ہو جائیں گی۔ یہی توفیق کمال ہوں گے اور یہی ام ایمن۔ مگر وقت اور حالات بالکل بدل جائیں گے۔ وہ اسی ام ایمن کو اپنے ساتھ بٹھا کر لوگوں سے ملوانا اور اپنی بیٹی کہہ کر متعارف کرانا قابل فخر سمجھیں گے۔

وہ ام ایمن کو اپنی دوست بنائے گا۔ وہ اس کے لیے سب کچھ کرے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ وہ چلنا نہ سیکھ لے۔ جب تک کہ توفیق کمال اسے اپنی بیٹی کی حیثیت سے قبول نہ کر لیں۔ اس سے دوستی کرنا بہت مشکل تھا۔

وہ کسی ایک کے دل میں بھی یہ شک پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے ام ایمن سے محبت ہے۔

اس نے توفیق کمال کو جب یہ بتایا کہ وہ ام ایمن کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے فارم دے کر آیا ہے تو انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ام ایمن اتنے دنوں تک ہمارے گھر رہی تو میری اس کے ساتھ کافی دوستی ہو گئی تھی۔ آپ کو میری اس کے ساتھ دوستی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" انہوں نے جواب میں مسکراتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "انہیں اس دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" عمران کی آنکھیں بڑے تعجب سے اس سے یہ بات کہہ رہی تھیں کہ یہ دوستی ہوئی کس وجہ سے ہے؟ ان کی بیٹی کسی بھی لحاظ سے حیدر مسعود کے دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اس نے توفیق کمال کی حیرت کو اس طرح نظر انداز کیا جیسے وہ اسے نظر ہی نہیں آئی ہو۔ وہ اس کو فون کرتا اس سے ملتا مگر سب توفیق کمال کے علم میں رکھتے ہوئے۔

وہ آفس میں انتہائی اہم باتوں کے دوران توفیق کمال کے ساتھ ام ایمن کے بارے میں باتیں شروع کر دیتا۔ اس نے اپنا اسائنمنٹ کتنا اچھا بنایا ہے' وہ کتنی محنت سے پڑھ رہی ہے' وہ ذہانت کے لحاظ سے بالکل اپنے باپ جیسی ہے۔

ان کی آنکھوں میں کبھی کبھار یہ تاثر بھی نظر آتا کہ اسے ان کی بیٹی کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ حیرت اور یہ ناگواری ختم ہونے لگی۔ توفیق کمال سمیت تمام قریبی افراد نے اس کی ام ایمن کے ساتھ دوستی کو قبول کر لیا۔

ام ایمن کی عزت اسے اپنی عزت سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ وہ ام ایمن سے اس کے لیے ایما ہو گئی تھی اور اس نام سے بھی وہ اسے سب کے سامنے بے جھجک پکارتا تھا۔

کیا محبت انسان کو اتنا بدل دیتی ہے' اسے اتنا اچھا بنا دیتی ہے' وہ خود پر حیران ہوتا۔ وہ اس کے لیے کتنا بدل گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ اپنی اچھائیوں پر خود تعجب کرتا تھا۔

اپنی محبت کے اول روز سے وہ اس کے انجام سے واقف تھا۔ پھر بھی بالکل بے غرض ہو کر بغیر کسی صلے کی خواہش کے یہاں تک کہ بدلے میں اس کی محبت ہی حاصل کرنے کی خواہش کیے بغیر وہ اس کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

اس نے سارہ کے دل میں ایمن کی محبت جگائی تھی۔ اس کم عمر اور مخلص لڑکے کو یہ بات سمجھائی تھی کہ اپنی بہن سے محبت کرو اس لیے کہ اس کے پاس رشتوں اور محبتوں کی شدید کمی ہے۔ اسے ویسی محبت اور ویسی اپنائیت دو جیسی ایک پیار کرنے والا بھائی اپنی بہن کو دیتا ہے۔

مگر اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود وہ اسے خود سے محبت کرنے سے روک نہیں پایا تھا۔ وہ اس کے قریب سب کچھ سوچ سمجھ کر آیا تھا۔ اس نے توفیق کمال' الماس' بی بی اور سارہ' ایک ایک کے رد عمل اور ان کے رد عمل کے جواب میں اپنے رد عمل پر غور کرنے کے بعد اس کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اس نے سب کے رد عمل کے بارے میں سوچ لیا تھا اور یہ سوچنا بھول گیا تھا کہ جب وہ اس کے ساتھ اتنا اچھا اور اتنا غیر معمولی سلوک کرے گا تو کیا وہ اس سے محبت نہیں کرنے لگے گی۔ وہ ڈر گیا تھا' وہ بہت بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کے دل سے اپنی

محبت کیسے نکالے۔ اس سے کیسے کہے کہ تمہیں مجھ سے بہت بہتر ایک شخص ملے گا جو صرف تمہارے لیے ہوگا جو صرف تمہارا ہوگا۔ اس کی زندگی میں تم سے پہلے کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی ہوگی۔ جتنی تم خاص ہو ایسا ہی وہ بھی ہوگا۔ وہ کم عمر اور نادان تھی ابھی اس نے دنیا کہاں دیکھی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا مرد تھا اور چونکہ وہ اس کے ساتھ اتنا زیادہ اچھا تھا اس کا اتنا خیال رکھتا تھا اسی لیے جواب میں وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اس نے یہ سوچا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ میچور ہونا شروع ہوگی۔ وہ اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوگی تو اسے پتا چلے گا کہ دنیا میں حیدر مسعود کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ وہ یہ بھی جان لے گی کہ اس میں اتنی خوبیاں ہیں کہ اسے حیدر مسعود سے کہیں بہتر اور اپنی ہی جیسی عمر کا کوئی شاندار انسان مل سکتا ہے۔

سب کچھ اس کی خواہشات کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ پر اعتماد ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر یقین آ گیا تھا۔ توفیق کمال بھی اسے اہمیت دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب کچھ کتنی اچھی طرح ہو رہا تھا اور اسی طرح ہوتا بھی رہتا اگر جمیلہ اس روز اس کے آفس میں نہ آئی ہوتی۔ وہ اس سے اپنی مرضی سے الگ ہوئی تھی مگر اب بلا وجہ اس کے پیچھے آ کر اس کا وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے جمیلہ بابر سے اب محبت تھی نہ نفرت۔ وہ اس کا گزرا ہوا کل تھی اور وہ ماضی میں زندہ رہنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔

وہ آفس میں آئی اور اس کی اتنے عرصے کی ساری محنت برباد کر گئی۔ کتنے اطمینان سے اس نے وہ ساری باتیں کہہ دیں جو وہ ایمن سے کہنے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے اور ایمن کے تعلق میں کبھی محبت کے لفظ کو داخل نہیں ہونے دیا تھا مگر اس روز جمیلہ اس لفظ کو ان کے درمیان لے آئی تھی۔

وہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا جو بات اسے کہنا تھی وہ بات وہ کہہ چکی تھی۔ اپنی محبت کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھنے کی اس کی ساری محنت اور کوشش بے کار چلی گئی تھی۔ ایمن اس کے پاس آ رہی تھی وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ جمیلہ کی باتوں سے اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس کا ایمن سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ خود پر یہ الزام سہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس نے ایمن کی کم عمری اور معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اور ایمن کی دوستی کو داغدار ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی اجنبیت اور اس کی لاتعلقی ایمن کے دل کو کتنا دکھ پہنچا رہی ہے وہ جانتا تھا مگر وہ سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ سوچ رہا تھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ شادی کرنے کا فیصلہ۔ اسے شادی کر لینا چاہیے تاکہ پھر سے کوئی اس کی اور ایمن کی دوستی پر کوئی بے ہودہ تبصرہ نہ کر سکے۔

اس نے شادی کے لیے فاطمہ مصطفیٰ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اس کی واقعی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ ذہین تھی، باصلاحیت تھی۔ حیدر خود اسے اپنی کمپنی میں لایا تھا۔ اس کی جمیلہ سے علیحدگی ہو گئی تب ایک بار فاطمہ نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اور تب بھی اس نے اسے منع کر دیا تھا۔ اب جو اس نے شادی کے بارے میں سوچا تو فاطمہ اسے اپنے جاننے والی تمام لڑکیوں میں سب سے بہتر لگی۔ وہ اچھی بیوی بن سکتی تھی۔

وہ اس فیصلے کے بعد اب ایمن کی زندگی سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ اب وہ اپنی زندگی جی رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو پہلے کے مقابلے میں محدود کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ بی بی اور ماریہ کی رائے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ اس کا ارادہ جلد سے جلد شادی کرنے کا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی شادی کی خبر اسے شاک پہنچائے گی مگر کوئی بات نہیں۔ کچھ وقت گزرے گا تو وہ خود ہی حیدر مسعود کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کو حماقت قرار دینے لگے گی۔

اسے شاک پہنچے گا اس نے یہ سوچا تھا وہ رونے لگی اس نے یہ سوچا تھا مگر وہ اس کے پاس آ کر اس فیصلے کی وجہ دریافت کرے گی۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اس کے پاس آ کر وہ سب کچھ کہے گی۔ جو جرأت اور جو اعتماد اس نے اس کے اندر پیدا کیا تھا وہ اسی کا اس کے سامنے مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل صاف اور واضح الفاظ میں اس سے اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ اس کے سخت لہجے میں سمجھانے اور ڈانٹنے نے اس کے چہرے پر سے جیسے سارا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ وہ اسے پیار سے پاس بٹھا کر سمجھانا چاہتا تھا مگر وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اس سے جواب مانگ رہی تھی اس بات کا کہ وہ اس سے شادی کرے گا یا نہیں اس بات کا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں اور جواب اسے صرف "ہاں" یا "نہیں" میں چاہیے تھا۔ وہ ان دو میں سے کوئی ایک لفظ سننے کے علاوہ اور کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سچ وہ بول نہیں سکتا تھا اور اس کا جھوٹ اسے دکھ سے دوچار کر دے گا وہ جانتا تھا پھر بھی وہ اس جھوٹ کو بولنے کے لیے مجبور تھا۔

پھر ان گزرے پندرہ دنوں میں نہ وہ آفس آئی تھی اور نہ حیدر خود میں اتنی ہمت پیدا کر پایا تھا کہ اسے فون کر سکے۔ اس سے ملنے اور اس کی نگاہوں میں موجود کرب اور غم دیکھنے کا تو اس میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ وہ کیسے دیکھ پائے گا اس کی نگاہوں میں اپنا ہی دیا ہوا غم اور دکھ۔ وہ اسے کبھی بھی کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا وہ اسے ہر تکلیف سے بچانا چاہتا تھا لیکن وہی اسے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر گیا ہے۔ یہ بات وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ بی بی کے ہر روز یاد دلانے کے باوجود بھی وہ فاطمہ کو فون نہیں کر پا رہا تھا۔ بی بی کہہ رہی تھیں کہ ماریہ اور مکرم کے آنے سے پہلے اسے فاطمہ سے بات کر کے شادی کی تاریخ طے کر لینی چاہیے۔

وہ فاطمہ سے بات کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا دل و دماغ اس کا پورا وجود اس ایک لڑکی کے لیے پریشان تھا جسے پچھلے پندرہ دنوں سے نہ اس نے دیکھا تھا اور نہ اس کی آواز سنی تھی۔

اس نے توفیق کمال کو پریشان دیکھا تو پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا کہ وہ ایمن ہی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ایمن اب ان کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ اب پہلے والی ام ایمن نہیں رہی تھی جس کی انہیں کوئی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایمن اب ان کے لیے ان کا آنے والا کل تھی۔ ایمن اور سائرہ ان کی امیدوں کا مرکز تھے۔

وہ ان پندرہ دنوں میں ایمن کے لیے صرف پریشان اور فکرمند رہا تھا مگر اب؟ اب جو ہونے جا رہا تھا اس نے اسے پورے کا پورا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ وہ تنہا اتنا بڑا فیصلہ کر گئی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ

CamScanner

کر جا رہی تھی۔ اس وقت جب زندگی بانہیں پھیلائے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ اب تنہا نہیں تھی اس کے گرد اس کے چاہنے والوں کا ہجوم تھا۔ اس کی فکر کرنے والے بہت لوگ اس کے پاس تھے پھر بھی وہ جان بوجھ کر خود کو تنہا کرنے جا رہی تھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جو تنہائی اسے ملی تھی وہ اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی اور اب کی بار وہ جان بوجھ کر خود کو تنہا کر رہی تھی۔ وہ اسے کیسے روکے۔ وہ اسے کیسے سمجھائے کہ ایسا مت کرو۔ خود پر یہ ظلم مت کرو۔ وہ اب اس کی کوئی بات نہیں سنے گی۔ وہ جانتا تھا پھر بھی وہ اسے یہ بے وقوفی کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

❀ ❀ ❀

شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے جب وہ توفیق کمال کے گھر پہنچا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ آگے بڑھا تو اسے لان میں توفیق کمال اور الماس کے ساتھ بی بی بھی بیٹھی نظر آئیں۔ وہ آفس سے سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔ اسے بی بی کی یہاں موجودگی کا علم نہیں تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ توفیق کمال آج آفس میں بہت تھوڑی دیر رک کر گھر واپس آ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی اسے بہت واضح نظر آ رہی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں حیدر کہ ایمن نے حیدرآباد میں جاب کر لی ہے اور وہ کل وہاں جا رہی ہے۔"

بی بی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ شاید یونہی الماس اور ایمن سے ملنے آج یہاں آ گئی تھیں اور یہاں آ کر ملنے والی اس خبر نے انہیں بری طرح حیران کیا تھا۔ وہ ان کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ وہ خود بہت الجھا ہوا تھا۔ "توفیق بھائی میں ایمن سے ملنے آیا ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے مل لوں؟" اسے یقین تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہو گی اور کسی کے بھی بلانے پر اس سے ملنے کمرے سے باہر نہیں آئے گی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔" انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ ان تینوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اندر آ گیا تھا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے ایمن!" اس نے گردن موڑ کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ غصہ اور جھنجلاہٹ چہرے پر لیے اس کے پاس آ رہا تھا۔ وہ گردن گھما کر الماری سے اپنے ہینگ شدہ کپڑے نکالنے لگی۔

"رشیدہ! یہ دوپٹے سارے تہہ کر کے ایک جگہ رکھنا ورنہ مجھے ڈھونڈنے میں مشکل ہو گی۔" اس نے الماری سے اکٹھے تین چار ہینگرز نکال لیے تھے۔ وہ اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ہینگرز میں سے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی۔ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس سے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ رشیدہ کی طرف گھوما۔ "تم جاؤ یہاں سے۔" وہ فوراً باہر نکلنے لگی تھی کہ ایمن کی غصہ بھری آواز نے اسے روک دیا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ یہ کپڑے رکھواؤ میرے ساتھ۔" وہ بے چارگی ہوتی نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

مالکوں کے جھگڑے میں ملازموں کی موجودگی مناسب نہیں یہی سوچ کر وہ اگلے لمحے کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس نے رشیدہ کو کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو مزید غصے میں آ گئی۔ غصے میں اس نے کھینچ کھینچ کر الماری سے کپڑے نکالنے شروع کر دیے۔

"کیوں تم یہ بے وقوفانہ حرکتیں کر رہی ہو؟ تمہیں پتا ہے ہم سب تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں؟"

وہ اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کپڑے نکالتی رہی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں ایمن!" وہ ایک دم سیدھی ہوئی اور اس کی طرف مڑی۔

"ام ایمن۔ ام ایمن نام ہے میرا۔ ایمن کہنے کا حق میں نے صرف اس شخص کو دیا تھا جس کے بارے میں مجھے یہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ وہ آنکھوں میں غصہ لیے براہ راست اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو لیکن....."

"ناراض.....؟" وہ اس کی بات کاٹ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"ناراضی کے لیے آپس میں کسی رشتے کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے حیدر مسعود اور ہمارے بیچ تو کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔"

"دیکھو ایمن.....!"

"ام ایمن....." وہ غصے سے چیخی۔ چند سیکنڈز تک اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت ہموار تھا۔

"میں اس بڑے شہر میں روتی ہوئی تنہا آئی تھی اور تنہا ہی جا رہی ہوں مگر بے فکر رہیں میں روتی ہوئی واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ مجھے زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کی شکل نظر نہ آئے مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ آپ میرے مسیحا، میرے ہمدرد اور غم گسار بنے پھر میرے سر پر موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ لب بھینچے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے کپڑوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اس بڑے شہر کے طور طریقے میں سیکھ نہیں سکی۔ آپ کے بہت سکھانے کے باوجود بھی اندر سے وہی رہی چھوٹے شہر کی رہنے والی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کو دل سے لگا لینے والی۔ کوئی اچھی طرح بات کر لے ذرا سا اخلاق برت لے تو مجھے لگتا ہے اسے مجھ سے محبت ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر جذباتی ہو جاتی ہوں۔ میری مڈل کلاس ذہنیت کبھی نہیں بدل سکی۔" وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے استہزائیہ ہنسی۔

"آپ کو میرے جانے پر اتنا غم کیوں ہو رہا ہے میں یہ بھی جانتی ہوں۔ میرے چلے جانے سے آپ کا پروجیکٹ جو ادھورا رہ جائے گا۔ ابھی میں نے MBA کر کے آپ کے کندھے پر موجود ستاروں میں ایک اور ستارے کا اضافہ جو نہیں کیا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

"تم بہت غلط بات کہہ رہی ہو ایمن! تمہیں خود احساس نہیں ہے غصے اور ناراضی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے خلوص کی توہین کرو۔" ایمن کی اس بات نے اسے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں کرب لیے اسے دیکھ

CamScanner

رہا تھا۔

اخلاص؟ ہمارے درمیان خلوص نام کی کوئی چیز کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ میں آپ کا ایک پروجیکٹ ہوں حیدر مسعود! آپ کا خود اپنے آپ کو دیا ہوا ایک اسائنمنٹ جس تعلق کو میں خلوص، دوستی اور محبت کا تعلق سمجھتی تھی وہ اصل میں ہے کیا میں کبھی سمجھ ہی نہیں سکی۔

آپ جو کہتے گئے میں بغیر سوچے سمجھے کرتی گئی۔ یہ سوچ کر کہ یہ شخص مجھ سے خلوص کی آخری حدوں تک مخلص ہے۔ یہ کبھی مجھ سے کچھ غلط کہہ ہی نہیں سکتا۔ مجھے کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں حیدر مسعود کا ایک پروجیکٹ ہوں، جس کی تکمیل پر اس کا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔ کیا حقیقت ہے ایمن کی۔ حیدر مسعود کے اشاروں پر ناچنے والی ایک کٹھ پتلی۔"

"کاش تم یہ سمجھ سکتیں کہ تمہاری یہ باتیں مجھے کتنا دکھ دے رہی ہیں! پھر شاید تم کبھی مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہتیں۔ میں شاید تمہیں کبھی بھی یہ سمجھا نہیں سکوں گا کہ تم میرے لیے کیا ہو؟"

وہ اس کی نفرت اور حقارت سے کی گئی باتوں کے جواب میں آہستگی سے بولا۔

"کوشش کیجیے شاید سمجھ جاؤں۔" وہ کرب سے ہنس دی۔

"میں اپنے باپ کو برا انسان سمجھتی تھی۔ ان سے شاکی رہتی تھی مگر آپ...... آپ تو ان سے بھی برے انسان ہیں۔ انتہائی خطرناک۔ دوستی اور خلوص کا نام لے کر آپ نے مجھے بے وقوف بنایا، میرے جذبات کا مذاق اڑایا۔ وہ میرے ساتھ برے تھے تو کھلے عام ڈنکے کی چوٹ پر برے تھے۔ آپ نے تو اچھائی کی آڑ میں میرے ساتھ وہ برائی کی ہے کہ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے ناں کہ ان کی واہ واہ ہو۔ ان کی ہر جگہ تعریفیں ہوں اور ہو رہی ہیں آپ کی تعریفیں۔ جہاں کہیں میری خوبیوں کو سراہا جاتا ہے وہاں خود بخود ہی حیدر مسعود کا نام بھی آ جاتا ہے۔ کتنے جوہر شناس ہیں آپ۔ میرے باپ نے ٹھیک آپ سے یہ بھی کہا ہو گا کہ آپ میں کسی بھی انسان کی قابلیت کو جانچنے کی صلاحیت ان سے بھی زیادہ ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہو گا اس وقت جب

"بس کرو ایمن!" وہ اس کی بات کاٹ کر بہت زور سے چلایا اس کے چہرے پر موجود دکھ اور کرب کی جگہ بے تحاشا غصے نے لے لی تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچا اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جب تم کچھ بھی نہیں جانتی ہو تو پھر اتنے یقین سے کچھ بولو بھی مت۔" وہ انتہائی طیش کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا نہیں جانتی میں؟ میں سب کچھ جانتی ہوں آپ کے بارے میں۔ آپ ابھی بھی جمیلہ بابر سے محبت کرتے ہیں جب ہی تو اس سے علیحدگی کے بعد اتنے سالوں تک آپ نے دوسری شادی نہیں کی لیکن جب وہ آپ کے پیچھے آئی تو آپ نے اسے دوبارہ قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ آپ کے اندر کے انا پرست مرد کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ آپ کو چھوڑ کر ایک دوسرے آدمی کے پاس چلی گئی تھی۔ آپ ایک انا پرست اور مغرور انسان ہیں۔ فاطمہ سے شادی آپ کسی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کر رہے ہیں۔ میں زبردستی آپ کے گلے پڑنے کی کوشش جو کرنے لگی تھی۔ خوش ہو جائیں اب میں جا رہی ہوں یہاں

سے۔ آپ کو مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کسی سے شادی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے جمیلہ سے کبھی محبت نہیں تھی۔ سن لیا تم نے آج۔" وہ غصے میں تو ابھی بھی تھا مگر اس بار وہ چلایا نہیں تھا۔

"میں نے صرف تم سے محبت کی ہے صرف تم سے۔" وہ ہار گیا تھا۔ وہ اس کی بدگمانیاں نہیں سہہ سکتا تھا۔

"یہ شاید آپ کا مجھ سے ایک اور جھوٹ ہے۔ مجھے جانے سے روکنے کے لیے فوری طور پر شاید یہی ترکیب آپ کی سمجھ میں آئی ہے کہ مجھ سے محبت کی بات کر لی جائے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر الماری کی طرف گھومنے لگی مگر اس نے ایک دم ہی اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا اپنے بالکل سامنے۔

"تم میری طرف دیکھو۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ کیا تمہیں ان میں محبت نظر نہیں آتی؟" وہ اس کے کندھوں پر بڑی سختی سے ہاتھوں کو جمائے کھڑا تھا۔

"ہاں نظر آئی تھی جب ہی تو اس روز آپ کے پاس گئی تھی۔ آپ کے قدموں تلے اپنی انا اور اپنی عزت نفس کو کچلانے کے لیے۔" اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں اور اس کی آواز بھیگی تھی۔ ان بھیگی ہوئی نگاہوں سے اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں اپنا ہی عکس نظر آیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کے کندھوں پر سے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔

"میرے لفظوں پر اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میری آنکھوں پر یقین کرو۔"

"اگر یقین کر لوں تو یہ میرے لیے مزید دکھ کی بات ہو گی۔ ایک بزدل مرد مجھ سے محبت کرتا ہے جو ایک بند کمرے میں کسی گناہ کی طرح اپنی محبت کا اعتراف کر رہا ہے۔ جس میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی محبت کا اقرار کر سکے۔ میں بزدل مردوں سے نفرت کرتی ہوں حیدر مسعود!" اس نے اپنے کندھوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹانے چاہے۔ اس کی کسی کوشش سے پہلے اس نے خود اس کے کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اسے کمرے کے دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔

"آپ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلائی۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا تھا۔

راستے میں نظر آتے کسی ملازم کی حیرت کی اس نے پروا نہیں کی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر لاؤنج اور لاؤنج سے پھر لان کی طرف جانے والے دروازے کی طرف وہ تیز قدموں سے بڑھتا گیا۔ وہ تکلیف سے چلاتی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی لان میں آ گئی تھی۔ وہاں بیٹھے تینوں افراد اپنی گفتگو بھول کر ان دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ توفیق کمال کی کرسی کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے۔

"میں آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ پُراعتماد اور بے خوف انداز میں بولا۔ اس کی اس غیر متوقع بات نے توفیق کمال، الماس اور بی بی کو تو سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا کیا ہی تھا خود ایمن بھی سکتے کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ اس طرح گھسیٹ کر یہاں لانے کا مقصد یہ بات ہو گی ایسا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کا وہ بزدلی کا طعنہ اسے اس قدر مشتعل اور جذباتی کر دے گا۔ ان تینوں میں سے

سب سے پہلے توفیق کمال ہی سکتے کی کیفیت سے باہر نکلے تھے۔

"یہ کسی باپ سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کا مہذبانہ طریقہ تو ہرگز نہیں ہے برخوردار شریف لوگ اس مقصد کے لیے اپنے بزرگوں کو بھیجتے ہیں۔" ان کے چہرے کی مبہم سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں اس کی جرأت بہت پسند آئی ہے۔

"بی بی یہاں موجود ہیں اور وہی میری بزرگ ہیں۔ کیوں بی بی! آپ کو کیا اس شادی پر کوئی اعتراض ہے؟" وہ ایمن کی ہاتھ چھڑانے کی کوشش پر اسے گھورتے ہوئے بی بی سے مخاطب ہوا۔

"ہرگز نہیں۔ ایمن مجھے بہت پسند ہے۔ میرے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔" وہ جواباً مسکراتے ہوئے بولیں۔ "اب تو آپ کو اس رشتے کو قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اس نے توفیق کمال کی طرف دیکھا۔

ایمن سر جھکائے ہوئے پریشانی کے عالم میں توفیق کمال کا جواب سن نہیں پائی۔ شرمندگی اور خجالت سے اس کا برا حال تھا۔ وہ کسی بھی طرح اپنا ہاتھ چھڑا کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اس کی مضبوط گرفت کے آگے اس کی تمام تر کوششیں بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔

"بی بی! آپ اپنے ہاتھ سے کوئی سی بھی ایک انگوٹھی اتار کر مجھے دے دیں۔ میں یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت پکا کرنا چاہتا ہوں۔" وہ نظریں گھاس پر جمائے اس کی بات اور التماس اور بی بی کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں سن رہی تھی۔ بی بی نے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود سب سے قیمتی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ اس نے فوراً ہی اس کے ہاتھ کو اپنے سامنے کر کے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ بی بی کی انگوٹھی اسے اتنی ڈھیلی تھی کہ وہ ہاتھ کو ذرا سا بھی ہلاتی تو وہ نیچے گر جاتی۔

"اب اس بات کا طعنہ دینے مت بیٹھ جانا کہ تمہیں بی بی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ ابھی جا کر تمہارے لیے نئی انگوٹھی خریدلوں گا تب تک اسے پہنے رہو۔" وہ اس لہجے میں بولا جیسے وہ آج تک پتا نہیں اسے کس کس بات کے طعنے دیتی آئی تھی۔

"توفیق بھائی! میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جلد ہی ہو جائے۔ اگلے مہینے مجھے واپس جانا ہے۔ میں وہاں اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور وہ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ وہ اسے بھاگتا ہوا دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کی اس جرأت اور بہادری نے ایمن کو جو بے تحاشا خوشی دی تھی وہ اسے جانتا تھا اور صرف ایمن ہی تو خوش نہیں تھی وہ خود بھی تو اپنے اس فیصلے پر بے انتہا خوش تھا۔

بعض فیصلے کتنے آناً فاناً اور بالکل اچانک ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی فیصلہ تو یہ بھی تھا۔ جس فیصلے کے خلاف رہنے کے لیے اس کے پاس ہزاروں دلائل تھے وہ آن واحد میں اپنے سارے دلائل اور سارے اعتراضات بھول کر وہی فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ بیان ہوئی جب ہو گئی تو کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہ سب کتنا خوش کن اور حسین تھا۔ اب اسے اپنی محبت کو چھپانے اور اپنے جذبوں پر پہرے بٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی محبت پر لگائی خود ساختہ پابندیوں کو ہٹانے کے بعد اب وہ اس سے وہ سب کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھا جو اس سے کبھی کہہ نہیں پایا تھا۔

دیارِ دل

دیر تک سونے کی اسے عادت نہیں تھی۔ رات میں خواہ کسی وقت بھی سوئی ہو صبح اپنے مقررہ وقت پر ہی اس کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی۔ اگرچہ کہ رات بھی وہ کون سا بہت بھرپور اور مکمل نیند سوئی تھی۔ گزشتہ چند دنوں کی طرح کل رات بھی بستر پر لیٹ کر کروٹیں ہی بدلی تھیں۔ کبھی سوئی، کبھی جاگی، کبھی ڈر کر اٹھ بیٹھی، پھر بھی نئے سال کی اس پہلی صبح وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی اس نامکمل اور ادھوری نیند سے بیدار ہو چکی تھی لیکن بیدار ہو کر بھی وہ کرے گی کیا؟ یہاں اپنے اس گھر میں وہ بالکل تنہا ہے، بالکل اکیلی۔

وہ کس کے لیے بستر سے اٹھے، وہ کس کے لیے کمرے سے نکلے۔ جو تنہائی کمرے میں اس کے ساتھ ہے وہی اس گھر کے ہر کونے میں بکھری ہوئی ہے۔

وہ پورا دن بھی اس بستر پر لیٹے کمرے میں مقید گزار دے تو کوئی اسے پوچھنے نہیں آئے گا کہ آج وہ اٹھ کیوں نہیں رہی۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں، کہیں اس کے ساتھ کوئی اور مسئلہ تو نہیں۔

یہ خود ترسی تھی۔ یہ بدترین خود ترسی تھی مگر وہ کیا کرتی۔ ان دنوں اس کا کہیں جانے آنے کا تو کیا اپنے کمرے تک سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ روتی نہیں تھی۔ وہ کچھ سوچتی بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ کچھ محسوس کرتی بھی تھی کہ نہیں کیونکہ اگر سوچنے اور محسوس کرنے لگتی تو شاید شدتِ غم سے پاگل ہو جاتی۔

عمر بھر اس سے بہت ناراض بہت خفا اور بہت دور رہنے والی اس کی ماں اس بار حقیقتاً اس سے بہت دور چلی گئی تھی اسے بالکل تنہا، بالکل اکیلا اور بے امان چھوڑ کر۔ کینیڈا اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔

وہ ان کا غصہ، ان کی ناراضی، ان کی اپنے سے ذہنی دوری سب سہنے کی عادی تھی مگر وہ یوں اس سے ناراض ہو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کینیڈا خالہ کے پاس جا سکتی ہیں؟

وہ ابھی بھی سوچنا شروع کرتی تو اسے یقین نہ آتا۔ کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہو سکتی' کوئی ماں اتنی سخت دل نہیں ہو سکتی کہ اپنی جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر اس سے ناراض ہو کر خود دوسرے ملک جا بیٹھے۔

اس کے بالکل برابر والا گھر اس کے ماموں کا تھا۔ ممی اسے اکیلا چھوڑ کر جاتے وقت کچھ بھی نہیں کہہ کر گئی تھیں۔ وہ اسے خدا حافظ تک نہ کہہ کر گئی تھیں۔ انہوں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ کیوں جا رہی ہیں؟ وہ کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہیں؟ وہ کب آئیں گی؟ اور سب سے بڑھ کر اہم بات ان کی غیر موجودگی میں وہ گھر میں تنہا کس طرح رہے گی؟ ان کی جانب سے ایسی کسی بھی بات کا اس شدید ناراضی کے عالم میں کوئی ذکر نہیں ہوا تھا لیکن اگر دل میں انہوں نے یہ سوچ کر خود کو اطمینان دلا دیا تھا کہ ان کے برابر والا گھر تو ان کے سگے بھائی کا ہے' جس بیٹی سے وہ ناراض ہو کر وہ دیس جا رہی ہیں وہ اپنے اس ماموں کے گھر رہ لے گی اگر انہوں نے ایسا سوچا تھا تو تب بھی ماموں کے گھر ہرگز نہیں گئی تھی۔

وہ کیوں کسی کے گھر جائے۔ وہ کیوں کسی کے گھر رہے' جب اس کی جنم دینے والی ماں کو اس کی پروا نہیں ہے پھر وہ کسی دوسرے سے کوئی آس کیوں باندھے؟ وہ ساری دنیا سے خفا تھی' وہ ساری دنیا سے ناراض تھی۔ وہ جمیل ماموں کے کہنے اور معیز کے فون پر سمجھانے کے باوجود ماموں کے گھر نہ گئی تھی۔

وہ چودہ دنوں سے اپنے گھر میں بالکل اکیلی رہ رہی تھی۔ وہ سارا دن اکیلی رہتی۔ وہ ساری رات اکیلی رہتی۔ ان کے اور ماموں کے گھر کے بیچ دیوار توڑ کر جو ایک گیٹ گھروں کے اندر ہی نکالا گیا تھا اسے بھی وہ بند رکھتی۔ رات میں ایک ہلکے سے کھٹکے اور آہٹ تک سے وہ اٹھ بیٹھتی۔ خوف سے کانپتی رہتی مگر ماموں کے گھر نہ جاتی' اگر یہ ضد تھی تو ٹھیک ہے یہ ضد ہی تھی۔ اگر ممی ضد دکھا سکتی ہیں اسے اکیلا چھوڑ کر جا سکتی ہیں تو پھر وہ بھی ضد دکھا سکتی ہے۔ وہ بھی ان ہی کی بیٹی ہے۔

زہرا ماں کئی بار اسے سرکش اور خود سر قرار دے چکی تھیں بلکہ ان کے مطابق تو ممی کے اسے اکیلا چھوڑ کر جانے کی قصوروار بھی مکمل طور پر وہی تھی۔

ان کے ان تبصروں میں نیا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں ان ہی القاب سے نوازا کرتی تھیں۔ اس کی زبان کی طراری سے خائف رہتی تھیں اس لیے منہ پر صاف کچھ نہ کہہ پاتیں تو در پردہ طنز کے تیر ضرور برساتیں۔

مختلف بات اس بار یہ تھی کہ جمیل ماموں بھی اس ساری صورت حال کے لیے قصوروار اسی کو کہتے تھے۔ اسے ماں سے محبت نہیں' اسے ماں کے غموں کا کوئی احساس نہیں' کیسی بیٹی ہے وہ جو ماں کے دکھوں کا مداوا کرنے کے بجائے ان میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔

یہ کون سے دکھ تھے جن کا مداوا صرف دولت کے حصول کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھتی نہ تھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا کچھ کہنے کا۔ اسے کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔

جب ماں ہی بیٹی کو نہ سمجھ رہی ہو تو کسی دوسرے سے کیا گلہ؟

معیز ان دنوں اپنے بزنس کے کام سے جاپان گیا ہوا تھا اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسی سے سب کچھ کہتی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی لیکن اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ سب ہوتا ہی کیوں؟ وہ ممی کو اتنی جذباتی اور ایسی حرکت بھی نہ کرنے دیتا۔ وہ یقیناً انہیں کینیڈا جانے سے روک لیتا۔

انہوں نے معیز کو بیٹا بنایا ہوا تھا اور جس وقت وہ کسی ضد پر اڑی ہوتیں تو صرف معیز ہی اگر چاہتا تو انہیں اس ضد سے باز رکھ سکتا تھا۔

معیز اس کا کزن تھا اس کا دوست تھا۔ اپنی پوری فیملی میں اگر کسی کے ساتھ اس کی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی تھی تو وہ معیز جمیل ہی تھا۔ وہ اس کے انٹلیکٹ (Intellect) کو سمجھتا تھا اور اسے سراہتا بھی تھا۔

وہ نہ تو زہرا ماں کی طرح طنز کرتا نہ جمیل ماموں کی طرح نصیحتیں نہ ممی کی طرح اس سے شاکی و بدگمان رہا کرتا۔

ڈیڈی کے انتقال کے بعد جب بتدریج ممی بھی اس سے ذہنی طور پر دور ہوتی چلی گئیں تب معیز ہی وہ واحد شخص تھا جس نے ہمیشہ اسے سمجھا' اسے سنا' وہ اس سے کہہ سن کر ہمیشہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی۔

صبح سویرے کی بےدار ہوئی آخر وہ ساڑھے گیارہ بجے بستر سے اٹھ گئی۔ یکم جنوری کی اس خوب سرد صبح ٹھنڈے پانی سے نہانے کے لیے خاصی ہمت درکار تھی مگر خود اذیتی کی جن کیفیتوں کا وہ شکار تھی ایسے میں اسے ٹھنڈا پانی ہی اپنی تھکن اور بوجھل پن دور کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دیر شاور کے نیچے کھڑی وہ ٹھنڈے پانی کو اپنے جسم پر بہاتی اپنے مردہ ہوتے اعصاب اور جسم کو توانائی پہنچانے کی کوشش کرتی رہی۔

نہانے کے بعد وہ بےدلی اور پژمردگی سے چلتی کچن میں آ گئی۔ اس نے کل دوپہر اور رات بھی کچھ نہ کھایا تھا اور اس وقت بھی کچھ کھانے کو اس کی طبیعت راغب نہیں تھی اس لیے وہ اپنے لیے فقط ایک کپ چائے کا اہتمام کر رہی تھی۔ چائے کا کپ لے کر وہ کچن سے باہر نکل آئی۔

پورے گھر میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ صرف اس کے اپنے چلنے سے ایک معمولی سی آواز پیدا ہو رہی تھی اور وہ بھی اس مکمل خاموشی اور گھر پر سناٹے کا مزید شدید احساس دلا رہی تھی۔

ممی چودہ دن پہلے جب یہاں تھیں تب بھی دن کے اوقات میں وہ کبھی گھر پر نہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کی صبح سے رات گئے تک کی بےشمار و بےحساب مصروفیات ہوا کرتی تھیں' مگر تب ان کے مختلف گھریلو امور کے لیے کئی ملازم یہاں ضرور موجود تھے۔ ممی کے جانے کے بعد دسمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے پورے مہینے کی تنخواہیں ہاتھ میں پکڑا کر ان سب کو فارغ کر دیا تھا۔ گھر میں صرف دو افراد اور ان کا بھی زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا ہو پھر نوکروں کا یہ جم غفیر اکٹھا کرنے کی تک کیا تھی۔

وہ ممی کی موجودگی میں بھی اتنے ڈھیر ملازمین کے رکھے جانے پر کبھی خوش نہ ہوئی تھی اور اب ان کی غیر موجودگی میں تو اس بے مقصد فوج کو اپنے سر پر سوار رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اب اپنے بل بوتے پر زندگی گزارے گی تو اپنے بل بوتے پر فی الحال وہ کچھ کیا ایک نوکر بھی افورڈ نہیں کر سکتی۔ اسے کسی کی کسی دولت جائیداد سے کوئی سروکار نہیں۔ جس بات پر ممی اس سے ناراض ہو کر گئیں وہ اب

بھی اپنی اسی بات پر قائم خود کو ہر اعتبار سے حق پر اور درست مان رہی تھی۔ زندگی کی الجھی گتھیوں کو سلجھاتی وہ باہر لان میں آ گئی۔ گیٹ کے پاس رول ہوا آج کا تازہ اخبار گرا تھا مگر یہ کیسا لطیفہ تھا کہ اس کے ساتھ پچھلے کئی دنوں کے اخبار بھی اسی طرح رول ہوئے پڑے تھے۔

شاید چار یا پانچ دنوں سے اس نے یہاں سے اخبار اٹھائے ہی نہیں تھے۔ وہ کپ ہاتھ میں لیے گیٹ تک آئی اور سارے اخبار یکجا ایک' کچھ دوسرے ہاتھ میں سنبھال لیے۔ انہیں بے دلی سے لان چیئر پر ڈال کر وہ دوسری کرسی پر بیٹھ کر چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

اس کی بھوک' پیاس بالکل مری ہوئی تھی۔ اس وقت بھی چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے اسے یہ نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کل پورا دن ایک لقمہ بھی حلق سے نہ اتار کر آج اسے ضرور کچھ کھا لینا چاہیے۔

اس کی زندگی کی تمام الجھنوں کا حل کیا نکلے گا؟ زندگی اس طرح کب تک گزرے گی؟ اس کے پاس نہ کوئی دوست موجود تھا نہ ہمدرد' وہ کس کے پاس جائے' وہ کس سے مشورہ مانگے۔

خود کو زندگی میں اتنا تنہا' اتنا بے اماں' اتنا غیر محفوظ اور اتنا اکیلا اس نے کبھی بھی محسوس نہ کیا تھا جتنا پچھلے چند دنوں سے کر رہی تھی۔

شاید معیز لاہور میں ہوتا تو وہ اس سے ہمیشہ کی طرح اپنے دکھ سکھ اور دل کی باتیں کہہ لیتی مگر کہہ دینے سے بھی کیا ہوتا۔ زندگی جن الجھنوں اور جن مشکلات میں گھری ہے وہ تو ویسے ہی گھری رہتی۔

چائے کے کپ میں سے آخری گھونٹ لیتے اس نے برابر والے گھر کی طرف دیکھا۔ رات وہاں نیو ایئر پارٹی تھی۔ نئے سال کا جشن خوب زور و شور سے منایا گیا تھا۔ پوری رات وہاں سے شور شرابا' بہت تیز آواز میں چلتا میوزک' قہقہے' باتیں' آوازیں سب یہاں تک بھی آتے رہے تھے۔

رات وہاں بہت ہنگامہ خیز انداز میں زندگی جاگی تھی اور اب دن کے ساڑھے بارہ بجے بھی وہاں زندگی گہری نیند سو رہی تھی۔

رات بھر جاگ کر نئے سال کا بھرپور انداز میں جشن منانے والے اب اپنی تھکن اتار رہے تھے۔

گھر کے افراد تو کیا اسے وہاں سے کسی ملازم تک کے چلنے پھرنے یا باتیں کرنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔

کل رات وقت کے وقت اسے بھی فون کر کے اس کی کزن ارم نے اس پارٹی میں شرکت کی بہت رسمی سی دعوت دی تھی لیکن اگر یہ بہت پر اخلاق اور پر جوش بلاوا بھی ہوتا تو تب بھی وہاں نہ جاتی۔

ان دنوں تو خیر وہ زندگی ہی سے بے زار ہو رہی تھی مگر جب ایسا نہیں تھا تب بھی بسنت اور نیو ایئر نائٹ اور نیو ایئر پارٹیز جیسی لغویات کو اس نے ہمیشہ سخت ناپسند کیا تھا۔

کبھی اس گھر یا کسی کوئی بے مقصد اور فضول پارٹی رکھتیں تو وہ دل پر کڑا ضبط کرتی بحالت مجبوری صرف ان کی ناراضی کے خوف سے اس میں شریک ہوا کرتی تھی۔

چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی سطح بالکل خشک اور ذہن بالکل خالی تھا۔

اس کا ملال اور یاسیت مایوسی میں اور مایوسی بے حسی میں بدل رہی تھی۔ وہ اتنی بے حس سی کیوں ہو رہی ہے؟ اسے خود پر جھنجلاہٹ ہوئی۔ وہ کھل کر روتی کیوں نہیں۔ ایک بار خوب کھل کر رو لے تو شاید اندر کا سارا غبار نکل جائے۔

اندر فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور وہ بے حسی سے بیٹھی کیاری میں کھلے نئے پھولوں کو دیکھ رہی تھی مگر فون پر جو کوئی بھی تھا وہ اتنی جلدی ہمت ہارنے کو تیار نہ تھا۔ فون کی یہ مسلسل بجتی بیلیں اسے اپنی برداشت سے باہر ہوتی محسوس ہوئیں تو ناچار اٹھ کر اندر آئی۔

"ہیلو۔" خاصی بے زاری سے اس نے ہیلو کہا۔

وہ ان دنوں ایسی ہی چڑچڑی اور بد مزاج سی ہو رہی تھی۔

"میں ولی بول رہا ہوں۔" ہیلو ہائے اور سلام دعا کے بغیر یہ فقرہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"اوہ....." اس کے ہونٹ ناگواری سے بھرپور انداز میں سکڑے۔

وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد کی آواز سننے کو تیار ہو سکتی تھی' سوائے اس ایک شخص کے۔

اس کی زندگی کی ہر الجھن' ہر پریشانی اور ہر مصیبت کی وجہ یہی ایک شخص تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتی تھی' وہ واقعی اس سے بے پناہ نفرت کرتی تھی۔ اس دنیا میں کسی چیز کی کمی نہ ہوتی اگر ولی صہیب خان اس میں نہ ہوتا یا کم از کم وہ فارہ بہروز خان کی دنیا میں تو نہ ہوتا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر وہ فوراً بولا۔

نئے سال کے اس پہلے دن جو سب سے پہلی آواز اس نے سنی' وہ اس شخص کی ہے اس کے چڑچڑے پن اور غصے میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

وہ فارہ ہی بات کر رہی ہے' کی تصدیق کے بغیر جو دو ٹوک اور حکمیہ سے لہجے میں اس سے جملہ بولا گیا اس نے اس کی طبیعت کو مزید مکدر کیا۔

فون پر اس سے زندگی میں صرف ایک ہی بار بات ہوئی تھی پھر بھی وہ مکار انسان اس کی آواز بخوبی پہچانتا تھا۔ "لیکن میں تم سے ہرگز ملنا نہیں....." اس نے انتہائی سخت لہجے میں کہنا چاہا مگر اس نے اس کے انکاری جملے کو مکمل نہیں ہونے دیا۔

"میں تم سے divorce (طلاق) کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ فون پر اتنی لمبی بات نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے' تم مجھ سے کہیں باہر ملو۔" وہ یک دم بالکل خاموش ہو گئی۔

یہ کال اگر غیر متوقع تھی تو یہ بات اس سے بھی بڑھ کر غیر متوقع۔

وہ اس کے سر پر ایک آسیب کی طرح تو پچھلے چھ سالوں سے مسلط تھا مگر گزرے چھ سات ماہ اس نے جتنی اذیت اور جتنی بے چینی میں گزارے تھے ایسے میں اسے لگنے لگا تھا کہ یہ شخص کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

وہ شخص ولی صہیب خان جتنا چالاک اور گھمنڈی انسان تھا ایسے میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس سے علیحدگی چاہتی اور وہ اسے چھوڑ بھی دیتا۔ وہ اس سارے مسئلے کو اپنی ناک اور انا کا مسئلہ بنا کر تا کون چپے چھپا سکتا تھا اور

نچوڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے divorce (طلاق) کا لفظ سن کر وہ کتنی دیر تو بے یقینی سے ریسیور تھامے رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"ٹھیک ہے کہاں ملنا ہے۔" اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کی مایوسی اور پژمردگی یک لخت ہی کچھ کم ہوئی ہے۔

وہ کیا بات کرنے والا تھا' یہ بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو یہی بہت غنیمت نظر آ رہا تھا کہ وہ اس معاملے پر بات کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی جانب سے ولی صاحب خان تک خلع کا قانونی مطالبہ کب کا پہنچ چکا تھا' نجانے یہ مسئلہ کب تک لٹکا رہتا تھا۔

اسے کورٹ' کچہری' وکیل' جرح' الزامات' جوابی الزامات ہر چیز سے الجھن اور کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ لوگوں کو تماشا دکھانے اور جگ ہنسائی کا کوئی فائدہ بھی تھا؟ لوگوں کو گفتگو کے لیے ایک چٹخارے دار موضوع ہاتھ آ جاتا' ہمدردی کے بہانے لوگ مزا لینے آ گئیں۔

اس کی پہلے ہی سے مشکل زندگی کو مشکل تر بنا گئیں۔ کورٹ سے باہر دنیا کو تماشا دکھائے بغیر اگر خوش اسلوبی سے یہ معاملہ طے ہو سکتا تھا تو اس سے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات اس کے لیے کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے بتا کر کہ کہاں ملنا ہے اور کتنے بجے ملنا ہے' فون بند کر چکا تھا۔

ریسیور واپس رکھ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی۔ لباس تبدیل کرتے وہ خود کو آنے والی صورت حال کے لیے تیار کرنے لگی۔

مقررہ ٹائم پر وہ اس ریسٹورنٹ کے باہر اپنی گاڑی پارک کر رہی تھی جہاں اس نے اس سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ اسے سامنے ہی کی ایک میز پر بیٹھا نظر آ گیا۔ وہ اگر بالکل ٹھیک ٹائم پر وہاں آئی تھی تو وہ وقت سے پہلے وہاں موجود تھا۔

وہ اس کی میز کے سامنے آ کر رکی اور پھر مکمل خود اعتمادی کے ساتھ کرسی کھینچ کر اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

اس غیر ملکی ریسٹورنٹ میں کئی نوجوان جوڑے ادھر ادھر کی میزوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ نئے سال کا پہلا دن ساتھ بتاتے' مستقبل کے حسین خواب بنتے' عہد و پیماں اور وعدے کرتے' سرگوشیوں میں کچھ دلنشین باتیں کرتے۔

خود پر ترس کھانا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا مگر پھر بھی اپنے ارد گرد ان محبت بھری سرگوشیوں میں مگن جوڑوں کو دیکھ کر اس کا دل نئے سرے سے آزردہ ہوا۔ ڈیڈی سے اپنی تقدیر سے نئے سرے سے شکوے دل میں پیدا ہوئے۔

جس عمر میں لڑکیاں خواب دیکھنے اور خواب بننے شروع کرتی ہیں اس عمر میں کسی اور نے نہیں اس کے اپنے ڈیڈی نے اس مغرور اور متکبر انسان کو اس کے سر پر مسلط کر کے اسے خواب دیکھنے کے حق سے ہی محروم کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بھی کوئی پسند' کوئی خواہش' کوئی خواب ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ بھی سوچے بغیر اس شخص کو اپنی بیٹی کی زندگی کا مالک بنا ڈالا تھا۔

یہاں اس میز پر اس سامنے والی کرسی پر میر بیٹھا ہوتا' کسی فکر اور کسی اندیشے کے بغیر وہ اس سے باتیں

کر رہی ہوتی۔ بے فکری سے ہنس رہی ہوتی' قہقہے لگا رہی ہوتی۔

کاش زندگی اتنی ہی آسان ہوتی' کاش زندگی اتنی ہی ہماری خواہشوں کے تابع ہوتی۔ سر جھٹک کر خود کو اس ٹرانس سے باہر نکالتے اس نے سامنے اکڑ کر بیٹھے اس مغرور گھمنڈی شخص کو دیکھا۔

ویٹر ان کی میز کی طرف آیا۔ اس سے اس کی مرضی پوچھے بغیر اس نے دو کپ کافی کا آرڈر کر دیا۔

وہ یہاں کچھ کھانے پینے اور دوستانہ گپ شپ کرنے آئی بھی نہیں تھی' وہ یہاں اپنی طلاق کی بات کرنے آئی تھی اور طلاق کبھی بھی دوستی اور محبت میں نہ توڑی جاتی ہے اور نہ لی جاتی ہے' اسی لیے جب کافی ان کے آگے سرو کر دی گئی وہ تب بھی اس سے لاتعلق ہی بیٹھی رہی۔

آرڈر ہونے اور کافی آ جانے کا وقفہ ان کے بیچ مکمل خاموشی میں گزر رہا تھا۔

وہ خود سے بات شروع کرنا نہیں چاہتی تھی' اس نے بلایا ہے' وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو پھر جو وہ کہنا چاہتا ہے وہ اسے پہلے غور سے سنے اور سمجھے گی' اس کے بعد کچھ بولے گی۔

وہ اس دوران بالکل خاموش اور اس سے بے نیاز و لاتعلق سا رہا تھا۔ کافی سرو ہو جانے کے بعد ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم divorce (طلاق) چاہتی ہو۔" یہ سوال یا تصدیق چاہنے والا فقرہ نہ تھا' یہ گویا کسی بات کا آغاز تھا۔ "میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔" ایک ڈرامائی سا وقفہ دے کر وہ اپنی کافی میں شکر ملانے لگا۔

سانس روک کر اس نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے گا' یہ تو جیسے کوئی خیال و خواب کی بات تھی۔ ایسے ظالم اور متکبر لوگ کتنے انا پرست اور خود سر ہوتے ہیں۔

وہ جانتی تھی خود چاہے وہ کسی بھی من پسند لڑکی سے جب دل کرتا شادی کر لیتا مگر اسے نجانے کب تک اپنے نام کے ساتھ لٹکا کر رکھنے والا تھا۔ اتنے بااثر لوگوں سے براہ راست مقابلے کے لیے تحمل ماموں نے بہت اچھے وکیل کا بندوبست کیا تھا۔

وہ خلع کے لیے اس کی طرف سے بہت اچھے اور بہت مضبوط دلائل دے گا مگر یہاں قانون' گواہ' جج' عدالتیں اور انصاف سب طاقت ور ہی کو فائدہ پہنچاتے ہیں' جس کے پاس جتنی دولت ہے' جتنی طاقت ہے' جتنی حیثیت ہے' وہی اتنا کامیاب ہے۔

کون جانے ولی سے خلع کی صورت علیحدگی اسے کتنی خواری اٹھانے کے بعد اور خود پر اپنے کردار پر کون کون سی تہمتیں لگوانے کے بعد کب جا کر نصیب ہو۔

"لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔ یوں سمجھ لو میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل یا ایگریمنٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ یہ ڈیل یا ایگریمنٹ کرنا چاہو تو میں تمہیں ہر طرح یقین دلانے کے لیے تیار ہوں کہ تمہیں تمہاری حسب خواہش آزادی کا پروانہ دے دوں گا' نہیں تو تمہاری مرضی ہے۔ میں ظاہر ہے تمہیں مجبور تو کروں گا نہیں۔"

CamScanner

اگر کوئی دھمکی اس کے لفظوں سے نہیں جھانک رہی تھی تو اس کی نگاہوں سے ضرور چھلک رہی تھی۔ "میں کب تک تمہیں لٹکا کر رکھ سکتا ہوں۔ میں کتنا تمہیں خوار و ذلیل کر سکتا ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کی نگاہوں کا یہ حملہ آور تاثر وہ پہچان سکتی تھی۔

طاقت کے زعم میں اکڑتے اس خود پسند انسان سے وہ کتنی شدید نفرت کرتی ہے نفرت کی ان گہرائیوں کو تو وہ کبھی ناپنا چاہتی تو ناپ نہ پاتی۔

"کیا ڈیل ہے؟" ڈرے یا گھبرائے بغیر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ اٹھارہ سال کی فارہ بہروز خان نہیں تھی جو اپنے نکاح کے بعد کتنے مہینوں تک گھر سے نکلتے ہر بار یہ سوچ کر ڈر جایا کرتی تھی کہ کہیں بااثر خاندان سے تعلق رکھنے والا شوہر اسے اغوا نہ کروا لے اسے زبردستی اٹھا کر نہ لے جائے۔ وہ آج ایک کامیاب ایڈووکیٹ تھی۔

اپنے دشمن کی طاقت کا اسے بالکل ٹھیک طرح اندازہ تھا مگر وہ اس طاقت سے ڈر کر بزدلوں کی طرح تھر تھر کانپ نہیں رہی تھی۔ نہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور نہ اس کی آواز۔

"تمہیں تین مہینوں تک آغا جان کے پاس ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے اگر آج تم میرے ساتھ چلو تو آج سے لے کر ۳۱ مارچ تک تمہیں وہاں ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اگر تم ایسا کرنے پر آمادہ ہو تو یکم اپریل کو جو تم چاہتی ہو وہ تمہیں مل جائے گا۔" بڑا پروفیشنل اور بزنس لائیک اسٹائل تھا ان جملوں کا۔ گویا واقعی یہاں ایک کاروباری ڈیل طے پا رہی تھی۔

یہ بات اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ ڈیل کے لفظ پر وہ کچھ خاص چونکی نہیں تھی اسے لگا تھا وہ اس سے کہے گا تم جائیداد میں اپنے سارے حق سے دستبردار ہو جاؤ میں بدلے میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔

وہ نہ حسینۂ عالم تھی نہ دنیا کی آخری لڑکی جس کے عشق میں وہ فنا ہو رہا ہو۔ جتنے عرصے سے طلاق اور خلع کی یہ کھینچا تانی ان دو گھرانوں کے درمیان چل رہی تھی اگر کوئی غیرت مند مرد ہوتا تو کب کا اس لڑکی کو آزاد کر چکا ہوتا جو بالکل صاف اور واضح کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

فارہ اسے ناپسند کرتی ہے فارہ کی ممی اسے ناپسند کرتی ہیں اس کے باوجود وہ آج تک اس رشتے کو نبھانے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہے۔ اس نکاح کو زبردستی قائم رکھنے کی وجوہ میں سرفہرست یہی وجہ اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ ایک تو وہ اس کے علیحدگی کے مطالبے کو غیرت اور انا کا مسئلہ بنا بیٹھا ہے اور دوسرا وہ جائیداد کی تقسیم نہیں چاہتا جس جائیداد کا وہ تنہا وارث بنا ہوا تھا۔ فارہ سے شادی کی صورت میں وہ سب اس کے پاس رہتی تھی اور علیحدگی کے نتیجے میں ظاہر ہے وہ فارہ کے حصے کا مالک تو نہیں بن سکتا تھا۔

اس کی ممی نے خلع کے ساتھ ساتھ آغا جان کی جائیداد میں فارہ کے حصے کا بھی مطالبہ کر رکھا تھا اور اسے ڈیل لفظ سے یہی شک ہوا تھا کہ وہ اس سے جائیداد سے دست برداری کا مطالبہ کرے گا اور یہ سوچتے ہی وہ خود کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار بھی کر چکی تھی کہ آغا جان کی جائیداد میں وہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو جائے گی۔

دولت، جائیداد اس کا مطلوب و مقصود کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا۔

یہ ولی صاحب خان یا رومی بہروز خان کا مقصد حیات تو ہو سکتا تھا مگر فارہ بہروز خان کا ہرگز نہیں۔ ولی کتنا بھی گھٹیا، کم ظرف اور پست ذہنیت کا انسان تھا اس سے اسے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اس اذیت ناک سوچ سے کہ اس کی اپنی ممی بھی دولت اور جائیداد کو اپنا ٹارگٹ اور گول بنا بیٹھی تھیں۔

چاہے آغا جان کو ہرانے کے لیے انہیں جھکانے اور شکست دینے کے ہی لیے مگر وہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ کر تو رہی تھیں۔

انا کی یہ ایک عجیب و غریب جنگ تھی ان کے اور آغا جان کے بیچ جس میں ہر خسارہ اور ہر نقصان اس کے حصے میں آ رہا تھا۔ ممی اور اس میں بنیادی اختلاف اور جھگڑے و کشیدگی کا سبب ان کا یہ مطالبہ ہی تھا۔ اس کے طلاق کے مطالبے کو گمبھیر و پیچیدہ اس دوسرے مطالبے ہی نے کر کے رکھ دیا تھا۔

لیکن اب یہ ولی ڈیل کا نام لینے کے بعد کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی سوچ کے برعکس اور بہت مختلف۔

وہ اس کے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے؟ دھوکا دہی اور مکاری پر مبنی یہ کوئی نیا آئیڈیا اس کے گھٹیا دماغ میں آیا ہے۔ وہ یہ سوچ رہی تھی اور وہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر پڑھنے میں مگن تھا۔

"تم سچ بول رہے ہو؟ میں کیسے یقین کر لوں؟ میرے تین مہینے وہاں رہنے سے تمہیں یا آغا جان کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ اس ساری بات کا مقصد کیا ہے؟"

"تم مطلب اور مقصد کو چھوڑو۔ وہ تمہیں وہاں جانا ہے۔ آغا جان کے ساتھ ایک بہت محبت کرنے والی پوتی بن کر رہنا ہے۔ اس دوران طلاق اور خلع کا ان کے سامنے نام بھی نہیں لینا۔ اگر تم ایسا کرنے پر راضی ہو تو میں آج سے ٹھیک تین مہینے بعد تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گا۔" وہ اپنے مخصوص حاکمانہ اور مغرور انداز میں فوراً بولا دو ٹوک اور مستحکم لہجے میں۔

"اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ فرسٹ اپریل کو میں قول نہیں بدل جاؤں گی؟ تمہیں کیا میں اتنی احمق نظر آتی ہوں کہ تم زبانی مجھ سے کوئی معاہدہ کرو گے اور میں اس پر احمقوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تمہارے پیچھے چل پڑوں گی؟" اس مغرور انداز پر دل میں شدید نفرت محسوس کرتے وہ طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں بولی۔

"اتنی قابل اور عالم فاضل ڈاکٹر کو احمق سمجھنے کی غلطی میں کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ تمہاری قابلیت اور ذہانت کا میں پہلے ہی سے معترف ہوں۔ تب ہی تو جانتا تھا کہ یہ بات ہوگی اور تب ہی یہ ایک قانونی دستاویز تیار کروا کر لایا ہوا ہوں۔" اس کا لب و لہجہ سنجیدہ اور بالکل پروفیشنل تھا۔

بولنے کے دوران وہ میز پر رکھے سیاہ رنگ کے لیدر بریف کیس کو کھول کر اپنے سامنے کر کے اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے بریف کیس میں سے ہلکے پیلے رنگ کا ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اسے دیکھ لو خوب اچھی طرح پڑھ لو، پڑھی لکھی اور خاصی ذہین لڑکی ہو تا تو اسے ایک نظر دیکھ کر ہی جان لو گی کہ یہ میری طرف سے ایک عہد نامہ ہے اور اس کی قانونی حیثیت مسلم ہے۔ اس پر میرے دستخط کے علاوہ دو معتبر بیرسٹر وکلاء کے دستخط بطور گواہ موجود ہیں۔

کوئی بھی معاہدہ یا Pact برابری کی سطح پر ہوتا ہے مگر ہمارے اس معاہدے میں اپر ہینڈ (Upper hand) میں تمہیں دے رہا ہوں۔ آج سے ٹھیک تین ماہ بعد کم اپریل کو فارہ بہروز کا ہر مطالبہ اس کی طے کردہ شرائط پر پورا کرنے کا قانوناً پابند ہوں گا۔ چاہے وہ مطالبہ طلاق کا ہو، رخصتی سے قبل کے حق مہر کا، جائیداد میں حصے کا یا ان کے علاوہ کسی اور بھی چیز کا جب ہر مطالبہ کہہ دیا تو وہ ایک سے زیادہ کئی مطالبات بھی ہو سکتے ہیں۔

اول تو اس کی نوبت نہیں آئے گی لیکن اگر فرض کرلو کہ تین مہینوں بعد میں تمہارے مطالبات پورے کرنے کے وعدے سے مکر جاؤں تب تم اس تحریری شہادت کو ایک مضبوط دلیل اور ثبوت کے طور پر پاکستان بھر کی کسی بھی عدالت میں لے جاؤ، فیصلہ تمہارے ہی حق میں ہوگا اور ویسے تم سمجھ سکتی ہو کہ ایسا میں چاہوں گا نہیں کہ اس میں میری ہتک ہے، اس لیے عدالت وغیرہ تک اسے لے جانے جانے کی نوبت آئے گی نہیں۔ میں از خود ہی تمہارے تمام مطالبات پورے کروں گا۔ یہ کاغذ صرف تمہیں یقین دلانے کے لیے ہے۔"

اس نے ایک نظر اس کاغذ کو اور پھر ایک نظر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

اسے جائیداد میں اپنا حصہ یا دوسری کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں، وہ صرف اس سے طلاق چاہتی ہے، اسے کوئی غرض نہیں پڑی تھی جو اس شخص کو یہ وضاحتیں پیش کرتی، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ آغا جان کی جائیداد میں اپنا حصہ چاہتی ہے تو بے شک شوق سے سمجھتا رہے۔

وہ کیسے میں ماما سے چاہے اس مسئلے پر جتنا بھی اختلاف کرے مگر اس شخص کو تو یہ ہرگز بھی نہیں بتائے گی کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ اس کی ممی کا ہے، اس کا نہیں اور اس معاملے پر ان دونوں کے تعلقات میں خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ "دولت، جائیداد کا طلب گار سمجھے تو سمجھتا رہے، خود کون سا مختلف ہے اور خود کے کون سے باپ کی دولت ہے جس دولت جائیداد کا قانونی مالک وارث بنا بیٹھا ہے وہ جیسے اس کے دادا کی ہے اسی طرح وہ فارہ بہروز خان کے بھی دادا ہی کی ہے۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے دیکھتا اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔ یہ اس کا کوئی مکر ہو سکتا ہے، اس سب کے پیچھے اس کی کوئی گھناؤنی سازش، کوئی چال کارفرما ہو سکتی ہے اس کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ اس نکاح سے اتنی تنگ آ چکی تھی اتنی شدید ذہنی الجھن اور اذیت کا شکار تھی کہ اسے ختم کرنے کے لیے تین مہینے کیا چھ مہینے بھی آغا جان کے پاس پشاور جا کر رہنے پر آمادہ ہو جاتی مگر یہ یقین تو ہوتا کہ اس سے سچ بولا جا رہا ہے اسے کسی نئی سازش یا دھوکے کا شکار نہیں بنایا جا رہا۔

وہ کس سے پوچھے، وہ کس سے مشورہ کرے اس کی زندگی کے فیصلے ہمیشہ دوسرے کرتے تھے بات اس کی زندگی کی ہو رہی ہوتی اور اس میں اس کے علاوہ باقی ہر کوئی بولا کرتا تھا۔ اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ وہ خود بھی کر سکتی ہے، شاید برسوں سے دوسروں کے فیصلے سنتے سنتے وہ یہ بھول ہی گئی تھی تب ہی تو اس وقت جو فیصلہ کرنے

کا مرحلہ پیش آیا تو بری طرح الجھنے لگی۔

کشمکش اور الجھن کا شکار ہوتے اس نے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اس کے جواب کا ہنوز عجلت بھرے انداز میں منتظر تھا۔

"فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔" اس کے کانوں میں اپنے ڈیڈی کی آواز گونجی۔ ان کی برسوں پرانی یہ نصیحت جو انہوں نے اسے اسکول اور پڑھائی سے متعلق کسی نوری اور اہم فیصلے کرنے کے وقت کی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی یہ نصیحت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر وہ اس کے حافظے سے کبھی نکلی بھی نہیں تھی اور اس وقت نجانے کیوں ان کی یہ نصیحت اسے اچانک یاد آ گئی تھی۔

شاید برسوں بعد یہ کوئی ایسا فیصلہ تھا جو وہ تنہا کرنے جا رہی تھی۔ اسے سمجھانے، مخلصانہ مشورہ دینے والا کوئی دوست، کوئی ہمدرد ان لمحوں میں اسے میسر نہ تھا اور شاید یہ فیصلے کے اس مشکل لمحے کی تنہائی ہی کا احساس تھا جو اسے اپنے ڈیڈی کی برسوں پرانی یہ بات یوں ایک دم اور بالکل اچانک یاد دلا گیا تھا۔

"اکثر بہت اہم فیصلے ہمیں بہت عجلت میں اور فوراً کرنے پڑ جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی اہم فیصلہ درپیش ہو تو ہمارے دل اور دماغ میں جنگ سی چھڑ جاتی ہے۔ دل کچھ کہتا ہے اور دماغ کچھ اور۔ ایسے میں جو سب سے پہلی سوچ دل میں ابھرے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دماغ انسان کو اندیشوں میں مبتلا کر کے بزدلانہ فیصلے کروانا چاہتا ہے جبکہ دل حوصلے اور جرأت کا سبق سکھاتا جو کچھ ہے وہ کرنے کو کہتا ہے۔" ڈیڈی نے ان جملوں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔

"سمجھ لو کہ ہمارا دل ایک مشین ہے اگر ہم نے اسے..... " نجانے کیا کیا جو کچھ اسے یاد رہا، کچھ بھول گئی کچھ سمجھا، کچھ بالکل نہ سمجھ سکی۔ کم از کم تیرہ سال کی عمر میں تو ان جملوں کا ایک لفظ نہ سمجھ سکی تھی اور نہ ہی ان کا مقصد اور مطلب اس پر واضح ہوا تھا مگر آج یہاں فیصلے کے اس مشکل لمحے کا تنہا سامنا کرتے ہوئے اسے ڈیڈی کی یہ نصیحت اچانک ہی یاد آئی تھی اور بے ساختہ ہی وہ اس پر عمل بھی کرنے لگی تھی۔

اس کا دماغ اس مغرور خود پسند شخص پر بھروسا کرنے سے انکاری ہے مگر اس کا دل..... وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے اپنے دل کی آواز سننے کی کوشش کی اس سے مشورہ مانگنا چاہا۔

"تمہیں وہاں چلے جانا چاہیے۔" اس کا دل اس سے یہی کہہ رہا تھا۔

دل کی آواز سنتے وہ سوچنے لگی کہ آغا جان کے پاس چلے جانے میں کوئی نقصان تو نہیں۔ ان سے اس کے تمام شکوے شکایتیں، ناراضیاں اور گلے جائز اور ہر اعتبار سے بالکل درست ہیں۔ پر ہیں تو وہ اس کے سگے دادا۔ ان کے پاس جانے پر آمادگی ظاہر کر دینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی غلط جگہ جانے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ وہ ایسے انسان نہیں۔ جانتی ہے وہ ظالم، جابر، مطلق العنان اور نہایت متکبر شخص ہیں۔ یہ بھی اس کے علم میں ہے اس سے جس محبت کا وہ دم بھرتے ہیں، وہ خود پرستی و انا پرستی کے سوا کچھ نہیں۔ جو بیٹے کی موت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکت کر سکتا ہے، وہ بہو کو نیچا دکھانے اور ذلیل و بے عزت کرنے

CamScanner

کے لیے پوتی سے محبت و چاہت کے ہتھیار استعمال کر کے اسے ماں کے خلاف اکسانے کی حرکت کیوں نہیں کر سکتا؟

چلو مان لیا۔ آغا جان یہ موجودہ ڈرامہ، یہ سب معاہدہ وعاہدہ کا کھیل محض ممی کو نیچا دکھانے کے لیے کر رہے ہیں یا ان کا دست راست ولی ان سے ایسا کروا رہا ہے۔

"تم طلاق اور خلع کا شور مچا رہی ہو اور میری پوتی تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ بخوشی میرے پاس میرے گھر آ رہی ہے۔"

ان کی انا ممی کے مقابل یہ سب کچھ کہہ کر بہت خوش ہوگی اور پھر بہت فیاضی دکھاتے وہ پوتی ہی کی محبت میں، اس کی خواہش کا احترام کرتے "اعلا ظرفی و محبت کا ثبوت فراہم کرتے اپنے پوتے سے اس کی جان بخشی کروا کر اپنی انا کو مزید اونچائی پر پہنچا دیں گے۔

لیکن اس سارے ڈرامے سے یہ تو بہر حال ہوگا کہ ولی صہیب خان سے اس کی جان بخشی واقعی ہو جائے گی۔ ولی اس کے پاس آغا جان کی اجازت سے یہ پلان لے کر آیا ہے یا یہ اس کے اپنے سازشی ذہن کی کرشمہ ساز سوچ ہے، وہ نہیں جانتی تھی لیکن یہ ضرور جانتی تھی کہ ممی اور آغا جان کے بیچ جو یہ عجیب و غریب اور تکلیف دہ انا کی جنگ چھ برسوں سے چھڑی ہے اور جس میں وہ دونوں ہی اسے اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، وہ اس سے بری طرح عاجز ہے، تنگ آ چکی ہے، تھک چکی ہے۔

اور ان چھ سالوں میں سے جو پچھلے چھ سات مہینے گزرے ہیں، وہ تو اذیت اور تکلیف میں گزشتہ ہر اذیت سے بڑھ کر ثابت ہوئے ہیں۔ چھ سات مہینوں سے جو اذیت وہ سہہ رہی ہے جس درد اور جس کرب سے وہ گزر رہی ہے، وہ ناقابل بیان حد تک تکلیف دہ، سخت اور کڑی ہے۔

اس کا اٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، سکون، چین، آرام سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہے۔

ممی تو محض چودہ روز پہلے اسے چھوڑ کر گئی ہیں مگر ان کے جانے سے قبل بھی اس کی زندگی ایسی ہی بے سکونی اور بے اطمینانی میں گزر رہی تھی۔ وہ رات سوتی تو ہول تو نیند ہی نہیں آتی اور اگر آ جائے تو کئی اذیت بھرے احساس ساتھ لیے اس کی آنکھیں بند ہوتیں۔ صبح جاگتی تو نئے دن کی کوئی خوشگواری نہیں بلکہ مستقبل کے اندیشے و تفکرات اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

چھ سال پہلے اس کی زندگی کا فیصلہ کچھ لوگوں نے اس سے اس کی مرضی پوچھنے کی زحمت کیے بغیر کر دیا تھا اور آج بھی اس زندگی کا فیصلہ کچھ دوسرے لوگ ہی اپنی اپنی اناؤں کو سر بلند رکھنے کی کوششوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ دوسروں کے ہاتھوں میں کیوں ہے؟

اسے ولی صہیب خان سے آزادی چاہیے، کسی بھی قیمت پر۔ چاہے ممی کی انا سرخرو ہو یا آغا جان کی اسے مطلق پروا نہیں۔ جب وہ دونوں اپنے اپنے مفادات کے لیے اسے بے جان شے کی طرح استعمال کر سکتے ہیں تو وہ کیوں کسی کی پروا کرے۔

دماغ کی تمام تاویلوں، اندیشوں، تفکرات، تحفظات اور وسوسوں کو اس نے آناً فاناً مسترد کر کے اپنے سامنے رکھا وہ کاغذ اٹھا لیا۔

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔"

وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسے مڑ کر پیچھے دیکھنا نہ کچھ سوچنا تھا۔

ولی چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر فوراً ہی ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کرتا کرسی پر سے اٹھ گیا۔ کپ میں اس نے شکر ملائی ضرور تھی پر کافی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔

"تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم گھر پر سے اپنا جو سامان لینا چاہتی ہو ایک گھنٹے کے اندر لے لو۔"

اسی بے تاثر سے سنجیدہ انداز میں اس نے اسے معاہدے کی اہم ترین شق سے آگاہ کیا۔

اس کے چہرے پر سے کوئی بھی تاثر پڑھنا ناممکن تھا۔ وہ فارہ کی آمادگی پر خوش ہے، اپنی چالاکی پر نازاں و مغرور ہے۔ اس کے چہرے سے اس کی کوئی بھی اندرونی کیفیت بالکل ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر آ گئی اور وہ اس کے پیچھے اپنی گاڑی میں جسے ایک درمیانی عمر کا آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہ باہر گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ اندر تیز رفتاری سے اپنا ضروری سامان بیگوں اور سوٹ کیس میں ٹھونس رہی تھی۔ اس کام کے دوران مسلسل اس کے ذہن میں جو ٹینشن سوار تھی، وہ ممی کو فون کرنے کی تھی۔ چودہ دن پہلے جب وہ گئی ہیں اس سے شدید ناراض ہو کر گئیں تو وہ وہاں پہنچ کر بعد میں بھی اسے فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رہ گئی فارہ خود تو اسے پہلے یقین تو آ جاتا کہ اس کی ماں اسے بالکل بے سہارا تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے، تب وہ انہیں فون کرنے اور ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے کا سوچتی بھی۔

ہاں ان کے ٹورنٹو پہنچنے کے بعد اس کی خالہ کا فوراً ہی فون ضرور آیا تھا، اسے ممی کی بخیریت آمد کی اطلاع دینے نہیں بلکہ ماں کی نافرمانی اور اس کا دل دکھانے پر خوب سخت سست سنانے۔ وہ انہیں بڑا جان کر چپ چاپ ان کی ساری پھٹکار خاموشی سے سن لیتی۔ اگر وہ اس ساری گفتگو میں اس کے ڈیڈی کا ذکر نہ لاتیں۔

"سچ کہتے ہیں لوگ جس شخص سے کوئی خوشی، کوئی فیض نہ پہنچا ہو تو اس کی اولاد سے کسی فیض، کسی بھلائی کی توقع کوئی کیسے رکھے۔ جب تمہارے باپ نے میری بہن کو کوئی سکھ اور خوشی نہ دی تو تم بھی تو اسی کی اولاد ہو۔"

تب وہ خاموش نہ رہ پائی تھی۔

کوئی اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو کچھ کہے اور وہ خاموشی سے سن لے؟ وہ ایسی بیٹی نہ تھی، یہ ممی کی دی ہوئی شہ تھی کہ خالہ، ماموں، ممانی جس کا جو جی چاہے اس کے ڈیڈی کو کہہ دے مگر وہ ممی ہوں گی جو شوہر کے متعلق کوئی بھی بات اطمینان سے سن لیا کرتی ہوں گی۔ فارہ کو اپنے ڈیڈی سے چاہے بہت سی شکایتیں ہوں مگر وہ کسی دوسرے کو یہ اجازت نہ دے سکتی تھی کہ وہ اس کے مرحوم باپ کی توہین کرے۔ اس نے پھر جواب میں خالہ کو اس بات کا خاصا سخت جواب دے کر ریسیور بہت زور سے کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔

اس روز کے بعد اس کا ٹورنٹو کوئی رابطہ نہ ہوا تھا اور اب اس وقت اسے وہاں فون کرنا تھا۔ اس نے اپنے

CamScanner

موبائل سے ممی کا موبائل نمبر ملایا۔ وہ خالہ یا کسی کزن سے نہیں ممی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے یہ وہ انہیں خود بتانا چاہتی تھی مگر ممی نے اس کا نمبر دیکھ کر خود کال ریسیو نہیں کی تھی ان کے بجائے کال نورین خالہ ہی نے ریسیو کی تھی۔

"وہ سو رہی ہے۔" یقیناً وہ اس کی آواز سننے کی بھی روادار نہیں تھیں مگر خالہ کو شاید یہ بات اسے بتاتے آج کچھ رواداری آڑے آ رہی ہو گی تھی تب ہی مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لیا گیا تھا۔

"آپ انہیں یہ بتا دیجیے گا کہ قارہ اپنے دادا کے پاس پشاور جا رہی ہے اور اب وہ تین مہینے وہیں رہے گی۔ وہ اگر اس دوران مجھ سے رابطہ کرنا چاہیں تو وہیں کریں۔" ماں کے اس رویے پر اس کی آنکھیں یک دم ہی بھر آئی تھیں اور لہجہ بھی بھرانے لگا تھا۔

اس نے خود کو بھری دنیا میں بالکل تنہا یا بالکل اکیلا محسوس کیا تھا۔ تب ہی یہ مختصر سا جملہ بول کر اس نے ان کا جواب سنے بغیر فوراً خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

اس کی ماں کو اپنی اکلوتی اولاد سے بڑھ کر اپنی انا کیوں عزیز ہے۔ وہ اسے سمجھتی کیوں نہیں۔ اس کی ماں ایسی کیوں ہے۔ ساری دنیا میں واحد رشتہ ایک ماں اور وہ اتنی بدظن اتنی دور اس قدر بدگمان اس درجہ اجنبی۔

اس کی ماں ایسی نہیں تھی وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ اسے ایسا کس نے بنایا؟ وہ انسان جس کے پاس وہ آج جا رہی ہے۔ چند منٹ لگے تھے اسے اذیت و تکلیف دیتے ہوئے ہر احساس سے باہر نکلنے میں۔

بے دردی سے آنکھیں رگڑ کر صاف کرتی وہ بہت تیزی رفتاری سے سارا گھر جلدی جلدی لاک کرنے لگی۔

ایک اداسی بھری نگاہ اپنے گھر کے خالی در و دیوار پر ڈالتی وہ گیٹ سے باہر نکلی۔ گیٹ کو تالا لگایا اور۔ پھر پاس زمین پر رکھے سوٹ کیس اور دونوں بیگز اٹھا کر مستحکم اور فیصلہ کن انداز میں اعتماد کے ساتھ چلتی اس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی جس میں ولی صہیب خان سکون سے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ آج زندگی میں تیسری بار اس عالیشان گھر میں آئی تھی پہلی بار وہ دل میں خوف و ہراس لیے یہاں آئی تھی اور دوسری بار غموں کا کبھی نہ ختم ہونے والا احساس لیے درد، غم اور آنسو لیے۔

ڈیڈی کی میت کو ساتھ لیے اسے اپنا دوسری بار کا یہاں آنا یک بارگی یاد آنے لگا۔ اسے ڈیڈی یاد آنے لگے۔ آج ڈیڈی کیوں نہیں۔ وہ ہوتے تو وہ یوں تنہا تو نہ ہوتی پھر ممی بھی اب جیسی نہ ہوتیں اور پھر اس کی زندگی بھی بالکل مختلف ہوتی۔

یا اس کی آنکھیں رونا بھول گئی تھیں یا ایک ہی دن میں آج دوسری بار اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی تھی۔ خود کو سرزنش کرتے اس نے فوراً ہی اپنی کمزوری پر قابو پایا۔

اجنبیوں کے سامنے رونا آنسو بہانا اپنی کمزوری دکھانا یہ اس کی سرشت میں نہ تھا اور اس وقت وہ ایک اجنبی ہی کے ساتھ تھی۔ وہ سگے بھائیوں کی اولادیں ہونے کا جو رشتہ اس کے ساتھ ہے اسے وہ اہم سمجھتی نہیں اور دوسرا

جو نام نہاد کا نظری رشتہ ہے اسے وہ مانتی نہیں اور جب وہ کسی بھی رشتے کو نہ اہم سمجھتی ہے نہ سرے سے مانتی ہے تو برابر کھڑا یہ شخص اجنبی ہی ہوا نا۔

جس طرح ان دونوں نے سارا سفر خاموشی سے طے کیا تھا اسی طرح وہ دونوں طویل راہداری بھی خاموشی سے عبور کرتے گھر کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

یہ گھر کتنا بڑا، کتنا عالیشان اور محل نما ہے۔ وہ یہاں پہلی بار نہ آئی تھی جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تعجب سے بلند چھتوں، بیش قیمت لکڑی کے منقش دروازوں، کھڑکیوں، قیمتی فانوسوں، فرنیچر، قالین اور دیگر نایاب اشیاء کو دیکھتی۔ وہ ان سب چیزوں پر بے نیازی سے بھری اچٹتی نگاہ تک ڈالے بغیر سر اٹھا کر بالکل سیدھ میں دیکھتی اس طرف چلتی رہی جہاں وہ جا رہا تھا۔

ولی نے ایک کمرے کے آگے رک کر اس کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اسے آنے کا اشارہ کرتا وہ اندر داخل ہوا۔ وہ اس سے ایک قدم کا فاصلہ رکھتی اس کمرے میں داخل ہوئی۔

چھ سالوں میں یہ کمرہ اس کا منظر کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ سامنے وہ عالیشان بیڈ اسی طرح رکھا تھا اور اس پر وہ پرغرور شخصیت اسی طرح لیٹی تھی۔

چھ برس قبل بھی وہ یہاں اس بیڈ پر اسی طرح لیٹے تھے بس فرق صرف اتنا تھا کہ جب ان کے پیروں کے قریب بیٹھ جاتے اس کے ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی بیٹی اور بیوی سے بالکل لاتعلق صرف آغا جان کے بیٹے بنے ہوئے۔

اور پھر انہیں اس کمرے میں اس بستر پر لیٹی اس شخصیت ہی نے ایک جابرانہ اور ظالمانہ فیصلہ قارہ بہروز خان کی زندگی کا کیا تھا اسے اس کے ڈیڈی سے منوایا تھا اور ڈیڈی کے ذریعے وہ فیصلہ اس پر مسلط کروایا تھا۔

وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ واقعی کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ ڈیڈی کی اجنبیت، ان کی دوری، ممی کا غم و غصہ اور اپنی سراسیمگی، خوف، بے اختیاری و بے بسی اسے سب کچھ یاد تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے اور ان کے بیڈ کے بالکل پاس ہی کرسی ڈالے زرینہ صہیب خان بیٹھی تھی۔

دروازہ بے آواز کھولا گیا مگر پھر بھی اس نے نجانے کس احساس کے تحت گردن گھما کر دیکھا اس کی نظریں بھائی پر شاید پل بھر کو ٹھہری تھیں اس کے بعد وہ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔

اسے دیکھ کر ان نگاہوں میں حیرت تو ابھری تھی مگر تنفر بھری۔ نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہ ہی کچھ کہا۔ وہ بس نفرت بھری نگاہوں سے قارہ کو دیکھتی رہی۔ وہ ولی کے ساتھ چلتی بیڈ کے قریب آ گئی۔

ولی نے آغا جان کو بغور دیکھتے زرینہ سے اشارے میں پوچھا کہ آیا وہ سو رہے ہیں یا یونہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کے جواب سے قبل ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ شاید ان کی حسیات بہت تیز تھیں۔ تب ہی بغیر کسی آواز کے بھی انہیں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ولی کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی اور انہوں نے اسے فوراً ہی دیکھ لیا تھا۔

"قارہ..... قارہ آئی ہے..... ولی! یہ تمہارے ساتھ قارہ ہی ہے نا..... یا میں....؟" ان کے لبوں سے بڑی

نحیف اور کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

ان کی آنکھیں حیرت، بے یقینی اور خوشی کا تاثر ایک ساتھ ظاہر کر رہی تھیں۔ اسے حیرت اور بے یقینی سے دیکھتے وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ولی نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیٹھنے میں انہیں مدد دی۔ ان کی کمر کے پیچھے تکیے اور کشن ٹیک کے لیے رکھ دیے۔

''تم کیسے آ گئیں بیٹا؟ کس کے ساتھ آ گئیں؟ کیا رجی بھی آئی ہے؟'' فارہ بہت گہری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

ان کی حیرت کتنی سچی ہے' وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ یعنی اسے یہاں بلا کر ممی کو شکست دینے کا یہ منفرد آئیڈیا آغا جان کا نہیں' ولی کا اپنا بچھایا ہوا جال تھا اور وہ اس سے بالکل بھی آگاہ نہیں تھے۔

دادا کی جائیداد کے وارث اور سیاہ و سفید کے مالک نے غالباً انہیں جیت کی خوشی فراہم کرنے کو یہ سارا پروگرام و منصوبہ کیا تھا۔

یہ بھانپ لینے کے بعد کہ چاہے وہ کتنا بھی عرصہ اسے اپنے نام کے ساتھ لگا کر رکھ لے' اسے اپنے ساتھ رہنے پر تو بھی آمادہ نہ کر پائے گا۔ تو کیوں نہ اس سارے معاملے کو کچھ اس انداز سے انجام تک پہنچایا جائے جس میں آغا جان کی اخلاقی فتح اور اس کی ممی کی شکست کا تاثر بھرپور انداز میں ابھر کر سامنے آئے۔

اسے چہرے پڑھ لینے کا کوئی بہت زیادہ دعویٰ تو نہیں تھا لیکن یہاں قدم رکھتے ہی زرینہ اور آغا جان کے بے تحاشا حیرت لیے چہروں نے اسے یہ اچھی طرح بتا دیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی آمد سے آگاہ و واقف نہیں تھا۔ آغا جان اس کی سوچ اور اس کی نگاہوں سے انجان اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔

''وہاں کیوں کھڑی ہو میری جان! ادھر آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ میں یقین تو کر لوں میری فارہ میرے پاس آئی ہے۔'' ان کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑی والہانہ خوشی چھلک رہی تھی۔ یوں جیسے ان کا بس نہیں چل رہا خود اٹھ کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آ جائیں اور اسے اپنے گلے سے لگا لیں۔

پوتی کو اپنے پاس دیکھ کر بکھرتی یہ بے تحاشا خوشی اپنی جیت کی تھی یا بہو کو شکست دے دینے کی یا ان دونوں کی؟ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ ایک پل کچھ سوچا پھر وہ ان کے قریب آ گئی۔

زرینہ اس دوران کمرے سے نکل کر جا چکی تھی اور اب اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ وہاں بیٹھنے لگی تب وہ بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو میں اپنی بچی کو جی بھر کر دیکھنا اور پیار کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے انداز میں ان کے بیڈ پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

وہ اپنے جھریوں زدہ کانپتے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ''یہ ولی لایا ہے نا تمہیں؟ بڑا ہی تمیز ہے یہ لڑکا۔ مجھے بتا کر بھی نہیں گیا کہ میں فارہ کو لینے جا رہا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو سفر میں تھک گئی ہو گی۔''

وہ اس سے محبت کرتے ہیں' وہ جانتی تھی۔ ہاں ان کی محبت کا اپنا ایک الگ انداز تھا۔ وہ جن سے محبت کیا کرتے تھے ان کی زندگی بھی خود جینے کی کوشش کرتے تھے انہیں ان کی زندگی کا ایک پل' ایک گھڑی اور ایک ساعت بھی اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے جینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

جس سے محمد بختیار خان محبت کا دعویٰ کرتے تھے ان کی آتی جاتی سانسیں بھی ان کی مرضی کے تابع ہوا کرتی تھیں۔ اگر دوسروں پر اپنے من چاہے فیصلے مسلط کرنے کا نام محبت ہے تو اس سے محبت کرتے تھے۔ اگر بے تحاشا پیسہ اور دولت لٹانے کا نام محبت ہے تو وہ اسے محبت کرتے تھے اور اگر دوسروں کی پوری زندگی خود جی لینے کا نام محبت ہے تو وہ اس سے محبت کرتے تھے۔

وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی یہ یم خاموشی ماحول کو بہت اکورڈ بنا رہی ہے' وہ جانتی تھی' وہ جب یہاں آ گئی ہے تو اب اسے کچھ بولنا بھی ہے۔ ان گزرے چھ سالوں میں ہر دو تین مہینے بعد جب بھی وہ اسے ایک مختصر سی فون کال کرتے تھے تب وہ ان سے باادب لہجے میں پر تکلف اور رسمی سی باتیں کر لیا کرتی تھی۔

باتیں کیا کرتی تھی جو وہ پوچھتے تھے اس کا جواب دے دیا کرتی تھی۔

جتنی شدید نوعیت کا جنگ و جدل سے بھرپور ماحول ان دو گھرانوں کے بیچ بالکل اعلانیہ اور کھلم کھلا پچھلے چھ سات ماہ سے چل رہا تھا۔ اس میں اس کی آمد کوئی عام سی اور روٹین کی بات نہ تھی۔

''اسے اس کی ممی نے یہاں کیونکر آنے کی اجازت دے دی؟'' جیسا بنیادی اور اہم ترین سوال بھی نہیں۔ وہ بیچے اسے دیکھ کر ہی بہت خوش ہو گئے تھے۔ ان کے جملے یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ان کی بیماری کا سن کر بھاگی بھاگی ولی کے ساتھ آ گئی ہے۔

وہ بیمار ہیں' یہ ان کا کمزور و نحیف وجود بستر پر دراز دیکھ کر ہی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ چھ سال پہلے اسی گھر کے اسی کمرے میں جب زندگی میں پہلی بار ان سے ملی تھی' وہ تب بھی بیمار ہی تھے۔ وہ تب بھی یونہی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تھے۔ اس نے ان سے ان کی طبیعت کی خرابی کا سرسری تذکرہ گزرے برسوں میں کئی بار سنا تھا۔

ولی انہیں ٹیک دلوا کر بٹھانے کے بعد سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کا چہرہ اور نگاہیں جو سفر کے دوران تمام وقت بالکل بے تاثر رہے تھے اب آغا جان کی سمت مرکوز اتنے بے تاثر نہیں رہے تھے۔ اسے یکسر فراموش کیے وہ یک ٹک آغا جان کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اسے بولنے کے لیے یہی مناسب لگا کہ ان کی طبیعت پوچھ لے۔

''طبیعت ٹھیک ہے بیٹا! اس عمر میں چھوٹی موٹی تکلیفیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے کے بچے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں تو ہماری تو اب عمر ہے۔ کبھی آنکھ دکھ رہی ہے تو کبھی داڑھ ہل رہی ہے' کبھی گھٹنے جواب دے جاتے ہیں تو کبھی دل' گردے' جگر شرارتوں پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپا نام ہی بیماریوں کا ہے۔''

اس کے چہرے کو محبت سے تکتے ہوئے انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

اس کی نظریں ان کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی فریم شدہ تصویر پر جم گئی تھیں۔ چھ سال قبل پہلی بار جب وہ اس

کمرے میں آئی تھی تب یہ تصویر یہاں موجود نہیں تھی اس لیے کہ تصویر کھینچی ہی اسی دن گئی تھی۔

خوف زدہ دوہراسا اس نظریں جھکا کر زبردستی کی دلہن بنا کر بٹھائی گئی وہ خود اس کے برابر میں جہیز' شرٹ میں ملبوس اس کا زبردستی کا دولہا' دولہا کے برابر دولہا کے کندھے کے گرد محبت سے بازو پھیلائے اداسی بھری مسکان چہرے پر سجائے اس کے ڈیڈی اور دلہن کے برابر میں بیمار کمزور اور لاغر سے آغا جان۔

آغا جان کے برابر سنگل صوفے پر بہت ناراض' بہت خفا' بہت غصے میں اس کی ممی اور ڈیڈی کے برابر سنگل صوفے پر آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لیے زرینہ...... اس تصویر کے ساتھ ایسی کوئی بھی تو خوش گو یاد نہ جڑی تھی جسے یاد کر کے وہ خوش ہو پاتی۔ وہاں کچھ اور تصاویر بھی تھیں۔ وہ ایک دیوار پر آویزاں اور دو ایک یہاں وہاں مختلف جگہوں پر تھی۔

آغا جان کی اس کی دادی' اس کے ڈیڈی اور اس کے چچا صہیب خان کے ساتھ ان کی جوانی کے دنوں کی تصویر۔

آغا جان اور اس کی دادی بہت ینگ اور ڈیڈی اور صہیب خان چھوٹے چھوٹے بچے۔

اس کے ڈیڈی کے کونووکیشن کے دن کی سیاہ روب اور ڈگری ہاتھ میں لیے تصویر اور صہیب خان کی کالج یونیورسٹی میں کوئی میڈل وصول کرتے وقت کی تصویر۔ وہاں ولی اور زرینہ کی ان کے والدین کے ساتھ بچپن کی ایک تصویر بھی نظر آ رہی تھی۔

تصاویر سے نگاہیں ہٹا کر وہ دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی جو اسے بیڈ پر اوپر کر کے آرام سے بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ وہ کمبل پیروں پر ڈال لے۔ اسے سردی تو نہیں لگ رہی۔

وہ لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز پشاور آئی تھی تب بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں سفر سے تھک نہ گئی ہو۔ یہاں جیسے اس نے لاہور سے پشاور تک کا راستہ پیدل طے کیا ہو۔

کسی جسمانی تھکن کا تو خیر اسے کیا شکار ہونا تھا۔ ہاں اعصابی' نفسیاتی اور ذہنی طور پر وہ کافی تھکی ہوئی تھی اور دباؤ میں بھی تھی۔

جس جگہ وہ آ گئی تھی' وہاں آنا کوئی عام بات نہ تھی۔ لاکھ وہ خود کو پُراعتماد اور بہادر ظاہر کر رہی تھی مگر اندر سے کچھ نروس تو تھی۔

"تم آ کر فریش بھی ہوئیں یا یونہی تمہیں اٹھا کر سیدھا میرے پاس لے آیا؟ یہ زرینہ کہاں ہے؟ کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اس سے کہو صمد سے کھانا لگوائے۔"

وہ خاصے خوش اور پرجوش سے نظر آ رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی بہت خاص الخاص اور غیر معمولی اہمیت کا حامل مہمان ان کے گھر آ گیا تھا اور ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ اس کی کس طرح خاطر مدارات کریں۔

"کھانا لگواؤ بیٹا! اور صمد سے پوچھو' کچھ ڈھنگ کی چیز اس نے پکائی بھی ہے کہ نہیں۔ میری بیٹی آئی ہے۔ اس کے شایانِ شان نہایت شاندار ڈنر ہونا چاہیے۔"

ولی زرینہ کو بلا کر لے آیا تھا اور یہ تمام کلام اسی سے ہو رہا تھا۔

"آپ ڈائننگ روم تک جانے میں تھک جائیں گے آغا جان! ایسا ہی کھانا یہیں لگوا دوں؟" زرینہ بیٹی اور شایانِ شان ڈنر دونوں کے ذکر کو مکمل نظر انداز کرتی صرف کھانا لگوانے کی بات کے جواب میں بولی۔

فارہ آغا جان کے بالکل برابر میں بیٹھی تھی مگر وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے وہاں آغا جان کے علاوہ اگر کوئی ہے تو اسے نظر نہیں آ رہا۔

"لگوا دو لیکن پھر سب کا یہیں لگواؤ۔ میں آج اپنے بچوں کے ساتھ کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ میرے تینوں پوتی' پوتا میرے دائیں بائیں موجود ہوں۔ ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ ایک پرفیکٹ فیملی ڈنر۔"

تھوڑی ہی دیر میں ان کے کمرے میں صوفے کے سامنے رکھی لکڑی کی خوب صورت میز پر تمام کھانا چن دیا گیا تھا۔ وہ بیڈ سے ولی کی مدد کے سہارے اٹھے اور انہیں صوفے تک بھی کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ چلاتا وہی لایا۔ آج تو وہ سہارے سے چل رہے تھے اس نے جب زندگی میں پہلی بار انہیں دیکھا تب وہ وہیل چیئر پر بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے تھے۔ بیٹھنے کے بعد انہوں نے فارہ کو ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا۔

"وہ دونوں شریر کہاں ہیں؟" آغا جان ابھی زرینہ سے پوچھ ہی رہے تھے کہ ولی جو چند سیکنڈ قبل ہی کمرے سے باہر گیا تھا' واپس آ گیا۔ اپنی گود میں دائیں بائیں دو خوب صورت بچوں کو اٹھائے ہوئے انہیں گدگدا کر ہنساتا اور کچھ بولتے ہوئے۔

زرینہ کے غصے سے بھرے خوب پھولے ہوئے منہ پر اس منظر کو دیکھ کر لحظہ بھر کو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔ زیادہ حیران ہونے یا سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ یقیناً زرینہ کے بچے تھے۔

تقریباً پانچ سال قبل اس کی شادی کا بلاوا جو آغا جان نے فون پر دیا تھا اور ولی کے ہاتھ شادی کا کارڈ معہ لاہور سے پشاور اور ریٹرن ہوائی ٹکٹ کے بھجوایا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا۔

"زرینہ کی شادی ہے میں ولی کے ہاتھ کارڈ اور تمہارا اور روحی کا جہاز کا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ تم لوگ آ ؤ گے تو مجھے اور زرینہ کو بہت خوشی ہو گی۔"

شادی میں تو خیر ان لوگوں کو کیا جانا تھا لیکن وہ بلاوا اسے یاد تھا اور تب کا اپنا افسوس بھی۔ ولی سے چار سال چھوٹی اور اپنی ہی ہم عمر لڑکی چاہے اس کا اس سے کوئی تعلق تھا یا نہیں لیکن اتنی کم سنی کی اس کی شادی پر اسے بہت افسوس ضرور ہوا تھا۔

پتا نہیں بے چاری کو کچھ پڑھنے لکھنے بھی دیا تھا آغا جان نے کہ نہیں۔ جب غالباً فارہ کے میڈیکل کے پہلے سال کا اختتام چل رہا تھا اور اتنا تو طے تھا کہ اگر اسے بھولے بھٹکے اسکول کالج کی شکل دیکھنے کی آغا جان نے اجازت دے دی تھی تب بھی وہ اس وقت تک گریجویٹ تو ہرگز نہیں ہوئی ہو گی۔

اس خاندان میں عورتوں کو دبا کر اور محکوم بنا کر رکھنے کی روایت تھی۔ یہاں مردوں کو حاکمیت حاصل تھی۔ فیصلے وہ کریں گے اور عورتیں بیوی' بیٹی' بہن' بہو اور پوتی وغیرہ وغیرہ کی مختلف حیثیتوں میں سر جھکا کر بغیر اُف کیے انہیں

قبول کریں گی۔

اس خاندان میں بچپن کی منگنیوں اور نکاح وشادیوں کا بھی بہت رواج تھا۔ اس کے ڈیڈی کی بھی ایسی ہی بچپن میں منگنی کی گئی تھی جسے توڑنا بعد میں ان کا جرم بنا تھا۔ زرمینہ کی شادی کی اطلاع دیتے ہوئے آغا جان نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی منگنی کچھ سال قبل اس کے والدین کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔

اٹھارہ' ساڑھے اٹھارہ سال کی لڑکی کی اگر چند برس قبل بھی منگنی ہوئی ہو گی تو بھلا اس وقت کیا عمر رہی ہو گی اس کی؟ اور خود اس کا نکاح...... صرف اٹھارہ سال کی عمر' منگنیوں' نکاحوں اور شادیوں کی کوئی مناسب عمر تو نہیں ہوتی۔

ولی ان دونوں بچوں کو گود میں لیے آغا جان کے برابر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں بچوں کی عمروں کا زیادہ درست اندازہ وہ لگا نہیں سکی۔ دیکھنے میں لڑکی ذرا زیادہ صحت مند اور بڑی نظر آ رہی تھی۔ شاید ساڑھے تین چار سال کی اور لڑکا نسبتاً کچھ کمزور دبلا اور چھوٹا لگ رہا تھا۔ زرمینہ ابھی تک بیٹھی نہیں تھی۔

ولی صوفے کے کونے پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر آغا جان تھے اور ان کے برابر فارہ۔ صوفے پر جو واحد جگہ بچی تھی' وہ فارہ کے برابر تھی اور وہ لڑکی اس سے اتنا بغض وعناد تو رکھتی ہی تھی کہ اس کے برابر میں نہ بیٹھ سکے۔ وہ مڑ کر بیڈ کے پاس سے اپنے لیے کرسی اٹھا لائی اور اس کرسی کو میز کے سامنے رکھ کر اس پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل چاہا' وہ اسے بتا دے کہ زیادہ فکر مت کرو میں کسی طویل قیام وطعام کے لیے یہاں ہرگز نہیں آئی جیسے تم مجھ سے بیزار ہو ایسے ہی میں بھی تم لوگوں سے بیزار ہوں۔ ویسے نفرت وعداوت اپنی جگہ اس لڑکی نے خود کو دو بچوں کے بعد بھی مین ٹین بہت اچھی طرح کر کے رکھا ہوا تھا۔

وہ اتنی دبلی پتلی اور نازک سی تھی جیسے فارہ۔ نیلے رنگ کی کڑھائی والے شلوار قمیص کے ساتھ سر پر دوپٹہ لیے وہ اتنی ہی فریش ینگ اور اسمارٹ لگ رہی تھی جتنی کوئی بھی غیر شادی شدہ لڑکی۔ اگر اس میں موجود خاندانی غرور وتکبر ہٹا کر اسے دیکھا جاتا تو وہ کافی زیادہ خوب صورت لڑکی تھی۔

جانے وہ یہاں مستقل رہتی تھی یا صرف ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس نے لمحہ بھر سوچنے سے زیادہ اس بات پر کچھ خاص غور وفکر کیا نہیں۔

ماں کو فارہ کے برابر بیٹھنا نہ تھا مگر بیٹی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ ماموں کی گود سے اتر کر صوفے کی اس خالی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

پلاؤ میں سے بوٹیاں ہٹوا کر اس نے ماں سے صرف چاول اپنی پلیٹ میں ڈلوائے تھے اور اب ان چاولوں کو بڑے سلیقے اور مزے میں کھا رہی تھی جبکہ اس کے بھائی صاحب کے منہ میں زبردستی نوالے ٹھونسے جا رہے تھے۔ ولی خود کھانا کھاتے بھانجے کے منہ میں بھی نوالے زبردستی ڈال رہا تھا۔

"لالا! آپ کو کھانا نہیں کھانے دے گا۔ لائیں! اسے مجھے دے دیں۔" زرمینہ نے ولی سے کہا۔

"نہیں ٹھیک ہے۔" نفی میں سر ہلاتے وہ بھانجے کے ساتھ مگن رہا۔

"تم نے اس کی عادتیں خراب کی ہوئی ہیں زرمینہ! بچہ اپنے ہاتھ سے اور خوشی ورغبت سے کھائے تو صحت بھی اچھی ہو۔ جب ہی دیکھو تو یہ کتنا کمزور ہو رہا ہے۔" آغا جان کے سامنے ان کا پرہیزی کھانا موجود تھا اور وہ اسے اپنی پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔

"میں کیا کروں آغا جان! یہ کچھ کھاتا ہی نہیں ہے۔ نوالے لے لے کر پورے گھر میں اس کے پیچھے بھاگوں' تب کہیں جا کر محترم کے پیٹ میں چند لقمے جائیں گے۔ دودھ انڈے اور فروٹس سے وہ بیزار ہے کہ الامان الامان۔ junk food میں پھر بھی بچارا دلچسپی لے لیں گے مگر صحت بخش تو کوئی چیز حلق سے نہیں اترتی۔"

یہ واقعی ایک پرفیکٹ فیملی ڈنر ہو سکتا تھا اگر اس میں وہ موجود نہ ہوتی وہ یہاں آؤٹ سائیڈر تھی۔ اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی بے تکلف سے گھریلو ڈنر میں وہ زبردستی شامل ہو گئی ہے۔

دادا' چچا' پوتی' پوتی کے بچے' وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟

"تم کچھ بھی نہیں لے رہیں بیٹا! کیا کھانا اچھا نہیں لگ رہا؟ تم رات کے کھانے میں کیا لیتی ہو بتاؤ زرمینہ وہ بنوا کر لے آئے گی۔" اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے ہوئے تھے اور انہیں چمچے سے یہاں وہاں گھما رہی تھی۔ آغا جان کے کہنے پر وہ فوراً چونکی۔

"میں لے رہی ہوں آغا جان! کھانا بہت مزے کا ہے۔" اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن اور سلاد بھی جلدی سے شامل کر لیا۔

دو مہینے قبل آپ جن لوگوں سے صاف صاف اور بالکل واضح ان کے منہ پر یہ کہہ چکے ہوں کہ آپ ان سے شدید نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے پھر ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا' بے تکلف سے گھریلو قسم کے ماحول میں اسے یہ سب بہت عجیب اور خاصا آکورڈ لگ رہا تھا۔

دو مہینے قبل اس نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہی' تحمل' ماموں اور معیز کی موجودگی میں آغا جان اور ولی کے منہ پر صاف صاف کہا تھا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔"

آغا جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' بالکل بے خوف وخطر ہو کر اس نے ان کے پوتے اور ان کے جوڑے اس زبردستی کے رشتے دونوں کو ایک ساتھ اور بڑی شدت سے رد کر دیا تھا۔ اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

یہ ایک کھلی سچائی اور واضح حقیقت تھی کہ وہ ولی صہیب خان سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی جتنی اس کی ممی وہ آغا جان کے جوڑے اس زبردستی کے رشتے سے اتنی ہی بیزار تھی جتنی اس کی ممی اور معیز کا ساتھ اگر کسی بھی سبب اسے نہ مل پاتا' اگر دنیا میں اس کے لیے آخری مرد ولی صہیب خان بچا ہوتا تو وہ ہمیشہ کنواری اور تنہا زندگی گزار لینے کو اپنے لیے منتخب کرتی۔

اس روز ان کے گھر آنے کے غالباً تین یا چار دن بعد آغا جان کی فون کال آئی تھی۔

"میری صحت ٹھیک نہیں' میری زندگی کا کچھ پتا نہیں' فارہ سے ایک بار میری بات کرا دو۔" اس کے صاف

صاف جواب دے دینے کے باوجود نجانے وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتے تھے۔

کال ممی نے ریسیو کی تھی اور انہوں نے ان کی فارہ سے بات کروانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"فارہ آپ سے بات نہیں کرے گی۔ اسے جو کہنا تھا وہ آپ سے بالکل صاف کہہ چکی ہے۔ اب برائے مہربانی یہاں فون کرنے کی زحمت نہ کریں۔"

وہ وہاں موجود تھی، جمال ماموں اور زہرا مامی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی طرف سے خلع کا قانونی مطالبہ پہنچ جانے کے بعد اس کے منہ سے براہ راست اس رشتے سے انکار سن لینے کے بعد نجانے وہ اس سے مزید کیا کہنا چاہتے تھے۔

ممی نے ان کی بات پوری سنے بغیر لائن کاٹ دی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ پھر آغا جان کے پاس سے کسی بھی طریقے کا رابطہ ان کے گھر نہیں کیا گیا تھا۔ دو مہینے پہلے ان کا اور ولی کا اس کے گھر آنا اور پھر تین روز بعد ان کی فون کال اس کے بعد پھر یہاں سے ہر طرح مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔ مگر یہ خاموشی ایسی ہی تھی جیسی طوفان سے قبل کی خاموشی ہوتی ہے۔

پچھلے چھ سات مہینے اگر اس نے سخت اذیت اور مشکل میں گزارے تھے اور آج وہ یہاں موجود تھی۔ جن لوگوں سے وہ نفرت کرتی ہے ان ہی کے بیچ۔

واقعی انسان اپنے بارے میں، اپنی زندگی تک کے بارے میں کبھی کوئی دعوا نہیں کر سکتا کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ کیا آج صبح تک اس نے سوچا بھی تھا کہ آج رات کا کھانا وہ کہاں اور کس کے ساتھ کھا رہی ہوگی۔

آغا جان نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا تھا اور وہ زیادہ دیر صوفے پر بیٹھ بھی نہیں سکے تھے ولی انہیں سہارا دے کر دوبارہ بیڈ پر لے گیا تھا۔ اسے تو کچھ کھانے کی رغبت ہی نہ تھی لیکن ولی اور زرینہ بھی بہت تھوڑا سا کھا کر جلدی کھانا ختم کر چکے تھے۔ آغا جان نے فارہ کو دوبارہ اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا تھا۔

"ابھی ہو نا میرے پاس؟ ابھی جاؤ گی تو نہیں؟"

ولی کی طرف اس کی پشت تھی اور ولی کی طرف دیکھے بغیر ہی اس نے ان کے سوال کا اثبات میں سر ہلا کر جواب دے دیا تھا۔

"لیکن تمہاری جاب؟ تمہارے کام کا حرج تو نہیں ہوگا بیٹا؟" انہوں نے متفکر سے لہجے میں اگلا سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آغا جان! آج کے لیے اتنی باتیں کافی ہیں۔ آپ کو زیادہ بولنا نہیں ہے پتا ہے نا آپ کو؟" زرینہ اٹھ کر ان کے پاس آ گئی اور تنبیہی لہجے میں اس طرح بولی جیسے انہیں ہی ڈانٹ رہی ہو۔

"اب یہاں سے دفع ہو جاؤ، یہ میرے آغا جان کے سونے اور آرام کرنے کا ٹائم ہے۔"

بعض باتیں کہی نہ جائیں زبانوں سے سمجھائی جاتی ہیں۔ وہ یہاں سے اٹھ کر جائے کہاں؟ اس نے پل بھر سوچا۔

"فارہ بھی تھک گئی ہوگی۔ اسے اس کا کمرہ دکھا دو۔ اپنے پورشن میں اکیلے شاید اسے ڈر لگے ایسا کرو بہروز کا کمرہ فارہ کے لیے ٹھیک کروا دو۔" انہوں نے نام لے کر کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا مگر کہہ یقیناً زرینہ سے رہے تھے۔ اس نے جیسے ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔

وہ سائڈ ٹیبل کے پاس کھڑی ان کی دوائیں نکال رہی تھی۔ اور ان کی بات سن لینے کے بعد بھی اپنا یہی کام دل جمعی سے کرتی رہی۔ دوائیں نکال لینے کے بعد وہ گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

"میں فارہ کے لیے کمرہ ٹھیک کروا کر آتا ہوں آغا جان!" ولی جو کھانے کے بعد سے صوفے ہی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نظر زرینہ کو دیکھتا صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اگلے سیکنڈ کمرے سے باہر تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ اندر آیا تو براہ راست اسی سے مخاطب ہوا۔

"آ جاؤ فارہ!" اس کا لہجہ تکلفات کا حامل ہونے کے باوجود اخلاق لیے ہوئے تھا بالکل ایسا ہی جیسے آپ کسی مہمان کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اخلاق بھی شاید اس ایگریمنٹ کا حصہ تھا۔

"جاؤ بیٹا! آرام سے جا کر سو جاؤ۔ اب ان شاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔ اس وقت یہ ظالم کی نانی مجھے زیادہ بولنے نہیں دے رہی۔ کل صبح ہم دادا پوتی خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"

بستر پر لیٹے لیٹے انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ خود آگے بڑھ کر ان کے قریب جھک گئی۔ لیٹے لیٹے انہوں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس کے ماتھے کو بڑی محبت سے چوما۔

"میری بیٹی میرے پاس آ گئی ہے آج رات مجھے بہت سکون کی نیند آئے گی۔" وہ خاموشی سے ان کے پاس سے ہٹ گئی۔

زرینہ دوا لیے ان کے قریب کھڑی تھی جبکہ ولی دروازے کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ الجھے ہوئے سے انداز میں وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ولی کے ساتھ زینے طے کیے، وہ ایک کمرے کے سامنے آ کر رک گیا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹر کام پر گل خان سے کہہ دینا۔" وہ دروازے سے واپس پلٹنے لگا تھا۔

"ایک منٹ ولی!" اس کے پکارنے پر وہ متعجب سے انداز میں مڑا۔ "آغا جان بیمار ہیں، میں ان کی بیماری کا سن کر تمہارے ساتھ آئی ہوں۔"

"اور انہیں سمجھتے بھی یہی رہنا چاہیے۔ تمہیں ان کے سامنے یہی ظاہر کرنا ہے کہ تم صرف ان کی بیماری کا سن کر سب کچھ بھلا کر یہاں آ گئی ہو۔"

"اور تین مہینے بعد؟ ابھی انہیں یقین دلا دوں اور تین مہینے بعد کیا کہوں گی ان سے؟" وہ اس حکمیہ لہجے و انداز پر بری طرح جھنجھلائی۔

وہ جھوٹ بولنے اور محبت کے ڈرامے کرنے یہاں نہیں آئی تھی۔ کیا ان کی بیماریوں کے آڑ لے کر اسے کسی طرح کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار بنایا جانے والا تھا؟

CamScanner

"یہ تمہارا درد سر نہیں۔ تمہارا کام تین مہینے یہاں آغا جان کے پاس رہنا ہے۔ تین مہینے بعد کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے یہ میرا کام ہے۔ تمہارے پاس میرا دیا ثبوت موجود ہے۔

پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے آج پہلی اور آخری بار تمہیں یقین دہانی کروا رہا ہوں کہ تین مہینے سے اگلا ایک دن بھی تمہیں نہ یہاں رہنا پڑے گا اور نہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو جوڑے رکھنا پڑے گا اور میں اپنے الفاظ سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں۔" وہ اس کے بالکل قریب آ کر سرگوشی نما آواز میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

وہ پر اخلاق اور مہمان نوازی والا انداز جو آغا جان کے سامنے اختیار کیا گیا تھا اب غائب تھا۔ اب انداز بارعب دبدبے ہونے کے ساتھ مکمل کاروباری و پروفیشنل نوعیت کا تھا۔

"اب اس موضوع پر تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ جو بات میرے اور تمہارے بیچ ہے وہ اب کسی بھی انداز میں دوہرائی نہ جائے۔ یہ تمہیں میری پہلی اور آخری وارننگ ہے۔"

بہت سخت اور بے لچک لہجے میں وہ آواز دبا کر اس انداز میں بولا گویا اسے یہ خدشہ ہو کہ کہیں اس کی آواز کسی اور تک نہ پہنچ جائے وہ فوراً ہی واپس مڑ گیا تھا۔

وہ اس کی بات مان کر یہاں کیوں آ گئی؟ اس کے اندر یک دم ہی پچھتاوے سر ابھارنے لگے۔

"فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔" پہلی بار اس بات پر عمل کیا تھا اور پہلی ہی بار منہ کے بل گر پڑی تھی۔

وہ بے شک کسی بھی قیمت پر اس ناپسندیدہ ترین اور زندگی پر عذاب کی طرح مسلط رشتے سے جان چھڑانا چاہتی تھی مگر محبت کے جھوٹے ڈرامے کر کے ہرگز نہیں یہ اس کے معیار سے بہت کم تر درجے کی بات تھی۔ یہ بڑی گھٹیا اور نیچ سی بات تھی۔ وہ اتنی جرأت رکھتی تھی کہ جن سے نفرت کرتی ہو علی الاعلان ان سے اظہار نفرت کر سکے اور جن سے محبت ہوتی ہے بانگ دہل اس کا بھی اعلان کر سکے۔

"تمہیں تین مہینے آغا جان کے ساتھ ایک بہت محبت کرنے والی پوتی بن کر رہنا ہے۔"

اسے ولی کے الفاظ یاد آئے۔ تب اس نے ان لفظوں پر اس سوچ کے پیش نظر زیادہ غور نہیں کیا تھا کہ یہ سب یونہی ایک دکھاوا اور جھوٹ ہے۔ دراصل تو آغا جان بھی اس سارے منصوبے سے واقف ہیں' ہاں اس کے سامنے ضرور لاعلمی کا ڈھونگ رچائیں گے۔ بہت بری طرح الجھی ہوئی اور مضطرب وہ کمرے میں آ گئی۔

برسوں پہلے اس کی پیدائش سے بھی بہت پہلے' کبھی یہ اس کے ڈیڈی کا کمرہ رہا تھا۔ یہاں وہی فرنیچر اور وہی سب سامان رکھا تھا جو برسوں پہلے اس کے ڈیڈی کے زیر استعمال رہا تھا۔

یہیں اسی کمرے میں ممی اور ڈیڈی کے بیچ جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس جھگڑے کی عینی شاہد تھی' خوف سے تھرتھر کانپتی اس جھگڑے کے دوران وہ بھی تو یہیں موجود تھی۔ یہی کوئی چودہ سال پہلے کی ایک شام تھی۔ یہاں اس بیڈ کے قریب ممی کھڑی تھیں۔

"کیا قارہ کا نکاح؟ بہروز! آپ ہوش میں تو ہیں؟" اور ان سے دو قدم دور ڈیڈی۔

"ہاں۔ اب ہی جا کر تو ہوش میں آیا ہوں۔ پوری زندگی باپ کی نافرمانی کر کے اسے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ بھائی سے ناجائز قربانیاں مانگی ہیں اب کوئی ایک کام تو ان کی خوشی اور رضا سے بھی کر جاؤں۔" اور وہ خود اس بیڈ پر بیٹھی ان دونوں کو ہراساں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ممی ڈیڈی پر چلا رہی تھیں' ناراض ہو رہی تھیں اور وہ چلا تو نہیں رہے تھے مگر وہ بھی پر خفا بہت ہو رہے تھے۔ بہت برہم لہجے میں ناگواری اور غصے سے بول رہے تھے۔ ممی اگر غصے سے چلا رہی تھیں تو وہ بالکل قطعی اور دوٹوک انداز میں اپنا حکم سنا رہے تھے۔

"میں اپنی بیٹی کے ساتھ یہ زیادتی کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ کیوں دوں میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس خاندان کے کسی شخص کے ہاتھ میں جس نے آج تک کبھی مجھے اس گھر کی بہو تسلیم نہیں کیا۔"

"اگر قارہ تمہاری بیٹی ہے تو میری بھی بیٹی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے۔" ان دونوں کا جھگڑا سمٹنے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ ابتدائی بحث و تکرار شدید غصے اور ناراضی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"بہروز! میں ایسا کبھی بھی نہیں ہونے دوں گی۔" ممی روتے ہوئے بہت زور سے چلائی تھیں۔

"بس۔" ڈیڈی نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کرنے والے انداز میں انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔

"مجھے بحث نہیں چاہیے۔ جو فیصلہ میں کر چکا ہوں' میں نے اس سے تمہیں آگاہ کرنا تھا سو کر دیا۔ میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی۔ میں قارہ کا باپ اپنی بیٹی کا نکاح اپنے بھائی صہیب خان کے بیٹے ولی صہیب خان کے ساتھ آج شام اب سے ایک گھنٹہ بعد کر رہا ہوں اور یہ میرا اٹل اور آخری فیصلہ ہے۔" سختی اور برودت لیا یہ حاکمانہ اور جابرانہ لہجہ اس کے ڈیڈی کا تو ہرگز نہیں تھا۔

ہاں شاید یہ آغا جان کا لہجہ تھا صرف چند روز میں وہ آغا جان کی زبان اور ان کا انداز سیکھ گئے تھے۔ اس تحکم اور سخت لہجے میں بولتے اس نے ڈیڈی کو کبھی بھی نہ سنا تھا۔

وہ تو خیر سترہ' اٹھارہ سال کی نا سمجھ اور ناتجربہ کار لڑکی یا شاید بچی بھی جاتی تھی۔ اس سے کچھ کہنے سننے یا پوچھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر یہاں تو اس کی ماں کو بھی کسی رائے یا مشورے کے بغیر ایک سیدھا حکم سنا دیا گیا تھا۔ سخت اور قطعی لہجے میں۔ ممی روتے ہوئے کمرے سے چلی گئی تھیں۔

وہ ممی اور ڈیڈی کے بیچ تناؤ' بدگمانی اور جھگڑے کی فضا دیکھ کر بری طرح سہمی ہوئی بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے وہ میاں بیوی آپس میں یوں جھگڑ کیوں رہے تھے۔ کاش کسی طرح وہ سب کچھ پہلے جیسا کر دے۔ اس کے ماں باپ کو لڑوانے والے محمد بختیار خان سے اسے نفرت ہو رہی تھی۔ اسے اس دن کا وہ ایک ایک پل یاد تھا۔

اس ایک دن نے اس کی زندگی کو کس قدر آزمائشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس ایک دن نے اس کی زندگی کو پورا کا پورا بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ یہاں اس کمرے میں وہ تنہا تھی' وہ دکھی

تھی اور رو رہی تھی۔

ڈیڈی کی زمانہ طالب علمی کی ایک تصویر کو اٹھا کر اس پر ہاتھ پھیرتے اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ تمام بتیاں بجھا کر جب زندگی اندھیروں اور آندھیوں کی زد میں تھی تو کمرے میں مصنوعی روشنی کس کام کی تھی۔

***

اپنے ماں باپ کی محبت بھری چھاؤں میں خوش باش اور بے فکری زندگی گزارتی' درد و غم کے معنوں سے ناآشنا' کم سن نو عمر فارہ بہروز خان کی زندگی اس روز تک خوشگوار اور بہترین تھی جب تک اس میں محمد بختیار خان' محمد صہیب خان اور روبی صہیب خان نام کے لوگ داخل نہ ہوئے تھے۔

اس کی اٹھارویں سالگرہ میں چار مہینے باقی تھے وہ اے لیول کے امتحانات سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ زندگی میں سب کچھ بدل گیا۔ اس کے ممی ڈیڈی کی پسند کی شادی تھی جسے ان کے گھر والوں نے قبول نہ کیا تھا اور اس کے ڈیڈی نے باپ کے گھر کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے منہ موڑ کر اپنی دنیا آپ بسائی تھی۔

یوں لگتا کہ جیسے ان کے سامنے ان کی فیملی کا نام بھی زبان پر لانا سنگین غلطی ہوگی۔ مگر پھر ایک روز ان سب لوگوں کا ان کے گھر میں ذکر ہوا اور وہ فارہ بہروز خان کی خوشگوار زندگی کا آخری دن تھا۔ ڈیڈی کے چھوٹے بھائی صہیب خان کا انتقال ہو گیا تھا۔

برسوں کی قطع تعلقی کے بعد آغا جان نے انہیں بھائی کی موت کی اطلاع بھجوائی تھی۔ وہ بھائی کے آخری دیدار اور اس کی تدفین میں شرکت کے لیے پشاور چلے گئے تھے۔ وہاں چند روزہ قیام کے دوران انہوں نے صرف ایک بار لاہور اپنے گھر بیوی اور بیٹی کو فون کیا۔ وہ بھی صرف یہ بتانے کے لیے وہ ابھی پشاور ہی میں کچھ روز رہیں گے کیونکہ ان کے والد بہت بیمار ہیں۔

فارہ اور ممی یہاں ان کے لیے پریشان ہوتی رہیں اور وہ وہاں رہتے رہے۔ پھر پندرھویں دن انہوں نے فون کر کے فارہ اور ممی دونوں کو اپنے پاس پشاور آنے کو کہا۔ انہیں ائیر پورٹ پر لینے آنے والا دراز قامت اور مضبوط جسامت والا اکیس بائیس سالہ لڑکا تھا جس کی نیلی آنکھیں بالکل اس کے ڈیڈی جیسی تھیں۔

وہ لڑکا چند گھنٹوں بعد اس کی زندگی پر کسی عذاب کی طرح مسلط ہونے والا ہے' وہ جانتی نہ تھی۔ اگر جانتی ہوتی تو شاید ائیر پورٹ سے آغا جان کے گھر آنے کے بجائے واپس لاہور کی فلائیٹ پکڑ لیتی۔ ممی اور وہ آغا جان کے عالیشان اور محل نما گھر پہنچیں' جہاں بستر پر دراز بیمار پڑے آغا جان سے ان دونوں کی زندگی میں پہلی ملاقات ہوئی۔ "آ گئے میرے بچے۔" وہ انہیں دیکھتے ہی فوراً بولے۔

"فارہ! اپنے دادا کے پاس نہیں آؤ گی؟ روبی بیٹا! تم وہاں کیوں رک گئیں؟ یہاں آؤ۔ کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟ دیکھو تو صہیب کیسے مجھے چھوڑ گیا۔" وہ لیٹے لیٹے ہی ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنے پاس بلاتے ہوئے بولے۔

فارہ انہیں نہیں دیکھ رہی تھی وہ اپنے ڈیڈی کو دیکھ رہی تھی شاید ممی بھی ان ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ چند روز ان کی

دوری کے بعد بھی وہ بیٹی یا بیوی کی طرف نہیں بلکہ اپنے باپ ہی کی طرف متوجہ تھے۔ ان کے پیر دباتے ہوئے اسے اور ممی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے۔ وہ اسے بہت بدلے ہوئے' بہت اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اسے اور ممی کو ایک دوسرے کمرے میں لے آئے تھے اور وہاں ان کی زبانی سب بات سننے کے بعد پتا چلا تھا کہ اسے اور ممی کو یہاں بلوایا کیوں گیا ہے۔

وہ اس کا نکاح اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے کے ساتھ فوراً کر دینا چاہتے تھے۔ جس بھائی سے وہ برسوں سے ملے نہیں تھے اس کے جس بیٹے کو وہ چند روز پہلے جانتے تک نہیں تھے' وہ اس کے ساتھ آناً فاناً بغیر کسی سے پوچھے' صلاح مشورہ کیے اپنی بیٹی کی زندگی وابستہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ممی اور ڈیڈی کے بیچ شدید جھگڑے کے بعد جب ممی کمرے سے روتی ہوئی چلی گئیں تب ڈیڈی بیڈ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت انہوں نے ممی سے تند لہجے میں کہا تھا کہ وہ بیٹی کے دشمن نہیں اور کچھ سوچ کر ہی انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور وہ انہیں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ واقعی اس کے ڈیڈی اس کے دشمن کبھی نہیں ہو سکتے' وہ کبھی اس کے لیے کچھ برا نہیں سوچ سکتے' لیکن پھر آج کیوں وہ اس کے لیے برا سوچ رہے ہیں۔

پر وہ اس کے ڈیڈی کہاں رہے تھے۔ وہ تو بالکل اجنبی لگ رہے تھے۔ وہ اتنے بدلے ہوئے اتنے مختلف لگ رہے تھے کہ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ڈیڈی کے اس ہم شکل سے پہلی بار مل رہی ہو۔

اس کے ڈیڈی تو اتنے نرم خو' صلح جو اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ سختی' تلخی' غصہ اور حکم چلانا یہ سب تو ان کی فطرت ہی میں نہ تھا۔ اس نے انہیں کبھی حکم چلاتے نہ سنا تھا ان کے گھر میں آج کیا پکنا ہے سے لے کر گھر کے فرنیچر و دیگر سامان کی خریداری' چھٹیاں کہاں گزاریں' فارہ کی برتھ ڈے کیسے سیلیبریٹ کریں؟ فارہ کو عید کی شاپنگ کہاں سے کرائیں؟ جیسے معاملات تک بھی ممی اور ڈیڈی کی باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور اس روز اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی کا سب سے بڑا' سب سے اہم فیصلہ وہ اپنی بیوی' اپنی بیٹی کی ماں کی مرضی کے خلاف جبراً مسلط کر رہے تھے۔ یہ اس کے ڈیڈی نہیں تھے۔ یہ اس کے ڈیڈی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

"فارہ! تمہیں کیا لگتا ہے' تمہارے ڈیڈی تمہارے ساتھ کیا کبھی کچھ برا کر سکتے ہیں؟" اس کے برابر بیڈ پر آ کر بیٹھتے ہی ڈیڈی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے آہستگی سے پوچھا۔

ممی سے بات کرتے وقت جو سختی اور تلخی ان کی زبان اور آنکھوں میں تھی' اس سے بات کرتے وقت اس کی جگہ نرمی' محبت اور شفقت نے لے لی تھی۔

"فارہ! مائی سویٹ ہارٹ' تمہارے ڈیڈی نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ اب ان کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ نہ دو گی؟ ان کی بات نہ مانو گی؟" وہ رو رہے تھے۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ واقعی وہ ڈیڈی نہیں رہے تھے جنہیں وہ جانتی تھی مضبوط اعصاب کے مالک' بڑی سے بڑی بات پر ٹینشن میں نہ آنے والے اور آج وہ کیوں اس طرح رو رہے تھے۔ گر ان کا چھوٹا بھائی مر گیا ہے تو اس کی موت کا ایسا

CamScanner

وقت مقرر ہوگا۔ بھائی کی موت میں ان کا کہاں قصور ہے؟ جسے وہ اپنی غلطی گردان رہے ہیں۔

برسوں بعد اس گھر میں آئے ہیں تو اتنے برسوں سے ان پر اس گھر کے دروازے اس گھر کے مالک نے بند کر رکھے تھے۔ ان کے باپ نے انہیں گھر بدری کی سزا دی ہوئی تھی۔ اپنا گھر وہ تو انہیں چھوڑ کر گئے تھے جسے اپنی غلطی قرار دے رہے تھے۔ تو کیا ممی سے پسند کی شادی آغا جان کی حکم عدولی انہیں اپنا گناہ نظر آ رہی تھی؟

بھائی کی موت' آغا جان کی بیماری' برسوں بعد اپنے گھر میں واپسی پر اگر انہیں ممی سے شادی اپنی غلطی نظر آنے لگی تھی تو یہ ان کی وہ سوچ تھی' وہ احساس جرم و ندامت تھا' جو آغا جان نے بستر پر بیمار پڑ کر ان کے دل میں پیدا کیا تھا ورنہ پسند کی شادی نہ جرم ہے نہ گناہ۔

وہ بھی اس صورت میں جب مطلق العنان اور جابر شہنشاہوں کا سا مزاج رکھنے والا باپ آپ سے یہ چاہے کہ آپ اس کی طے کردہ کسی بچپن کی منگنی کو قبول کریں نہ کہ اپنی زندگی کا ساتھی خود چننے کی جسارت کر بیٹھیں۔ اور اگر یہ جسارت کر بیٹھیں تو آپ کو آپ ہی کے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا دیا جائے۔

اپنی جائیداد سے آپ کو عاق کر کے سب کچھ چھوٹے بیٹے کے نام کر دیا جائے اور اپنی ضد پوری کرنے کے لیے اپنی انا کو سربلند رکھنے کے لیے چھوٹے بیٹے کی اپنی اس بھانجی سے فوراً شادی کروا دی جائے جس سے منگنی توڑنے کا گناہ آپ سے سرزد ہوا ہے۔

"یہ میرے مرنے والے بھائی کی خواہش تھی فارہ کہ تم اس کی بہو بنو اور ہمارا ٹوٹا رشتہ اس مضبوط رشتے کی بدولت پھر سے جڑ جائے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مضبوط ہو جائے" وہ روتے ہوئے اس کا سر سینے سے لگائے اس سے مخاطب تھے۔

ایک مرے ہوئے انسان کے لیے وہ اپنی زندہ جیتی جاگتی' کم عمر بیٹی کی زندگی بھینٹ چڑھانے کو تیار تھے۔

کسی مرے ہوئے انسان کی خواہش پر ایک زندہ انسان کی قربانی دی جا رہی تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا'

آغا جان جو بیٹے کی موت اور اپنی بیماری کو ہتھیار کی طرح اس کی ممی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ایک کل کی لڑکی جو برسوں پہلے ان سے ان کا بیٹا چھین کر لے گئی تھی اس لڑکی کو اس جسارت اور گستاخی کی سزا تو دی ہی تھی۔ وہ بظاہر فارہ اور ممی دونوں کے ساتھ بہت اچھے بنے ہوئے تھے مگر کیا انہیں یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ جبراً جو رشتہ وہ ڈیڈی کے ذریعے مسلط کروا رہے ہیں' ممی اس پر خوش نہیں' فارہ اس پر خوش نہیں۔

ممی اور ڈیڈی کے جھگڑے کے ایک گھنٹے بعد اسے ایک سرخ جوڑا اور کسی طرح کے بھاری بھرکم زیورات پہنا کر جو آغا جان نے اپنی سیف سے نکال کر دیے تھے اور جو سارے کے سارے ان کے خاندانی اور بہت قیمتی زیورات تھے' اسے زبردستی دلہن بنا کر ولی صاحب خان کے برابر بٹھا دیا گیا تھا۔

مختصر سے مہمان تھے' صرف خاص خاص اور قریبی رشتے دار و احباب' کوئی دھوم دھام اور ہنگامہ نہ تھا کہ پندرہ دن قبل اس گھر میں ایک موت ہو چکی تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا' فیصلہ سنایا جا چکا تھا اس کا کام تو فقط اب صرف گردن اقرار میں ہلا کر سامنے رکھے کاغذوں پر دستخط کرنا تھا۔

خود پر اترے جبر کے اس لمحے کے لیے وہ ڈیڈی اور آغا جان کو کبھی معاف نہیں کر سکے گی' کہ اپنے ہاتھوں سے

نکاح نامے پر دستخط کرتے اس نے سوچا تھا۔

"آغا جان! مجھے اجازت دیں' میں لاہور میں اپنے سارے ادھورے بکھرے کام سمیٹ لوں' ملازمت سے استعفیٰ دے دوں' روحی اپنا اور فارہ کا سارا سامان پیک کر لے' بس پھر ہم واپس یہیں آ جائیں گے۔ ہم اب ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے آغا جان! آپ سے وعدہ کرتا ہوں اب زندگی بھر آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا' آپ کے قدموں میں ساری زندگی گزار دوں گا۔"

تیسرے دن جب ڈیڈی نے لاہور واپسی کی بات کی تب آغا جان آنکھوں میں آنسو لے آئے تھے اور ڈیڈی نے فوراً انہیں واپسی کی وجہ سے آگاہ کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں واپس آ جانے کا یقین بھی دلا دیا تھا' جبکہ آغا جان اس کے اور ممی کے ساتھ اچھا بننے کا ڈرامہ کرتے رہے تھے۔

"روحی بیٹا! سارے گلے اور رنجشیں اور پچھلی ہر بات بھول جاؤ۔ تم میرے لیے میری بہو نہیں میری بیٹی ہو۔"

وہ لوگ ہمیشہ کے لیے پشاور واپس جانے کے لیے لاہور لوٹ آئے تھے۔ تین دن پہلے کے شدید جھگڑے کے بعد سے ممی اور ڈیڈی میں بات چیت مکمل بند تھی۔ جس طرح ان تین دنوں میں ممی نے ان سے کوئی بات نہ کی تھی اس طرح سارے راستے بھی نہ کی تھی اور لاہور واپس آ کر بھی شدید غم و غصے میں گھری اپنے گھر میں قدم رکھنے کے بجائے بالکل برابر والے گھر میں جو ان کے سگے بھائی کا تھا چلی گئی تھیں۔

ڈیڈی کو جس طرح ان کی ناراضی اور غصے کی کوئی پروا نہ تھی اسی طرح انہیں ان کے ناراض ہو کر بھائی کے گھر چلے جانے سے بھی کچھ فرق نہ پڑا تھا۔ ممی کی ناراضی سے لاتعلق و بے نیاز فارہ کو ساتھ لیے اپنے گھر میں آ گئے تھے۔ ہاں وہ کچھ بجھے بجھے اور خاموش سے ضرور تھے' وہاں پشاور میں آغا جان' اور اپنے بھتیجے بھتیجی کے ساتھ بہت زیادہ باتیں کرنے والے ڈیڈی یہاں آتے ہی بالکل چپ چپ سے ہو گئے تھے۔

وہ اسی اداسی بھرے انداز میں لاؤنج میں فارہ کے ساتھ بیٹھے اس سے کچھ باتیں کرتے رہے تھے۔ پشاور میں بھی اچھے تعلیمی اداروں کی کوئی کمی نہیں' وہ فارہ کو میڈیکل کی تعلیم وہاں سے دلوائیں گے' وہ وہاں پڑھنے میں بھی اتنا ہی انجوائے کرے گی جتنا یہاں کرتی ہے' نئی سہیلیاں بنانے میں کچھ وقت ضرور لگے گا مگر بہت جلد وہ وہاں بہت اچھی طرح خود کو ایڈجسٹ کر لے گی' جیسی چند باتیں' تھوڑی دیر بعد وہ اس کے پاس سے کھڑے ہو گئے۔

"فارہ بیٹا! اپنا سارا ضروری سامان پیک کر لو۔" وہ اس سے یہ جملہ کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں تھے اور مضطرب اور پریشان لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

ممی اور ڈیڈی کے اس جھگڑے میں وہ کس کا ساتھ دے؟ ممی ناراض ہو کر جمیل ماموں کے گھر چلی گئی ہیں' وہ پشاور آغا جان کے گھر مستقل رہائش اختیار کرنے کسی قیمت پر نہیں جائیں گی۔ یہ بالکل واضح تھا اور ڈیڈی اب وہاں جانے کے علاوہ کہیں اور رہائش اختیار کریں گے نہیں' وہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے؟ کس کی بات مانے گی' کس کی حکم عدولی کرے گی؟ ماں یا باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب یہ کس طرح ممکن تھا' یہ کس طرح

ہو سکتا تھا؟ وہ بہت الجھن اور بے چینی کے عالم میں گم صم سی بیٹھی تھی اس دوران دوپہر سے شام شام سے رات اور رات سے اگلی صبح ہو گئی۔

شمی تجمل ماموں کے گھر سے واپس آئیں اور نہ ڈیڈی اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ اب کیا ہونے والا تھا' زندگی اب نجانے کیا رخ دکھانے والی تھی مگر یہ تو واضح نظر آ رہا تھا کہ زندگی اب دوبارہ کبھی پہلے جیسی نہ ہو پائے گی اور واقعی زندگی پھر دوبارہ کبھی پہلے جیسی ہو بھی نہ پائی تھی۔

صبح جب کافی دیر ہو گئی اور ڈیڈی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے تب وہ ان کے کمرے کے دروازے پر آئی۔ دستک کا کوئی جواب نہ تھا' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہاں ڈیڈی کا صرف جسم تھا ان کی روح ایک دوسری دنیا کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل پر ان کے ہاتھوں کا ٹائپ شدہ وہ استعفیٰ رکھا تھا جس پر ان کے دستخط تھے۔

اسی دن کی تاریخ تھی جس کی صبح کو وہ اس دنیا میں موجود ہی نہ تھے کہ اگر زندہ رہتے تو آج انہیں استعفیٰ اپنے آفس جا کر دینا تھا۔ اس استعفیٰ کے ساتھ کمرے میں الماریوں میں سے بھی تمام سامان نکال کر سوٹ کیسوں اور بیگز میں بھر کر رکھا ہوا تھا۔

کچھ وہ سامان بھی تھا جسے پیک کرنے کی شاید انہیں مہلت نہ مل پائی تھی' وہ سب کارپٹ' صوفوں اور بیڈ پر بکھرا پڑا تھا' یہ ساری پیکنگ بھی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ دوپہر سے رات تک یہی کام کرتے رہے تھے' اپنے آغا جان کے پاس جانے کی تیاری کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ رات کے آخری پہر کسی وقت ان کا انتقال ہوا تھا۔ نجانے کس کس نا کردہ گناہ کا بوجھ اپنے دل پر لیے وہ یوں خاموشی سے رخصت ہو گئے تھے۔

کل دوپہر لاؤنج میں اس کے پاس سے اٹھنے والے ڈیڈی اب دوبارہ کبھی اس کے پاس نہ آئیں گے' اس سے بات نہ کریں گے۔ وہ صدمے سے بدحواس ہو گئی تھی' وہ پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکراتی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ڈیڈی سے اپنے اس جبری نکاح اور ممی سے جھگڑا کرنے پر وہ دل ہی دل میں ناراض تھی اور وہ اسے منائے بغیر ہی چلے گئے تھے۔

اب وہ کس سے ناراض ہو؟ کس سے شکوہ کرے؟ ڈیڈی سے شدید ناراض اور بدگمان' بھائی کے گھر چلی جانے والی ممی سر پر بیوگی کی چادر لیے صدمے سے بدحال اپنے گھر واپس آ گئی تھیں۔ ان کی ہنستی مسکراتی زندگی میں آگ لگا دینے والے ان سے ان کا سہاگ چھین لینے والے ان کی بیٹی کو یتیمی کا دکھ دینے والے محمد مختیار خان کو وہ کبھی معاف نہیں کریں گی' وہ روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

پھر آغا جان وہاں آ گئے تھے' وہ ڈیڈی کی میت پشاور لے جانا چاہتے تھے' ممی انہیں اس بات کی اجازت کبھی بھی نہ دیتیں مگر تجمل ماموں کے سمجھانے بجھانے پر وہ بحالت مجبوری اس بات کے لیے آمادہ ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کی آخری رسومات پشاور میں ان کے آبائی گھر میں ادا کی گئی تھیں' انہیں ان کی ماں اور بھائی کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

تجمل ماموں نے ممی اور فارہ کو سنبھالا تھا' وہ لوگ تدفین کے بعد وہاں ایک پل نہ رکے تھے۔ ان کی زندگی

اجڑ گئی تھی ان کا گھر بکھر گیا تھا' ممی سے ان کا سہاگ چھن گیا تھا' فارہ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا' محمد مختیار خان سے شدید نفرت لیے ممی اور فارہ واپس لاہور اپنے گھر آ گئی تھیں۔ ڈیڈی کے انتقال کے مہینہ بھر بعد آغا جان ولی کے ساتھ ان کے گھر آئے تھے۔

وہ اسے اور ممی کو اپنے گھر اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ ممی نے ان کے ساتھ جانے سے قطعی انکار کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ اصرار کیے جا رہے تھے۔

"میں نے تمہیں بحیثیت بہو قبول نہ کر کے ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔ میں اعلیٰ ظرف نہ تھا بیٹا! تم اعلیٰ ظرف ہو جاؤ۔ اپنے گھر چلو۔ تمہارا گھر تمہارا منتظر ہے۔ تم وہاں کی بہو ہو۔" وہ ممی سے محبت جتا رہے تھے' فارہ پر والہانہ چاہت نچھاور کر رہے تھے۔

اس سے اس کے باپ کو چھین کر' ممی سے ان کے شوہر کو جدا کروا کر اب وہ یہاں کیا لینے آئے تھے' کیوں یہ جھوٹی محبتیں جتا رہے تھے' وہ انہیں دیکھتے ہوئے دل میں شدید غم و غصہ محسوس کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ممی نے ان کے ساتھ جانے سے قطعی اور واضح الفاظ میں انکار کر دیا تھا پھر بھی وہ ہمت نہ ہار رہے تھے۔ وہ مسلسل انہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے کئی ماہ سے ان کے گھر آ رہے تھے' فون پر فون کر رہے تھے۔

فارہ کو ان سے اور ان سے جڑی ہر شے سے نفرت ہوتی' اسے ولی صاحب خان سے نفرت ہوتی' جو لاہور آمد پر ہر بار ان کے ساتھ ہوتا اور اس سے یہ یاد دلاتا کہ مرنے سے پہلے ہی وہ لوگ اس کے ڈیڈی کو اس سے چھین چکے تھے۔ ممی سے چھین چکے تھے۔

ان دنوں ممی آغا جان اور ولی کے بار بار اپنے گھر کے چکروں سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ کہیں آغا جان اس نکاح کو مضبوط دلیل بنا کر' حق جتا کر فارہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کریں۔ فارہ بھی گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس کرتی تھی کہ کہیں ممی کے مسلسل انکار سے ضد میں آ کر آغا جان اسے ولی کے ذریعے اغوا نہ کروا لیں۔ اسے زبردستی پشاور نہ لے جائیں۔

وہ راتوں کو خوف کے مارے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی۔

دکھوں اور خوف سے بھرے ان دنوں میں میڈیکل کالجز میں داخلے شروع ہو گئے تھے اور داخلے شروع ہوتے ہی آغا جان ولی کو ساتھ لیے ایک بار پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ یہ کہتے کہ ممی پشاور جانے پر آمادہ نہیں تو ٹھیک ہے وہ فارہ کا کسی میڈیکل کالج میں داخلہ کروا دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کی بہو اور پوتی اب مکمل طور پر ان کی ذمہ داری ہیں لہٰذا فارہ کے تعلیمی اخراجات ہوں یا ان کے گھریلو اخراجات' وہ سب پورا کرنا اب ان کی ذمہ داری ہے۔

ممی ابتدا میں ان سب سے انکاری ہوئی تھیں' انہوں نے پیسے کے حوالے سے بھی آغا جان سے کوئی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر پھر تجمل ماموں نے انہیں سمجھایا تھا کہ وہ اس ضد اور اکڑ میں اپنی بیٹی کو اس کے جائز اور قانونی حق سے محروم کر رہی ہیں۔

محمد بختیار خان کی دولت' جائیداد پر کیا صرف صہیب خان اور اس کے بچوں کا حق ہے۔ فارہ کا بھی اس پر پورا پورا حق ہے بلکہ صہیب خان کے بچوں سے زیادہ ہی ہے کہ آغا جان نے برسوں اس کے ڈیڈی کو ان کے ہر جائز اور قانونی حق سے محروم رکھا تھا۔

آغا جان فارہ کی پڑھائی کا خرچا اٹھا ئیں یا ان کے گھریلو اخراجات کی ذمہ داری لیں تو یہ کوئی احسان نہیں بلکہ صرف ان کا فرض ہے۔ آخر کار ممی' تجمل ماموں کی بات مان گئی تھیں' پھر ان کے تجمل ماموں کی موجودگی ہی میں آغا جان سے بہت طویل مذاکرات ہوئے تھے۔ اور پھر اس سے اگلے روز آغا جان اسے میڈیکل کالج کے داخلہ فارم دلوانے اور اس کے نام ایک بینک اکاؤنٹ کھلوانے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ولی ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اسے داخلہ فارم دلوایا خود ساتھ بیٹھ کر اس کے ساتھ فارم بھروایا۔ وہ اس کے ساتھ انتہا سے زیادہ محبت اور شفقت سے پیش آ رہے تھے' وہ صرف ممی کے کہنے پر ان کے ساتھ آئی تھی مگر ان کی محبتوں کا یہ مظاہرہ اس کے دل کو کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔

"جس روز تم ڈاکٹر بن جاؤ گی نا فارہ! بہروز کی روح بہت خوش ہو گی۔ تمہیں ڈاکٹر بنانے کی اسے بہت خواہش تھی۔" پھر وہ اسے اپنے ساتھ بینک لے آئے تھے۔

وہ اس کا اور ولی کا ایک جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا رہے تھے اور اس عمل کی اسے یہ توجیہہ دے رہے تھے کہ ایک اکیلے آدمی کے مقابلے میں جوائنٹ اکاؤنٹ زیادہ بہتر رہتا ہے اور پھر ابھی وہ بہت چھوٹی بھی ہے' بینکنگ سے متعلق معاملات تنہا سنبھالتے شاید گھبرا جائے۔

وہ اس وقت تو کچھ بھی نہ سوچ سکی تھی کہ ان کی محبتوں کے حصار میں جکڑی گئی تھی مگر گھر آ کر اس نے جب سنجیدگی سے سوچا تو خیال آیا کہ جوائنٹ اکاؤنٹ ہی کھلوانا تھا تو وہ اپنا اور فارہ کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا سکتے تھے یا اس سے بھی بہتر تھا کہ ممی کا اس کے ساتھ اکاؤنٹ کھلوا دیتے اور سب سے بڑی بات کسی نئے اکاؤنٹ کے کھلوائے جانے کی ضرورت کیا تھی۔

ممی کا اپنا پہلے ہی سے ایک بینک اکاؤنٹ موجود ہے اگر وہ بہو اور پوتی کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں' خود کو ان کا سرپرست قرار دیتے ہیں تو وہ ممی کے اس اکاؤنٹ میں ہر ماہ ان کے اخراجات کے لیے رقم ڈلوا دیا کریں۔ بہو کے ہوتے پوتی کو فوقیت دے کر کیا وہ ممی کو ان کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کر رہے تھے' انہیں ذلیل و بے عزت کرنا چاہتے تھے۔

"پوتی میرا خون ہے اور تم بالکل غیر' میری نگاہوں میں تمہاری کوئی حقیقت نہیں۔" وہ اس روز کے بعد بھی مسلسل اس سے ملتے رہے تھے' اس کے داخلے سے متعلق تمام امور ولی کے ذریعے انجام دلواتے رہے تھے۔

اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ' پانچ لاکھ روپیہ رکھنے والا بینک اکاؤنٹ جس میں مزید پیسہ ڈلوائے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ان کی اس کے لیے بک کروائی نئے ماڈل کی گاڑی' وہ ان محبتوں اور پیسوں کی برسات سے متاثر ہو جاتی اگر اسے اپنی ماں کی کوئی پرواہ نہ ہوتی یا وہ ایک خود غرض بیٹی ہوتی۔

اس کی ماں کو ذلیل کر کے کیا وہ سمجھتے تھے کہ اس کی محبت جیت لیں گے؟

اس کا داخلہ کروا دینے کے بعد وہ واپس چلے گئے تھے اور پھر وہ خود تو نہیں آتے تھے البتہ ان کی فون کالز اس کے پاس ہر دو تین مہینے بعد ضرور آتی تھیں' جن میں اس کی خیریت پوچھی جاتی' پڑھائی کا احوال دریافت کیا جاتا' کچھ چاہیے تو نہیں اور ادھر ادھر کی کچھ مختصر گفتگو ہوتی۔

وہ ان سے تہذیب و شائستگی سے مگر بہت فاصلہ رکھ کر بات کرتی۔ جتنا وہ پوچھتے صرف اتنا جواب دیتی۔ ان فون کالز کے ساتھ وہ ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں خطیر رقم ڈلوایا کرتے۔

وہ کالج جاتی تھی مگر پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ وہ پہلے سی زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی بھی نہ رہی تھی۔ وہ خود کو بڑی مشکلوں سے کتابوں' پڑھائی اور کالج میں گم کرنے کی کوشش کرتی۔ یہ سوچ کر کہ اسے ڈاکٹر بنانا اس کے ڈیڈی کا ایک بہت بڑا خواب تھا۔

یہ خواب کبھی اس کا بھی تھا مگر اب وہ صرف ڈیڈی کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے دن' رات پڑھتی اور محنت کرتی۔ ممی ڈیڈی کے انتقال کے بعد سے جو بیمار رہنے لگی تھیں تو ان کی طبیعت سنبھلی ہی نہ تھی۔

وہ پہروں اداس اور خاموش بیٹھی رہتیں' وہ گھنٹوں روتی رہتیں۔ وہ ان کی بیٹی تھی' وہ ان کے دکھوں کو سمجھ سکتی تھی۔ ساری زندگی اپنے جس شوہر کا ساتھ انہوں نے اتنی محبت اور پوری وفاداری سے نبھایا' وہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کے قریب کیوں نہیں تھیں؟

ان کا شوہر ان سے خفا' کچھ کہے سنے بغیر کیوں اس دنیا سے چلا گیا۔ کیا وہ اچھی بیوی نہیں تھیں؟ کیا وہ شوہر کی وفادار نہ تھیں؟ پھر ان کے حصے میں یہ کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ اور پچھتاوا کیوں آیا؟ کس کے سبب آیا؟ کس کی وجہ سے آیا۔ صرف اور صرف ایک شخص۔

ممی یا کمرہ بند کر کے روتی رہتیں یا ایک دم اتنی بیمار پڑ جاتیں کہ تجمل ماموں اور معیز انہیں لے ہسپتال بھاگتے۔ وہ خوف زدہ اور پریشان جب اپنی روتی اور بیمار ماں کو دیکھتی تو فون پر خود سے محبتیں جتاتے دادا سے اسے مزید نفرت ہو جاتی اور گلے پیدا ہو جاتے۔ دکھوں سے بھرے ان روز و شب میں تجمل ماموں اور ان کی فیملی نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔

اس کے ایک ماموں اور ایک ہی خالہ تھیں۔ خالہ شادی ہو کر برسوں سے کینیڈا میں مقیم تھیں' یہاں واحد قریبی رشتہ دار تجمل ماموں ہی تھے۔ انہوں نے اور اس کے ڈیڈی نے برسوں پہلے برابر برابر واقع یہ دو پلاٹ ایک ساتھ خریدے کر ان پر آگے پیچھے ہی اپنے اپنے گھر بنوا کر یہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔

ڈیڈی کے انتقال کے بعد بہن اور بھانجی کی تنہائی اور اکیلے پن کو دیکھتے تجمل ماموں نے دونوں گھروں کے بیچ کی دیوار میں ایک حصہ تڑوا کر اس میں ایک چھوٹا سا گیٹ لگوا دیا تھا جو ہر وقت کھلا رہتا' تا کہ وہ اور ممی خود کو تنہا محسوس نہ کریں اور انہیں تحفظ کا احساس بھی رہے۔

وہ دادا کا تجمل ماموں کے ساتھ موازنہ کیا کرتی۔ تجمل ماموں اور معیز جو کہ ایک آواز پر ان لوگوں کے پاس موجود ہوتے تھے' وہ ہر لمحہ ان کی خبر گیری کو موجود رہا کرتے تھے۔

معیز تقریباً ہر رات اپنے گھر کا اپنا کمرہ چھوڑ کر ان کے گھر سونے آ جاتا۔ اس کے ہونے سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ کسی مرد کے سہارے کے بغیر وہ ماں بیٹی تنہا کیسے جئیں گی؟ ممی اکثر اس بات پر رو کر اللہ سے شکوے کرتیں کہ اس نے انہیں بیٹی کے ساتھ ایک بیٹا بھی کیوں نہ دیا۔

ان کی ایسی ہی باتوں پر معیز بار ہا انہیں یقین دلاتا کہ وہ ان کا بیٹا ہے اور وہ انہیں زندگی میں کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ وہ ممی کے لیے بھتیجے سے بیٹا بن گیا تھا۔ وہ ان کا احترام بھی کرتا اور ہر مشکل میں ان کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا۔

ممی کا تارک الدنیا ہو جانا، ان کی گوشہ نشینی، بیماری اور ان کے بے حساب آنسو ان سب کے ساتھ ممی کے مزاج میں گزرتے وقت کے ساتھ مزید کچھ اور تبدیلی بھی آ گئی۔ وہ حد سے زیادہ حساس اور زود رنج ہو گئی تھیں، وہ معمولی معمولی باتوں پر چڑ جاتیں، ناراض ہو جاتیں، رونا شروع کر دیتیں۔ اس کی کسی چھوٹی سی بات پر بھی جو انہیں ناگوار گزرتی، چیخنا چلانا شروع کر دیتیں۔ اس سے خفا ہو جاتیں، اپنا بی پی بڑھا لیتیں۔

ان سے اختلاف رائے تو کیا وہ کسی عام سے گھریلو معاملے پر اظہار رائے ہی کی جرأت کر لیتی تو وہ غصے میں آ جاتیں، اس پر چلانے لگتیں۔ وہ اپنے دادا کی دولت سے متاثر ہے اور انہیں چھوڑ کر دادا کے پاس چلے جانا چاہتی ہے۔ وہ ہر دم اس پر شک کیا کرتیں، اس سے مشکوک رہا کرتیں کہ وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر دادا کے پاس چلی جائے گی۔

وہ انہیں اپنی محبت کا کیسے یقین دلائے؟ وہ اکثر اکیلے میں رو پڑتی۔ ممی کو انتہائی سخت غصہ آنے لگا تھا اور ان کے غصے کو اگر کوئی قابو کر پاتا تو صرف معیز۔ انہیں اگر کوئی بات کوئی سمجھا پاتا تو صرف معیز، فارہ اپنی ہر بات اور ہر کیفیت ممی تک پہنچانے کے لیے معیز سے مدد لیتی۔ وہ اس کی مدد کرتا۔ ممی سے دوری، اپنے گھر کی تنہائی، کسی دوست، کسی ہمدم، کسی کی شدید کمی کے ان ہی ماہ و سال میں اس کی معیز سے دوستی ہو گئی۔

اپنے سے سات سال بڑے ماموں زاد کزن سے وہ دل کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ڈیڈی کی زندگی میں صرف اس کا کزن تھا مگر ان کے بعد تنہائیوں اور آزمائشوں کے سالوں میں اس کا دوست بن گیا۔ وہ اپنی ہر پریشانی، ہر مشکل اور ہر الجھن اس سے شیئر کرنے لگی۔ ممی تک کوئی بات پہنچانی ہے تو معیز کا سہارا لیتی اور خود کو کوئی مشورہ درکار ہے تو معیز سے رجوع کر لی۔

وہ اس سے سات سال بڑا تھا اس لیے جب وہ انیس بیس سال کی ابتدائی عمر سے گزر رہی تھی تب وہ تعلیم مکمل کر کے اپنا کریئر بنا چکا تھا، خود کو اسٹیبلش کر چکا تھا۔

وہ اس کے خاندان کا سب سے لائق اور قابل لڑکا تھا۔ معاشیات اور شماریات میں ڈگری لینے کے بعد بھی اس کا تعلیمی سفر ختم نہ ہوا تھا، وہ ہر آن کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے میں مصروف رہا کرتا تھا۔

آغا جان کا باقاعدگی سے چیک بھجوانا اور دو تین ماہ بعد کی فون کالز ان دو معمولات سے ہٹ کر انہوں نے اس کے نکاح یا رخصتی کے حوالے سے بھی کچھ نہ کہا تھا۔ مگر وہ اس نکاح کو یاد کر کے روز اول ہی کی طرح ڈر جایا کرتی تھی۔ آگے کیا ہوگا؟ اسے شدید خوف محسوس ہوتا۔

اس سے بات بے بات ناراض رہنے اور غصہ کرنے والی ممی کو بھی اس بات کی بے حد فکر رہتی کہ فارہ کے

مستقبل کا ہوگا کیا؟ وہ اپنی بیٹی محمد بختیار خان کے خاندان میں نہیں رہنے دیں گی۔ یہ تو طے تھا۔

فارہ کی طلاق یا خلع ایک بالکل طے شدہ بات تھی مگر انہیں اس بات کی فکر لاحق ہوتی کہ طلاق کا داغ لگنے کے بعد ان کی بیٹی کا مستقبل ہوگا کیا؟

اس کی شادی کہاں ہوگی؟ کیسے ہوگی؟ ایسے ہی ایک موقع پر جب ممی اس کے مستقبل کے حوالے سے سخت پریشان اور آزردہ ہو رہی تھیں تب جمیل ماموں نے انہیں تسلی دی کہ وہ فارہ کے مستقبل کی طرف سے بے فکر رہیں۔ فارہ کو وہ اپنی بہو بنائیں گے اور ان کی خواہش سے بھی بڑھ کر یہ خود معیز کی خواہش ہے۔

ممی نے بے حد خوشی کے ساتھ جمیل ماموں کے اپنے معیز کے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ فارہ اس بات پر حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ وہ معیز کے لیے کزن اور دوست سے بھی بڑھ کر کچھ خاص مقام حاصل کر گئی ہے یہ تو اس کے کہے بنا ہی وہ سمجھتی تھی مگر یہی بات جمیل ماموں کے ذریعے باضابطہ ممی تک پہنچ جانا اور اس کا قبول بھی کر لیا جانا۔

وہ خوش ہونا چاہتی تھی کیونکہ معیز میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کوئی بھی لڑکی اپنے شریک سفر میں چاہ سکتی ہے۔ مگر وہ کیسے خوش ہوتی۔ پرواز کی خواہش سے پہلے ہی اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے، خوشی کا احساس پانے سے پہلے ہی اس سے خوشیاں چھین لی گئی تھیں۔

اگر ولی صاحب خان کا خوف کسی آسیب کی طرح اس کے وجود پر مسلط نہ ہوتا تو وہ بے خوف و خطر معیز کے خواب دیکھتی، خوشیوں کے خواب دیکھتی مگر اب تو خواب دیکھتے بھی ڈر لگتا تھا۔ کیا ولی صاحب خان کبھی اس کا پیچھا چھوڑے گا؟ کیا کبھی وہ اس جبر کے رشتے سے نجات حاصل کر پائے گی؟ وہ سوچتی اور بہت روتی۔

گھر کا سربراہ نہ رہے تو گھر کا شیرازہ کس طرح بکھرتا ہے، وہ اپنے گھر کو دیکھتی تو بہت اداس ہوتی۔ بہت کڑھتی۔ ڈیڈی کے بعد بتدریج تبدیل ہوتا ان کے گھر کا ماحول اس کے میڈیکل کے آخری سالوں کے آتے آتے مکمل طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔

ممی نے زہرہ ماسی کے ساتھ ایک این جی او جوائن کر لی تھی وہ سوشل ورک میں مصروف رہنے لگی تھیں، گھر کو مکمل طور پر نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ڈیڈی کی زندگی میں جس گھر میں سوائے صبح سے رات تک کام کرنے والی ایک اکلوتی ملازمہ کے کوئی نوکر نہ تھا ممی نے وہاں نوکروں کی فوج جمع کر ڈالی تھی۔

آغا جان کے جس پیسے کو ابتدا میں وہ ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھتی تھیں اور وہ صرف فارہ کی تعلیم یا پھر انتہائی ناگزیر گھریلو اخراجات کے لیے استعمال ہوتا تھا، انہوں نے اسے بے دریغ خرچ کرنا شروع کر دیا تھا وہ ہر دوسرے دن اس سے چیک کیش کروا لیتیں۔ کبھی پچیس ہزار، کبھی پچاس ہزار، کبھی اسی ہزار اور کبھی لاکھ۔

کبھی گھر کا سارا فرنیچر بدل دیا تو کبھی تمام قالین، کبھی سارے پردے، کبھی گھر پر کوئی پارٹی رکھ لی تو کبھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دوست احباب کو گیٹ ٹو گیدر ارینج کروا لی۔

کبھی کسی رشتے دار یا دوست کو تحفے میں کچھ قیمتی چیز دے دی تو کبھی کہیں ڈونیشن دے آتیں اور کبھی ان کی مرضی انہوں نے کہاں خرچ کیا، وہ فارہ کو بتانے کی پابند تو نہیں۔ سادہ گھریلو عورت سے بدل کر وہ امیر طبقے کی

CamScanner

بلکہ تو وہ اس طبقے کی نمائندہ بے حساب پیسے کی نمائش کرنے والی عورت بن گئی تھیں۔

یوں لگتا جیسے وہ پانی کی طرح اس پیسے کو لٹا کر اسے تباہ و برباد نہیں کر رہیں بلکہ محمد مختیار خان کو تباہ و برباد کروانا چاہتی ہیں۔ روز روز کے ان بڑے بھاری رقوم کے چیک کاٹنے پر ایک بار وہ می سے تھوڑا سا اختلافی انداز گفتگو اختیار کر بیٹھی تو انہوں نے وہ واویلا مچایا' وہ چیخیں' چلائیں اور روئیں کہ اسے اپنے اعتراض پر شرمندہ نادم ہونے اور پچھتانے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔

"میرا شوہر نہیں رہا محتاج ہو گئی ہوں اپنی اولاد کی۔ مختار خان نے مجھے ایسا لاچار بنا دیا ہے کہ آج مجھے اپنی ہی بیٹی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور پھر یہ مختیار خان کی پوتی کی مرضی ہے کہ وہ ماں کو پیسہ دے یا نہ دے۔" رو رو کر اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتے وہ اسی وقت اپنا ATM کارڈ نکال کر لائی تھی اور اسے پن کوڈ سمیت می کے حوالے کر دیا تھا۔

تجمل ماموں' زہرا مامی' معیز کوئی کتنا بھی کہتا رہے یہ پیسہ تمہارا حق ہے' بالکل جائز حق' یہ کوئی احسان یا بھیک نہیں پھر بھی وہ اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے اس پیسے کو استعمال کرنے کے علاوہ کسی انتہائی شدید اور ناگزیر ضرورت ہی کے تحت اپنے اکاؤنٹ سے خوب سوچ سمجھ کر اور بس ضرورت ہی کے مطابق رقم نکالا کرتی تھی مگر اس کے باوجود بھی می ہر مہینے اکاؤنٹ تقریباً تقریباً خالی کروا دیا کرتی تھیں۔

می پر افسوس' ترس اور ہمدردی کے بجائے اب اسے ان پر غصہ آنے لگا تھا' جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

اس کے فائنل ایئر ہی کے دوران معیز نے اسے باقاعدہ پرپوز کیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب وہ میچور ہو چکی ہے اس کی تعلیم بھی مکمل ہونے والی ہے لہٰذا اب یہاں سے کسی اچھے وکیل سے مشورہ کیے جانے کے بعد جلد ہی وہاں پر طلاق کا مطالبہ کر دیا جائے گا۔ معیز کا پرپوزل خوشی کی بات تھی مگر اس کی طلاق؟ گزشتہ چار سالوں میں اس کے نکاح یا رخصتی کے متعلق کچھ نہ کہنے والے آغا جان اب اس کے فائنل ایئر کے دوران اکثر باتوں باتوں میں ایسی کوئی بات ضرور کہہ جاتے جو اس کی رخصتی اور شادی سے متعلق ہوتی۔

فارہ یہ شادی کرنا بھی چاہتی ہے یا نہیں' یہ جاننے کی زحمت گوارا کیے بغیر وہ اس کی اور ولی کی شادی کی باتیں کیا کرتے۔ زبردستی کا نکاح اور زبردستی کی شادی۔ واقعی آغا جان کی محبت مطلق العنانی والی محبت تھی۔ ان کے من چاہے اور زبردستی مسلط کردہ فیصلوں کو قبول کیے جاؤ اور بدلے میں ان کی محبت پائے جاؤ۔

شادی دل کی خوشی کا نام ہے یا زبردستی مسلط کردہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو نباہنے کا؟ وہ آنے والی قیامت جو اب بہت نزدیک آ چکی تھی کو سوچ سوچ کر خوف زدہ ہوتی' خود کو دباؤ میں محسوس کرتی' ہر وقت ٹینشن میں رہتی' اس صورت حال کا منفی اثر اس کی پڑھائی پر یہ پڑا کہ بے تحاشا محنت کے باوجود فائنل ایئر میں اس کا ویسا رزلٹ نہ آیا جس کی اسے امید تھی اور جس کی اس نے دن رات لگ کر محنت کی تھی۔ اس کا اکیڈمک کیریئر' اس کا پروفیشنل کیریئر سب ایک شخص کے سبب تباہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

اسے اس شخص ولی صہیب خان سے پہلے اور بھی شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کے رزلٹ کا پوچھتے آغا جان

ان آیا تھا اور یہاں می نے تجمل ماموں اور معیز کے مشورے سے ایک بہت اچھے وکیل سے رابطہ کر لیا تھا۔ یہی ی کہ جب وہ اس کے پاس ہو جانے کا سن کر اس کے لیے کئی لاکھ قیمت تحائف لے کر ان کے گھر گئی برسوں آئے تب می نے اسی روز ان سے اعلانیہ فارہ کی طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

پانچ سالوں بعد اگر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اپنی دولت کی خیرہ کن چمک دمک دکھا کر اور محبتیں جتا کر ان کے اور ے فیصلے کو تبدیل کروا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے تو آج اپنی تمام خوش فہمیاں دور کر لیں۔

فارہ اور اس کی ماں کا پانچ سال بعد بھی وہی فیصلہ ہے جو پانچ سال پہلے تھا۔ می کے اگر الفاظ نہیں تو لہجہ ضرور یا سب کہہ رہا تھا اور پھر اس روز سے می اور آغا جان کے بیچ چھڑی غیر اعلانیہ سرد جنگ باقاعدہ اور باضابطہ لانیہ جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ می کے جارحانہ پالیسیوں کے جواب میں آغا جان کا انداز دفاعی حکمت عملی کھنے والا تھا۔

"اچھا رخصتی کچھ عرصہ کے لیے موخر کر دیتے ہیں۔ فاعملاً ہاؤس جاب ہو جائے۔ اگر وہ پوسٹ گریجویشن ی انٹرسٹڈ ہے تو وہ کر لے رخصتی چند سالوں بعد" جیسی میٹھی میٹھی مصلحت اور صفائی والی باتیں۔

طلاق کے مطالبے کے ساتھ ہی می نے ان سے جائیداد میں فارہ کے حصے کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ طلاق کی بات درست تھی مگر جائیداد؟ اسے اس شخص ولی صہیب خان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا تھا' یہ طے تھا مگر اسے کسی جائیداد میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جائیداد کے اس مطالبے پر اس کا می سے اختلاف ہوا تھا۔

"کہو' میں غلط ہوں۔ تمہارے آغا جان ٹھیک ہیں۔"

"جاؤ' چاہتی ہو تو چلی جاؤ اپنے دادا کے پاس۔ کروا لو ان کے پوتے سے رخصتی۔"

"چھین لی اس ظالم انسان نے مجھ سے میری بیٹی۔ کر دیا اسے ماں سے باغی۔" وہ ان کے ان عجیب و غریب الزامات و دھمکیوں سے خائف ہو کر مجبوراً چپ تو ہو گئی تھی مگر یہ بات اس کے دل کو بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اپنی زندگی اور گھر کی الجھنوں کا انتہائی منفی اثر اس کی ہاؤس جاب میں خراب ترین کارکردگی کی صورت سامنے آ رہا تھا۔ وہ روز کسی نہ کسی سینئر ڈاکٹر سے خود کو نااہل' غیر ذمہ دار اور غیر پیشہ ورانہ رویے کا حامل سن کر آتی۔ یہاں سے شدومد سے طلاق کا مطالبہ اور وہاں سے مسلسل ٹال مٹول' اس کا اضطراب اور بے چینی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ می اور آغا جان اپنی اپنی انا کی جنگ لڑ رہے ہیں' اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے بیٹی یا پوتی نہیں بلکہ ان کی انا' ان کی ضد اور ان کی جیت ہے۔ وہ جس کی طرف ہو جائے وہی جیت جائے گا۔

اس کے اندر ان دونوں کے لیے شدید ناراضی اور خفگی پیدا ہونے لگی تھی۔ ان کے طلاق کے مطالبے کو وہاں سنجیدگی سے نہ لیا جاتا دیکھ کر آخر کار مجبوراً ان لوگوں کو خلع کی طرف جانا پڑا۔

اسے اس کا رخصتی سے قبل کا آدھا حق مہر جو کہ طلاق کی صورت میں مذہبی لحاظ سے اسے لازمی ملنا تھا اس سے دست برداری کے بعد مجبوراً خلع کا مطالبہ کرتے می اب جائیداد میں فارہ کے حصے کے مطالبے سے تو ایک

اٹھ بیٹھنے کو تیار تھیں۔

اس کے وکیل کی طرف سے خلع کا قانونی مطالبہ ان تک پہنچنے کی دیر تھی۔ آغا جان ولی کے ساتھ اگلے ہی روز ان کے گھر موجود تھے۔ آغا جان کی وہی صلح صفائی والی میٹھی میٹھی باتیں اور ولی کا اشتعال اور غصہ۔

"فارہ کو بلائیں۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔" ممی جو آغا جان کو کافی ٹھیک ٹھاک سنا رہی تھیں ولی نے ان کی بات کاٹ کر بہت گستاخی سے کہا تھا۔

"فارہ کے بڑے یہاں موجود ہیں، تمہیں جو کچھ کہنا ہے ان سے کہو۔" ممی کے بجائے معیز نے اسے جواب دیا تھا۔ وہ معیز کی بات کے جواب میں حقارت اور تنفر سے فوراً بولا تھا۔

"اپنے پرسنل معاملات میں کسی تھرڈ پرسن کی شرکت میں پسند نہیں کرتا۔ تمہارے والد بزرگوار کو میں فارہ کے ماموں ہونے کے ناتے یہاں برداشت کر سکتا ہوں مگر تمہاری یہاں موجودگی کا تو سرے سے کوئی جواز ہی نہیں ہے اور ویسے میں یہاں کسی بڑے سے نہیں اپنی بیوی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ لوگ اسے یہاں بلائیں گے یا میں اندر جا کر خود اس سے مل لوں۔"

ولی کی اس بدتمیزی پر ممی اسے ڈرائنگ روم میں بلا لائی تھیں، وہ خود آ کر اپنا جواب ان دونوں دادا پوتے کو دے دے تاکہ انہیں تسلی ہو سکے اور پھر وہیں آ کر اس نے آغا جان سے پہلی بار بالکل صاف اور واضح اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔ میں ولی صاحب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہی وہ وہاں سے واپس آ گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اپنے دل کی بات آغا جان تک پہنچا کر اس کا بے چینی و اضطراب ختم ہو جائے گا مگر ان تک اپنا انکار پہنچا دینے کے بعد تو اس کی بے چینی، اضطراب اور بے قراری مزید کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی اس کا رہا سہا چین، سکون اور آرام سب کچھ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی پہلے اگر بدتر تھی تو اب بدترین ہو گئی تھی۔ ان کے گھر سے جا کر تیسرے دن آغا جان کا فون آیا تھا۔

"میری صحت ٹھیک نہیں، میری زندگی کا کچھ پتا نہیں۔ فارہ سے میری بات کرا دو۔" وہ ممی سے بولے تھے۔

وہ وہاں موجود تھی، ممی اگر ان کی اس سے بات نہیں کروانا چاہتی تھیں تو وہ خود بھی ان سے بات کرنے سے کترا رہی تھی۔ وہ ان سے کیا بات کرے گی، کیا کہے گی۔ یہاں سے طلاق کا مطالبہ کیے جانے کے بعد آغا جان نے اسے اس کے موبائل پر تین چار بار کال کی تھی جو اس نے نمبر دیکھ کر ریسیو ہی نہ کی تھی۔

وہ ولی سے شادی کے لیے راضی نہیں، یہ جاننے کے باوجود وہ اسے اس شادی کے لیے راضی کرنے کی کوشش کریں گے، اس سے محبت کا اظہار کریں گے، وہ ان کے پاس ہمیشہ کے لیے آ کر رہ جائے یہ ان کی شدید خواہش ہے، جیسی باتیں کہیں گے اور وہ جواب میں کیا کہہ پائے گی۔

اپنے زبردستی کے نکاح اور ڈیڈی کی اتنی تکلیف دہ انداز میں موت کے لیے وہ آغا جان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی مگر وہ اس کے دادا تھے، اس کے ڈیڈی کے والد، وہ ان سے کوئی گستاخی یا بدتمیزی تو ہرگز نہیں کر سکتی

تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ ان کی کالز نہ اٹینڈ کی جائیں۔

اس کی بے کلی اور بے قراری میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ ممی کی ریسیو کی اس آخری فون کال کے بعد ان کی کوئی کال نہ آئی تھی۔ ممی نے نہ کبھی اس کی سنی تھی اور نہ سننے پر آمادہ تھیں، ہاں اس نے معیز سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ ممی کو سمجھائے انہیں بتائے کہ فارہ کو جائیداد میں اپنا حصہ نہیں صرف طلاق چاہیے۔ وہ اس جھگڑے کو مزید الجھا کیوں رہی ہیں۔

معیز نے بجائے ممی کے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔ وہ آخر ولی صاحب خان نام کے اس گھمنڈی انسان کے آگے کیوں جھک رہی ہے، کیوں اپنے ہر حق سے دستبردار ہو رہی ہے۔ پہلے ہی وہ خلع کا مطالبہ کر کے اپنے حق مہر سے دستبردار ہو چکی ہے، اب اس لالچی اور دولت پرست انسان کو جو اسے طلاق دے گا ہی صرف اس لیے نہیں کہ اسے جائیداد میں بٹوارا گوارا نہیں، کیوں جائیداد سے دستبرداری کا اعلان کر کے جیت کی ایک اور خوشی فراہم کر رہی ہے۔

طلاق اور خلع کے مطالبے کے باوجود وہاں سے پابندی سے اس کے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈلوایا جا رہا تھا، تاکہ اس پر اپنی اچھائی، بڑائی اور اعلیٰ ظرفی ثابت کرنے کے لیے اور ممی ATM کے ذریعے اس میں سے بے دریغ پیسہ نکلوا کر آدھے ہی مہینے میں اکاؤنٹ میں محض چند ہزار روپوں کا بیلنس چھوڑ رہی تھیں۔ اسے اپنی ممی پر شدید افسوس ہوتا۔ اس کی ماں کی غیرت اور خودداری کہاں جا سوئی ہے، جن سے اتنی شدید نفرت ہے، جن سے ہر رشتہ توڑ دینے کا مصمم عزم ہے ان کا پیسہ استعمال کرتے کیا ان کی انا اور غیرت نہیں جاگتی؟

پھر اس روز جب اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروائے گئے تازہ ترین پیسوں میں سے ممی نے ہمیشہ کی طرح ادھر ادھر پیسے نکلوا کر یہاں وہاں خرچ کرنا شروع کیے تب اس کا ممی پر افسوس خود پر سخت غصے میں تبدیل ہو گیا۔

ممی نے روتے اور طعنے دیتے جو بھی کہا تھا، اسے ATM کارڈ ان کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی، ایک بار دے کر اب واپس مانگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس روز اپنا بیلنس پتا چلنے پر اپنا ATM کارڈ ممی کے سپرد کرنے والی جذباتی حرکت پر بے انتہا پچھتائی۔

وہ اس کا اور ولی کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا۔ وہ ہر مہینے پیسہ ڈلواتے وقت جب بیلنس دیکھتا ہوگا تو اس کے متعلق کیا سوچتا ہوگا۔ اسے ولی کے سامنے اپنے کسی امپریشن کے بننے یا بگڑنے کی پروا نہیں تھی۔ وہ اسے جو مرضی سمجھتا ہو مگر پھر بھی اس کی انا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کا دشمن اسے بے غیرت اور خودداری سے عاری سمجھے۔ خرچ وہ پیسہ ممی کرتی ہیں مگر اس میں شامل تو وہ بھی سمجھی جاتی ہوگی۔ اس روز اس نے اپنی اے ٹی ایم سروس منقطع کرا دی تھی۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ ممی کو کوشش کر کے تحمل اور بردباری سے ایسا کرنے کی وجوہات سے ضرور آگاہ کرے گی مگر ایسا کچھ بھی ہونے کی نوبت ہی نہ آ سکی تھی۔ ممی نے شاید اس روز پیسہ نکلوانے کی کوشش کی تھی اور ناکامی کی صورت یہ جان گئی تھیں کہ اس نے اپنی اے ٹی ایم سروس کا خاتمہ کرا دیا ہے جب ہی وہ ہسپتال سے گھر پہنچی تو ممی شدید غصے کے عالم میں اس کی منتظر تھیں۔

CamScanner

وہ معاملے کو سنبھالنے' ممی کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ زہرا ماں کی آمد نے اس کی ہر کوشش پر پانی پھیر دیا۔

نگا کا وہ گیٹ کافی عرصے سے اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ زہرا ماں یا اس کا کوئی بھی کزن وقت بے وقت جب منہ اٹھاتا ان کے گھر آ جاتا۔ ایک تو ان کے اپنے گھر کی پرائیویسی متاثر ہوتی جو اسے بدمزا کرتی۔ دوسرے زہرا ماں کی موقع بے موقع آمد اور ان کے گھریلو معاملات میں غیر ضروری اور بے جا مداخلت۔

اپنے گھر کے ذاتی معاملات میں اسے ان کی ضرورت سے زیادہ مداخلت کھلتی تھی مگر جمیل ماموں اور صبوری کی وجہ سے وہ مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیا کرتی۔ انہوں نے

"فارہ! ماں سے ایسے بات کرتے ہیں۔"

"ماں وہ ہے تمہاری یا تم اس کی؟ اب تم اسے بتاؤ گی کہ صحیح کیا ہے؟" جیسی باتیں کر کے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔

ممی تو پہلے ہی غصے سے بے قابو تھیں ان اشتعال انگیز جملوں کے بعد تو پھر وہ کسی صورت کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہ تھیں۔ مزید قصور اس سے یہ سرزد ہو گیا کہ وہ ممی کے جائیداد کے مطالبے کے متعلق ناپسندیدگی بلکہ اپنی مخالفت ظاہر کر بیٹھی اور یہ اس کی کھلی نافرمانی اور بغاوت تھی۔

ان کی ہر غلط بات پر سر جھکا کر فرماں برداری اور غلط پر کچھ بولنے کی جسارت بغاوت تھی۔ پھر اس کے ساتھ انہوں نے وہی سلوک کیا جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے کیا جاتا ہے۔

دو ڈھائی سال قبل انہوں نے نورین خالہ کے کہنے پر کہ بڑی عمر کے افراد کو کینیڈا کی امیگریشن نوجوان کے مقابلے میں آسانی سے مل جاتی ہے لہٰذا وہ بھی امیگریشن کے لیے اپلائی کریں' اپنی درخواست داخل کی تھی۔ وہ سب ایک کھیل جیسا تھا۔ ممی نے محض تفریحاً امیگریشن کے لیے اپلائی کر دیا تھا مگر خوش قسمتی سے انہیں ڈیڑھ دو برس کے اندر ہی کامیابی نصیب ہوئی اور وہاں کی امیگریشن مل گئی تھی۔

وہ پانچ ماہ قبل ممی کا کینیڈین ایمبیسی میں ہونے والا انٹرویو اور اس میں کامیابی' ان کا میڈیکل' ان کی کینیڈا کی امیگریشن سب کچھ بھول چکی تھی۔

اس کے خیال سے وہ سب ممی کی ایک تفریح تھی بس یونہی کہ موڈ بنے پر وہ شاید بہن سے ملنے اور کینیڈا گھومنے پھرنے وہاں چلی جاتیں مگر وہ اپنی کینیڈا کی اس تفریحی امیگریشن کو بیٹی کو سزا دینے کے لیے استعمال کریں گی ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پانچ ماہ سے اپنی اس امیگریشن کا کوئی ذکر بھی نہ کرنے والی ممی نے اپنی گستاخ اور باغی بیٹی کو سزا دینے کے لیے فوراً کینیڈا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ خود اپنی بہن کے پاس جا رہی تھیں۔ انہیں فارہ سے ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہا تھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر اپنے دادا کے پاس چلی جائے گی مگر اس کے دل میں تو کبھی معمولی سا شک بھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ اس کی ماں اسے بالکل اکیلا چھوڑ کر اس سے ناراض ہو کر بھی کہیں جا سکتی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ پوری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دے گی اور اسے نیند نہیں آئے گی۔ ان دنوں جب رات کی تنہائیوں میں اکیلے پن کے دکھ اور خوف کو ساتھ لیے اپنے گھر میں نیند نہیں آتی تھی تو اس جگہ تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ جگہ تو مرکز و منبع تھا اس کے تمام دکھوں اور خوفوں اور ٹینشن کا مگر سوچتے الجھتے بے تحاشا روتے نجانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

ایسی گہری نیند کہ جس کروٹ وہ سونے لیٹی تھی اسی کروٹ جاگی تھی۔

بند پردوں اور کھڑکیوں کے اس پار ایک نیا دن طلوع ہو چکا ہے' پردوں کی جھریوں سے ہلکا ہلکا جھانکتا اجالا خبر دے رہا تھا۔ شاید گزشتہ کئی راتوں کی ادھوری' نامکمل نیند نے یوں غافل کر دیا کہ وہ بے فکری سے سو گئی۔ اپنے دونوں بیگ اور سوٹ کیس اسے سامنے رکھے نظر آ رہے تھے تو وہ بیڈ سے اٹھی۔

سوٹ کیس میں سے اپنا ایک جوڑا نکالا اور فریش ہونے باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر لباس تبدیل کر لیا' بال سکھانے کے بجائے گیلے ہوئے بالوں کو باندھا گیا تھا انہیں کیچر میں جکڑ لیا۔ اب پردے کھول کر کھڑکی سے باہر جھانکتے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔

اس گھر سے اس کا ایسا تعلق نہ تھا کہ بے تکلفی سے گھومنا شروع کر دے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے گارڈن پورا کا پورا بہت واضح نظر آ رہا تھا' صبح کا صاف شفاف منظر' ہرے بھرے پیڑ' پتے' پھول' پھلوں سے لدے درخت' اس قدرتی منظر کی یہ رعنائی اس کے دل و دماغ کو سکون بخشنے لگی۔

وہ رات کے مقابلے میں اس وقت خود کو زیادہ پرسکون اور زیادہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اپنے یہاں آنے کے فیصلے پر پچھتانے اور الجھنے کے بجائے اس وقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ صحیح یا غلط جب وہ یہاں آنے کا فیصلہ کر کے یہاں آ چکی ہے تو اب اسے باوقار انداز میں اپنے اس فیصلے کو نبھانا چاہیے۔

وہ آغا جان سے کوئی جھوٹ نہیں بولے گی' فی الحال وہ ان کے ساتھ ملنے کی اپنی بات بتاتے خاموش رہے گی مگر ان تین ہفتوں کے آخر تک آتے آتے وہ آغا جان کو یہ ضرور باور کروا دے گی کہ جو رشتہ برسوں پہلے انہوں نے جوڑا تھا وہ اس سے ناخوش ہے اور اس کا خاتمہ چاہتی ہے۔ لڑائی جھگڑے اور بدمزگی کے ساتھ نہیں بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ۔ وہ اس کے دادا ہیں' اس کے بزرگ اور اس کے لیے قابل احترام بھی ہیں اور وہ ہمیشہ ان سے ملا بھی کرے گی اگر وہ اس رشتے کو باوقار اور مہذبانہ انداز میں ختم ہونے دیں۔

اگر یہ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے تو یہ تین ہفتے کوئی لمبا عرصہ تو نہیں۔ دروازے پر دستک دی گئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک ملازمہ کھڑی تھی' باادب سے انداز میں اسے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دینے۔ کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتی وہ نیچے آ گئی۔

ڈائننگ روم کس طرف تھا اسے معلوم تھا۔ اس گھر میں دوسری بار کے آنے پر تو نہیں۔ ہاں پہلی بار آمد پر وہ کئی مرتبہ اس جگہ کھانا کھانے ڈیڈی کی ہمراہی میں آ چکی تھی۔

ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی اسے وسیع و عریض میز کے سامنے والی زرینہ اور اس کی بیٹی بیٹھے نظر آئے۔

CamScanner

زرینہ سے آتار کیے لینے کے باوجود شدید کھنچے کا تاثر دیتی اپنی بیٹی کی طرف متوجہ رہی۔ فارہ یہاں آ چکی ہے تو وہ معیز سے پھر دور رک گئی ہے اور یہ میزبانی اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ اسے ناشتے کی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی جائے تو ایسے کسی بھی طرح کے معیز سے تعلقاری نظر آ رہی تھی۔

"آؤ فارہ!" زرینہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ولی نے اس سے سنجیدگی سے کہا۔

وہ خاموشی سے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچن سے گرم گرم آملیٹ کی پلیٹ لا کر میز پر رکھتی ملازمہ نے جسے وہ لوگ گل صمد کے نام سے پکارتے تھے ولی کے اشارہ کرنے پر میز پر موجود ناشتے کے لوازمات میں سے کئی اشیاء فارہ کے آگے کر دیں۔

سنجیدہ تاثرات کے ساتھ ان لوازمات کو دیکھے بغیر اس نے کیتلی اٹھا کر ایک کپ میں چائے ڈالی اور آہستہ آہستہ اس کے سپ لینے لگی۔ میز پر موجود وہ تینوں افراد ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ رات آغا جان موجود تھے اور اپنی گفتگو سے ماحول کو خوشگوار بھی بنائے ہوئے تھے جب ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانا اتنا مشکل نہیں لگ رہا تھا اس وقت تو دل چاہ رہا تھا یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

ولی اپنی پلیٹ پر نظریں مرکوز کیے آملیٹ کھانے میں اور زرینہ اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھی بچی کو ناشتہ کروانے میں مصروف تھی۔ اس بچی کی معصومانہ دو چار باتوں کے سوا ڈائننگ روم میں مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی میں وہاں رکھے فون کی بیل ذرا زیادہ ہی زور سے گونجی تھی۔

"ہیلو۔" ولی نے اٹھ کر کال ریسیو کی تھی۔

"تمہارا فون ہے۔" دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس کی بات سن کر کچھ بھی جواب دیے بغیر یہاں تک کہ ہولڈ کیجیے تک بھی کہے بغیر ریسیور ایک سائڈ میں رکھتے ولی نے اسے اطلاع دی۔

اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا پائی کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے خوب صورت سی چھوٹی میز پر رکھے فون کے درمیان چند قدموں سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔

"فارہ! میرے خدا! تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" وہ معیز تھا۔ اس کے ہیلو کے جواب میں وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

"پھوپھو نے مجھے فون پر بتایا کہ تم ان کی اجازت کے بغیر پشاور چلی گئی ہو تو مجھے یقین نہیں آیا۔ مجھے لگا کہ ضرور انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اس وقت یہاں اس گھر میں تمہاری آواز سن کر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کیا کہوں۔ میں رات بھر اتنا بے چین اور پریشان رہا ہوں۔ تمہارا سیل فون کہاں ہے؟ میں نے اس پر تمہیں کانٹیکٹ کرنے کی کس قدر کوشش کی ہے۔" وہ ایک سانس میں بولتے چلا گیا۔

کل اس سے فون پر بات کرنے کو راضی نہ ہوتی ماں کو اس کی اتنی پروا تو تھی کہ اس کی تازہ ترین بغاوت سے چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی معیز کو [illegible] میں مطلع کر دیا گیا تھا۔ ایک تلخ اور دکھ بھرا تاثر اس کی آنکھوں میں در آیا۔ بے پروا اس کی تھی یا اپنی انا کی شکست۔ اس نے سوچا نہیں کہ سوچنے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔

معیز کی ناراضی بھری باتوں کا جواب دینے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک نظر ولی اور زرینہ کو دیکھا۔ وہ [illegible]

نظریں پلیٹ پر مرکوز رکھے بالکل پہلے کے سے بے تاثر انداز میں ناشتہ کر رہا تھا جب کہ زرینہ لاتعلقی کا تاثر دینے کے باوجود اسے دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں کی موجودگی میں وہ معیز سے کیا کہے۔

"سیل فون میرے پاس ہی ہے۔ آغا جان بیمار ہیں اس وجہ سے مجھے ایمرجنسی میں ولی کے ساتھ یہاں آنا پڑ گیا۔" وہ بہر ممکن حد تک آواز دھیمی رکھ کر بولی۔

اس نے معیز کو یہ نہیں بتایا کہ کل اپنے گھر سے نکلتے وقت اس نے موبائل آف کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ وہ جب یہاں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو پھر اسے مثل ماموں ہوں یا زہرا امی یا نورین خالہ کسی کی بھی نصیحتوں سے پر اور لیکچر دیتی فون کالز کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"فضول باتیں مت کرو۔ آغا جان بیمار ہیں۔ تمہارے کب سے وہاں ایسے تعلقات ہو گئے جو بیماریوں کا سن کر دوڑ پڑو۔ اس طرح کسی سے بھی کچھ پوچھے اور کہے سنے بغیر تم وہاں چلی کس طرح گئیں۔ پھوپھو اور میں لاہور میں نہیں تھے لیکن ممی اور پاپا تو وہاں تھے۔ تم نے پوچھنا یا اجازت لینا تو دور انہیں بتایا بھی نہیں اور یہاں آ گئیں۔ تم سے اس حماقت کی مجھے بالکل امید نہیں تھی فارہ۔" وہ انتہا سے زیادہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔

"تمہارا وہاں خلع کا جھگڑا چل رہا ہے میں نہیں مان سکتا کہ تم وہاں اپنی خوشی سے گئی ہو۔ تم مجھے سچ سچ بتاؤ فارہ! تمہیں اس سورما نے ڈرایا دھمکایا تو نہیں ہے۔ کہیں تم اس کی کسی بھی طرح کی دھمکیوں سے ڈر کر تو وہاں نہیں چلی گئیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صرف ہاں کہہ دو۔ باقی سب پھر میں دیکھ لوں گا۔ مجھے پتا ہے وہ پیچھے کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ تمہیں ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ زبردستی تمہیں وہاں روک نہیں سکتے۔" وہ اس کے لیے شدید تشویش اور فکر میں مبتلا لگ رہا تھا۔

اب وہ ولی اور زرینہ کی موجودگی میں اس سے کیا کہے۔ وہ محتاط سے انداز میں آواز کو پہلے سے بھی زیادہ دھیما اور پست کر کے اس سے بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے معیز! آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ پلیز مطمئن رہیں۔"

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو تم فوراً لاہور واپس جاؤ۔ میں شام میں لاہور تمہارے گھر پر فون کروں گا اور وہاں میری کال تم ریسیو کرو گی۔" معیز نے غصیلے لہجے میں کہتے "خدا حافظ" کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ وہ جیسے اس کی اس بے وقوفانہ حرکت پر اس سے شدید ناراض ہو گیا تھا۔

"رات آغا جان کا بی پی چیک کر لیا تھا؟" ریسیور بڑی بے دلی سے کریڈل پر رکھتے اس نے ولی کی آواز سنی۔ چائے کے سپ لیتا وہ زرینہ سے مخاطب تھا۔

"جی لالہ! رات بھی دیکھا تھا اور ابھی صبح جوس دے کر گئی تھی تب بھی چیک کیا تھا۔ وہی ۹۰ اور ۱۲۰ ہے۔" ٹیلی فون کی میز سے کھانے کی میز تک واپس آتے اس نے ان دونوں بھائی بہن کی بات چیت سنی۔

غالباً اسے باور کرایا جا رہا تھا کہ اس فون کال کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں بلکہ ان کے نزدیک تو اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ کرسی پر واپس بیٹھ کر اپنی چائے کے بے دلی سے سپ لیتی وہ معیز کو سوچ رہی تھی۔ کل کتنے

CamScanner

غیر متوقع انداز میں ولی اس سے ملا۔ جتنی غیر متوقع اور حیرت انگیز بات اس سے کی اس سب کے دوران وہ واقعی معیز کو بالکل فراموش کر گئی تھی۔

اب کسی وقت بالکل تنہائی میں وہ اس سے فون پر بات کرنا چاہتی تھی۔ ولی نے اسے کسی کو بھی کچھ بتانے سے منع کیا تھا۔ وہ اس سے کیے وعدے کی پابند تو تھی مگر پھر بھی وہ معیز سے بات کر کے اس کا غصہ اور ناراضی ختم کرنا چاہتی تھی۔

وہ ذہین اور معاملہ فہم ہے اور اس کے لیے بہت کیئرنگ بھی۔ ممی کے اسے چھوڑ کر کینیڈا چلے جانے کا الزام دوسروں کی طرح معیز نے اس پر عائد نہیں کیا تھا وہ قارہ کو سمجھتا ہے اور وہ اسے اگر کچھ سمجھانا چاہے گی تو وہ سمجھ لے گا۔ وہ اپنے ایک اچھے دوست کو خود سے ناراض تو ہرگز نہیں رہنے دے گی۔

* * *

"السلام علیکم۔" اس کے لیے مکمل اجنبی ایک خاصا ہینڈسم مرد ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔ سلام کی اس بلند آواز پر اپنی سوچوں سے چونک کر نکلتے اس نے اسے دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ عباد بیٹھو۔" ولی نے کرسی پر سے کھڑے ہو کر بڑی خوش دلی بے تکلفی اور گرم جوشی سے نووارد کا استقبال کیا۔ استقبال کا یہ محبت بھرا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ آنے والا کوئی بہت ہی عزیز اور خاص الخاص بندہ ہے۔ آنے والا کون ہے؟ اسے سمجھنے میں چند سیکنڈز بھی نہیں لگے۔

زرینہ کے برابر بیٹھی اس کی بیٹی کرسی پر سے فوراً ہی پاپا کہتی آنے والے کی طرف دوڑ گئی تھی۔ بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتا وہ ولی کی طرف بڑھا اس سے ہاتھ ملا کر وہ ڈائننگ ٹیبل کے آگے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زرینہ کے اکڑے ہوئے مغرورانہ تاثرات کے حامل چہرے پر شوہر صاحب کو دیکھ کر کچھ تھوڑی بہت مسکراہٹ اور نرمی نمودار ہوئی تھی۔

"میں کل بھی آیا تھا۔ تم تھے نہیں۔"

"ہاں کل میں۔" اسے جواب دیتے دیتے ولی قارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

آنے والا پہلے ہی قارہ کو کافی حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تک تو نہیں مگر بیٹی کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس کی نگاہ قارہ پر پڑی تھی اور وہ سر جھکائے ہوئے لاتعلقی سے میز کو گھورنے کے باوجود جانتی تھی کہ وہ بندہ مسلسل اور ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا ہے۔ غالباً اس کی اس حیرت اور استعجاب کو بھانپتے ہی ولی کو تعارف کروانے کا خیال آیا تھا۔

"میں تم لوگوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ عبادالرحمٰن ہمارا کزن بھی ہے اور زرینہ کا شوہر بھی اور عباد! یہ قارہ....."

عبادالرحمٰن خالی عبادالرحمٰن نہ تھا اس کے تعارف میں باقی سب کچھ بتایا جانا بھی ضروری تھا۔ ہاں وہ صرف قارہ تھی اس کی شہرت کے شاید یہاں ڈنکے بجے ہوئے تھے۔ ایک مشہور اشتہار کی طرح "قارہ۔ نام ہی کافی ہے۔" کہہ دیا جائے۔

لاتعلقی و بے نیازی کا چولا اتار کر اسے اس تعارف کے بعد اس بندے کی طرف دیکھنا پڑا۔

پتا نہیں وہ پہلے سے اس کے متعلق کیا کیا جانتا تھا یا کیا اس کی اس اکھڑ بیوی نے اسے بتا رکھا تھا یقیناً کچھ اچھا اور مثبت تو بتایا نہیں گیا ہوگا بہرکیف اسے رسمی انداز میں سلام دعا تو کرنا تھی۔ وہ قارہ کے سلام کے جواب میں خوش اخلاقی سے مسکرایا۔

"میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں لیکن آپ کو شاید یاد نہیں ہوگا۔" شاید یہ حوالہ اس کے نکاح کے دن کا تھا۔ وہ خود پر جبر کر کے قصداً مسکرائی۔

جو بھی تھا وہ بندہ مہذب بھی نظر آ رہا تھا اور خوش اخلاق و ملنسار بھی۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی الٹ ضد۔

"بہت اچھا کیا قارہ! آپ نے کہ آپ یہاں آ گئیں۔ آغا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" قارہ کو دیکھ کر جو حیرت اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی وہ اس پر قابو پا چکا تھا۔

اتنے جنگ و جدل کے بعد یہ لڑکی یہاں کیسے آ گئی۔ یہ شاید وہ بعد میں اکیلے میں اپنی بیوی سے پوچھے گا۔

"حذیفہ کہاں ہے؟" وہ زرینہ سے مخاطب ہوا۔

"سو رہا ہے۔ آپ ناشتہ کریں گے؟"

"نہیں ناشتہ میں کر کے آیا ہوں۔ ہاں چائے اگر تیار ہی ہو تو پلا دو۔ بس کھڑے کھڑے آغا جان کو دیکھنے آیا ہوں۔ دیکھتے ہی پھر آفس بھاگوں گا۔" زرینہ اس کے لیے چائے نکالنے لگی اور وہ ایک مرتبہ پھر قارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"آغا جان آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔ کل بھی جب میں آیا تھا تو سارا وقت وہ مجھ سے آپ ہی کی باتیں کرتے رہے۔"

اس کی نگاہیں زرینہ کی طرح الزام دیتی ہوئی تو نہیں تھیں مگر یہ ضرور بتا رہی تھیں کہ آغا جان کی بیماریوں کا سبب کہیں نہ کہیں وہی ہے۔ آخر یہ سب لوگ اسے یہ کیوں باور کرانا چاہتے ہیں کہ ایک شخص جس سے وہ جب زندگی میں پہلی بار ملی تھی تب بھی اسے بستر پر ہی پڑا دیکھا تھا۔ وہ اگر آج صاحب فراش ہے تو اس کے سبب۔ وہ بہت بری طرح جھنجلائی۔

عباد کو چائے دے کر زرینہ کچن میں چلی گئی۔ وہ اپنا چائے کا کپ کب کا خالی کر چکی تھی مگر مروتاً بیٹھی ہوئی تھی جب کہ عباد اب بڑی سنجیدگی سے ولی کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ وہ کسی ڈاکٹر کے متعلق ولی کو بتا رہا تھا۔ آغا جان کا جو علاج چل رہا ہے وہ تو چل ہی رہا ہے لیکن ایک سیکنڈ opinion (مشورہ) کے لیے اگر کسی دوسرے ماہر ڈاکٹر سے بھی ان کا تفصیلی معائنہ کرا لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ ان کے بیچ بہت دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ ہے یہ ان دونوں کے بات کرنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ زرینہ کچن سے ایک ٹرے لے کر نکلی تھی۔

"زرینہ! آغا جان کا ناشتہ قارہ لے جائے گی۔" ولی اپنی گفتگو کو درمیان میں روک کر زرینہ سے بولا جس کے چہرے پر یک دم ہی ناگواری سے بھرپور تاثر پھیل گیا۔

بھائی کا تحکمیت بھرا انداز دیکھ کر وہ کچھ کہہ تو نہیں سکی مگر اس کا غصہ اور جھنجلاہٹ اس کے چہرے سے صاف

CamScanner

عیاں تھا۔ وہ کب سے یہاں سے اٹھنے کا کوئی بہانہ چاہ رہی تھی اسے یہ موقع جو ملا تو بھاگی کر جھٹ کرسی پر سے اٹھ کر زرینہ کے ہاتھ سے ٹرے لے کر فوراً ڈائننگ روم سے نکل گئی۔ اس جگہ اور اس ماحول سے نکلتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا۔

"آہا آج تو مزے آ گئے محمد بختیار خان کے۔ ڈاکٹر فارہ بہروز خان کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ مل رہا ہے انہیں۔" وہ جاگے ہوئے تھے اسے دیکھتے ہی کمزور سی آواز میں خوش دلی سے بولے۔

ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔ خوشیوں سے بھری مسکراہٹ۔

"یہ مجھے نہیں زرینہ نے بنایا ہے آغا جان!" اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے فوراً تصحیح کی۔

اس نے کل دیکھا تھا کہ وہ خود اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتے اس لیے اٹھ کر بیٹھنے میں انہیں مدد دی۔ وہ بیٹھ چکے اور اس نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی تب انہوں نے اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پر بیٹھنے کو کہا۔

بیٹھنے کے بعد اس نے انہیں دیکھا تو وہ بہت بھرپور سے انداز میں مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ اسے ان کی بوڑھی اور بیمار آنکھیں کسی شرارت سے مسکراتی نظر آئیں۔

"اگر تمہاری شکل بہروز سے نہ ملتی ہوتی تب بھی اسے جاننے والا کوئی بھی شخص تم سے مل کر فوراً بتا دیتا کہ تم بہروز کی بیٹی ہو۔ ضدی، اکھڑ اور چہرے پر یہ اونچی لمبی ناک صرف دکھانے کے لیے نہیں لگی ہوتی بلکہ اصل میں ہر معاملے میں ناک اور انا کے مسئلے حائل ہوتا۔ اب اگر ناشتہ ہم نے نہیں بنایا تو ہم ناشتہ بنانے کا کریڈٹ کیوں لیں؟ چاہے ہمارے اس کریڈٹ لے جانے سے دادا کو خوشی ہی حاصل ہوتی ہے کہ پوتی دادا کے لیے ناشتہ بنا کر لائی ہے ہم تو ٹرے اٹھا کر لانے کا کریڈٹ بھی نہیں لیں گے۔" ان کا کہنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ یک دم ہی جھینپ سی گئی۔

کوئی اس کی کسی حرکت، کسی عادت کو اس طرح جانچ کر اسے ڈیڈی کے مماثل قرار دے سکتا ہے؟

وہ اسے کل سے بڑے مختلف لگ رہے تھے بلکہ وہ اسے ہمیشہ سے مختلف لگ رہے تھے۔ وہ ان سے ان برسوں میں جتنی بار بھی ملی ان سب سے مختلف۔ بیمار نظر آنے کے باوجود وہ بہت خوش بہت مطمئن اور کافی زندہ دل سے لگ رہے تھے۔

"تم نے ناشتہ کر لیا؟" ناشتہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے اس سے پوچھا۔

"تھوڑا سا میرے ساتھ بھی کھا لو۔ یہ بیماروں والا بدمزا سا پرہیزی ناشتہ کیا کرو گی۔ یہ بسکٹ لے لو۔"

انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اسنیکس کا ایک ٹن کا ڈبا اٹھا کر اسے پکڑا دیا جس میں کئی طرح کے اسنیکس موجود تھے۔ وہ بسکٹ کھانے لگی۔

پتا نہیں کب سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب اسے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔

"تم میرے پاس یہاں آ گئیں تمہارا بہت شکریہ بیٹا!" اس نے سر اٹھا کر بے اختیار انہیں دیکھا۔

"کل حیرت میں اتنا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ ممی ناراض ہوئی ہوں گی نا تمہارے یہاں آنے پر؟ اس کی اجازت سے آئی ہو یا اجازت کے بغیر؟" ایک پل کے لیے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔ وہ دلیہ کھاتے بغور

اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں ممی کو بتا کر آئی ہوں آغا جان!" اسی وقت عباد، ولی اور زرینہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"پوتی کو دیکھتے ہی آغا جان تو بالکل تندرست ہو گئے۔" عباد انہیں سلام کرنے کے بعد شوخی و شرارت سے بولا۔

"ہاں میری یہ پوتی میرے لیے میری ملٹی وٹامن کی ٹیبلٹ، کیپسول اور انجکشن سب کچھ ہے۔ اسے دیکھتے ہی جسم کی ساری کمزوری غائب ہو گئی اور بیماری کا پتا نہیں چل رہا کہ کبھی تھی بھی کہ نہیں۔" عباد کے ساتھ ان کی شوخ و شریر گفتگو چل رہی تھی۔

ولی صوفے پر بیٹھا ان دونوں کو دیکھ زیادہ رہا تھا اور بول بہت کم رہا تھا اور زرینہ کل ہی کی طرح آغا جان کو زیادہ بولنے سے منع کرتی، دوا کھلاتی، بی پی دیکھتی بڑی مصروف سی تھی۔ آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھ کر جب عباد جانے کے لیے اٹھا اور اسے رخصت کرنے زرینہ اور ولی بھی ساتھ چلے گئے تب وہ اس سے آہستگی سے بولے۔

"بیٹا! آج کسی وقت ممی کو فون کر لینا۔ ان سے کہنا ناراض نہ ہوں، میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔" اتنی دیر میں اسے لگا تھا کہ جو بات ان کے بیچ ادھوری رہ گئی ہے وہ اسے بھول گئے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔

اسے لگا اب وہ ممی کا ذکر نکالتے ان کے خلاف کچھ کہتے اس کی طلاق کے مسئلے پر کچھ کہیں گے۔ شاید اپنی بیماری کو وجہ بنا کر جذباتی انداز اختیار کر کے اسے اس کا خلع کا مطالبہ واپس لینے کو آمادہ کرنا چاہیں گے۔ اپنی بیماریوں کو ہتھیار کی طرح دوسروں کو جذباتی شکست دینے کے لیے استعمال کرنا تو انہیں بخوبی آتا تھا۔ وہ ایسی کسی بات پر کیا کہے گی وہ یہ سوچ رہی تھی مگر وہ ممی کے اتنے ذکر کے بعد موضوع تبدیل کر چکے تھے۔

وہ اب اس سے یہ کہہ رہے تھے کہ اگر وہ ان کی بیماری کا سن کر ولی کے ساتھ جلدی جلدی میں یہاں آئی اور اپنی ضرورت کی سب چیزیں نہیں لا سکی ہے تو وہ زرینہ سے کہہ دیتے ہیں وہ اسے شاپنگ کرا لائے گی۔ وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ بازار چلی جائیں۔

وہ اس سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ وہ جب تک یہاں ہے بالکل بے تکلفی اور پورے حق کے ساتھ رہے۔ خود کو مہمان نہ سمجھے۔ یہ گھر جتنا ولی اور زرینہ کا ہے اتنا ہی اس کا بھی ہے۔ وہ اس گھر کی مالک ہے نہ کہ مہمان اور اجنبی۔ وہ زندگی میں دوسری بار اس طرح ان کے ساتھ بالکل تنہا بیٹھی تھی۔

پہلی بار تب بیٹھی تھی جب وہ اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروانے گئے تھے۔ اس کے ساتھ فارم لینے کے لیے آئے انہوں نے ولی کو کہیں کسی کام سے بھیج دیا تھا اور پھر جب وہ فارم خرید چکی تب وہ اس سے بولے تھے۔

"ولی تو ابھی آیا نہیں ہے۔ چلو ہم یہیں بیٹھ کر فارم فل کر لیتے ہیں۔" آج وہ کھڑے کئی لوگوں کو داخلے کے فارم بھروا رہی تب میڈیکل کالج میں داخلے کا وہ فارم اسے بے انتہا مشکل اور پیچیدہ لگا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔

آنکھوں پر ریڈنگ گلاسز لگائے انہوں نے اس کا فارم بھروانا شروع کیا تھا تب اپنے نکاح، ڈیڈی کے انتقال اور پھر انہیں بیٹا اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ان کی دو تین بار آمد کے علاوہ یعنی کل چار یا پانچ دفعہ

CamScanner

سے زیادہ وہ ان سے ملی نہیں تھی اور ان کے فارم فل کروانے اور روانی سے انگریزی بولنے پر اسے ان کے تعلیم یافتہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔

تب اسے یہ جان کر زیادہ دکھ ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ اتنے جابر اور دوسروں پر اپنے فیصلے مسلط کر دینے والے انسان ہیں۔ گارجین کے طور پر انہوں نے ہر جگہ اپنا نام لکھوایا تھا اور جہاں کہیں فارم پر سرپرست کے دستخط چاہیے تھے وہاں انہوں نے دستخط بھی کیے تھے۔ انہوں نے ہر جگہ بڑے سنبھل سنبھل کر دستخط کیے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی ایسی لرزش جیسی کسی بہت بیمار اور کمزور ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ بڑے نرم و شیریں لفظوں میں ڈوبے لہجے میں وہ اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔

"میری خواہش تھی کہ تم میڈیکل کی تعلیم پشاور سے حاصل کرتیں' میرے ساتھ میرے پاس رہتیں لیکن خیر جو میرے رب کی مرضی۔"

وہ ان سے ہدایات لیتی فارم فل کر رہی تھی اور وہ یہ دیکھنے کے ساتھ کہ فارم صحیح بھرا جا رہا ہے یا نہیں اس کے ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

"داخلہ تو تمہارا ان شاءاللہ ہو ہی جائے گا۔ اب میڈیکل کالج سے بڑے شاندار انداز میں تمہیں ایم بی بی ایس کر کے نکلنا ہے۔ جس روز تم ڈاکٹر بن جاؤ گی ناں قارہ! بہروز کی روح بہت خوش ہوگی۔ تمہیں ڈاکٹر بنانے کی اسے بہت خواہش تھی۔" تب اس نے بہت چونک کر سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

اس کے اسکول' کالج کا ہر فارم ڈیڈی اسے پاس بٹھا کر بھروایا کرتے تھے وہ اس وقت ان کی شدید کمی محسوس کرتے حد درجہ دل گرفتہ تھی اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھی آ رہے تھے۔ آغا جان کے لبوں سے ڈیڈی کا نام سنتے ہی اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے ان کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آئی اور پتا نہیں کیوں لیکن اس کا دل چاہا وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر ڈیڈی کو یاد کر کے بہت سارے' بہت سارے آنسو بہائے۔

جو اس کے باپ کی موت کا سبب بنا' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رونا چاہتی ہے' اپنی اس عجیب و غریب خواہش کو بمشکل دبا کر خود کو جھڑکتی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر اپنی آنکھوں کی نمی پر قابو پاتے انہوں نے اس سے بھر لیے جانے والے فارم کو دوبارہ چیک کرنے کو کہا تھا اور جب فارم بھر کر وہ ان کے ساتھ بیٹھے سے کھڑی ہوئی تب وہ اس سے بولے تھے۔

"اب ہم بینک چلیں گے۔ وہاں تمہارا اکاؤنٹ کھلوانا ہے جوائنٹ اکاؤنٹ ہوگا تمہارا اولی کے ساتھ لیکن عملاً اسے آپریٹ تم ہی کرو گی۔ چیک بک بھی تمہارے ہی پاس رہے گی۔ یہ مت سمجھنا کہ اس میں موجود پیسے بس صرف تمہاری پڑھائی اور گھر کے روزمرہ کے اخراجات کے لیے ہیں۔ تمہارا جیسے دل چاہے ان پیسوں کو خرچ کرنا۔ ممی سے بھی کہنا وہ ان پیسوں کو استعمال کیا کریں۔ اس کے علاوہ اور بھی پیسے چاہیے ہوں یا کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً مجھے فون کرنا۔ جو بھی چیز چاہیے ہو جو بھی بات ہو جو بھی پریشانی ہو جیسے بہروز سے کہتی تھیں ایسے ہی

مجھ سے کہنا۔ میں نے تمہارے لیے ایک گاڑی بھی بک کروائی ہے۔ گھر پر جو گاڑی ہے' وہ ممی کے استعمال کے لیے چھوڑ دینا۔ تم کالج دوسری گاڑی میں جایا آیا کرنا۔

ممی سے پوچھ لینا اگر وہ مان جائیں تو میں ڈرائیور بھی بھجوا دوں گا۔ ورنہ پھر یہیں سے کوئی ڈرائیور تمہارے لیے تمہاری ممی رکھ لیں گی۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میری قارہ کو کسی ضرورت میں کوئی کمی نہ آئے۔" پھر اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد وہ اسے گھر واپس چھوڑنے آئے تب ممی سے بولے تھے۔

"روحی بیٹا! تم میرے پاس آ کر نہیں رہنا چاہو' رہیں کوئی بات نہیں۔ بس مجھے اتنی اجازت دے دو کہ کبھی کبھار فون پر تم لوگوں سے بات کر لیا کروں۔" ممی نے بعد میں یہ بات تجل ماموں کو بتائی تو وہ بولے۔

"کوئی حرج نہیں قارہ کے ان سے بات کرنے میں۔ قارہ ان کی پوتی ہے اگر وہ اس سے رابطہ رکھنا چاہتے ہیں فون پر بات کرنا چاہتے ہیں تو کرنے دو۔ تم بھلے نہ بات کرو۔"

"رابطہ رکھنے دوں؟ بات کرنے دوں؟ آج ایک دن قارہ ان کے ساتھ گئی تھی تو آ کر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ آغا جان اسے آج بہت مختلف لگے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا وہ زور زبردستی سے قارہ کی شادی کی کوشش کریں گے مگر جو پلان انہوں نے بنایا ہے وہ تو میری سوچ سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ زور زبردستی سے وہ میری بیٹی کا دل تو نہیں جیت سکیں گے ناں؟

اپنا پیسہ کھلے ہاتھوں سے خرچ کر کے اور خوب محبت جتا کر وہ میری بیٹی کا دل اور اس کا اعتماد جیت لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کی طرف داری کرتے میرے مقابل کھڑی ہو سکے۔ جیسے انہوں نے میرے شوہر کا دل مجھ سے پھیر کر اسے مجھ سے دور کیا تھا ایسے ہی وہ میری بیٹی سے کروائیں گے۔ مجھ سے ان کی نفرت اور انتقام کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوگی جب تک وہ میری بیٹی کو میری مخالفت میں نہ کھڑا کر دیں۔" تب ممی کی باتیں چھپ کر سنتی وہ بہت بری طرح شرمندہ ہوئی تھی۔

آغا جان کی لگاوٹ بھری میٹھی میٹھی باتیں اور اس پر خرچ کیا جانے والا ڈھیر سارا پیسہ' وہ کتنی آسانی سے ان کی باتوں میں آنے لگی تھی' یہ تک بھلا کر کہ انہوں نے اکاؤنٹ اس کے نام کھلوا کر ممی کو بے عزت کیا ہے۔

اس کی ان کے ساتھ بالکل تنہا وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی پھر اس کی میڈیکل کی تعلیم کے دوران وہ بھی لاہور آئے نہیں تھے محض فون پر رابطہ رکھتے تھے اس کے رزلٹ کا سن کر جب وہ لاہور ان کے گھر آئے اس کے بعد جب بھی آئے تو ہر بار ان کی ملاقات میں ممی' تجل ماموں' زہرا ممانی' عمیر اور روبل سب موجود ہوا کرتے تھے۔

اتنے برسوں بعد آج وہ زندگی میں دوسری بار ان کے ساتھ یوں اتنے قریب اور تنہا بیٹھی تھی۔ آج وہ اٹھارہ سال کی نا سمجھ کم سن قارہ بہروز خان نہ تھی جو کسی کی بھی چکنی چپڑی میٹھی میٹھی باتوں میں آ جائے مگر پھر بھی اس وقت وہ اپنے دل میں وہی کیفیت پیدا ہوتی محسوس کر رہی تھی جو چھ سال پہلے داخلہ فارم بھرتے وقت اس کے پہلو میں بیٹھ کر کی تھی۔ اس کے دل میں ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے کی خواہش بڑی شدت سے مچل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر آنسوؤں کا ایک سمندر ہے جو بہہ نکلنے کو بے قرار ہے۔ وہ اپنی اس عجیب و غریب اور نہ سمجھ

میں آنے والی کیفیت سے ہراساں ہوئی۔

وہ کیا جادوگر ہیں انہیں کیا لوگوں کو اپنے زیر اثر کرنا 'چٹا' ناکر کرنا آتا ہے۔ وہ کیا کوئی جادوئی اسم پڑھ کر پھونکتے ہیں کہ ان کے مقابل بیٹھا بندہ پھر ان کے سوا ساری دنیا سے لاپروا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ڈیڈی کے ساتھ بھی تو ایسا ہی کوئی جادوئی عمل کیا تھا۔

ڈیڈی یا تو ان سے اتنے ناراض تھے کہ زندگی بھر کبھی ان کا نام تک اپنے لبوں پر نہ لائے اور جب ان سے ملے تو چند ہی دنوں میں اتنے بدل گئے کہ نہ اس کے ڈیڈی رہے نہ ممی کے شوہر بس صرف محمد بختیار خان کے بیٹے رہ گئے۔

کمرے کا دروازہ بڑے دھماکہ خیز انداز میں کھول کر زرمینہ کی بچی اندر آئی تھی چونک کر اسے دیکھتے وہ اپنی عجیب و غریب جذباتی کیفیت سے باہر نکلی۔ جتنے دھماکے سے وہ اندر آئی تھی ایسے ہی اچھلتے انداز میں وہ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر اس کے اور آغا جان کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"فرمائیے بڑی بی کیسی ہیں آپ؟" آغا جان تکیوں سے کمر لگا کر بیڈ پر نیم دراز تھے۔ نیلی جینز جس کے ایک پائنچے پر باریک ڈول بنی ہوئی تھی اس کے اوپر گہرا گلابی رنگ کا خوب موٹا سویٹر اور سر پر سویٹر کا ہم رنگ اونی ٹوپا پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

گول مٹول، خوب صحت مند تو وہ ویسے ہی تھی، سردی کے سبب جا بجا ڈھیر سارے لوازمات پہن رکھے تھے ان سے اور بھی موٹی موٹی لگ رہی تھی۔ عارہ دلچسپی سے اس بچی کو دیکھنے لگی۔ اس کے سرخ سرخ گال ہولے سے کھینچنے کو بھی دل چاہا۔

"اس کی باتیں سنو کبھی۔ ایسی پکی بڈھیوں والی باتیں کرتی ہے۔" آغا جان اسے بتانے لگے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"سلمیٰ عبدالرحمٰن!" اس نے بڑی مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے اپنے سامنے رکھا بسکٹوں کا ڈبا اس کے سامنے کیا اس نے فوراً ہی بے تکلفی سے ایک بسکٹ اٹھالیا۔

"تم بڑی ہو بھائی سے؟"

"نہیں میں اور حذیفہ Twins ہیں۔ وہ کہتا نہیں ہے ناں اس لیے بڑا نہیں ہوتا۔" اس نے فوراً ہی آغا جان کی بات کی تصدیق کرتے پکے پن کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔

"دیکھا۔ کیا کہا تھا میں نے تم سے۔" آغا جان بلند آواز سے قہقہہ لگا کر ہنسے، وہ بھی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نجانے کتنے مہینوں بعد آج وہ یوں ہنسی تھی۔ اپنی ہنسی اسے خود اجنبی بھی لگی اور بہت اچھی بھی مگر اس کی یہ طویل عرصہ بعد کی ہنسی زوئی کو دیکھتے ہی فوراً غائب ہو گئی۔

ڈینم، کاٹن شرٹ، سویٹر والے عام حلیے کے یکسر برعکس اس وقت وہ خاصی فارمل قسم کی تیاری میں تھا۔

دائیں ہاتھ میں بریف کیس پکڑے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کے منظر کو دیکھ کر اگر اسے کوئی حیرت یا تعجب ہوا بھی تھا تب بھی اس نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے چہرے پر سے مسکراہٹ کا ہر نشان ہٹا کر سنجیدگی طاری کر لی۔

وہ اس پر اور سلمیٰ پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا آغا جان کے پاس آ گیا اور ان کے قریب جھک کر بولا۔

"آغا جان! میں جا رہا ہوں۔" اس نے ان کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوما۔ وہ بڑی محبت اور چاہت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ان کی طرف دیکھتے ہر بار اس کے چہرے کا بے تاثر اور خشک سا انداز گہری محبت میں بدل جاتا تھا۔ وہ اس سے اور اپنی بھانجی سے مکمل طور پر لاتعلق آغا جان کی طرف متوجہ تھا۔

"جاؤ بیٹا!" انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

"اور میری فکر میں زیادہ ہلکان ہونے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خوب مزے میں ہوں، دو دو ڈاکٹرز میری خدمت کرنے کو موجود ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے اس سے بولے۔

وہ جواباً ہنسا نہیں بلکہ سنجیدگی سے سر ہلاتا ان کے پاس سے ہٹ گیا۔

وہ جس تیز رفتاری اور عجلت میں اندر آیا تھا اسی سے فوراً چلا بھی گیا۔

"بہت فکر رہتی ہے اسے میری۔ آفس چلا بھی جائے تو پیچھے دس دس بار فون کر کے میری خیریت پوچھے گا۔ فون پر میری ہلکی سی کھانسی کی آواز بھی سن لے تو سب کام چھوڑ کر بھاگا بھاگا گھر آ جائے گا۔" اگر یہ جملے اس نیت سے کہے جا رہے تھے کہ زوئی صاحب خان کے لیے اس کے دل میں کوئی سوفٹ کارنر پیدا ہو جائے گا تو یہ ایک بے کار اور بے مقصد کوشش تھی۔

"بہت چھوٹی عمر میں بڑی بھاری ذمہ داریاں آ پڑی تھیں میرے بچے پر۔ نوجوانی کا بے فکری کا زمانہ گزارنے کا سوچ بھی نہ سکا وقت سے پہلے بڑے بھاری بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانا پڑ گئیں اسے۔" وہ اپنے بچے کا ذکر ابھی ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان کے ہنستے مسکراتے چہرے پر ایک دم ہی اداسیاں پھیل گئی تھیں۔

"بائیس سال کی عمر اتنی بھاری ذمہ داریاں اٹھانے کی تو نہیں ہوتی۔ میں تو پہلے بھی کاروباری اور زمینوں کے معاملات کم ہی دیکھا کرتا تھا، سب ذمہ داریاں صاحب نے اٹھائی ہوئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر چلا گیا یا گھر پر بیٹھے بیٹھے ہی زمینوں کا حساب کتاب دیکھ لیا مگر صاحب نے یوں اچانک جا کر تو میری کمر ہی توڑ دی۔ کوئی کام سنبھالنا تو دور میں تو خود کو سنبھالنے لائق بھی نہیں رہا۔

پھر زوئی نے صاحب کے سوئم والے دن قبرستان سے آتے مجھ سے کہا تھا۔ "آغا جان! آپ کا ایک بیٹا چلا گیا تو کیا ہوا دوسرا بیٹا تو زندہ ہے۔" اس نے مجھ سے یہاں سارا کاروبار اور سارا کام سنبھالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ولی اور زرمینہ کو سینے سے لگاتے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ان بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ "آج سے میں سمجھوں گا میری صرف ایک بیٹی نہیں میرے تین بچے ہیں۔" اور ہوا کیا! مجھ سے اتنے

وعدے کرنے والا وہ کسی بھی وعدے کو نبھانے کے لیے زندہ ہی نہ رہا۔" اپنی آنکھوں کی نمی اس سے چھپانے کے لیے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک دو منٹ تک خاموش ہی رہے۔

حنا کھلی کھڑکی کو بند کر کے جا چکی تھی۔ کمرے میں اس وقت صرف وہ دونوں ہی تھے۔

"آمنہ اور صہیب کی زندگی ہی میں ولی امریکہ گیا ہوا تھا پڑھنے۔ وہ وہاں سے گریجویشن کر چکا تھا لا اسکول میں اس کا پہلا سال اختتام پر تھا جب صہیب کا انتقال ہوا اور وہ سب چھوڑ چھاڑ کر پاکستان واپس آ گیا۔

صہیب کے بعد بہروز بھی نہ رہا تو وہ اس فکر میں واپس گیا ہی نہیں کہ یہاں بزنس کون سنبھالے گا زمینوں کے معاملات کون دیکھے گا۔ بعد میں میں نے بہت کہا کہ بچے یہاں سب کام ہوتے رہیں گے تم اپنی پڑھائی پوری کرو۔ مگر وہ واپس جانے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میرے بہت کہنے سننے اور ناراض ہونے پر وہاں گیا بھی تو بس اپنا لا میں گریجویشن مکمل کر کے واپس آ گیا۔

"اسے Taxation میں ماسٹرز کے لیے ورجینیا لا اسکول سے اسکالرشپ آفر ہوئی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ایسے مواقع زندگی میں روز روز نہیں ملتے Taxlawyer بننے کا Taxation میں اعلیٰ ڈگری لینا تو تمہارا خواب تھا کیوں اپنے کیریئر کو اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہو مگر اس نے میری ایک نہ مانی۔ کہنے لگا آپ کی خاطر میں نے اپنا لا میں گریجویشن پورا کر لیا بس اب مجھے یہاں سے کہیں جانے کے لیے مجبور نہ کریں۔"

اسے یاد تھا کہ جب وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی تب اس سے آغا جان نے فون پر ولی کے امریکہ اس کی ادھوری تعلیم مکمل کرنے جانے کا تذکرہ کیا تھا اور دو سال بعد ایک اور فون کال میں یہ ذکر بھی کیا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم اور شاندار کیریئر کے بہترین مواقع چھوڑ کر وہ پاکستان واپس آ گیا ہے۔

وہ اس ذکر سے نہ تب متاثر ہوئی تھی نہ اب۔ بطور Tax Lawyer شاندار کیریئر، ورجینیا لا اسکول کی اسکالرشپ، وال اسٹریٹ کے دلکش بلاوے، ڈالرز کی خیرہ کن چمک دمک، عروج کامیابیاں یہ سب یہاں اس کروڑوں کی جائیداد سے زیادہ پرکشش تو نہیں ہو سکتے تھے ان سب کی قربانی دے کر ٹھکرا کر انہیں چھوڑ کر واپس پاکستان آ کر اس نے کس پر احسان کیا تھا؟

جس کروڑوں کی جائیداد کا وہ تن تنہا وارث بنا ہوا تھا اس کی ذمہ داریاں سنبھال کر، دیکھ بھال کر کے وہ کس پر احسان کر رہا تھا۔ کاروبار، زمینوں اور باغات کی دیکھ بھال اور تمام امور کی ذمہ داریاں سنبھال کر بوڑھے دادا کا دل بھی جیت لیا سب کچھ اپنے نام بھی کروا لیا اور آپ کی خاطر کیریئر چھوڑ آیا ہوں کے احسان تلے انہیں دبا بھی لیا۔ وہ ان کا دست راست تھا۔ آغا جان اگر بادشاہ تھے تو وہ ان کا وہ ولی عہد جس نے ان کی زندگی ہی میں سارے اختیارات اپنے نام کروا رکھے تھے۔ اسے دولت، جائیداد سے کوئی مطلب غرض نہ تھی؟

اس کے علم میں تھا کہ آغا جان نے اپنی وصیت تیار کی ہے یا نہیں اور باقاعدہ کوئی چیز کسی کے نام کی ہے یا نہیں مگر ولی صہیب خان کو یہ قانونی حق ضرور دے رکھا ہے کہ جہاں جہاں محمد بختیار خان کے دستخط ہو سکتے ہیں وہاں وہاں ولی صہیب خان کے دستخط سے بھی کام ہو سکتا ہے۔

ان کا ہر کاروباری معاملہ، جائیداد سے متعلق امور روپے پیسے کا لین دین اور تمام کے تمام بینک اکاؤنٹس میں ان کے ساتھ جو دوسرے دستخط ہو سکتے تھے چل سکتے تھے اور چل رہے تھے وہ صرف اور صرف ولی صہیب خان کے تھے۔ اب وہ اس سے اس بات پر کیونکر متاثر ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے قیمتی تعلیمی سال اس کاروبار، جس کا وہ مالک و مختار بنا بیٹھا ہے کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ضائع کیے۔

اس کی ان قربانیوں کو وہ قربانیاں اس وقت مانتی جب وہ اپنا کیریئر اور کامیابیاں چھوڑ کر ایک بے تحاشا امیر کبیر دادا کے لیے نہیں بلکہ ایک غریب، بے آسرا، بے سہارا دادا کے لیے واپس آیا ہوتا۔

"آغا جان! آج لنچ میں کیا لیں گے آپ؟" زرینہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"پلاؤ اور بیف تکہ، خوب سارے گھی میں پکا کڑاہی گوشت، خوب تیز مسالوں اور نمک والے چپلی کباب اور میٹھے میں دیسی گھی کی خوشبوؤں سے مہکتا اخروٹ کا حلوہ۔"

انہوں نے بڑی روانی سے اپنا لنچ کا مینیو اس کے گوش گزار کیا اور ساتھ ہی شرارتی نگاہوں سے زرینہ کو دیکھا ایسے جیسے جانتے تھے وہ اس بدپرہیزی کا سن کر ہی اپنا دل تھام لے گی۔

"ہائے ہائے کیا دن تھے جب بختیار خان ایسے مزے مزے کے کھانے کھایا کرتے تھے۔ اب تو نصیب میں بدمزا پرہیزی کھانے لکھ دیے گئے ہیں۔" شرارتی مسکان ہونٹوں پر لیے انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

"تو زرینہ عبدالرحمن! قصہ کچھ یوں ہے کہ آپ جو مرضی ہو اور جو دل چاہے کھلا دیں لنچ بھی اور ڈنر کے ہر سالن ایک سا ہی لگتا ہے۔" زرینہ شاید ان کے ان کمنٹس پر کوئی بے تکلفانہ تبصرہ کرنا چاہتی تھی اس نے لب کھولے مگر پھر اس کی موجودگی کے سبب سنجیدہ ہی کھڑی رہی۔

"میرے لیے کچھ بھی بنا لو بیٹا! ہاں صدف سے کہنا لنچ میں کوئی نہ کوئی چائنیز ڈش ضرور بنا لے۔ یہ جو میری پوتی صاحبہ ہیں نا انہیں پھیکے سیٹھے بدمزا چینی کھانے بہت پسند ہیں۔" وہ اس کی طرف اشارہ کرتے زرینہ سے بولے وہ فارہ کی طرف دیکھے بغیر محض سر ہلا کر کمرے سے فوراً واپس چلی گئی۔

اس نے انہیں اپنی پسند ناپسند تو کبھی نہیں بتائی تھی۔ ان سے اس کی فون پر ہمیشہ بہت نپی تلی اور پر تکلف گفتگو ہوتی تھی اور اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے کبھی انہیں کھانے پینے کی اپنی پسند ناپسند سے آگاہ کیا ہو۔

"مجھے بہروز نے بتایا تھا۔ صہیب کے انتقال پر جب تم اور روبی بھی یہاں آئی تھیں پھر اس رات بہروز نے مجھے تمہاری بہت باتیں بتائی تھیں۔" وہ اس کی حیرت بھانپتے فوراً بولے۔

وہ اس دن کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے نہ کچھ بولی اور نہ خود کو مزید کچھ سوچنے دیا۔

"بیٹا! زرینہ کے کسی رویے کا برا مت ماننا۔ تھوڑی جذباتی اور غصے کی تیز ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ میری دونوں کی دونوں پوتیاں ایسی ہی ہیں۔ ضدی، جذباتی، غصے کی تیز، تھوڑی سی مغرور مگر دل کی بہت اچھی۔"

انہوں نے شاید یہ جان لیا تھا کہ اس وقت اس گھر میں موجود یہ دو لڑکیاں ایک دوسرے کے خلاف شدید

نفرت اور عداوت رکھتی ہیں اور ان کے تعلقات رسم دنیا کا لحاظ رکھتے سرسری' رسمی یا اوپری انداز میں بھی ہرگز اچھے نہیں۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ مگر دل میں اس نے یہ ضرور سوچا کہ جس دوسری پوتی کا ذکر ہے وہ وہ خود ہے اور اسے زندگی میں پہلی بار کسی نے ضدی اور جذباتی قرار دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔

اپنے متعلق اس نے اچھے بھی اور برے بھی کئی طرح کے کمنٹس سن رکھے تھے مگر ضدی اور جذباتی اسے کسی نے پہلی بار کہا تھا۔ اس کے دل کی اچھائیاں بھی شاید کسی نے پہلی بار دریافت کی تھیں۔ اس کے متعلق سب سے اچھے کمنٹس معیز دیا کرتا تھا۔ وہ اسے سادہ' مخلص' خوش اخلاق' ذہین اور صاف گو قرار دیا کرتا تھا۔ ان میں ذہین اور مخلص وہ تھی۔ سادہ والی خوبی ذرا مشکوک سی تھی اور خوش اخلاق تو وہ ہرگز نہیں تھی۔

یہ وہ خوبی تھی جو معیز اس میں زبردستی دریافت کر کے لاتا تھا۔ وہ خوش اخلاق صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی جو اسے اچھے لگتے تھے اور جو اچھے نہ لگتے پھر وہ مروتاً رسماً اخلاقاً مصلحتاً یا دنیاداری کے لیے بھی ان سے اخلاق نہ برتا کرتی تھی۔ اچھے لفظوں میں اسے صاف گو' دل کی صاف' جو دل میں وہی چہرے اور زبان پر' منافقت سے عاری وغیرہ کہا جا سکتا تھا اور برے الفاظ میں بدلحاظ' منہ پھٹ' بداخلاق' بے مروت اور بدتمیز۔

اس خوبی کے ساتھ وہ نڈر اور بے خوف بھی تھی' جو اس کے دل میں ہے وہ زبان پر لاتے کبھی ہچکچاتی نہیں تھی۔ لوگ مصلحت سے کام لیتے ہیں اور وہ ہر بات صاف صاف لوگوں کے منہ پر بول کر دوست کم اور دشمن زیادہ بنالیا کرتی تھی۔ اسے احساس ہوا آغا جان' زرمینہ اور اس کی عادات کو ایک سا بالکل درست قرار دے رہے تھے۔ اس گھر میں وہ شاید کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی تھی مگر یہ جرأت صرف زرمینہ عبادالرحمٰن ہی میں ہے کہ وہ منہ پر اس سے نفرت اور بیگانگی کا اظہار کر سکے۔ جو اسے پسند نہیں' وہ اس کے ساتھ مصلحتاً بھی کیوں اخلاق برتے۔ جو اس گھر میں اس کے ساتھ سب سے برا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا وہ اس کے متعلق پہلی مرتبہ کچھ غلط سوچ رہی تھی۔

اور جو بھی ہے زرمینہ عبادالرحمٰن منافق تو نہیں۔

"ویسے تو ضد' غصہ' غرور اور اکڑ ہماری خاندانی صفات ہیں مگر تم دونوں بہنوں میں یہ ذرا زیادہ ہی شدت سے پائی جاتی ہیں۔ نوجوانی میں بھی ایسا ہی تھا' بہروز بھی ایسا ہی تھا' ہاں صہیب تھوڑا مختلف تھا اس میں لحاظ مروت اخلاق' تدبر اور معاملہ فہمی ذرا زیادہ تھی۔ وہ اپنی ماں پر پڑا تھا اور بہروز مجھ پر۔ تمہاری دادی' صہیب اور ولی ایک طرح کے اور میں' بہروز' تم اور زرمینہ ایک طرح کے۔ خون کا اثر ہے۔ تم دونوں بہنوں کا ان خوبیوں میں نہ کمال ہے نہ قصور۔" آغا جان بڑے پرلطف سے انداز میں مزید گویا ہوئے۔

زرمینہ کے لیے بہن کا لفظ اس نے ذرا مشکلوں سے ہضم کیا جبکہ تمام زمانہ صفات اور عادات کو وہ ڈیڈی کے خاندان کے ساتھ جوڑتی اور ان سب میں بکثرت موجود قرار دے رہی تھی' آغا جان بڑے اطمینان سے انہیں نظریہ قبول کرتے یہ بتا رہے تھے کہ وہ بھی ان ہی خاندانی و موروثی صفات کی مالک ہے۔

لنچ تک وہ یونہی ان کے ساتھ بیٹھی رہی۔ وہ بولتے بولتے تھکنے لگے تو بیڈ پر لیٹتے اس کے ہاتھ میں اخبار پکڑا دیا کہ انہیں پڑھ کر سنائے۔

"مار دھاڑ اور خون خرابے کی خبریں نہ سنانا' کھیلوں کی خبریں سنا دو یا شوبزنس کے چٹپٹے قصے سنا دو۔" وہ لوگ دوپہر کا کھانا شروع کرنے والے تھے کہ ولی کا فون آ گیا۔ وہ آغا جان سے بات کر رہا تھا۔

"وکیل صاحب! تسلی رکھئے۔ ایک ڈاکٹر میرے دائیں بیٹھی ہے اور ایک بائیں۔" ولی نے نجانے کیا کہا تھا جس پر وہ ہنستے ہوئے بولے تھے۔

"اس مہنگائی کے دور میں لوگوں کو ایک ڈاکٹر بمشکل دستیاب ہوتا ہے میرے پاس تو دو دو ہیں اور وہ بھی تھوڑی بہت دیر کے لیے نہیں بلکہ راؤنڈ دا کلاک۔" اسے کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے خوش اخلاق اور خوش مزاج ہیں۔

"خبردار جو میری پوتیوں کی قابلیت پر کوئی شبہ کیا ہو تو۔ آپ نے پریکٹس ہی کی اگر کرتے تو کتنے بڑے وکیل ثابت ہوتے' یہ ایک زمانہ جانتا ہے اور میری پوتیاں' ذہین' قابل' لائق' فائق۔"

سامنے بیٹھی زرمینہ بیٹے کے منہ میں نوالے ٹھونسنے میں مصروف تھی' مگر اس کے چہرے پر پہلے جیسے طنزیہ تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنا ذکر مسلسل اور متواتر اس کے ساتھ لفظ پوتیوں کی صورت ہونے پر ہرگز ہرگز خوش نہیں ہے۔

کل بھی اور آج بھی اس نے زرمینہ کو جس ماہرانہ سے انداز میں آغا جان کا بی پی چیک کرتے' نبض دیکھتے' دوا دیتے اور خالص ڈاکٹرانہ انداز میں نیند ٹھیک آئی' بھوک ٹھیک لگی وغیرہ وغیرہ جیسے سوالات کرتے سنا تھا' ان سے اسے ایسا ہی کچھ لگا تھا۔

اسے یاد آیا آغا جان نے ایک آدھ بار زرمینہ کی مشکل پڑھائی اور کالج جانے آنے کا ذکر کیا تو تھا مگر اس نے دھیان دے کر سنا نہیں تھا۔ شادی کے بعد میڈیکل کی طرف پڑھائی اور ساتھ میں بچوں کی ذمہ داری بھی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اس ہم عمر کزن کو ایک اور تعریفی سرٹیفکیٹ عطا کرنا پڑا۔ دشمن میں بھی اگر کوئی خوبی ہے تو اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ یہی بڑائی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ فون پر ولی سے مختصر سی گفتگو کرنے کے بعد آغا جان بھی کھانے میں شریک ہو گئے تھے۔

وہ بیڈ پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور فارہ' زرمینہ اور دونوں بچے بھی وہیں قریب ہی کل رات کی طرح صوفے اور میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد زرمینہ نے انہیں زبردستی لٹا دیا تھا اور ان کے مزید گفتگو پر پابندی عائد کر دی تھی۔ فارہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ معیز کو فون کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کہ وہ دونوں بچے بے تکلفی سے دروازہ کھولتے اس کے کمرے میں آ گئے۔

تین چار سال کے بچوں کو آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے اسے مسکراہٹ چہرے پر لا کر ان کا استقبال کرنا پڑا۔ سب ہی بچے اتنی تجسس فطرت کے مالک ہوتے ہیں یا یہی شیرلاک ہومز کے نانی' دادا تھے۔ وہ طے نہیں کر پائی۔ بہرحال وہ اپنے نانا کے گھر آئی اس نئی مہمان سے تعارف چاہتے تھے۔

ان کی اماں کو پتا چل جائے کہ ان کے بچے دشمن کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں تو غالباً زمین آسمان ایک

CamScanner

کریں گی۔ تعارف کا مرحلہ تو چند سیکنڈز میں نمٹ گیا تھا۔ وہ کس کنڈر گارٹن میں پڑھ رہے ہیں یہ بھی فوراً بتا دیا گیا تھا۔ اب بھائی صاحب اسے کمانڈر انکل ڈرائیو اور ساورڈ رائی کے قصے سنا رہے تھے اور بہن صاحبہ پاور پف گرلز سے بلوسم زیادہ اچھی ہے یا بٹل سمجھانے میں مصروف تھیں۔

وہ سب لطف لیتی بھول کر اس بیگانہ ماحول کو انجوائے کر رہی تھی۔

***

"دل کی بیماری بڑی وفادار ہے ایک بار زندگی میں شامل ہو جائے پھر عمر بھر ساتھ نبھاتی ہے اور ہم ٹھہرے وفاداری کی قدر کرنے والے سو ناز اٹھا رہے ہیں اس کے۔" آغا جان کے کمرے میں داخل ہوتے اس نے سنا۔ وہ کسی سے خاصے پر لطف سے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

سردیوں کے دن چھوٹے ہوتے تھے ایسے میں شام ہونے کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ خاصی تیزی میں دن گزر رہا اور شام ڈھلنے لگی تھی۔ مغرب سے قبل انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا اور اب وہ وہاں آئی تو زرمینہ اور ولی تو موجود تھے ہی، عمران کے ساتھ سامنے صوفے پر ایک سرخ و سفید خاصی صحت مند سی خاتون بیٹھی نظر آئی تھیں۔

ان کے عظیم الشان جثے کے برابر زرمینہ ہمیشہ سے بھی زیادہ دھان پان اور دبلی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں بالکل برابر بیٹھی تھیں جبکہ ولی ذرا الگ رکھے سنگل صوفے پر بیٹھا تھا اور آغا جان بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ولی شاید ابھی ابھی آیا تھا اس کے لباس میں سے کوٹ اور ٹائی غائب ہو چکے تھے مگر تھا وہ صبح والے ہی لباس میں۔

"آؤ بیٹا۔" اسے دروازے پر رکتا دیکھ کر آغا جان نے فوراً کہا۔ "ان سے ملو کسی زمانے میں یہ میری بھتیجی عاشی ہوا کرتی تھی۔ اب زرمینہ کی ساس سمر عائشہ خٹک ہیں۔"

تعارف کے اس انداز پر ہکا بکا سی ہوتے اس نے سامنے بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا جو آغا جان کی بات کا برا مانے بغیر با آواز بلند قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔ ان کی صحت کی طرح قہقہہ بھی نہایت شاندار اور بلند و بالا ہی تھا۔

"جب اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی یہ اپنی ساس کی برائیاں اور چغلیاں مجھ سے آ کر کیا کرتی تھی۔ اب اس کی برائیاں زرمینہ مجھ سے کرتی ہے۔ یہ ساسیں بہوؤں کو اتنا تنگ کرتی کیوں ہیں کہ پھر وہ بے چاریاں اپنے چاچا اور دادا کے پاس شکایتیں لے کے پہنچیں۔" زرمینہ ان جملوں پر مسکرا رہی تھی جبکہ ولی اتنا سنجیدہ تھا جیسے آغا جان امریکہ ایران پر حملہ کرنے والا ہے یا نہیں پر اظہار خیال کر رہے ہوں۔

فارہ احمقوں کی طرح گردن اٹھائے کبھی آغا جان کو اور کبھی زرمینہ سے چپٹے ان خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

"ہم ساس بہو لاکھ واویلا کریں آپ کی ہر سازش ان شاء اللہ ہم دونوں مل کر ناکام بنا دیں گے۔" انہوں نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ زرمینہ کے گرد ڈال کر اسے اپنے مزید قریب کر لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا! یہ ہمارے چچا محترم بے چارے عادت سے مجبور ہیں۔ تم حیران مت ہو۔ اور سناؤ کیسی ہو؟ پشاور کیسا لگ رہا ہے؟ یہاں دل لگا؟" وہ اب اس کی طرف متوجہ ایک سانس میں کئی سوال کر گئی تھیں۔

اگر زرمینہ کی بد اخلاقی موروثی و خاندانی تھی تو عباد کی خوش اخلاقی بھی موروثی و خاندانی ہی ہے اسے اس کی

والدہ سے مل کر چند منٹوں ہی میں اندازہ ہو گیا۔

گو وہ آغا جان کے برابر بیڈ پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ سلام کرنے اور ان کی خیریت پوچھنے والے سوال کا جواب دینے کے بعد وہ پھر ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ مگر ان کی اور آغا جان کی مسلسل ہوتی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ سے ان کی خوش اخلاقی اور بہو کی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا پتا دے رہی تھی۔

وہ آغا جان کی خیریت دریافت کرنے اور عیادت کرنے آئی ہوئی تھیں مگر آغا جان انہیں مسلسل یہ کہہ کر چھیڑ رہے تھے کہ عیادت اور خیریت تو محض بہانے ہیں، درحقیقت تو وہ اپنے پوتی پوتا سے ملنے آئی ہیں جو ان دنوں اپنی ننھیال میں رہ رہے ہیں۔ اکیلے آغا جان کے ساتھ بیٹھنے کی بات دوسری تھی مگر ان کی فیملی کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھنا اسے جتنا ان ایزی اور آکورڈ لگ سکتا تھا لگ رہا تھا۔ وہ چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ مگر بغور اس کا مشاہدہ تو ضرور کر رہی ہوں گی۔

اچھا تو یہ ہے وہ ملکہ حسن جو کروڑوں کی جائیداد کے وارث ولی صاحب خان کو رد کر کے خلع کا مطالبہ اور جائیداد میں اپنا حق مانگ رہی ہے۔"

ان کی تواضع کافی، ڈرنکس، سینڈوچز وغیرہ سے کی گئی تھی۔ انہیں کھانے کے لیے بھی بے حد اصرار روکا جا رہا تھا مگر وہ معذرت کرتی اٹھ گئیں۔ آغا جان کی دوا اور آرام کا ٹائم نہ ہو اس لیے کھانا کچھ دیر بعد ہی لگا لیا گیا تھا۔

کل کی طرح صوفے پر بیٹھ کر آغا جان کے کمرے ہی میں۔ زرمینہ فارہ کو نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے ہوئے۔ آج کل جیسی بالکل خاموش رہنے کی پالیسی ترک کر کے آغا جان اور ولی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

آج آغا جان کی خیریت دریافت کرنے کس کس کا فون آیا اور پھر اس کس کس سے جڑی کبھی پہلے کی کوئی بات، کوئی واقعہ۔ ولی صرف سر ہلانے یا ہنسنے کا تاثر دیتے کھانا کھا رہا تھا مگر آغا جان ان تمام باتوں میں خوب دلچسپی لے رہے تھے۔

"بیٹا! ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں کچھ دیر فارہ کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" کھانے اور دوا کے بیچ مناسب وقفہ رکھتے جب زرمینہ انہیں دوا دے چکی اور کل کی طرح فوجیوں والے اسٹائل میں انہیں سلانے اور اسے یہاں سے بھگانے کا غیر اعلانیہ انداز اختیار کرنا چاہا تب آغا جان زرمینہ سے بولے۔

وہ کوئی اختلافی بات کہنے والی تھی وہ اپنے پیارے دادا کو ایک دشمن کے ساتھ رات میں اکیلا چھوڑنے کے حق میں نہیں نظر آ رہی تھی مگر اس کے کسی اختلافی فقرے اور اعتراض سے پہلے ولی صوفے پر سے اٹھتا ہوا تحکمیت سے بولا۔

"چلو زرمینہ! اعتنا کو نیند آ رہی ہے۔ اسے جا کر سلاؤ۔"

"لیکن لالہ۔" وہ دونوں بھائی بہن بالکل قریب قریب کھڑے تھے اور وہ ہولے سے بولے سے یہ لفظ سنائی دی تھی۔

ولی نے جواباً بغیر کچھ کہے صرف اسے گھورا تھا۔ کسی قدر سخت اور غصے بھری نگاہوں سے۔

"جو میں نے کہا ہے وہ کرو لیکن اگر اور مگر کیے بغیر۔"

عورتوں کو دبا کر رکھنا ان پر حکم چلانا تو اس خاندان کے مردوں کی فطرت ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ لڑکی اس کے مخالفت میں کھڑی تھی پھر بھی فارہ کو ولی کا حکمیہ انداز سخت زہر لگا۔

زرینہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی تھی اور اس کے پیچھے حذیفہ اور حسن کو ساتھ لیے ولی۔ کمرے میں صرف وہ اور آغا جان رہ گئے تب اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ طنز' نفرت' حقارت' دشمنی' پراسراریت' کسی بھی انداز سے نہیں دیکھتے' اس گھر میں کم از کم ان کے ساتھ اکیلے بیٹھ کر کھل کر سانس لی جا سکتی ہے' بغیر کوئی دباؤ اور پریشانی محسوس کیے۔ وہ پہلے فقط بیڈ پر ان کے برابر بیٹھی تھی مگر اس نے ٹانگیں نیچے لٹکا رکھی تھیں۔

"اوپر ہو کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔" وہ بیڈ پر نیم دراز تھے' وہ پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھی تو وہ مزید بولے۔

"اتنی دور نہیں۔ میرے پاس آ کر بیٹھو۔ آنکھیں کمزور ہیں۔ اتنی دور سے تو تم مجھے صاف نظر بھی نہیں آ رہیں۔" وہ ان کے مزید قریب ہو گئی تو انہوں نے خود پر پڑا کمبل اس پر ڈال دیا۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے بالکل نزدیک کر لیا۔

ہو رہا تھا۔

ایک ہاتھ انہوں نے اس کی کمر کے گرد رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ہولے ہولے اس کے چہرے کے نقوش پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"فارہ! تمہاری شکل بالکل بہروز جیسی ہے۔ ویسی ہی لمبی ستواں ناک' ویسی ہی چوڑی پیشانی اور یہ جو

وہ ان کے شانے پر سر رکھنا نہیں چاہتی تھی مگر انہوں نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ ان کے اتنے قریب تھی' وہ ان کے بازوؤں کے حصار میں تھی' وہ ان کی خوشبو محسوس کر رہی تھی' وہ ان سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ ہٹ نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے اسے زبردستی پکڑا ہوا نہیں تھا۔

ان کے پیار اور کمزور وجود سے وہ ایک سیکنڈ میں معمولی سی بھی طاقت استعمال کیے بغیر دور ہٹ سکتی تھی' مگر وہ ہٹ نہیں رہی تھی۔

اگر وہ جادوگر تھے تو ایک جادوئی حصار اس کے گرد قائم کر چکے تھے۔ رات کی اس خاموشی اور تنہائی میں صرف نائٹ بلب اور لیمپ کی مدھم مدھم سی روشنی میں یہ جادوئی دائرہ اسے زیادہ ہی طاقت ور اور بااثر محسوس تمہاری ٹھوڑی کا ڈمپل ہے' بس یہ تو بالکل ہی اس کی طرح ہے۔" انہوں نے اس کے ڈمپل پر اپنی شہادت کی انگلی رکھی ہوئی تھی۔

"تمہارے پاس سے بہروز کی خوشبو آتی ہے فارہ! ایسا لگتا ہے وہ زندہ ہو کر پھر میرے پاس آ گیا ہے۔"

اسے لگا وہ رو رہے ہیں۔ انہیں اس کے پاس سے ڈیڈی کی خوشبو آ رہی تھی اور اسے ان کے پاس سے کس کی خوشبو آ رہی تھی؟ ان دو لوگوں کو جو باہم ایک کرتا تھا وہ ان دونوں کے وجود میں اپنی خوشبو رکھتا تھا۔ ان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتا تھا۔

ایک کا بیٹا' ایک کا باپ' اسے پتا ہی نہیں تھا وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گرتے ان کے کرتے کو نم کر رہے ہیں۔ ان کے شانے پر سے سر ہٹا کر اس نے ان کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔

رات اگر انسان کو کمزور کم ہمت اور بزدل بناتی ہے اس سے جذباتی اور احمقانہ حرکتیں کرواتی ہے تو ایسا ہی ٹھیک

"فارہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور کسی بات کا نہیں بس صرف اس کا یقین کر لو بیٹا! تم میرے بیٹے کی واحد نشانی ہو' میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ بے شک میرے پاس مت رہو' مجھ سے ملو بھی نہیں مگر صرف میری محبت کا یقین کر لو اگر تمہیں اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکا تو سکون سے مر بھی نہیں سکوں گا' میرے لیے موت کو آسان کر دینا فارہ۔" وہ بہت آہستہ آہستہ آواز میں بول رہے تھے' ان کا لہجہ ان کے آنسوؤں کا پتا دے رہا تھا۔

"بیٹا! میں تم سے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔"

اس کے آنسو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے بہنے لگے تھے' اس کی ٹھوڑی پر سے انگلی ہٹا کر وہ دوبارہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگے تھے۔ وہ اس کے آنسو صاف کر رہے تھے' وہ اس طرح اس کے چہرے کے ایک ایک نقوش کو محسوس کیے جا رہے تھے۔

اسے اپنے چہرے پر گردش کرتی ان کمزور بوڑھی انگلیوں کا لمس' ان کے وجود سے اٹھتی ایک مانوس سی خوشبو۔ وہ اس پل صرف اس قربت' اس محبت کی گرمی کو محسوس کر رہی تھی۔ حقیقت اور خواب سب آپس میں گڈمڈ سے تھے۔

جو حقیقت تھی۔ وہ خواب جیسی تھی اور جو خواب تھا وہ حقیقت جیسا۔ پھولوں کا ایک کنج تھا' اتنے پھول' اتنے پھول۔ وہ جگہ پھولوں سے بھری پڑی تھی۔ قدم جہاں پڑیں راہوں میں پھول ہی پھول دکھائی دیکھا اور پھولوں کے اس کنج میں اسے ڈیڈی نظر آئے تھے۔ بہت خوش' مسکراتے ہوئے "ڈیڈی" کتنے دنوں بعد آج اس نے دیکھا ہے۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی ان کے پاس آئی۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ مسکرائے کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

وہ اسے پیار کر رہے تھے۔ کبھی اس کی پیشانی چومتے' کبھی رخسار' کبھی ہاتھ۔ وہ جگہ دنیا نہیں تھی۔ وہ جنت تھی۔ جنت ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ ڈیڈی کے سینے پر سر رکھے' ان کے بازوؤں کو اپنے گرد محسوس کرتے وہ ان سے یہ کہہ ہی نہیں پائی کہ میرے ساتھ واپس ہماری دنیا میں چلیں۔ ایسی جنت چھوڑ کر کوئی واپس جانا چاہتا ہی نہیں بھی کوئی احساس تھا' کوئی مدھم سرگوشی جو اس کے گرد ہو رہی تھی۔ وہ کسمسائی' اس نے کروٹ بدلی۔ وہ بازو کہاں گئے جو اس کے گرد تھے' اسے اپنی پناہوں میں لیے' بے چین ہو کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں روشنی تھی' کسی ٹیوب لائٹ' بلب یا فانوس کی نہیں' دن کے اجالے کی۔ آغا جان کی کمر کے گرد ہاتھ رکھ کر انہیں سہارا دے کر ولی باتھ روم کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ حقیقت اور خواب دونوں کی گرفت میں تھی۔

اس نے آج ڈیڈی کو خواب میں دیکھا ہے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ ان کے انتقال کے بعد کتنی راتوں' کتنے مہینوں اور کتنے سالوں سے وہ خواہش کرتی آئی تھی' دعا مانگتی آئی تھی کہ ڈیڈی کو خواب ہی میں دیکھ سکے۔

اور آج اتنے برسوں بعد جب مایوس ہو کر وہ یہ دعا مانگنا چھوڑ چکی تھی تب۔

آغا جان باتھ روم میں چلے گئے تھے' انہوں نے دروازہ صرف بند کیا تھا' اسے لاک نہیں کیا تھا۔ ولی بالکل

باتھ روم کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ فارہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ مگر شاید اس کی نگاہوں کا اسے احساس ہوا تھا جب ہی گردن گھما کر ایک پل کو اس کی طرف دیکھا تھا۔

سنجیدہ آنکھیں' خاموش چہرہ' جن پر کوئی تاثر رقم نہیں تھا۔ نہ دوستی نہ دشمنی۔ بالکل بے تاثر اور سپاٹ۔

اجنبی اجنبی لاتعلق سی نگاہ اس پر سے ہٹا کر وہ دوبارہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ تکیے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

ادھر ادھر کہیں نگاہ ڈالے بغیر وہ سیڑھیاں چڑھتی سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ اسے یقین کرنے میں خود تامل ہوا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے والوں میں تھی' رات کسی وقت بھی سوئی ہو مگر اس طلسم کدے میں جہاں سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا وہاں ایک عادت کے بدلنے پر کیا تعجب کیا جا سکتا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے لباس تبدیل کیا' بال بنائے' ویلویٹ کے سیاہ سوٹ کے اوپر کڑھی ہوئی سیاہ شال لپیٹ کر وہ اپنے کمرے سے باہر تھی۔

اس کا رخ آغا جان کے کمرے کی طرف تھا۔ لاؤنج میں اسے زرینہ' صمد اور کسی دوسری ملازمہ سے پشتو میں کچھ بولتی نظر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ضرور' پر کہا ایک لفظ نہیں۔

دروازہ کھول کر وہ بے دھڑک اندر گھسی۔ آغا جان بیڈ پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا' سائیڈ ٹیبل پر رکھی ناشتے کی ٹرے بتا رہی تھی' وہ بھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہیں۔

کل صبح انہوں نے کس وقت ناشتہ کیا تھا اور آج...... ؟ اس کی نیند خراب ہوئی اس لیے وہ جاگ جانے کے باوجود اس کے پاس بیٹھے رہے' اپنا ناشتہ' اپنی دوا' اپنے سارے معمولات ڈسٹرب کر لیے۔

بیڈ پر انہوں نے اپنے پاؤں بالکل سیدھے پھیلائے ہوئے تھے اور ان کے پیروں کے پاس بیڈ پر ولی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کے پیروں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

ان کے پیروں کے نیچے بیڈ شیٹ کے اوپر ایک چھوٹا سا چوکور کپڑا بچھا تھا' جس پر کٹے ہوئے ناخن گرتے جا رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھلنے پر گردن گھما کر دیکھا ضرور مگر پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"آ جاؤ میری ننھی پری!" وہ اسے دیکھ کر بہت بھرپور انداز میں مسکرائے۔

چائے کا کپ انہوں نے ٹرے میں رکھ دیا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا کر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ اگر ولی یہاں نہ ہوتا تو وہ واقعی اس وقت دوڑ کر ان کے پاس آتی۔

تب ہی ان کا ملازم گل خان اندر آیا۔ وہ کسی کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔

"اوہو۔" آغا جان نے قدرے تاسف سے سر ہلایا' پھر اسے بتانے لگے۔

"حجام آیا ہے میری حجامت بنانے۔" وہ اپنے جملے پر خود ہی ہنسے۔ "ولی کہہ رہا تھا۔ جاپان کی لوک کہانیوں میں جو بونوں کے کردار ہوتے ہیں ناں۔ جتنے لمبے ان کے قد ہیں' اس سے بھی لمبی داڑھی' زمین کو چھوتی ہوئی' آپ کی داڑھی بالکل ویسی ہی لگنے لگی ہے۔ ویسے ہر اتوار ولی میرا یوم صفائی مناتا ہے۔"

ولی' گل خان سے بیڈ کے قریب ایک کرسی رکھوا رہا تھا اور اس گفتگو سے لاتعلق تھا' یوں جیسے ولی کی بات ہو رہی ہے' وہ کہیں کوئی اور ہے۔

کرسی رکھوا لینے کے بعد اس نے گل خان سے حجام کو اندر لے آنے کو کہا۔ اب یہاں اس کی موجودگی کا نہ جواز تھا' نہ یہ مناسب بات تھی۔

"میں ذرا اپنے یوم صفائی سے فارغ ہو لوں پھر تفصیلی بات چیت کرتے ہیں۔ ہم دونوں۔" اسے واپس پلٹتا دیکھ کر آغا جان بولے۔ وہ سر ہلاتی واپس مڑی تو وہ جلدی سے بولے۔

"فارہ! اچھا ناشتہ کر لو۔ گل خان! اے صمد کہاں ہے' فارہ کو ناشتہ بنا کر دے۔" ولی انہیں بیڈ سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا رہا تھا اور وہ اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔

"آغا جان! فارہ یہاں مہمان نہیں ہے۔ یہ اس کے دادا کا گھر ہے۔ اس کا جو کھانے کا دل چاہے گا' کچن میں خود جا کر کسی بھی ملازمہ سے اپنے لیے بنوا لے گی۔" ولی نے رسانیت سے کہا۔ یہ جملے اسے بولنے چاہیے تھے مگر اس کی خاموشی کے سبب آغا جان کو اطمینان دلانے کی خاطر بولنے پڑے تھے۔

"آغا جان! میں ناشتہ کر لوں گی۔ آپ فکر مت کریں۔" آہستگی سے کہتی وہ فوراً کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اب لامحالہ اسے کچن کی طرف جانا ہی تھا۔

"آغا جان بے چارے پرہیزی کھانے کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ ابلے ابلے پھیکے بے رنگ سے کھانے پکا پکا کر میری طبیعت اکتا گئی تو ان بے چاروں کی انہیں مسلسل کھاتے کیا حالت ہوتی ہو گی۔ چکنائی' نمک اور ریڈ میٹ پر ان کے لیے پابندی ہے تو جو چیزیں allowed ہیں ان ہی میں کچھ جدت' کچھ ذائقہ اور کچھ انفرادیت پیدا کی جائے۔ بس آج اسی کوشش میں لگی ہوں۔ اسکم (Skim) ملک میں' چینی بھی ذرا کم ہی رکھتے یہ کھیر بنا رہی ہوں اور یہ پھل بھی فرائی نہیں کروں گی بلکہ اوون میں بالکل معمولی سا کارن آئل لگا کر رکھ دوں گی۔" کچن میں داخل ہوتے اس نے زرینہ کی آواز سنی۔

پہلی بار پتا چلا تھا کہ جب یہ ہنٹر والی اور پھولن دیوی نہیں بنی ہوتی تو خاصے اچھے لہجے اور آواز کی مالک ہے۔

آغا جان اردو بڑی شستہ اور نستعلیق بولتے تھے یوں جیسے سیدھے علی گڑھ یونیورسٹی سے تشریف لا رہے ہوں مگر اس کے باوجود ان کے لہجے میں پشتو کی ہلکی بہت معمولی سی آمیزش ہوتی تھی' ایسی آمیزش جو سننے والے پر بڑا خوشگوار سا تاثر ڈالتی تھی مگر ولی اور زرینہ کی اردو بالکل صاف اور کسی بھی دوسری زبان کی آمیزش سے مبرا ہوتی تھی۔ اندر داخل ہونے پر پتا چلا کہ یہ گفتگو عباد کے ساتھ ہو رہی تھی جو کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی پر بیٹھا حذیفہ کے منہ میں پراٹھے کے نوالے بھی ٹھونس رہا تھا اور اپنے سامنے پھیلا انگریزی اخبار بھی پڑھ رہا تھا اور بیوی کی گفتگو بھی مناسب ہوں' ہاں' اچھا' واقعی اور نہیں جیسے الفاظ کے ساتھ سن رہا تھا۔

یہ الفاظ غالباً بیوی کی تسلی و تشفی کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ "میں تمہاری گفتگو پورے دھیان سے سن رہا ہوں۔" پتا نہیں یہ بیویاں' شوہروں کو سکون سے اخبار کیوں نہیں پڑھنے دیتیں۔

CamScanner

زرمینہ کلنگ رینج اور کاؤنٹر کے گرد متحرک سی پھرتی آغا جان کا لنچ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

"السلام علیکم فارہ۔" عباد نے سلام میں پہل کی تھی۔

"وعلیکم السلام کیسے ہیں آپ؟" خالی عباد کہنا بے تکلفی لگ رہی تھی۔ صاحب لگانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور بھائی کہنا زبردستی کا رشتہ جوڑنا لگ رہا تھا مگر عباد کے خوش اخلاقی والے انداز کے جواب میں وہ ہلکا سا مسکرائی ضرور تھی زرمینہ کی گھورتی' خشمگیں نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر۔

"الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں؟" عباد کے خیریت پوچھنے کا جواب دے کر وہ فوراً اصدو سے مخاطب ہوئی۔

اپنا ناشتہ کمرے میں لانے کے لیے کہا اور پھر حاضرین کچن خاص کر کچن کی مالک پر نگاہ ڈالے بغیر جلدی سے کچن سے باہر نکل آئی۔

ناشتہ کے بعد وہ آغا جان کے کمرے میں آئی۔ بے دھڑک اندر داخل ہونے کے بجائے اس بار اس نے ہلکی سی دستک دی تھی۔

اندر آغا جان نہیں تھے صرف ولی تھا۔ اس نے حیرت سے پورے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں۔

"آغا جان نہا رہے ہیں۔" اسے ان کی تلاش میں نگاہیں گھماتے دیکھ کر ولی سنجیدگی سے بولا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھا' وہ صرف بھڑا ہوا تھا لاکڈ نہیں تھا اور ولی قریب ہی کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے واپس جانے کے لیے مڑنے لگی تو وہ سنجیدہ لہجے میں اس سے بولا۔

"رات تمہارے ماموں کا فون آیا تھا۔" وہ بے اختیار ٹھٹک کر رکی' چونک کر بغور اسے دیکھا' وہ اسے یہ اطلاع فراہم کرنے کے بعد دوبارہ باتھ روم کے دروازے کو دیکھنے لگا تھا بالکل لاتعلق انداز میں۔

وہ یہ بھی اندازہ نہیں لگا پائی کہ تجمل ماموں اور اس کے بیچ کیا گفتگو ہوئی ہوگی۔ یقیناً کوئی خوشگوار بات تو ہرگز نہیں ہوئی ہوگی اور یہ فون آیا کب تھا؟

اطلاع دینا تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جب وہ سو چکی تھی تب آیا تھا۔

پہلے تو کبھی نہیں ہاں اس کے خلع کے اعلانیہ مطالبے کے بعد جب ولی آغا جان کے ساتھ لاہور ان کے گھر آیا تھا تو تجمل ماموں اور معیز سے اس کی کافی زیادہ تلخ کلامی ہوئی تھی۔ وہ تجمل ماموں اور خاص کر معیز سے خار کھاتا بلکہ نفرت کرتا ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ولی اس کی اور معیز کی دوستی اور بے تکلفی سے بہت اچھی طرح آگاہ ہے۔ ابتدا میں ولی نے ایک بار اسے فون کال کی تھی۔

"میں ولی بول رہا ہوں فارہ..... کیسی ہو؟" بظاہر لہجے میں کوئی دھمکی اور ڈرانے والی بات شامل نہیں تھی پھر بھی وہ ڈر گئی تھی۔

تب وہ میڈیکل کے پہلے سال میں تھی' اس کے نکاح کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور ان دنوں واقعی وہ اتنی ڈرپوک سی تھی کہ اسے لگا کرتا تھا جیسے اس کا زبردستی نکاح پڑھوایا گیا ہے' ایسے ہی کسی دن وہ زبردستی اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

"میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" اپنا خوف اس پر ظاہر کیے بغیر بظاہر بہادری کا مظاہرہ کرتے اس نے نفرت سے یہ جملہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔

پھر ایک بار وہ اسے اپنے ہاسٹل کے داخلی راستے پر کھڑا نظر آیا تھا۔ یہ غالباً تب کی بات تھی جب آغا جان نے اسے ایک فون کال میں یہ بتایا تھا کہ ولی ان کے بہت کہنے کے باوجود بھی امریکہ سے پڑھائی چھوڑ کر واپس آ گیا ہے۔ اس کا میڈیکل کا چوتھا سال تھا اور کالج کے ساتھ ساتھ ہاسٹل میں بھی ان کا خوب رگڑا لگا کرتا تھا۔
تھکی ہاری وہ وہاں سے نکل رہی تھی۔ معیز اسے لینے آیا ہوا تھا۔ اس روز فارہ کی برتھ ڈے تھی اور معیز اسے کہیں باہر کھانا کھلانے لے جا رہا تھا۔ تب تک وہ اب جتنی بہادر اگر نہیں ہوئی تھی تو اتنا بھی ڈرپوک بھی نہیں رہی تھی۔ تب ہی اسے کھڑا دیکھ لینے کے باوجود اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتی معیز کے ساتھ باہر پارکنگ میں آ گئی تھی۔

اور تیسری بار میں جب اس نے ولی پر اپنی ناپسندیدگی اور بے زاری ظاہر کی وہ اس کے فائنل ایئر کے آخری دنوں کی بات تھی۔ وہ پشاور سے لاہور کیا کرنے آیا ہوا تھا فارہ کے علم میں نہ تھا مگر اس روز معیز کے ساتھ ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے اس نے وہاں دو تین افراد کے ساتھ ولی کو کھانا کھاتے دیکھا تھا۔

اپنی بے حد مشکل اور تھکا دینے والی پڑھائی سے وہ کچھ وقت نکال کر فریش ہو سکے۔ خود کو ریلیکس کر سکے یہی سب سوچتے معیز کبھی کبھار اسے لانگ ڈرائیو' لنچ' ڈنر وغیرہ کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ایک دن تھا اور یہ تب کی بات تھی جب معیز باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔

ولی ان دونوں سے کافی دور ایک میز پر بیٹھا تھا مگر جن نگاہوں سے وہ انہیں دیکھ رہا تھا انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا وہ ابھی اپنی میز پر سے اٹھے گا اور دندناتا ہوا سیدھا اس کے سر پر آ کھڑا ہو گا۔ اس پر حق جتاتے ہوئے کوئی سین کری ایٹ کرے گا۔

وہ کھانے اور اپنے ساتھ آئے افراد سب کو نظر انداز کیے کافی دیر فارہ اور معیز کی میز کی طرف دیکھتا رہا۔ بہت غصے سے' یوں جیسے اگلے ہی پل وہ اس کے پاس آئے گا اور اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جائے گا۔

اس نے اسے میز پر سے یکدم ہی اٹھتے دیکھا تو اپنی تمام تر بہادری کے باوجود لوگوں میں تماشا بننے کے خیال سے ہراساں ہو گئی مگر وہ ان کی میز کی طرف آنے کے بجائے نہایت تیز رفتاری سے چلتا ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے ریسٹورنٹ سے جاتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس پل اس سوچ نے اسے بہت سکون پہنچایا تھا کہ وہ ولی کے سامنے بہت اچھی طرح یہ بات اسٹیبلش کر چکی ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اگر وہ اپنی خوشی و رضامندی سے شامل کرے گی تو وہ ولی صہیب خان نہیں معیز تجمل ہوگا۔

تجمل ماموں کے فون کا سن کر اسے کئی گھنٹوں بعد جا کر یہ یاد آیا کہ کل اسے معیز کو فون کرنا تھا اس کی ناراضی دور کرنی اور اسے اعتماد میں لینا تھا۔

کل رات سے صبح ابھی جب تک کہ ولی نے تجمل ماموں کے فون کا ذکر نہیں کیا تھا فون کرنے والی بات تو دور اسے تو سرے سے معیز ہی یاد نہیں آیا تھا اور یہ کیسی حیرت کی بات تھی۔

CamScanner

معیز نے اسے کل شام تک لاہور پہنچنے کا الٹی میٹم دیا تھا اور وہ شام اور رات سب گزار کر اگلی صبح بلکہ دوپہر کر چکی تھی۔

گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی اور وہ بجائے یہ سوچنے کے کہ معیز اس سے کتنا شدید ناراض ہو گیا ہوگا یہ سوچ رہی تھی کہ اب تک یقیناً آغا جان نہا چکے ہوں گے۔

اس بار ان کے کمرے تک جب وہ آئی تو گل خان سے یہ تصدیق کر لینے کے بعد کہ وہ نہا چکے ہیں' اپنے کمرے میں موجود ہیں اور بالکل اکیلے ہیں۔

"تشریف لائیے ڈاکٹر فارہ بہروز خان!" وہ اسے دیکھ کر بھرپور اور شرارتی انداز میں مسکرائے۔ بہت طویل اور پرانی بیماری کے سبب ان کے سے وجیہ گورے اور پیلاہٹیں لیے چہرے پر یکدم ہی جیسے کئی چراغ جل اٹھے تھے۔

صرف اس کا چہرہ بھی کسی کو ایسی خوشی فراہم کر سکتا ہے؟

انہوں نے سفید کرتا شلوار کے اوپر ڈارک براؤن رنگ کا خوب موٹا سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے اوپر ہلکے براؤن رنگ کی گرم مردانہ شال بھی کندھوں اور سینے کے گرد پھیلا رکھی تھی۔ ان کے بال جو ہلکے ہلکے بڑھے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی کنگھی ہو چکی تھی' سفید داڑھی جو صبح تک کچھ بے ترتیب سی نظر آ رہی تھی۔ خط بننے کے بعد چہرے پر بھی پھر سے کئی نورانی چمک بڑھا رہی تھی۔

انہوں نے آنکھوں پر سے گلاسز اتار کر اخبار بھی ایک طرف رکھ دیا اور اسے اپنی طرف اتنا بغور دیکھتا پا کر شرارتی انداز میں بولے۔

"لگ رہا ہوں نا ہینڈسم؟" وہ بے اختیار مسکرائی۔

"تم نے مجھے بہت دیر میں دیکھا بچے! اب تو یہ کھنڈرات بچے ہیں۔ تیس چالیس سال پہلے دیکھتیں تو کہتیں۔ آغا جان آپ کے آگے بالی ووڈ کا ہر ڈیشنگ' ہینڈسم ہیرو پانی بھرتا نظر آتا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنستی بیڈ پر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

آج انہوں نے اسے بیڈ پر نہیں بلایا تھا۔ وہ از خود وہاں آئی تھی۔ انہوں نے اس کے شانوں کے گرد محبت سے بازو پھیلا کر اپنی گرم شال اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

"کیا ٹائم ہو گیا؟" انہوں نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ "ایک بجنے میں تیس منٹ ہیں۔ ابھی بہت ٹائم ہے۔" انہوں نے جیسے خود کلامی کی پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"ناشتہ دیر سے کیا ہے نا۔ میں نے زرینہ سے کہا تھا۔ ڈھائی تین بجے سے پہلے کھانا نہیں کھاؤں گا۔ چلو تب تک میں تمہیں ایک خاص جگہ دکھا کر لے آتا ہوں۔"

"خاص جگہ؟" اس نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"ہاں! ایک بہت خاص جگہ ہے جو میں نے خاص تمہارے لیے بنوائی ہے۔ صرف تمہارے لیے۔ تمہیں روحی کے لیے بھی۔ بہروز کا نام چاہو تو شامل کر لو۔ جب میں نے اسے بنوانے کا سوچا تھا تب وہ زندہ تھا مگر جب وہ بننا اور بنانا شروع ہوئی تب وہ ہم سب سے بہت دور جا چکا تھا۔"

وہ ایک پل کے لیے بجھا اداس ہوئے پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے اس سے کہنے لگے۔

"چلو جلدی سے چلتے ہیں۔ ابھی کھانے میں بھی وقت ہے اور اس وقت کوئی ملنے بھی نہیں آیا ہوا ورنہ اتوار کے دن ملنے اور خیریت پوچھنے آنے والوں کا رش ہی لگا رہتا ہے۔" اس کے گرد سے ہاتھ ہٹا کر وہ فوراً بیڈ سے اٹھنے لگے۔ بہت پرجوش اور بہت زیادہ ایکسائیٹڈ ہوئے۔

"آپ سے چلا نہیں جائے گا آغا جان! ابھی آپ آرام کریں۔ میں بعد میں دیکھ لوں گی جو آپ دکھانا چاہ رہے ہیں۔"

"مجھ سے چل لیا جائے گا بیٹا! تم بعد میں جا کر دیکھو گی تو مجھے خوشی نہیں مل سکے گی۔ مجھے خوشی تو اس وقت ہو گی جب میں خود تمہیں وہاں لے کر جاؤں اور اپنی بہت شوق اور محبت سے بنوائی ایک ایک چیز تمہیں خود دکھاؤں۔"

"آغا جان! زیادہ چلنا اور تھکنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے میں پھر بھی۔"

"میں تمہارے سہارے سے چل لوں گا فارہ! زیادہ دور تھوڑی جانا ہے' یہ جو میرے کمرے کا یہ دوسرا دروازہ ہے' یہ ادھر کچن کے پاس کھلتا ہے' وہاں سے بس چند قدموں کا فاصلہ ہے۔ بیماری تو مجھے زیادہ ہی چھوٹی سی لگتی ہے ایسے برے حالات بھی نہیں۔ میں چل پھر سکتا ہوں۔" وہ اس کا جملہ کاٹ کر بہت عجلت میں بولے۔

ان کے بوڑھے چہرے پر بچوں جیسی خوشی اور ایک عجیب بے تابی بکھری ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی متامل سی تھی۔

"اچھا مجھے وہیل چیئر پر لے چلو۔" انہوں نے اس کا تامل اور ہچکچاہٹ دیکھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی وہیل چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"فارہ! یہ میری بہت سالوں پرانی خواہش تھی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو۔ میرے بہروز کی فیملی میرے گھر آباد ہو سکے۔ میں نے تم لوگوں کے لیے گھر کے اندر ہی ایک الگ پورشن بنوایا تھا۔ تمہیں یاد ہے بہروز مجھ سے آخری بار مل کر گیا تھا۔ وہ واپس میرے پاس آ جائے گا ہمیشہ کے لیے۔

تم لوگوں کو الگ رہنے کی عادت تھی اسی لیے میں نے اسی روز ایک آرکیٹیکٹ سے رابطہ کیا تھا۔ بہروز اسی رات ہمیں چھوڑ گیا تھا مگر مجھے تمہارے اور روحی کے لیے تو یہ پورشن تعمیر کروانا ہی تھا۔ سو اس کی تعمیر فوراً کروائی۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی فارہ! کہ تم اور روحی یہاں آ کر آباد ہو جاؤ۔ میرے بچے اپنے گھر لوٹ آئیں اور اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے بس اتنی ہی خوشی مل جائے کہ میں نے جو کچھ تم لوگوں کے لیے بنوایا' وہ خود لے جا کر تمہیں دکھا سکوں' تمہیں ان کمروں' راہداریوں اور دالانوں میں چلتا پھرتا دیکھ کر اس منظر کو اپنی آنکھوں میں بسا سکوں۔ فارہ! میں تمہارے ساتھ وہاں جانا چاہتا ہوں یہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت اور سب سے یادگار لمحہ ہوگا فارہ! مجھے بس اتنی سی خوشی دے دو بیٹا! بس اتنی سی خوشی۔" وہ اب مزید کیا کہہ سکتی تھی۔

انہوں نے اسے کسی اعتراض اور انکار کے قابل ہی نہیں رکھا تھا۔

وہ آنکھوں میں آس اور امید لیے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھی اور کمرے کے دوسرے کونے سے وہیل چیئر کھسکا کر ان کے پاس لے آئی۔ ان کے چہرے پر بے ساختہ ہی خوشیوں کے کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ اسے

CamScanner

خوش لگ رہے تھے جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔
اس نے انہیں سہارا دینے کو ہاتھ آگے بڑھایا مگر وہ اس کے سہارے کے بغیر خود ہی کھڑے ہو کر وہیل چیئر پر بیٹھ گئے۔
وہ وہیل چیئر پر پیچھے سے بیٹھ گئے اور اس نے ان کی چادر اچھی طرح ان کے گرد لپیٹ دی پھر ابھی وہ وہیل چیئر چلانا شروع بھی نہیں کر پائی تھی کہ ہاتھ میں کارڈلیس لیے ایک ملازم اندر آیا۔
"آپ کا فون ہے۔" مؤدب سے انداز میں اسے کارڈلیس تھما کر وہ فوراً باہر چلا گیا تھا۔
"ہیلو۔" ذہن میں اندازے لگاتے ہوئے کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے؟ اس نے کارڈلیس کان سے لگایا۔
"فارہ! تم میرے کہنے کے باوجود گھر واپس کیوں نہیں گئیں۔ رات پاپا نے فون کیا تو اس بدتمیز اور بے ہودہ انسان نے ان کی تم سے بات نہیں کرائی۔ پھوپھو کتنی ناراض ہیں تم سے' کچھ احساس ہے تمہیں؟ اور میں یہاں اپنے دس مسئلوں کے ساتھ تمہاری وجہ سے بری طرح پریشان اور ڈسٹرب ہوں۔ تم مجھے سچ بتاؤ فارہ! کیا تم کسی دباؤ میں ہو؟ کیا وہ تمہیں زور زبردستی سے کوئی دھمکی دے کر کسی بات سے ڈرا کر یہاں لایا ہے؟ ہم اتنے بے اختیار اور لاچار نہیں ہیں فارہ! کوئی اندھیر نہیں مچی جو وہ تمہیں ڈرا دھمکا سکے۔ تم مجھے صرف ایک ہاں بولو میں نے اپنے دوست ایس پی یاسین لغاری سے ساری بات کل رات ہی کر لی ہے۔ ہم تو فون کی مدد لیں گے اور تم آج ہی واپس لاہور میں ہو گی۔
میں پاکستان میں ہوتا تو اب تک یہ سارا تماشا کب کا ختم چکا ہوتا' کوشش کر رہا ہوں کہ آج یا کل واپس آ جاؤں۔ تم بس مجھے میرے سوال کا جواب دے دو۔" وہ پھر سلام دعا اور خیر و عافیت کے بغیر ایک دم شروع ہو چکا تھا۔
وہ بے حد غصے میں بھی تھا اور اس کے لیے فکرمند اور پریشان بھی۔ اس کا غصہ اور فکر دونوں اس کے لفظوں اور لہجے سے عیاں تھے۔ اس نے سامنے وہیل چیئر پر بیٹھے آغا جان کو دیکھا اور پھر چلاتے' جھنجھلاتے شکر معیز کو سنا۔
معیز اس کا دوست تھا' وہ اس کا پرپوزل بھی قبول کر چکی تھی اور وہ اس کے لیے اہم بھی تھا مگر سامنے وہ بوڑھا شخص جو وہیل چیئر پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا' سے احساس ہوا وہ اس کے لیے معیز سے زیادہ اہم ہے۔
"مجھے کچھ ماموں کے فون کا میسج مل گیا تھا۔ رات میں سو چکی تھی اس لیے ان سے بات نہ کر سکی آج ضرور ان سے اور ممی سے فون پر بات کر لوں گی اور آپ کو کسی دوست سے مدد لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں' میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ اچھا میں اس وقت تھوڑی مصروف ہوں' ہم بعد میں بات کریں گے اللہ حافظ۔" آغا جان اسے یہ اشارہ کرتے ہی رہ گئے تھے کہ وہ آرام اور اطمینان سے کسی جلدی اور عجلت کے بغیر فون پر بات کر لے مگر ان کے اشاروں کو نظر انداز کرتی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر چکی تھی۔
"بیٹا! ایسی کوئی بات تو نہیں تھی جانے کی۔ تم آرام سے بات کر لیتیں۔"
"کس کا فون تھا؟ تمہارا موڈ ایک دم سے آف کیوں ہو گیا؟" انہوں نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔
"معیز کا۔ اسے لگ رہا ہے' ولی مجھے یہاں زبردستی اغوا کر کے لے آیا ہے۔ آغا جان! ہم لوگوں کی زندگی

نارمل کیوں نہیں۔ میں اپنے سگے دادا کے پاس اگر اپنی مرضی سے بھی آؤں تو سب کو یہی کیوں شک ہوتا ہے کہ مجھے ڈرایا دھمکایا یا اغوا کیا گیا ہے؟" وہ اپنے دل میں آئی باتیں بہت کم کسی سے کہا کرتی تھی مگر اس وقت معیز کا فون سن کر جو سوچ اس کے دل میں ابھر رہی تھی وہ اسے آغا جان سے کہہ اٹھی تھی۔
آغا جان کے خوشیوں بھرے چہرے پر اس کے اس سوال نے اداسیاں بکھیر دیں۔ اسے کوئی جواب دینے کے بجائے وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔
ان کے کمرے کا یہ پچھلا دروازہ اس نے دیکھا بار ہا تھا مگر یہ کہاں کھلتا ہے وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ باہر نکلنے پر گھر کا ایک قطعہ نظر آیا تھا اور ایک مصنوعی جھیل بھی جو بے حد خوب صورت تھی اور جہاں وہ جھیل ختم ہو رہی تھی وہاں جدید طرز تعمیر کا حسین شاہکار اس گھر کا وہ پورشن جو آغا جان نے ان لوگوں کے لیے آج سے چھ برس قبل تعمیر کروایا تھا۔ اس پورشن میں داخل ہونے کا سفید لوہے کا گیٹ' پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔
"گیٹ کھولو۔" اس نے وہیل چیئر وہاں لا کر روکی تو آغا جان اس سے بولے۔ اس نے کنڈی کھولی اور ان کی وہیل چیئر اندر لے جانے کے لیے پیچھے مڑی تو دیکھا کہ آنکھوں میں نمی لیے وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے ہیں۔
"فارہ! اس ایک پل کا میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔ اب اگر میں مر بھی گیا تو مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔" وہ بہت عجیب کیفیات میں گہری خاموشی سے وہیل چیئر چلاتے اندر جانے لگی۔ تب آغا جان ہی کی چھ برس قبل کی ایک آواز اس کی سماعتوں میں گونجی۔
"میں اپنی غلطی مانتا ہوں روحی بیٹا! میں نے تمہیں بطور بہو قبول نہ کر کے ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔ میں اعلا ظرف نہ تھا تم اعلا ظرف ہو جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔ تمام زیادتیوں کو بھلا کر اپنے گھر چلی چلو۔ تمہارا اصلی گھر تو وہی ہے ناں۔ تم وہاں چلو گی تو میرے بہروز کی روح بھی کتنی خوش ہو گی۔"
اسے یک بارگی چھ سال پہلے کے وہ سب لمحے یاد آئے جب جب وہ اسے اور ممی کو اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔
"بیٹا! تمہاری ممی ہم سے بہت ناراض ہیں۔ انہیں سمجھاؤ۔ ان سے کہو آغا جان کو معاف کر دیں۔ تم لوگوں کا گھر تم لوگوں کے بغیر بہت ویران ہے۔ ممی سے کہو اپنے گھر کو آباد کر دیں۔" انہوں نے چھ برس قبل بھرائی ہوئی آواز میں بڑی شکستگی' رنجیدگی اور التجا کرتی آواز میں فارہ سے کہا تھا۔
"ابھی تم بہت غصے میں ہو۔ مجھ سے سخت خفا بھی ہو' روحی بیٹا! میں پھر آؤں گا۔ تمہارا گھر تمہاری اور فارہ کی راہ تک رہا ہے۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے' الجھے بکھرے انداز میں اس خوب صورت جگہ کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھی۔
وہ پورا حصہ خاموش اور غیر آباد تھا۔ مگر وہاں کے لان کی خوشنما حالت یہ بتا رہی تھی کہ یہاں پابندی سے دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کروائی جاتی ہے۔ لان کے سامنے وہ اسٹیپس تھے' پھر لکڑی کا مضبوط اور خوب صورت دروازہ جو درمیانی حصے میں کھلتا تھا۔ اس نے وہیل چیئر اوپر چڑھائی وہ تب تک سکون سے ٹیک لیے کھڑے رہے' پھر انہیں دوبارہ وہیل چیئر پر بٹھا کر وہ اندر لے آئی۔

CamScanner

یہ ڈرائنگ روم ہے' یہ ٹی وی لاؤنج' یہ کچن' یہاں کی ممی کا بیڈروم' یہ فارہ کا کمرہ اور یہ فارہ کا اسٹڈی روم۔ اس کے لیے بنے اس اسٹڈی روم میں رائٹنگ ٹیبل' کمپیوٹر' بک شیلف وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ کمپیوٹر کورز سے ڈھکا ہوا اور بک شیلف میں سب ہی میڈیکل و سائنس کی ڈھیر ساری کتابیں۔

اسٹڈی روم کی دیواروں پر انسانی جسم کے کئی اعضا اور ہڈیوں وغیرہ سے متعلق رنگین ڈایاگرام' چارٹس وغیرہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ میڈیکل کے کسی طالب علم کی اسٹڈی ہے۔ میڈیکل کی وہ طالبہ ڈاکٹر بن بھی گئی اور ویران اسٹڈی اس انتظار میں رہی کہ اس کی مالکن یہاں آ کر بیٹھے گی' پڑھے گی اسے آباد کرے گی۔

سب جگہیں آراستہ تھیں' سب جگہ قالین' پردے اور دیگر سارا سامان موجود تھا۔ یہاں تک کہ کچن بھی پورا سیٹ تھا۔

سارے کمرے دیکھ لینے کے بعد وہ ان کے ساتھ دوبارہ لاؤنج میں آ گئی۔ وہ وہیل چیئر ہی پر بیٹھے تھے اور وہ ان کے برابر صوفے پر۔

"رات میں نے خواب میں بہروز کو دیکھا تھا۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"وہ پہلے بھی خواب میں کئی بار نظر آیا مگر بجھا ہوا' اداس اداس' لیکن کل وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔" وہ بے اختیار صوفے سے اٹھ کر ان کے سامنے آ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر تھے اور وہ آنکھوں میں حیرت لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"فارہ! ابھی تم مجھ سے اپنی زندگی کے نارمل نہ ہونے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ بات یہ ہے بیٹا! کہ اپنے بچوں کی زندگیوں کو ابنارمل بنانے میں' انہیں آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈالنے میں ہم بڑے بہت قصوروار ہوتے ہیں۔ ہماری زندگیاں بہت سیدھی سادی اور نارمل ہو سکتی تھیں اگر میں بہروز کی پسند کو قبول کر لیتے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتا۔ کوئی قیامت تو نہ آ جاتی اگر میں اس کی خوشی سے وہاں شادی کروا دیتا جہاں وہ کرنا چاہتا تھا۔ میں انا پرست' ضدی۔ میں نے کہا میں تمہیں جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں' میرا صرف ایک بیٹا ہے صہیب' تم سے میں اپنا ہر رشتہ توڑ رہا ہوں اب زندگی میں کبھی مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا تو وہ میرے پاس سے' اپنے گھر سے ایسا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر آیا ہی نہیں۔ واقعی کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھائی میں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ ضد میں آ کر فوراً ہی صہیب کی وہیں شادی کر دی جہاں بہروز منگنی توڑ کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا لیکن وہ صہیب ہم دونوں باپ بیٹے کی طرح ضدی اور انا پرست نہیں تھا۔ زندگی میں اس کی اپنی بھی کوئی پسند' کوئی خواہش ہے' یہ مجھے جتائے بغیر بھائی جس لڑکی سے منگنی توڑ کر گیا تھا اس نے میرے کہنے پر اپنی اسی کزن سے شادی کر لی۔

روحی اگر آج تک مجھ سے خفا ہے' بدگمان ہے تو شاید اس میں اس کا اتنا قصور بھی نہیں۔ میں نے اسے اپنی بہو تسلیم کرنے میں اتنی دیر لگا دی کہ شاید تب تک وہ اپنے دل کے دروازے مجھ پر بند کر چکی تھی۔" وہ آنکھوں میں نمی لیے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

اس نے انہیں ہمیشہ بہت غلط اور بہت برا سمجھا تھا لیکن آج جب وہ خود اپنی برائیاں اور غلطیاں قبول

کر رہے تھے تب اس کا دل چاہ رہا تھا ان سے کہے۔ آپ اتنے غلط نہیں جتنا خود کو کہہ رہے ہیں' آپ اتنے برے ہرگز نہیں' جتنا خود کو ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ سب ہی ماں باپ اولاد سے فرماں برداری کی توقع کرتے ہیں۔ ان پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔

"ہم دو انا پرست کے بیچ صہیب پل کا کام کرتا تھا۔ وہ کبھی مجھے سمجھاتا کہ آغا جان! بھائی کو واپس بلا لیں' اسے معاف کر دیں' وہ کبھی بہروز کے پاس پہنچتا کہ بھائی! اپنے گھر واپس چلو۔ آغا جان ناراض ہیں تو کیا' تمہاری شکل دیکھتے ہی سارا غصہ و ناراضی بھول جائیں گے۔ میں کہتا تھا میں اس کا باپ ہوں' میں اس کے آگے کیوں جھکوں' کیا اسے اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ماں باپ غصے میں کچھ برا بھلا اگر اولاد کو کہہ بھی دیں تو ان کا دل سے وہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا۔"

"کیا اسے اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی کہ ہزار ناراضیوں کے باوجود میں اس کی راہ تکتا ہوں۔" اور بہروز کہتا تھا۔ آغا جان نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ جب تک وہ خود نہیں بلائیں گے' میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ہم باپ بیٹے کے بیچ برسوں یہ انا کی جنگ چلی صہیب ہم دونوں کو سمجھا سمجھا کر ہار گیا مگر ہم میں سے کوئی اپنی ضد چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔" بولتے بولتے وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوئے۔

اپنے لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو پایا' آنکھوں کی نمی کو پیچھے دھکیلا پھر اس کی طرف دیکھتے دوبارہ اسی مدھم اور کمزور آواز میں بولنے لگے۔

"میری ضد' انا اور غصے کے سبب بہروز اپنے اکلوتے بھائی تک سے بدگمان ہو گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی منگیتر آمنہ سے شادی کر کے صہیب نے میری نظروں میں خود کو زیادہ اچھا اور فرماں بردار بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے میری نظروں سے مزید گرانا چاہا ہے وہ بھائی کی دولت' جائیداد کا لالچی لگنے لگا تھا۔

میں نے بہروز کو عاق کر کے سب کچھ صہیب کے نام جو کر ڈالا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے بڑے خوددار اور غیرت مند تھے۔ ان میں سے کوئی بھی دولت' جائیداد کا لالچی اور خودغرض نہیں تھا۔ ان محبت کرنے والے بھائیوں کے درمیان غلط فہمیوں کا سبب میری ضد بن گئی۔

بہروز اس سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا' پھر بھی وہ بڑی پابندی سے گاہے گاہے اس سے ملنے لاہور جاتا رہتا تھا۔ اسے اس کے گھر واپس آنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ وہ میرے غصے سے خائف ہو کر مجھے بتاتا نہیں تھا مگر میں جانتا تھا وہ بہروز سے ملتا رہتا ہے۔ وہ ایک روز تم سے بھی مل کر آیا تھا' شاید تمہارے اسکول۔ وہ تمہاری ایک تصویر بھی کھینچ کر ساتھ لے آیا تھا۔

آغا جان! یہ دیکھیں۔ آپ کی پوتی' میری بھتیجی' کتنی پیاری ہے یہ گڑیا۔ میں نے اس تصویر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ دیکھتے میری انا حائل ہو رہی تھی مگر وہ میرا بیٹا میری رگ رگ سے واقف تھا۔

وہ میری لاتعلقی و بے گانگی کے اظہار کے باوجود اس تصویر کو میرے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ اور پتا ہے فارہ! وہ مجھے بالکل ٹھیک طرح جانتا تھا۔ اس کے جانے کے بہت دیر بعد' رات میں اپنے کمرے میں بالکل اکیلے میں

نے تمہاری اس تصویر کو اٹھا کر دیکھا تھا۔
اسے بہت دیر تک محبت سے چومتا رہا تھا۔ اسکول یونیفارم میں نو دس سال کی وہ بچی میری پوتی تھی' میرا خون۔ وہ تم سے میری محبت کا پہلا دن اور پہلا لمحہ تھا فارہ! اور تم سے مجھے متعارف کروانے والا میرا وہ بیٹا جو مجھے بہت اندر تک جانتا تھا۔ تمہاری وہ تصویر آج بھی میرے پاس ایک بہت قیمتی یاد کی طرح رکھی ہے فارہ! اس سے تمہاری اور صہیب دونوں کی یادیں جڑی ہیں۔"

"آپ نے میری تصویر کیوں کھینچی ہے؟" بہت پہلے کی وہ ایک گرم دوپہر' بچپن کی وہ ایک بھولی بسری یاد وہ تو اس دن کو غیر اہم جان کر بھول چکی تھی۔ آج آغا جان نے ذکر کیا تو اسے جیسے ایک دم ہی وہ دن یاد آ گیا۔

5th گریڈ میں تھی' اسکول سے چھٹی کے وقت وہ باہر نکل رہی تھی جب اس نے ایک اجنبی کو بغور اپنی طرف دیکھتا اور اپنے پاس آتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس شخص نے ہاتھ میں لیے کیمرے سے اس کی تصویر اتاری تھی۔ اس شخص نے جھک کر اسے پیار کیا تھا اور اسے ڈھیر ساری چاکلیٹس دینی چاہی تھیں۔

"ممی منع کرتی ہیں۔"

"ممی کو پتا نہیں چلے گا یار! تم راستے میں کھا لینا۔" وہ اس کے معصومانہ سے انکار اور ساتھ ساتھ چاکلیٹس کو للچائی نگاہوں سے دیکھنے کو انجوائے کرتے ہوئے بولا تھا۔

"آپ کیا بچوں کو اغوا کرنے والے ہیں؟" وہ اپنی سمجھ کے حساب سے معصومیت سے بولی تھی۔

"بچوں کو نہیں صرف تمہیں۔ ایک روز تمہیں اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارے ابو اور ڈیڈی دیکھتے رہ جائیں گے۔" وہ اس کے سادگی بھرے بچکانا استفسار کے جواب میں قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

اور پھر اس کے دونوں گالوں پر پیار کرتا۔ وہ جس گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آیا تھا اس میں بیٹھ کر وہاں سے واپس چلا بھی گیا تھا۔ بچپن کی وہ یاد' وہ چاکلیٹس دینے اور والہانہ پیار کرنے والا اجنبی اس کے چچا تھے' اس کے سگے چچا صہیب خان۔

"اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے وہ بڑی شدت سے یہ بات کہنے لگا تھا کہ میں فارہ کو اپنی بہو بناؤں گا۔ بھائی نہ مانا تو اسے زبردستی اٹھا کر ساتھ لے آؤں گا۔ چچا بھی سرپرست ہوتا ہے' اس کا بھی حق ہوتا ہے۔ آغا جان! آپ اور بھائی لاکھ رشتوں کو توڑنے کی کوشش کر لیں' میرے جیتے جی یہ ٹوٹیں گے نہیں۔ میں انہیں کبھی ٹوٹنے دوں گا نہیں۔"

وہ ان دنوں اکثر اداس لہجے میں یہ بھی کہنے لگا تھا "آغا جان! آپ باپ بیٹے کے جھگڑے نے مجھ سے میرا بھائی' میرا سب سے پیارا دوست چھین لیا۔ وہ مجھ سے اتنا متنفر ہو گیا ہے۔ اسے تو اب یہ یقین بھی نہیں رہا کہ میں صہیب خان بھی اس کا سب سے اچھا دوست بھی رہا ہوں۔" ان دونوں بھائیوں میں بچپن سے بہت دوستی' بہت محبت تھی فارہ!

ان کی عمروں میں بس سال کا ہی فرق تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ پڑھے بھی ایک ہی کلاس میں' اسکول اور کالج

تک وہ دونوں ہمیشہ ساتھ پڑھے' ان میں بہت انڈر اسٹینڈنگ' بہت پیار تھا۔ مگر میرے ایک ضدی فیصلے نے بڑے بھائی کو چھوٹے سے حد درجہ بدگمان کروا دیا تھا۔

اپنے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے وہ لاہور بہروز سے ملنے گیا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہمیشہ ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ اس روز اس نے بہروز سے یہ کہا تھا کہ میں فارہ کو اپنی بہو بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جن رشتوں کو تم توڑ دینے پر تلے ہو میں انہیں پہلے سے زیادہ مضبوط کر دوں گا۔ اس کی یہ باتیں مجھے بہروز نے اس کے انتقال کے بعد بتائی تھیں۔

بہروز جو ایک ہفتہ پہلے اپنے دفتر میں ملنے آئے بھائی سے ہمیشہ کی سی لاتعلقی و بے گانگی سے ملتے وقت جانتا نہیں تھا کہ یہ بھائی سے اس کی آخری ملاقات ہے۔ اگر جانتا ہوتا تو...... وہ بہت پیارا تھا' بہت اچھا' بہت محبت کرنے والا۔ اس کے دفتر سے اٹھتے صہیب نے اس سے کہا تھا۔

"اب کی بار میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ تم ساری ضد بھلا کر دوڑتے ہوئے پشاور آؤ گے۔" بہروز نے اس کی بات بغیر دھیان دیے سنی تھی۔

"اگر میں مر جاؤں پھر تو گھر آؤ گے ناں؟" وہ بالکل صحت مند اور تندرست تھا' پھر پتا نہیں اس نے ایسی بات بہروز سے کیوں کہی تھی' شاید یونہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی' شاید اس کے وجدان نے اس سے کہلوائی تھی' کون جانے' وہ ایسی بات بہروز سے کیوں کہہ کر آیا تھا۔

مگر یہ سچ ہے کہ اس بات کے صرف ایک ہفتے بعد صہیب کا انتقال ہو گیا تھا۔ نہ بیمار پڑا نہ کچھ۔ بس معمولی سی طبیعت خراب ہوئی اور وہ جیسے ہنستا کھیلتا ہی ہمیں چھوڑ گیا۔ اسے جیسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹا اپنی اپنی ضد اتنی آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔ اس کے لیے اسے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

میں نے اپنی برسوں کی ضد توڑتے بہروز کو فون کیا تھا۔ "بہروز! تمہارا بھائی چلا گیا۔ میں ٹوٹ رہا ہوں' مجھ میں طاقت نہیں۔ بھائی کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے آ جاؤ بیٹا۔"

فارہ کو وہ فون کال یاد تھی۔ وہ وہیں ڈیڈی کے پاس تو بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا۔ ڈیڈی نے وہ کال ریسیو کی تھی اور پھر اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے بالکل گم صم سا ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

تب وہ نہیں جانتی تھی پر آج سمجھ سکتی تھی ڈیڈی کی فیلنگز۔ اس کال کو سن کر ان کے کانوں میں کیا جملہ گونج رہا ہو گا۔

"اگر میں مر جاؤں پھر تو گھر آؤ گے ناں؟"

"اب کی بار میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ تم ساری ضد بھلا کر دوڑتے ہوئے پشاور آؤ گے۔" اور وہ دوڑتے ہوئے ہی پشاور جا رہے تھے۔

اسے یاد تھا اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھتے ڈیڈی کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ وہ رو نہیں رہے تھے پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہے ہوں' جیسے ان کے اندر کہیں آنسو ہی آنسو گرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ

CamScanner

پشاور چلے گئے تھے۔ تب اسے لگتا تھا ڈیڈی اتنے سارے دنوں کے لیے انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور پلٹ کر کوئی خبر بھی نہیں لی اور آج وہ سوچ رہی تھی ڈیڈی نے وہ غم سہا کس طرح ہوگا۔ ان کے دل کے اوپر کیا گزر رہی ہوگی جب انہوں نے اس بھائی کو کفن میں لپٹے دیکھا ہوگا جو ان کی لاتعلقی و بے گانگی کی پروا کیے بنا روز اور وز اان کے پاس جایا کرتا تھا۔

غم کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں کتنے پچھتاوے کتنے افسوس اور کتنی آہیں ہوں گی۔ وہ خود پر اپنی ضد پر کس قدر خفا ہوں گے۔ اور اسے لگتا تھا ڈیڈی بدل گئے ہیں' وہ صرف آغا جان کے بیٹے بن گئے ہیں آغا جان نے انہیں پتا نہیں ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ وہ ڈیڈی نہیں رہے ہیں۔

"میں نے بہروز کو سمجھانا چاہا تھا فارہ! کہ اتنی عجلت میں نکاح کا فیصلہ درست نہیں۔ مگر وہ کہتا تھا یہ میرے مرنے والے بھائی کی آخری خواہش تھی' اس کی مجھ سے آخری خواہش۔ عمر بھر اس کی ایک نہیں سنی' مرنے سے پہلے جو ایک خواہش وہ مجھ سے کر گیا تھا۔ میں اسے تو پورا کر دوں۔"

تمہارا اور روحی کا رشتہ ہو جانے' ہمارے ٹوٹے رشتے اس ایک رشتے کی بدولت پھر جڑ جائیں۔ یہ میری بھی خواہش تھی' مگر میں یہ بھی جانتا تھا۔ روحی اس کے لیے راضی نہیں ہوگی' اس لیے بہروز کو سمجھانا اور روکنا چاہا تھا۔ مگر وہ ضدی اس بات پر بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔

پتا نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگتا ہے فارہ! کہ شاید بہروز کو بھی صہیب کی طرح اس کے وجدان نے خبر دے دی تھی کہ وہ اب زیادہ جیے گا نہیں' شاید اپنی موت سے پہلے وہ بھائی کی یہ آخری خواہش پوری کر جانا چاہتا تھا۔ اس لیے تھوڑے ضدی انداز میں اپنا فیصلہ روحی سے منوایا تھا۔

تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں فارہ! مگر بیٹا میرا یقین کرو' یہ نکاح میری کوئی ضد یا میرا فیصلہ نہیں' بہروز کا فیصلہ تھا۔ یوں کہہ لو کہ یہ ان دونوں بھائیوں کا فیصلہ تھا جو طے کر بیٹھے تھے کہ چند روز کے اندر آگے پیچھے ہی ہمیں اس دنیا سے' آغا جان کی زندگی سے رخصت ہو جانا ہے۔ میں نے صرف بہروز کی ضد مانی تھی' اس نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں اسے اس کے بھائی کی یہ آخری خواہش پوری کرنے دوں اور میں اس کے آنسوؤں سے ہار گیا تھا۔

"فارہ! تمہارے ڈیڈی نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ اب ان کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ نہ دو گی؟ ان کی بات نہ مانو گی؟"

اور اسے لگتا تھا آغا جان نے ڈیڈی کو ممی سے متنفر کروا دیا ہے۔ وہ اس روز اپنے ڈیڈی کی فیلنگز کو سمجھ کیوں نہیں پائی تھی۔

"یہ میرے مرجانے والے بھائی کی آخری خواہش تھی فارہ کہ تم اس کی بہو بنو اور ہمارا ٹوٹا رشتہ اس رشتے کے ذریعے پھر سے جڑ جائے۔"

جب نہیں پر آج وہ بری طرح رو رہی تھی' اس انسان کی موت پر' جس کے لیے اس نے زندگی بھر کبھی کوئی

فیلنگ محسوس نہیں کی تھی۔ نہ محبت نہ نفرت' جو بس ایک غیر اہم اور انجان شخص تھا۔ اس کا چچا صہیب خان۔ اس سے بہت محبت کرنے والا۔

اسے اس شخص کا اپنے گالوں پر پیار کرنے کے وہ والہانہ انداز یاد آیا۔ خون کی کشش کیا ہوتی ہے۔ خون کا رشتہ کوئی معمولی رشتہ تو نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں سے چھ سال پہلے مرجانے والے اپنے چچا کے لیے آج آنسو بہہ رہے تھے۔

آغا جان کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے اور وہ اسے دیکھتے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں دھیمی اور بھرائی آواز میں بولے جا رہے تھے۔

"فارہ! میں یہ نہیں چاہتا کہ اس نکاح کے لیے مجھے قصوروار اور ذمہ دار ٹھہرا' چھوڑ کر تم صرف اپنے باپ کو قصوروار ٹھہراتے لگو' اس سے ناراض ہو جاؤ۔ بیٹا! اپنے ڈیڈی سے ناراض مت ہونا' اس لیے تمہاری ناراضی و بدگمانی دور کرنے وہ اب بھی تمہارے پاس آ نہیں سکے گا' گر اس سے ناراض ہو تو بھی اپنی ناراضی ختم کر کے اسے معاف کر دو۔"

وہ بھی تو نہیں پوچھ سکی تھی ڈیڈی سے ان کے دل کا حال۔ لاہور اپنے گھر واپس آ کر جب وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس وقت اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے' شاید وہ اس وقت ممی سے بھی کچھ کہنا چاہتے تھے' ممی جو انہیں سمجھے اور ان کے احساسات کو جاننے کی کوشش کیے بغیر ناراض ہو کر چلی گئی تھیں۔

وہ ان کی زندگی کے آخری چند گھنٹے تھے۔ وہ ان کی زندگی کی آخری رات تھی کہ اگلی رات وہ پھر اسی گھر میں اسی جگہ ان کی میت رکھی تھی' پشاور لے جائے جانے کے لیے بالکل تیار۔

"ہمیں جن سے محبت کا بہت دعویٰ ہوتا ہے' غم کے لمحوں میں آزمائشوں کی گھڑیوں میں ہم ان کا حوصلہ' ان کا سہارا کیوں نہیں بن پاتے۔

جب انہیں ہماری ضرورت ہوتی ہے' وہ ہم سے محبت اور اعتبار پانے کے آرزومند ہوتے ہیں تب ہم انہیں تنہا کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ کیا ان کی زندگی کے ان آخری گھنٹوں میں' ان سے بہت محبت کا دعویٰ کرنے والی ممی کو ان کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے تھا؟ کیا ان کی محبت کا دم بھرنے والی بیٹی کو ان کے قریب نہیں ہونا چاہیے تھا؟

جب وہ زندگی کی بازی ہار رہے تھے' جب وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے تب نہ وہ بیوی ان کے قریب تھی نہ بیٹی۔ اکھڑتی سانسوں کے ساتھ ان کی بند ہوتی بجھتی آنکھوں نے کتنی حسرت و یاس سے اپنے ارد گرد اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاشا ہوگا۔

بیٹا! یہ رشتہ اگر قائم رہتا تو یقیناً یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوتی۔ لیکن اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں تو میں بھی خوش نہیں۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر تو میرے لیے کچھ اہم نہیں بیٹا! یہ رشتہ میری خوشی ضرور تھا مگر میری ضد ہرگز نہیں۔

میری انا' میری ضد قصے پارینہ ہیں جان عزیز۔ میں انا پرست اور ضدی تھا فارہ! مگر اب نہیں ہوں۔ صہیب

راضی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ پر یہ پابندی بھی لگا دی کہ میں ان پانچ سالوں کے دوران اپنی پوتی سے بھی ملنے نہیں آؤں گا ہاں فون کبھی کبھار کر سکتا ہوں۔ میں اس کا یہ خوف' یہ بدگمانی دور کر دینا چاہتا تھا کہ میں اس سے اس کی بیٹی کو چھیننے یا اس پر تسلط قائم کرنے کی کسی کوشش میں لگا ہوں اس لیے اس کی ہر شرط اور ہر خواہش مانتا چلا گیا۔ میری بہو' میری پوتی میری ذمہ داری تھیں' میں ان کا سرپرست تھا انہیں تحفظ نہ دے پاتا' انہیں اپنے گھر کی چھت نہ دے پاتا تو روزِ قیامت بہروز کا سامنا کیسے کرتا؟" آغا جان! یہ بھی تھی آپ کی محبت' میری بہو' میری بیٹی تنہا رہتی رہیں اور آپ نے کبھی ان کی پروا تک نہ کی؟" روتے روتے ان کی آواز پہلے سے بھی دھیمی ہو گئی تھی۔

وہ بہت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے یوں جیسے کوئی بہت وزنی بوجھ ان پر رکھا ہو یا وہ کسی اونچائی پر چڑھ رہے ہوں اور شدید تھکاوٹ اور کمزوری محسوس کر رہے ہوں۔

"فارہ! بیٹا یہ مت سمجھنا۔ میں تمہیں تمہاری ماں کے خلاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے یہ سب بھی نہ کہتا اگر مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ ہوتا۔

میری صحت ٹھیک نہیں رہتی بیٹا! کب بلاوا آ جائے پتا نہیں اور میں اس حال میں مرنا نہیں چاہتا کہ میرے بہروز کی واحد نشانی' میرا خون' میری پوتی مجھ سے خفا اور بدگمان ہو۔ یہ سمجھتی ہو کہ میں اس سے محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہوں محض ایک انا پرست انسان ہوں۔ فارہ! تم' ولی اور زرینہ میرے لیے کیا ہو' میں لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتا۔ میری آتی جاتی سانسیں میرے دل کی دھڑکنیں سب تم تینوں کے ساتھ جڑی ہیں۔ میں تم تینوں میں اپنے بیٹوں کو دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔

تم بس میری محبت کا یقین کر لو بیٹا! اس نکاح کے بارے میں سوچے بغیر' تمہارے اس نکاح کو.... میں خود میں ولی سے کہوں گا وہ تمہیں۔ جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔" ان کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ کھینچ کھینچ کر گہرے گہرے سانس لیتے جیسے انہیں آکسیجن کی شدید کمی محسوس ہو رہی تھی۔

روتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ انہیں سانس لینے میں شدید دشواری کا سامنا تھا لب کھینچ کر وہ جیسے کوئی بہت ہی شدید تکلیف' کوئی بہت ہی کڑا اور دہشت کے عمل سے گزر رہے تھے۔ انہیں پسینے آ رہے تھے ان کے چہرے کا رنگ بالکل فق ہو رہا تھا۔

"آغا جان۔" اس کے لبوں سے بے ساختہ ایک بلند اور ہراساں سی پکار نکلی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" آنکھیں کھول کر درد و ہمت سے برداشت کرتے وہ قصداً اور بدقت مسکرائے' اسے تسلی دینے کے لیے انہوں نے خود ہی اپنے کرتے کی جیب کی طرف ہاتھ لے جانا چاہا تھا' مگر وہ اس سے پہلے ان کی جیب سے دوا نکال چکی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں آغا جان؟ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟" انہیں وہیل چیئر سے سہارا دے کر بڑی مشکلوں سے اٹھاتے ہوئے وہ صوفے پر آرام دہ حالت میں بٹھا لینے میں کامیاب ہو گئی اور ان کی نبض دیکھی۔

ان کے بائیں بازو میں شدید درد پھیل رہا ہے یہ ان کے مٹھیاں بھینچنے کے انداز سے پتا چل رہا تھا۔

جاتے جاتے مجھے اور بہروز کو یہ سمجھا گیا تھا کہ انا کی جنگ میں جیتتا کوئی نہیں اور ہارتے سب ہیں۔

کیا صہیب کے مرنے پر جب میں نے بہروز کو فون کر کے یہاں بلایا تو اس نے یہ سوچا ہو گا کہ میں جیت گیا آخر کار جھکنا تو آغا جان ہی کو پڑا اور کیا بہروز کو فون پر بھائی کے انتقال کی اطلاع دے کر گھر بلاتے میں نے یہ سوچا تھا کہ صہیب کی وجہ سے میں ہار گیا نہیں فارہ نہیں۔

تمہارا اور ولی کا رشتہ نہ میری انا اور ضد تھا اور نہ ہے۔ اسی انا کے زعم میں' میں نے اپنا بیٹا اور بہروز نے اپنا بھائی کھو دیا تھا۔ ولی کے ساتھ انا اور ضد کی کوئی جنگ لڑ کر میں تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ رشتہ تو بہت بعد کی بات تھی' بہت الگ بات۔ میری بنیادی ترجیح' میری اولین خواہش' میری آخر شب کی دعا تو فقط اتنی تھی بیٹا کہ میری بہو اور میری پوتی اپنے گھر واپس لوٹ آئیں۔ جو گھر ان کا حوالہ' ان کی شناخت ہے' وہ اسے اپنا لیں' قبول کر لیں۔ خونی' مشرقی اور محرم رشتوں کے ہوتے تم دونوں وہاں تنہا رہو یا ہے' اس میں تم دونوں کی خوشی ہی کیوں نہ شامل ہو میرا دل اسے گوارا نہیں کرتا تھا۔

روحی کو لگتا تھا کہ میں اس سے اس کی بیٹی کو چھین لینا چاہتا ہوں' اسے مجھ سے شکوہ تھا کہ میں نے اسے پرائے کی دھن میں اس سے اس کے شوہر کو دور کر دیا تھا۔

میں اسے کبھی یہ نہ سمجھا سکا کہ بہروز مرنے سے پہلے بدلا نہیں تھا اسے میں نے یا کسی نے بھی ورغلایا نہیں تھا۔ وہ بس بھائی کی اچانک موت کے صدمے کے زیر اثر تھا وہ اس غم سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔

یہ حقیقت ایزدی تھی کہ وہ دو ہفتے اس کی زندگی کے آخری دو ہفتے ثابت ہوئے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنے بارے میں تم دونوں کی ہر غلط فہمی خود دور کر دیتا اپنے پیار' اپنی محبت اور اپنی توجہ سے۔

میں روحی کو یہ سب سمجھانا چاہتا تھا' اس کے شکوک' بدگمانیاں اور ناراضیاں دور کرنا چاہتا تھا۔

اس لیے جو جو شرائط وہ میرے سامنے رکھتی گئی۔ میں مانتا گیا۔

اس نے کہا میں اسے اور فارہ کو پشاور لے جانے کی بات پھر کبھی نہیں کروں گا میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ طلاق کی بات کرتی تھی' میں نے کہا فارہ ابھی بہت چھوٹی ہے' پڑھ رہی ہے' اس وقت نکاح یا طلاق سے متعلق کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں۔ اس کا ذہن ابھی باپ کی موت کا صدمہ قبول نہیں کر پایا' ابھی اسے کوئی الجھن اور پریشانی نہ دو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے فی الحال وہ نکاح یا طلاق کی کوئی بات نہیں کرے گی مگر پھر میں بھی اس رشتے کے حوالے سے خاموشی اختیار کیے رکھوں گا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میں اگر خود کو سرپرست اور ذمہ دار قرار دے رہا ہوں تو صرف فارہ کا ہوں' اس کا نہیں۔ میں سرپرست' نگران اور ذمہ دار صرف اپنی اکلوتی پوتی کا ہوں' وہ میرا ایک پیسہ بھی لینا حرام سمجھتی ہے۔ لہٰذا مجھے اس بات کی بھی اجازت نہیں دے گی کہ میں اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلواؤں' میں نے اس کی بات مانتے تمہارا الگ اکاؤنٹ کھلوا دیا۔

وہ تمہارے ساتھ صرف سرپرستی کے نظریے کے تحت بھی اس اکاؤنٹ کی جوائنٹ اکاؤنٹ ہولڈر بننے پر

CS CamScanner

"سینے پر بہت بوجھ سا ہے بیٹا!" ان پر شدید ترین نقاہت' بے چینی اور گھبراہٹ طاری تھی۔ ان کا جسم ساکت سا ہو رہا تھا۔

تین منٹ گزرنے پر وہ طبیعت میں بہتری کے آثار نہ پا کر ان کی زبان کے نیچے دوسری گولی رکھ چکی تھی۔ اس نے ان کی نبض پھر دیکھتے ہوئے ان کے کرب و اذیت میں ڈوبے چہرے کو اور بے جان سے ہوتے جسم کو دیکھا۔ وہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ بتا نہیں پا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے نکلی۔

جس دروازے سے کچھ دیر قبل وہ ان کے ساتھ باہر نکلی تھی اسی سے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک طرف بی پی اپریٹس رکھا تھا اس نے وہ اسٹیتھو اسکوپ سمیت اٹھایا' پین کلر کا پتا اور پانی کی ایک بوتل لی اور بہت تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آئی جہاں وہ تینوں ابھی بھی اسی طرح باتیں کر رہے تھے۔

"ولی!" خود پر بمشکل کنٹرول رکھتے اس نے اسے آواز دی۔ وہ تینوں ایک ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جو وہ تینوں یک دم ہی صوفے پر سے بھی بے اختیار کھڑے ہوئے تھے۔ "آغا جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" وہ اطلاع دے کر رکی نہیں بلکہ الٹے قدموں واپس دوڑی بھاگی۔

وہ تینوں اس کے ساتھ بھاگے' ولی اس سے آگے نکل آیا تھا مگر کمرہ خالی دیکھ کر چونک کر رکا' وہ تب تک دوسرے دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ ولی اسی طرف دوڑا' پیچھے عباد اور زرمینہ بھی تھے۔

"کہاں ہیں آغا جان؟ تم انہیں ان کے کمرے سے باہر لے کر کس کی اجازت سے گئیں؟ تمہیں نہیں پتا معمولی سے کام اور حرکت سے وہ تھک جاتے ہیں' انہیں انجائنا کا اٹیک ہو جاتا ہے۔" زرمینہ اسے پورشن میں داخل ہوتا دیکھ کر چلائی۔ وہ اسے جواب دیے بغیر اندر لاؤنج میں آ گئی۔

ولی اس کے ساتھ وہاں داخل ہوا تھا۔ ولی نے انہیں آواز دی' انہیں چھو کر دیکھا' انہوں نے ایک پل کے لیے آنکھیں کھولیں پھر بند کر لیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے گہرے گہرے' اکھڑے ہوئے سانس لے رہے تھے۔

ان کے چہرے پر چند منٹوں کے اندر انتہا سے زیادہ کمزوری' سرخی اور تپش پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ان کا بی پی دیکھنے فوراً ان کے پاس جانے لگی مگر زرمینہ نے ایک جھٹکے سے بی پی اپریٹس اس کے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور اسے دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔

"خبردار جو تم نے میرے آغا جان کو ہاتھ لگایا۔" وہ روتے ہوئے اس پر چلائی۔

وہ بہت بری طرح رو رہی تھی' اس کے بری طرح کانپتے ہاتھوں سے تو اپریٹس ہی ٹھیک سے نہیں تھاما جا رہا تھا۔ دھکیلے جانے کے بعد وہ اس سے ایک قدم پیچھے ہی کھڑی تھی' اس نے خاموشی سے زرمینہ کے ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ بازو بند کس کر کھینچ سے باندھا' اسٹیتھو اسکوپ کان سے لگایا اور ان کا بی پی چیک کرنے لگی۔ ولی اور عباد آغا جان کے بالکل پاس کھڑے کبھی اسے اور کبھی آغا جان کو دیکھ رہے تھے۔

ولی نے زرمینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا مگر وہ بہت بری طرح روئے چلی جا رہی تھی۔ تین تین منٹس

کے وقفے سے وہ انہیں پانچ ٹیبلٹس دے چکی تھی' دوبارہ نبض دیکھی تھی بی پی دیکھا تھا' طبیعت میں بہتری نہ پا کر ایک پین کلر بھی دے دی تھی۔

مگر وہ اسی طرح تکلیف میں تھے' وہ اسی طرح درد کی شدت محسوس کر رہے تھے ان کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا تھا' ان کی کمزوری ہر لمحہ بڑھتی ہی نظر آ رہی تھی۔

اب ان کا فوراً ECG ہونا بہت ضروری تھا۔ انہیں فوراً کسی اچھے ہاسپٹل لے جایا جانا اب لازمی تھا۔ اس نے اپنے برابر کھڑے ولی کی طرف دیکھا' اسے اس سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں پڑی شاید اس وقت وہ خود بھی انہیں ہاسپٹل لے جانے ہی کا فیصلہ کر رہا تھا تب ہی خاصی عجلت میں عباد سے بولا۔

"عباد! گاڑی نکالو میں آغا جان کو لاتا ہوں۔" وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

ولی نے بڑی احتیاط اور آرام سے آغا جان کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور باہر نکلا' وہیل چیئر پر بڑی احتیاط سے چلاتا ہوا۔ زرمینہ روتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگی تھی' وہ بھی ان دونوں کے ساتھ ہی باہر آ گئی تھی۔

"زرمینہ! آغا جان کی رپورٹس لے کر آؤ۔" اس نے بری طرح روتی زرمینہ سے کہا۔

وہ زار و قطار روتے بس خوف زدہ نگاہوں سے آغا جان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے جیسے ولی کی بات دھیان سے سنی بھی نہیں تھی۔ مایوسی سے بہن پر ایک نگاہ ڈالتا وہ عفارہ سے بولا۔

"آغا جان کے بیڈ سائڈ ٹیبل کے اوپر والی دراز میں براؤن رنگ کی ایک فائل رکھی ہے وہ لے آؤ' اس کے نیچے کچھ دوسری رپورٹس اور ایکسرے بھی ہیں' وہ بھی لے آؤ۔" وہ بھاگتے ہوئے کمرے میں آئی جو کچھ ولی نے کہا تھا وہ سب نکالا اور باہر پورچ میں آ گئی۔

گاڑی اسٹارٹ کیے عباد اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ آغا جان کا سر اپنی گود میں رکھے ولی پیچھے بیٹھا تھا اور زرمینہ بھی آغا جان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے پیچھے ہی بیٹھی تھی۔

وہ ان کو ہاتھوں کو چومتی اسی طرح روتی جا رہی تھی۔ عفارہ وہ فائل اور دوسرے خاکی لفافے ہاتھ میں لیے اگلی سیٹ پر عباد کے برابر بیٹھ گئی۔ اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے اس کا دل بھی زرمینہ کی طرح ہسٹرک ہو کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر خود پر قابو رکھتے' خود کو یہ یاد دلاتے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے' وہ ڈاکٹر جس پر اس کے والد کو فخر ہے' خود کو سنبھال رہی تھی۔

"لوگوں کو ایک ڈاکٹر بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ میرے پاس تو دو دو ہیں اور وہ بھی راؤنڈ دا کلاک۔"

"خبردار جو میری پوتیوں کی قابلیت پر کوئی شبہ کیا ہو تو۔ میری پوتیاں ذہین' قابل' لائق فائق۔"

ہاسپٹل تک پہنچنے کے اس راستے میں ان کی میڈیکل ہسٹری سے آگاہ ہونا چاہتی تھی تاکہ ان کے کارڈیالوجسٹ سے بہتر انداز میں بات کر سکے۔ اس نے وہ موٹی فائل کھولی۔ اس میں تاریخ کے اعتبار سے آغا جان کی تمام رپورٹس ترتیب سے لگی تھیں۔ تین روز قبل ہونے والے ان کے ای سی جی اور ہفتہ قبل ہونے والے ایکو کی رپورٹس سب سے اوپر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھتی صفحے پلٹتی گئی' ترتیب سے لگی ای سی جی تھے' خون کی کئی رپورٹس تھیں۔

CamScanner

وہ ایک ای سی جی کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔ اس نے اس طرح ای سی جی پر درج تاریخ اور وقت پڑھا۔ ۶ نومبر شام چھ بج کر چودہ منٹ نومبر ۶ نومبر۔

"مجھے طلاق چاہیے۔ میں ولی صاحب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔" آغا جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں اور ان سے وابستہ ہر چیز کو رد کرنے والا وہ دن، کیا تاریخ تھی اس روز۔

زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی اسے یاد تھا۔ دو مہینے پہلے کی وہ صبح چھ نومبر کی صبح تھی۔ بہت سادہ سی بات تھی بہت عام سی چھ نومبر کی صبح اس نے انہیں اور ولی صاحب خان کو اپنے گھر پر ذلیل و بے عزت کیا تھا دوسروں سے کروایا تھا اور چھ نومبر کی شام انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

اور یہ ہاسپٹل کی ڈسچارج شیٹ تھی۔ چھ نومبر کو دل کے دورے کے سبب ہاسپٹل داخل ہونے والے محمد بختیار خان وہاں سے بیس نومبر کو ڈسچارج ہوئے تھے۔

"بیٹا! میری صحت ٹھیک نہیں۔ میری زندگی کا کچھ پتا نہیں۔ فارہ سے ایک بار میری بات کرا دو۔" یہ نو نومبر کی رات تھی۔

چھ نومبر کو اتنے شدید ہارٹ اٹیک کا شکار ہونے والا نو نومبر کو کہاں ہوگا؟ آئی سی یو میں؟ سی سی یو میں اور فارہ بہروز خان صوفے پر بیٹھی تھی بے نیاز، لاتعلق۔ اس کی ماں آئی سی یو یا سی سی یو سے التجا کرتے اس بوڑھے انسان پر چلا رہی تھی۔

"فارہ آپ سے بات نہیں کرے گی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا وہ آپ سے صاف صاف کہہ چکی ہے۔ آپ کے خاندان سے جڑ کر اس کی ماں کو کون سا سکھ نصیب ہو گیا جو وہ خود کو قربان کروا لے۔ وہ آپ سے کہہ چکی ہے کہ اسے آپ سے اور آپ کے پوتے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ اگر آپ کو جگ ہنسائی اور اپنی عزت کا خیال ہے تو کہیے اپنے پوتے سے خاندانی اور مہذب ہونے کا ثبوت پیش کرتے میری بیٹی کو طلاق دے دے۔

یا اگر واقعی آپ کو اپنی پوتی سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ فرما رہے ہیں تو اسے جائیداد میں اس کا جائز اور قانونی حق دے دیں کیوں نہیں دے دیتے۔" وہ سکون سے بیٹھی رہی تھی اور اس کی ماں اس بوڑھے انسان پر خوب چلا کر فون بند کر چکی تھی۔

"کیا فرما رہے تھے بزرگوار؟" تجمل ماموں نے طنزیہ انداز میں ممی سے پوچھا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میری زندگی کا کچھ پتا نہیں۔ فارہ سے ایک بار میری بات کرا دو۔ ہونہہ ساری زندگی اپنی بیماریوں اور مرنے کے ڈراوے دیتے آئے ہیں اور زندہ خیر سے اب تک ہیں۔ پہلے بیٹے کی موت اور اپنی بیماری کو ہتھیار بنا کر میرے شوہر کو میرے خلاف کیا، میری بیٹی کا زبردستی نکاح پڑھوایا اور اب بیماریوں کے ڈرامے کر کے فارہ سے اپنا من چاہا فیصلہ کروا کر اسے میرے خلاف لے جانا چاہتے ہیں۔" ممی نفرت سے بولی تھیں۔

"ابھی تین روز پہلے تو یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ مجھے تو بالکل بھلے چنگے دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے بالکل تندرست۔ اب اس بڑھاپے میں نوجوانوں جیسی صحت تو ان کی ہونے سے رہی۔" زہرہ مامی کا

لہجہ چنگ آمیز اور انتہائی تمسخرانہ تھا۔

اس کے کانوں میں آغا جان کی کچھ دیر پہلے کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ اگر زمین اور آسمان کے بیچ کوئی جگہ ایسی تھی جہاں وہ اپنا یہ سنگدل اور ظالم وجود چھپا سکتی ہو تو وہ وہاں عمر بھر کے لیے چلی جانا چاہتی تھی۔

"تم میرے پاس یہاں آ گئیں، تمہارا بہت شکریہ بیٹا!" وہ بوڑھا انسان کوئی شکوہ گلہ اور شکایت کیے بغیر اس شقی القلب، گھٹیا، بیچ اور پست لڑکی کا شکریہ ادا کر رہا تھا جو یہاں بوڑھے بیمار دادا سے ملنے نہیں بلکہ ایک ایگریمنٹ ایک معاہدے کے تحت آئی تھی۔

"تم جلدی جانا چاہتی ہو۔ میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ محبتوں کی عینک لگا کر اسے دیکھتے تھے اس لیے اس کا گھٹیا پن اس کی پست ذہنیت انہیں نظر نہیں آتی تھی مگر ولی صاحب خان کو نظر آتی تھی۔

وہ بوڑھا بیمار دادا جو اس کی راہ تک رہا ہے، اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کو مچل رہا ہے، وہ اس کی بیماری، بے بسی اور بے کسی سن کر بھی وہاں نہیں جائے گی، وہ گھٹیا اور بے غیرت لڑکی جو بات سن کر وہاں جانے کو آمادہ ہو سکتی تھی اس نے وہی بات اس سے کہی تھی اپنی انا، اپنی ضد اور اپنی عزت نفس کو پس پشت ڈال کر۔

اس لیے کہ وہ اس کے گھٹیا پن اس کی سنگدلی اور بے حسی سے بخوبی آگاہ تھا۔ دادا کی بیماری کا سن کر وہ کبھی یہاں آتی؟ کبھی بھی نہیں۔

وہ بوڑھا انسان بیمار تھوڑی تھا۔ وہ تو بیماریوں کے ڈرامے کیا کرتا تھا، اپنی موت سے ڈرا کر لوگوں سے من چاہے فیصلے کروایا کرتا تھا۔ وہ محبتیں لٹانے والا دادا اپنی اس پوتی کی اصلیت جان لے کہ وہ اس کی محبت میں نہیں بلکہ طلاق کے لالچ میں آئی ہے، اس سے رشتے جوڑنے نہیں بلکہ ہر رشتہ توڑنے آئی ہے تو کیا گزرے گی اس کے بیمار و کمزور دل پر؟

اسے اپنے وجود سے گھن آئی۔

جب اس کا بوڑھا بیمار دادا مرنے کو پڑا تھا تب وہ اسے خلع کے نوٹس بھجوا رہی تھی، جب وہ اسے اس کے موبائل اور گھر کے نمبروں پر کال کر کر کے تھکتا، بستر پر نڈھال پڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا تب وہ اپنے گھر میں اپنی خود ساختہ بدنصیبیوں اور دکھوں کا ماتم کر رہی تھی۔

وہ تو نئے سال کے اس پہلے دن ولی صاحب خان کی فون پر آواز سننے کی بھی روادار نہ تھی۔ لفظ طلاق نے اسے اس کی بات سننے پر آمادہ کیا تھا۔

"ولی! فارہ کہاں ہے؟" اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ان کی بہت ہلکی آواز سنی۔

"فارہ ہمارے ساتھ ہے آغا جان!" ولی نے سنجیدگی سے انہیں جواب دیا۔

"زرینہ! میں ٹھیک ہوں بیٹا!" اس بار انہوں نے سست آواز میں روتی ہوئی زرینہ کو تسلی دی۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنی دونوں پوتیوں کی فکر تھی۔

وہ ریورس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی، اس میں جرأت ہی نہ تھی گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کی۔ گاڑی ہاسپٹل

CamScanner

کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔

یہ تینوں باہر کوریڈور میں کھڑے تھے اور ولی اندر سی سی یو میں تھا۔ وہ اندر ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر ولی کو جاتا دیکھ کر باہر رک گئی تھی۔

"کیا کہا تھا تم نے میرے آغا جان سے؟" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی جب زرینہ آنسو صاف کرتی کسی زخمی شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی تھی۔ وہ اس کے سر پر کھڑی خونخوار نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"وہ ابھی دوپہر تک' تھوڑی دیر پہلے تک بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے ان کے لیے کھیر پکائی ہے' یہ سن کر خوش ہو رہے تھے' صبح لالہ نے انہیں ٹہلوایا تھا انہوں نے اپنے سارے کام آرام سے کیے تھے وہ بالکل ٹھیک تھے ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ تم نے انہیں کچھ کہا ہے جو ان کی طبیعت ایک دم بگڑی ہے۔ کیا کہا تھا ان سے؟ تمہیں طلاق چاہیے' جائیداد میں اپنا حصہ چاہیے؟" نفرت و حقارت سے اسے دیکھتے وہ زور سے چلائی۔ عباد فوراً اس کے پاس آیا۔

"زرینہ! بری بات ہے' اس طرح بات نہیں کرتے۔ یہ ہاسپٹل ہے' سی سی یو ہے۔ تم تو خود میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو تمہیں نہیں پتا یہاں آہستہ آواز میں بولتے ہیں۔"

ولی موبائل پر کسی کا نمبر ملاتا باہر نکلا تھا اس نے ایک نظر اس منظر کو دیکھا مگر اس کے کچھ کہنے یا کرنے سے پہلے زرینہ اس کے پاس بھاگتی ہوئی آ گئی۔

"آپ اسے اپنے ساتھ کیوں لے کر آئے لالہ؟ دیکھیں' اس نے آغا جان کو پھر کہاں پہنچا دیا۔ آپ اسے طلاق دے دیں۔ آپ اسے جائیداد میں اس کا سارا حصہ بلکہ حصے سے بھی زیادہ دے دیں اور اس سے کہیں یہ اب عمر بھر ہمیں اپنی شکل نہ دکھائے۔ چلی جائے وہیں واپس جہاں سے آئی ہے۔

اس کے پاس تو اس کے ہمدرد اور مہربان بہت ہیں ہمارے پاس تو بس یہ ایک دادا ہی ہیں انہیں کیوں ہم سے چھین لینے یہاں آئی ہے۔" وہ ولی کے بازو پر سر رکھ کر پھر زار و قطار رونے لگی۔ روتے روتے اس نے یک لخت سر اوپر اٹھایا اور بہت نفرت سے بولی۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو قارہ خان! اگر میرے آغا جان کو کچھ ہوا تو میں تمہیں چین سے جینے تو ہرگز نہیں دوں گی۔"

ولی اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر آہستہ آواز میں بہت پیار سے اس سے کچھ کہتا اسے قریب نظر آتی ایک بینچ کی طرف لے گیا۔

عباد نے ایک شرمندہ سی نگاہ قارہ پر ڈالی۔ وہ شاید زرینہ کے رویے کی تلافی کے لیے اس سے کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ ان تینوں پر ایک نگاہ ڈالتی اندر آغا جان کے پاس سی سی یو میں آ گئی۔

انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی ان کی آنکھیں بند تھیں' ان کے سینے پر کچھ تار چپکے تھے' ان کے دل کی رفتار' ان کی دھڑکنوں کا شمار کرتی کچھ مشینیں ان کے قریب موجود تھیں۔

وہ سانس بھی لے رہے ہیں' ان کا دل دھڑک رہا ہے کہ نہیں' اس نے ایک ڈری ڈری نگاہ ان پر ڈالی اور

پھر اس مشین پر۔ ان کے سوئی پیوست ہوئے ہاتھ کو اس نے جھک کر آہستگی سے چوما۔

"آپ کو میرے پاس سے اپنے بیٹے کی خوشبو آتی ہے اور مجھے آپ کے پاس سے اپنے باپ کی خوشبو آتی ہے۔ ہمارا رشتہ تو اتنا مضبوط' اتنا اٹوٹ ہے۔ بہت بری قارہ کو آپ نے بہت دیکھا ہے' ایک بار اسے اچھا بننے کا موقع دے کر بھی دیکھیں۔

ابھی ابھی آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ کی سانسیں' آپ کی دھڑکنیں' میرے ساتھ جڑی ہیں' پھر جب میں سانس لے رہی ہوں' میرا دل دھڑک رہا ہے تو آپ کی سانسیں کیسے ختم ہو سکتی ہیں' آپ کی دھڑکنیں کیسے خاموش ہو سکتی ہیں۔"

وہ بہت آہستہ آواز میں ان سے کہہ رہی تھی اس کی آواز ان کی سماعتیں سن رہی ہیں اسے یقین تھا۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو بڑی خاموشی سے گر رہے تھے۔

"آپ برسوں سے مجھ پر محبتوں کی بارش برساتے آئے ہیں۔ ایک بار مجھے بھی تو موقع دیں میں آپ سے اپنی محبت ثابت کر سکوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں آغا جان! میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ دھیمی آواز میں سرگوشی کے سے انداز میں' ایسے جیسے انہیں ڈسٹرب نہ کرنا چاہتی ہو' آنسو بہاتی انہیں اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی۔

اسی وقت پردہ کھینچ کر کوئی اندر آیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور کرسی پر سے فوراً کھڑی ہو گئی۔ ولی تھا اس کے ساتھ ایک سینئر ڈاکٹر اور پیچھے ایک جونیئر ڈاکٹر اور نرس بھی تھے۔

وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی مگر نکلتے نکلتے جو آوازیں اور باتیں اس نے سنیں وہ اسے یہ سمجھا گئیں کہ یہ سینئر ڈاکٹر آغا جان کے کارڈیالوجسٹ تھے۔ آغا جان برسوں سے انہی کے زیر علاج تھے۔

زرینہ سی سی یو کے شیشے کے دروازے کی طرف مسلسل امید' آس' خوف اور ہراس سے دیکھے جا رہی تھی اور عباد اس کے پاس بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک طرف خاموشی سے آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ ہاسپٹل آنے کے راستے میں سرسری ان کی ساری رپورٹس دیکھ آئی تھی۔ ان کے تینوں ہارٹ اٹیکس کی تفصیلات بھی دیکھ لی تھیں۔

ان کا دل کتنے فیصد کام کر رہا ہے اور کتنے فیصد زخم خوردہ و بے کار ہو چکا ہے وہ یہ بھی جان چکی تھی۔ پہلے ہارٹ اٹیک کی تاریخ اس کی پیدائش سے بھی قبل کی تھی۔

دوسرا ہارٹ اٹیک وہ تھا جب مصعب خان کا انتقال ہوا تھا اور جب بستر پر بیمار پڑے اس وجود سے اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ممی کو تو وہ بیماری بھی ڈھونگ اور ڈرامہ لگی تھی۔

اور تیسرا' تیسرے کی تو بات ہی الگ تھی۔

پچیس فیصد جس کا دل کام کر رہا ہو' جو تین ہارٹ اٹیکس سہہ چکا ہو' جو معمولی کاموں کے کرنے سے بھی انجائنا میں مبتلا ہو جاتا ہو' اس کے لیے ڈاکٹر کیا کہتا۔ میں دوا کرتا ہوں آپ دعا کیجیے۔ مریض کو خوش رکھیے اسے ٹینشن میں نہ آنے دیجیے۔ اسے خوشگوار ماحول دیجیے' کوشش کیجیے کوئی اختلافی امور' لڑائی جھگڑا اس کے سامنے نہ ہو۔

اگر نفرتوں کے مضبوط قلعے میں حقیقت اس کی پوری ایسا ہونے دیتے تو۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں اور وہ چاروں کسی طے شدہ معاہدے کے بغیر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اندر ان کے پاس آئی سی یو میں جا کر بیٹھتے اور پھر دوسرے کو اندر آنے کا موقع دیتے خود باہر آ جاتے تھے۔

عباد نے اپنے گھر فون کر کے اپنے چھوٹے بھائی سے دونوں بچوں کو گھر لے جانے کو کہہ دیا تھا کہ آغا جان کے گھر پر بہت سے ملازمین کی موجودگی کے باوجود بھی وہ بہت چھوٹے بچے ماں باپ کے بغیر اکیلے وہ نہیں رہ سکتے تھے۔

"میں آغا جان کے پاس میں ہوں۔ تم لوگ گھر جاؤ۔" رات دس بجے ولی زرینہ اور عباد سے بولا تھا اس کی طرف دیکھے یا اس کا نام لیے بغیر یہ بات کہی گئی تھی مگر ظاہر ہے اس جملے کی مخاطب وہ بھی تھی۔

زرینہ گھر جانے کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ ولی اور عباد سے یہاں رکنے کی ضد کر رہی تھی۔ عباد اور ولی نے بڑی مشکلوں سے اسے بچے گھر پر اسے یاد کر رہے ہوں گے اور آئی سی یو میں تو ویسے بھی ایک سے زیادہ کوئی فرد رک نہیں سکتا جیسی باتیں کہہ کر گھر جانے پر راضی کیا تھا۔ زرینہ دوبارہ اندر آغا جان کو دیکھنے چلی گئی تھی۔ وہ چند منٹوں بعد واپس آئے گی تو یقیناً ولی اسے بھی ان لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے کہے گا۔ بہت زیادہ مضطرب اور بے قرار ہوتے وہ سیدھی ولی کے پاس آئی۔

"ولی! میں آغا جان کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں! تم یہاں اکیلے۔"

"ولی! پلیز مجھے یہاں رکنے دو۔ پلیز مجھے یہاں سے مت بھیجو۔" وہ کبھی تھی کہ اجنبیوں کے سامنے آنسو نہیں بہاتی اور اس پل ولی سے التجائیہ انداز میں یہ بات کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

دوپہر سے ہسپتال میں آنے کے بعد زرینہ جتنا روئی تھی وہ اتنی ہی خاموش رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر کوریڈور میں اکیلی بالکل خاموش کھڑی رہی تھی۔ عباد نے اس سے بینچ پر بیٹھنے کو ایک دو بار کہا تھا مگر وہ ویسی ہی کھڑی رہی تھی۔ اس وقت سامنے کھڑے عباد نے اسے یوں روتے تاسف سے دیکھا ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا کہ وہ اسے تسلی دے سکتا یا کوئی اپنائیت بھری بات کہہ سکتا مگر اس وقت اس کا اسے تسلی دینے کو دل چاہا تھا۔ عباد نے ولی کو بغور دیکھا۔ کاش ولی اسے یہاں رکنے دے۔ اس نے دل میں سوچا۔ ولی نے فارہ کو ایک لمحے کے لیے دیکھنے کے بعد کچھ سوچا تھا پھر اس پر سے نظریں ہٹا کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" زرینہ بھائی سے تحت شائی کہ اسے گھر بھیج کر وہ اس لڑکی کو آغا جان کے پاس رکنے کی اجازت دے رہا ہے جو آغا جان کی آج اس حالت کی ذمہ دار ہے۔ عباد کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ آغا جان کے پاس اندر آ گئی اور ولی باہر شاید کسی بینچ پر بیٹھا تھا۔

آغا جان کو بدستور آکسیجن لگی ہوئی تھی سکون آور ادویات کے زیر اثر وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ کرسی ان کے بیڈ کے بالکل قریب کر کے ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی اور اس کے ذہن کی اسکرین پر ماضی کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

اس انسان کی اس موجودہ حالت کی ذمہ دار وہ تھی انہیں اس حالت تک پہنچانے والی وہ تھی مگر وہ یاد کرنا چاہتی تھی۔ ماضی میں اس شخص کے ساتھ اس نے کیا کیا کچھ غلط کیا تھا۔

"آ گئے میرے بچے۔" یہ اس بوڑھے انسان کے لبوں سے اس نے پہلے الفاظ سنے تھے۔ یہ اس کی اس کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ سرسری نگاہوں سے اس نے اس بوڑھے انسان کو کسی توجہ اور دلچسپی کے بغیر دیکھا تھا۔ یہی وہ آغا جان تھے نا جنہوں نے اس کے ڈیڈی کو کسی سے محبت کے جرم کی سزا دیتے برسوں پہلے ان کے اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور اس کی ممی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اس کے لیے نفرت تھی۔

"فارہ! اپنے دادا کے پاس نہیں آؤ گی؟ ارے ہی بیٹا! تم وہاں کیوں رک گئیں۔ یہاں آؤ۔ کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟ دیکھو تو صہیب کیسے مجھ سے چھوٹ گیا؟" انہوں نے ان کے استقبال کے لیے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اٹھ نہ سکے تھے۔

بیٹے کی موت کے تیسرے دن ان کے بیمار دل پر ایک تازہ زخم لگا تھا انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ کئی دن ہسپتال رہ کر اسی روز گھر واپس آئے تھے۔ وہ اپنے اس وقت کے رویوں کے لیے خود کو مجرم گردانتے جو ناتجربہ کار کم سن کہہ کر جان چھڑانے لگے کی کے رویے کو کیا نام دے؟ جنہوں نے رسم دنیا کے لیے بھی آغا جان سے ان کے بیٹے کے انتقال پر تعزیت نہ کی شوہر کو غم کی اس گھڑی میں حوصلہ نہ دیا اس کی دل جوئی نہ کی ولی اور زرینہ کے سروں پر شفقت بھرا ہاتھ نہ پھیرا۔

ممی نے ہمیشہ اپنی غلطیوں کا الزام آغا جان پر ڈالا۔ آخر کیوں؟ ان کا شوہر آغا جان نے ان سے دور کر دیا تھا یا وہ خود بدگمانیوں میں گھر کر شوہر سے دور ہوگئی تھیں۔

ڈیڈی ۲۲ سال بعد اپنے گھر آئے تھے باپ سے ملے تھے اور کس حال میں ملے تھے۔ ان کا مسکراتا زندگی سے بھرپور صحت مند بھائی زندگی کی بازی ہار گیا تھا انہیں منا منا کر واپس بلا بلا کر ہار گیا تھا۔ باپ شدید بیمار تھا۔ انہیں شدت سے یہ احساس ندامت ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ضد توڑ کر یہاں پہلے کیوں نہیں آئے۔

ممی بجائے ان کی کیفیت ان کا غم ان کا درد سمجھنے کے ان سے دور ہوگئیں۔ اپنے اور ان کے بیچ ایک اجنبیت قائم کر ڈالی۔

انہوں نے تو یہاں آنے سے قبل ہی ڈیڈی کی چند روزہ غیر حاضری اور دوری پر یہ بدگمانی اور شک دل میں راسخ کر لیا تھا کہ ڈیڈی کو ان کے گھر والوں نے ممی کے خلاف کر دیا ہے۔ وہ اس گھر میں پہلی بار آئی تھیں وہ اپنے سسر سے پہلی بار مل رہی تھیں مگر دل میں کینہ و نفرت لیے۔

اس کا نکاح تو ایک بالکل الگ واقعہ تھا اور اس واقعہ کی وجوہات آغا جان نے اسے آج بتائی تھیں لیکن آج وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نکاح نہ ہوتا صرف اپنا نا ہور کا گھر چھوڑ کر بیٹا اور آغا جان کے گھر مستقل رہائش اختیار کرنے کی بات ہی ڈیڈی نے کی ہوتی ممی تب بھی یوں ہی ری ایکٹ کرتیں جیسے انہوں نے تب کیا تھا۔

اس گھر نے برسوں انہیں یہاں کی بڑی بہو کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا تھا اور اب وہ اس گھر اور یہاں بسنے والوں کو معاف کرنے کو تیار نہ تھیں۔ یہ نہ سوچا کہ اس گھر نے ایسا تیئیس برس پہلے کیا تھا۔ ڈیڈی ان تیئیس برسوں

میں پلٹ کر کبھی یہاں آنے ہی نہیں اگر پلٹ کر آتے تو کیا پتا یہ گھر یا نہیں کھول کر ان کا استقبال کرتا۔ اس کے نکاح کے لیے ہونے والا ممی اور ڈیڈی کا جھگڑا جس کے لیے اس نے ہمیشہ ممی کو مظلوم اور ڈیڈی کو ظالم سمجھا تھا۔

آج جب ڈیڈی کے نظریے سے سوچ رہی تھی' ان کے دل میں جھانک کر اور ان کی نگاہوں سے اس دن کو یاد کر رہی تھی تو احساس ہو رہا تھا جھگڑا ڈیڈی نہیں ممی کر رہی تھیں۔ وہ شوہر سے کس لہجے اور کس انداز میں مخاطب تھیں۔ روحی بیٹا! سارے گلے' رنجشیں اور پچھلی ہر بات بھول جاؤ۔ تم میرے لیے میری بہو نہیں بیٹی ہو۔" ممی کی آنکھوں میں موجود نفرت دیکھنے کے باوجود وہ کس طرح ان تین دنوں میں کئی بار ممی سے یہ جملے کہہ چکے تھے اور وہ نفرت بھری خاموشی لیے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔

ڈیڈی کو بیوی کے اس تحقیر اور نفرت بھرے رویے سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا کتنا دکھ ہوا ہوگا' جس کی محبت میں انہوں نے باپ کی نافرمانی کر کے عارضی سول لے کر اپنے گھر اور اپنی ہر محبوب چیز کو چھوڑ ڈالا تھا آج جب وہ اس سے یہ امید کرتے تھے کہ وہ ان کو سمجھے' دکھ کی اس گھڑی میں ان کے ساتھ کھڑی ہوگی تب وہ ان سے ناراض ان کے مقابل جا کھڑی ہوئی تھی۔

ممی نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا تھا وہ واپس آ کر وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔

یہ اعلان تھا اس بات کا کہ وہ شوہر کے ساتھ بیٹا اور اس کے باپ کے گھر نہیں جائیں گی' وہ اگر بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ وہ اپنے نکاح پر ڈیڈی سے اتنی ناراض اور شاکی تھی کہ اسے ممی کا ہر رویہ درست نظر آتا تھا۔

ہمیشہ اتنی چاہتیں لٹانے والا باپ' بیٹی سے والہانہ محبت کرنے والا باپ اگر اپنی عادت و مزاج کے خلاف ہمیشہ سے کچھ مختلف کر رہا تھا تو اس کے اسباب جاننے کی کوشش کیے بغیر اسے بھی باپ ظالم اور سخت گیر نظر آنے لگا تھا۔

شوہر کی زندگی کی آخری لمحوں میں اس کے پاس نہ ہونے کا الزام ممی بڑے اطمینان سے آغا جان پر ڈال کر اپنے اندر سر اٹھاتے احساسِ ندامت و پشیمانی کو بہلا رہی تھیں مگر جو سچ تھا وہ سچ تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ساتھ گزار دینے کے باوجود شوہر کی زندگی کے آخری دنوں میں اسے سمجھا نہیں۔

تیئیس سال تک جس شوہر نے انہیں محبت' عزت' وفا' سکھ اور چین سب کچھ دیا جب اسے ضرورت پڑی تب وہ اپنی وفا نبھانے اس کے ساتھ کھڑی نہ ہوئیں اور وہ خود اٹھارہ سال محبتیں' چاہتیں اور شفقتیں لٹانے والا وہ باپ کیا اس پر اپنی بیٹی پر اتنا حق بھی نہیں رکھتا تھا کہ اگر کہیں اس کا رشتہ طے کرنا چاہتا تو کر دیتا۔

کیا وہ ایسی بیٹی نہ تھی جو سوچ سکتی میرا اتنی چاہتیں لٹانے والا باپ کبھی میرے لیے کچھ غلط نہیں سوچ سکتا' اس کے اس فیصلے کا یقیناً کوئی سبب ہے اور یقیناً وہ اس میں میری بہتری دیکھ رہا ہے۔

وہ سنگ دلی اور ظلم کی حد تھی اس نے اور ممی نے ڈیڈی کی موت کا ذمہ دار تک اس شخص کو قرار دے دیا تھا۔

جس روز اس کا باپ مرا تھا' جس روز ممی کا شوہر مرا تھا۔ اس روز اس شخص کا بیٹا بھی تو مرا تھا۔ وہ جو اس کا باپ تھا اس کی ماں کا شوہر تھا' وہ ان [illegible] تھا۔ دکھ کہتے کس کو ہیں' کیا وہ جانتی ہے؟ اس کمزور دل تو اس بیمار

انسان نے ایک نہیں اپنے دونوں بیٹے کھو دیے تھے' یکے بعد دیگرے محض چند دنوں کے وقفے سے۔

بجائے اس کے کہ بیٹے باپ کے جنازے کو کندھا دیتے اس بوڑھے باپ نے بیٹوں کے جنازوں کو کندھا دیا انہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی میں اتارا اپنے ہاتھوں سے ان کی قبروں پر مٹی ڈالی۔

"آغا جان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ آپ لوگ اگر کچھ دیر ٹھہر جاتے تو۔" وہ آغا جان کا کوئی قریبی رشتے دار تھا جو ڈیڈی کی تدفین کے فوراً بعد انہیں واپس لوٹتا دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

وہ لوگ گیٹ کے پاس کھڑے تھے' ممی' تجمل ماموں اور وہ گیٹ سے نکل رہے تھے۔ وہی بھی اس رشتے دار کے ساتھ کھڑا تھا۔ آغا جان قبرستان سے آتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے تھے' کوئی کہہ رہا تھا شاید ان کی طبیعت بھی خراب ہو گئی ہے مگر اسے اور ممی کو ان کے صدمے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

اس گھر میں ٹھہر جاؤں؟ دعا کرتی ہوں اللہ مجھے اس منحوس گھر اور یہاں رہنے والوں کی شکلیں زندگی میں پھر کبھی نہ دکھائے۔" ممی اس رشتے دار کو نفرت سے جواب دیتی تجمل ماموں اور اسے ساتھ لیے وہاں سے باہر نکل گئی تھیں۔

اپنی خود ساختہ نفرتوں سے نکل کر کبھی سوچا نہ تھا۔ آج سب یاد آ رہا تھا تو سوچ رہی تھی۔ آغا جان نے وہ پہاڑ سا غم سہارا کس طرح ہوگا؟ ان کا دل تو غم سے پھٹ رہا ہوگا۔ پہلے ایک بیٹا پھر دوسرا جو ملا بھی تھا برسوں کی جدائی کے بعد تھا مگر وہ پہاڑ سا اور صبر و ہمت کا پیکر اپنے غموں سے سمجھوتا کرتا اپنی بیماری اور دکھوں کو بھلا کر چند ہی دنوں میں بہو اور پوتی کے پاس آ پہنچا تھا۔

"خواہش تو میری یہی تھی کہ تم لوگ میرے ساتھ رہتے لیکن بیٹا اگر تمہاری یہ مرضی نہیں تو ہم قارہ کا لاہور ہی میں داخلہ کروا دیتے ہیں۔" اور پھر یہاں سے سلسلہ شروع ہوا تھا اس شخص کی بے بہا محبتوں اور یہاں سے بے حساب نفرتوں کا۔

وہ تو آج بھی جب اسے اپنی زندگی ختم ہوتی نظر آ رہی ہے تب بھی بہت ڈرتے ڈرتے جب اپنی محبت کا اسے یقین دلا رہا تھا تو اپنی بیماری کا ہر ذکر دانستہ چھوڑ گیا تھا۔ اس پوتی کی ضد' اس کی ہٹ دھرمی اس دل کے مریض کو موت کے منہ میں لے جا رہی ہے' وہ دو مہینے پہلے تیسری بار دل کے دورے کا شکار ہوا پوتی کے ناروا رویے اس کے مرض کی شدتوں کو مسلسل بڑھا رہے ہیں۔ اس نے تو اس سے یہ شکوہ' یہ گلہ تک نہ کیا۔

یہ اس کی سچی محبت ہی تو تھی جو پوتی کو ندامت میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو اس کی ماں کا صریح ظلم اس کی زیادتیاں اور اس کی غلطیاں بھی اسے بہت ڈر ڈر کر بتا رہا تھا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ وہ اسے اس کی ماں کے خلاف کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ کہیں یہ سوچ کر ان سے بدگمان نہ ہو جائے۔

اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروا رہے ہیں' ان کے گھریلو اور دیگر تمام اخراجات اور اس کی تعلیم کا سارا خرچا اپنے ذمے لے رہے ہیں تو وہ ان کا فرض ہے اور ان ماں بیٹی کا حق ہے۔ ہاں بدلے میں اس شخص کے کوئی حقوق نہیں' ان ماں بیٹی کے کوئی فرائض نہیں۔ محبت نہ کریں وہ دونوں اس کی احسان مند ہی ہو جائیں۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد وہ اور ممی کس مالی بحران میں آ جاتے اگر آغا جان نہ ہوتے تو۔

CamScanner

اس کی میڈیکل کی مہنگی تعلیم تو ایک طرف رہی گھر کے اخراجات تک کے لیے چند ہی ماہ کے اندر اسے اور ممی کو کوئی ملازمت اختیار کرنا پڑتی۔ ذاتی گھر، گاڑی، تھوڑے بہت شیئرز جن کا Dividend آ جایا کرتا تھا، ممی کے زیورات اور بہت ہی قلیل بینک بیلنس پر مشتمل تھا ان کا کل اثاثہ ڈیڈی کے انتقال کے وقت۔

آج اگر وہ ڈاکٹر بہروز خان کہلائی جاتی ہے تو کس کے سبب، کس کے طفیل۔ حق، حق، حق۔ بہت سنا یہ لفظ اس نے ممی سے، تجمل ماموں سے، معیز سے، فرض، فرض، فرض یہ لفظ کسی نے سکھایا نہیں تو اس نے سیکھنا چاہا بھی نہیں جس دادا کے پیسے پر وہ اور اس کا سارا کنبہ عیش کرتا رہا۔ وہ کبھی اس کی شکر گزار احسان مند بھی نہ ہوئی۔ اس بوڑھے شخص نے آخر ایسا کیا گناہ کیا تھا کہ فارہ بہروز خان کے دل میں اس کی محبت نہ سہی ہمدردی اور احسان مندی بھی پیدا نہ ہو سکی۔

آخر وہ اس سے خفا کس بات پر تھی؟ اگر اپنے نکاح پر تھی تو وہ نکاح اس کے باپ نے کروایا تھا، وہ جا کر اپنے اس مرے ہوئے باپ سے لڑے۔

یا پھر وہ اس کی محبتوں سے بیزار ہے، اس کی چاہتوں اور الفتوں سے نالاں و تنگ ہے؟

"فارہ! پڑھائی ٹھیک چل رہی ہے ناں بیٹا؟ کوئی مشکل تو نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"فارہ! پیارا ممی سے ضد کر کے آ جاؤ ناں زرینہ کی شادی میں انہیں بھی ضد کر کے زبردستی ساتھ لے آؤ۔ ہم سب یہاں مل کر خوب مزے کریں گے۔"

"میں دن گن گن کر گزار رہا ہوں، کب میری بچی کی پڑھائی ختم ہو اور وہ اپنے آغا جان کے پاس ہمیشہ کے لیے آ جائے۔"

"جب تم میرے پاس آ جاؤ گی ناں پھر تم اور میں ہم دونوں یہاں مل کر کوئی ایسی ترکیب سوچیں گے کہ روحی بھی یہاں ہمارے پاس ہی آ کر رہنے لگے۔"

"فارہ! عید پر تمہاری بہت یاد آئی بیٹا! ولی اور زرینہ میرے پاس تھے مگر تم نہیں تھیں ناں، اس لیے ہر خوشی ادھوری تھی مگر میں نے رمضان میں بڑی شدت سے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ اگلی عید اگر میرے نصیب میں ہے تو اس میں میرے تینوں جگر کے ٹکڑے میرے ساتھ ہوں۔"

"تمہاری دادی کے زیورات تو پرانے فیشن کے ہو گئے۔ اب ڈاکٹر صاحبہ تھوڑا ہی کوئی آؤٹ ڈیٹڈ چیزیں پہنیں گی۔ میں نے تمہارے لیے سب زیور بالکل نئے اور آج کل کے فیشن کے مطابق بنوائے ہیں۔"

"یعنی اب مجھے علاج کے لیے ادھر ادھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر فارہ بہروز خان اپنے آغا جان کا خود علاج کریں گی اور وہ بھی بالکل مفت۔"

"کاش آج میرا بہروز زندہ ہوتا۔ اپنی بچی کو ڈاکٹر بنا دیکھ کر خوشی سے اس کے پاؤں ہی نہ ٹکتے زمین پر۔ فارہ تم نے اپنے ڈیڈی کا خواب پورا کر دیا بیٹا۔" بے پناہ پیار اور والہانہ محبت سے مہکتے یہ جملے اس نے اپنے کانوں سے سنے تھے۔ خود احتسابی کی یہ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

رات کا یہ آخری پہر تھا، وہ گہری نیند سو رہے تھے اور وہ کئی گھنٹوں سے ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہی تھی۔ چار

جنوری کی یہ ایک نہایت ہی سرد رات تھی۔ سی سی یو میں مکمل اور بھرپور ہیٹنگ ہونے کے سبب سردی کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ کرسی پر بغیر کسی کمبل کے صرف اپنی شال لپیٹ کر بیٹھی تھی اور ذرا سی بھی ٹھنڈک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مگر سی سی یو سے باہر کوئی ہیٹنگ نہ تھی۔ اسے ولی کا خیال آیا۔ وہ اس ٹھنڈ میں یخ بستہ کوریڈور میں کسی بنچ پر بیٹھا ہوگا۔ وہ آہستگی سے بغیر کوئی آواز پیدا کیے اٹھی اور پردہ ہٹا کر آغا جان کے کیبن سے باہر نکل آئی۔

وہ پورا کوریڈور طے کرتی ولی کی تلاش میں نظریں گھماتی رہی۔ یہ کوریڈور آگے دائیں اور بائیں میں مزید کوریڈورز میں جا کر کھلتا تھا۔

اس نے دائیں طرف دیکھا، وہاں دور دور تک سناٹا اور خاموشی کا راج تھا۔ بائیں طرف نظر ڈالی، جہاں وہ طویل کوریڈور ختم ہو رہا تھا، وہاں صرف ایک مدھم سا بلب روشن تھا اور بلب کی مدھم روشنی میں اسے ولی نظر آ گیا تھا۔ کوریڈور کے اختتام پر جہاں جا کر مزید کوئی کمرے نہیں تھے اور محض ایک دیوار تھی، وہاں وہ دیوار کے سامنے جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بالکل دبے قدموں چلتی اس کے پاس آ گئی۔ وہ سجدے میں تھا۔ اتنا طویل سجدہ۔ وہ تو اسے یہ کہنے آئی تھی کہ اب تم اندر چلے جاؤ، میں باہر بیٹھ جاتی ہوں، مگر وہ سجدے سے سر اٹھائے گا تو وہ اسے یہ بات کہے گی۔

وہ وہیں اس دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ولی سے چند انچ دور زمین پر بیٹھ گئی۔ سجدے میں جھکے اس کی پیٹھ ہلکے ہلکے ہل رہی تھی، اس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز سا رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

اس طویل سجدے میں وہ رو رو کر اللہ سے اپنے دادا کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

یہ تھا شاہ میر کبیر دادا کے لیے 'دولت' جائیداد کی خاطر اپنا کیریئر، مزید اعلیٰ تعلیم اور کامیابیاں چھوڑ آیا تو بہت احسان کیا۔ کسی غریب، بے آسرا و بے سہارا دادا کے لیے سب کچھ چھوڑ کر واپس آیا ہوتا تو بات بھی تھی۔ یہ سوچا کرتی تھی ناں وہ ولی صہیب خان کے بارے میں۔

خود اپنے گریبان میں کبھی جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ تو غریب کیا امیر دادا کے پاس بھی ایک ایگریمنٹ کر کے آئی تھی۔

جب وہ امیر زادہ اس جیسی گستاخ، بدتمیز اور خود سر لڑکی پر مسلسل اپنا پیسہ لٹا رہا تھا تو ولی صہیب خان تو اس کا بہت فرماں بردار اور چاہتیں لٹانے والا پوتا تھا۔

وہ امریکہ شوق سے بیٹھا رہتا، اپنا کیریئر بناتا رہتا اور ساتھ ہی یہاں سے امیر دادا سے اسی طرح پیسہ بٹورتا رہتا جیسے خود غرض اور بے حس فارہ بہروز خان بٹورا کرتی تھی اور ولی صہیب خان، فارہ ہی کی طرح کوئی احسان تو نہیں، میرا حق ہے کہہ کر اسے وصول کیے جاتا۔

کیا یہ ضروری تھا کہ صہیب خان کے بچے اس کی طرح فرماں بردار و سعادت مند ہوں گے اور بہروز خان کی اولاد اس جیسی ضدی و سرکش؟ رشتہ ایک ہی تھا مگر بہت فرق تھا فارہ بہروز خان اور ولی صہیب خان و زرینہ عبدالرحمن میں۔ دادا نے تینوں پوتے پوتیوں پر ایک ہی طرح چاہتیں نچھاور کی تھیں۔

تینوں کو ایک جتنا ہی چاہا تھا مگر وہ دونوں بھائی بہن اس کی طرح احسان فراموش و خود غرض نہ تھے۔

وہ دادا سے سچے دل سے محبت کرتے تھے ایک پوتی انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی اور وہ دونوں اسے موت کے منہ سے نکالنے کی سعی کرتے دن رات ایک کر کے اس کی تیمارداری کر رہے تھے۔

اپنا گھر، شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں، شوہر، بچے ان سب کے ساتھ زرمینہ عبدالرحمٰن اپنے دادا کے پاس صبح، شام، دن رات ان کی خدمت اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔

نوکروں کی ایک فوج کے ہوتے اس کا پرہیزی کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی اسے وہ خود دیتی تھی، کسی کو دکھانے یا متاثر کرنے کے لیے نہیں اپنی محبت، اپنا فرض اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر۔

جو فارہ بہروز خان سے صرف اس لیے نفرت کرتی تھی کہ وہ اس کے دادا کو دکھ پہنچا رہی تھی اور یہ ولی صاحب خان جس سے وہ نفرت کرتی ہے جسے وہ جائیداد کا لالچی سمجھتی ہے، وہ اسے اس لیے طلاق نہیں دیتا کیونکہ وہ جائیداد میں بٹوارا نہیں چاہتا۔

اسے اپنے داخلہ فارم پر دستخط کرتے آغا جان کے کانپتے ہاتھ بھول گئے، وہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ و لرزش کے سبب دستخط کتنی مشکلوں سے کر پائے تھے۔ داخلہ فارم میں ان دستخطوں کی اتنی چھان پھٹک نہ ہوگی مگر بینکوں و دیگر مالیاتی اداروں میں تو ہر بار ہوگا۔

اگر اس کے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ ہولڈر خود نہیں بنے تھے ولی کو بنایا تھا تو اس لیے کہ ان کے دستخط میں فرق آ سکتا تھا اور لازماً آتا، دیگر ہر جگہ بھی اس کے دستخط کو یقیناً کارآمد اس لیے بنوایا گیا تھا قانونی حیثیت اسی لیے دلوائی گئی تھی کہ لکھتے اور دستخط کرتے ان کے ہاتھوں میں مسلسل لرزش و کپکپاہٹ رہا کرتی تھی۔

اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا یا یونہی اس نے سجدے سے سر اٹھایا تھا وہ اسی طرح زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنے پر سر رکھ کر بیٹھی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

فارہ نے دیکھا کہ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ دن بھر میں اس نے ایک بار بھی اسے حواس کھوتے نہ دیکھا تھا اس کے چہرے پر ٹینشن و پریشانی کے آثار دو تین بار ضرور نظر آئے تھے مگر وہ سارا وقت خود کو اور اپنے ساتھ موجود دوسرے افراد کو سنبھالے رہا تھا۔

اور اس وقت اللہ کے حضور سجدے میں سر رکھ کر زار و قطار روتا وہ ایک بہت مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے تمام آنسو صاف کیے اور آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“ ”کچھ نہیں۔“ نفی میں سر ہلاتی وہ وہیں بیٹھی رہی۔

”تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟ کچھ کھاؤ گی؟“ یہ سوال وہ اس سے رات بھی ایک بار پوچھ چکا تھا۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کے وہاں بیٹھنے پر کوئی اعتراض کیے بغیر وہ دوبارہ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اسے عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ واپس اندر آغا جان کے پاس آ گئی۔

زرمینہ اور عباد صبح سویرے آئے تھے۔ آغا جان کا ناشتہ ساتھ لے کر، آغا جان جاگ چکے تھے مگر ان کی طبیعت ابھی بھی سنبھلی نہ تھی۔

انہوں نے بس لبوں کی جنبش سے ان لوگوں کے سلام کا جواب دیا اور پھر خاموشی سے اپنی بیمار آنکھوں سے ان چاروں کو دیکھتے آنکھیں دوبارہ بند کر لی تھیں۔

”آغا جان کو ناشتہ زرمینہ کرا دے گی۔ تم لوگ اب گھر جاؤ۔“ سی سی یو سے باہر نکل کر عباد ولی سے بولا تو وہ سر اثبات میں ہلاتے فوراً اس سے بولا۔

”چلو فارہ!“ ”لیکن ولی میں۔“

”آغا جان کو خدا حافظ کہہ آؤ۔ ہم اب دوپہر میں یہاں آئیں گے۔“ وہ اس کا جملہ کاٹ کر قطعیت سے بولا۔

رات اس نے اس کی بات مان کر اسے یہاں رکنے دیا تھا۔ اب اس پر یہ اخلاقی پابندی تھی کہ وہ اس کی بات مان کر یہاں سے چلی جائے۔ ولی اس سے پہلے اندر جا کر آغا جان کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔ وہ اب سیڑھیوں کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

زرمینہ آغا جان کا بیڈ سرہانے کی جگہ سے تھوڑا سا اونچا کر کے اپنے ہاتھ میں گلاس پکڑے آہستہ آہستہ، تھوڑا تھوڑا دودھ انہیں پلا رہی تھی۔

زرمینہ ان کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ وہ خاموشی سے بائیں طرف آ گئی۔ آغا جان کے لبوں پر اسے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور بہت مسکرا کر بشاش لہجے میں بولی۔

”میں ولی کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ دوپہر میں آ جاؤں گی۔ اب تب تک آپ کو اپنی طبیعت بالکل ٹھیک کر لینا ہے ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ انہوں نے سر اثبات میں ہلا کر آہستہ آواز میں اسے خدا حافظ کہا۔

راستہ پورا خاموشی سے کٹا تھا۔ راستے بھر ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی تھی اور اب وہ گھر کے سامنے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ولی گاڑی اندر لا رہا تھا اور وہ اس عمارت پر نظریں مرکوز کیے ہوئی تھی۔

یہ اس کے ڈیڈی کا گھر تھا۔ اسے اس گھر کے در و دیوار سے کبھی محبت کیوں نہیں ہوئی؟ کیا وہ ڈیڈی کی بیٹی نہیں؟ جس جگہ کو وہ اتنا والہانہ چاہتے تھے کہ مرنے سے پہلے ان کی آخری خواہش یہاں واپس آنا تھی۔ ایک بیٹی نے اپنے باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنے میں چھ سال لگا دیے۔

اور چھ سال بعد آئی بھی تو کس طرح؟ کیا باپ کا حکم ماننے اس کی خواہش پوری کرنے کی نیت سے؟ خود اپنے وجود سے شرمسار وہ گاڑی سے اتری، ولی اس سے پہلے گاڑی سے اتر چکا تھا۔

اس وقت ان کے گیٹ پر کوئی گاڑی آ کر رکی تھی۔ وہ اس گاڑی اور اس سے اترنے والے پر دھیان دیے بغیر اندر چلی گئی ہوتی اگر اس نے اپنا نام اور ایک جانی پہچانی آواز نہ سنی ہوتی۔

”مجھے فارہ سے ملنا ہے۔“ چوکیدار سے یہ جملہ بولنے والے کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس نے معیز کو گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اسے یہاں دیکھ کر سیدھا یہیں آ گیا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور اشتعال پھیلا ہوا تھا۔

CamScanner

"چلو گاڑی میں بیٹھو فوراً۔" ولی کو مکمل نظر انداز کرتا وہ اس سے تحکمیہ لہجے میں انتہائی غصے سے بولا۔

"کہاں جانا ہے معیز؟" وہ جواباً سکون سے بولی۔

"لاہور، ہم لاہور جا رہے ہیں۔ ابھی اور فوراً میں اور تم۔ ہم دونوں۔ کافی ہے اتنی وضاحت۔" غصے کے ساتھ اس کے لہجے میں طنز بھی در آیا۔ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

یہ ولی کا گھر تھا اس کی راجدھانی' یہاں اس کی سلطنت تھی اور وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ' چاہتا تو پچھلے کل حساب چکا تا معیز کو اپنے چوکیدار سے دھکے دلوا کر اور بہت بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال سکتا تھا مگر وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اور کچھ بھی کہے بغیر بالکل لاتعلق سا پورچ سے چلا گیا۔

فارہ نے دور لکڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں۔ وہ گھر کے اندرونی حصے میں جا چکا تھا۔

"میں آپ کو فون پر بھی بتا چکی ہوں معیز! میں یہاں سے کہیں نہیں جا رہی۔ ابھی آغا جان بہت بیمار ہیں' میں ان کے پاس یہاں ہوں اور بعد میں بھی اب بھی لاہور وہاں مستقل رہنے کے ارادے سے ہرگز نہیں آؤں گی بھی آپ سب سے ملنے آ جاؤں' وہ الگ بات ہے۔" ولی کے اندر چلے جانے کی آوازوں کو پوری طرح محسوس کرتے وہ معیز سے بہت پرسکون لہجے میں بولی۔

اس کے طنز اور غصے کا اثر قبول کیے بغیر۔

"فارہ! میں اپنے ہزاروں کام چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔ میرے پاس کسی بحث کا وقت نہیں ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت فوراً میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟" وہ اس کے ضدی اور فیصلہ کن انداز پر جھنجلایا پہلے سے زیادہ غصے سے بولا۔

"نہیں۔" اس کا ایک لفظی جواب قطعی نوعیت کا تھا۔ وہ جتنے غصے میں تھا حیرت انگیز طور پر وہ اتنی ہی پرسکون۔

"فارہ! تم مجھے ناراض کر رہی ہو۔ تمہاری یہ فضول ضد اور غلط حرکتیں ہمارے رشتے پر بہت برا اثر ڈالیں گی۔" ان کے باہم رشتے کا حوالہ دیتا وہ کچھ نرم اور دھیما پڑا۔

"معیز! میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہی بلکہ مجھے لگتا ہے میں زندگی میں پہلی بار کچھ صحیح کر رہی ہوں۔" یہ لفظ ادا کرتے اس نے اپنے اندر کل سے سر اٹھاتے احساس ندامت کو کچھ کم ہوتا پایا۔

معیز جو لہجہ پھر پہلے نرمی لیے انداز میں گویا ہوا تھا' اس کے اس جواب پر یک دم ہی پھٹ پڑا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ طیش اور غصے میں آ گیا۔

"وہ الو کا پٹھا' دادا کی بیماریوں کی داستانیں سنا کر تمہیں یہاں لے آیا اور تم چلی آئیں' بغیر کچھ سوچے سمجھے' بنا کسی سے مشورہ کیے۔ ان لوگوں کے ساتھ تمہارا خلع اور جائیداد میں اپنے حصے کا معاملہ کورٹ تک چلا گیا ہے' یہ سوچے بغیر اور اب جب تمہیں سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو بجائے بات کو سمجھنے کے اپنی بے وقوفی پر ہٹ دھرمی سے جمی ہو۔ پہلے پھوپھو کو اپنی ضدی حرکتوں سے ناراض کر کے کینیڈا جانے پر مجبور کر دیا اور اب بجائے

اپنی غلطی تسلیم کرنے کے مزید حماقتیں کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔"

یہ اس کے غصے کی انتہا ہی تھی جو وہ اپنے جملوں میں ایک گالی کو بھی شامل کر گیا تھا ورنہ معیز جیسا کھرا اور ریفائنڈ انسان کبھی گفتگو میں گھٹیا الفاظ کو شامل نہیں ہونے دیتا تھا۔

"میں نے صرف آپ کا پرپوزل قبول کیا تھا' ابھی ہمارا ایسا کوئی رشتہ نہیں جس کی بنیاد پر حق جتا کر آپ مجھے کچھ بھی کہہ سکیں۔ یہ میری ضد ہے' ہٹ دھرمی ہے' حماقت ہے یا بے وقوفی۔ میں کچھ غلط ہو جانے پر مدد مانگنے آپ کے پاس نہیں آؤں گی' آپ بے فکر رہیں۔

میں اپنی زندگی اور اپنے فیصلوں کی خود مالک اور خود ذمہ دار ہوں۔" وہ اپنا پرسکون اور دھیما انداز ترک کر کے یک لخت ہی غصے میں آ گئی۔

وہ غصے کی تیز تھی' اسے جلدی غصہ آ جایا کرتا تھا مگر معیز کے ساتھ اس نے اس طرح پہلی بار بات کی تھی۔ اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ چند سیکنڈ بالکل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تو تم میرے ساتھ نہیں چل رہیں' یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اس بار غصے سے نہیں اس نے سنجیدگی کے ساتھ کسی قدر روڈ انداز میں پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں چل رہی' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"ٹھیک ہے' اچھی بات ہے۔" آخری الفاظ سکون سے کہتا وہ یک دم ہی واپس گھوما' وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑے رہ کر اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ گیٹ سے نکل گیا' ایک سیکنڈ بعد اس نے باہر ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ گھر کے اندرونی رہائشی حصے کی طرف بڑھی۔

اندر آ کر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ لاؤنج پورا خالی تھا' ملازمین کی آوازیں بھی کچن یا کسی دوسرے کونے سے تو آ رہی تھیں مگر یہاں کوئی نہیں تھا اور ولی کا تو یہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ یہاں لاؤنج میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے معیز کو کچھ کہہ کر خاصا چوکیدار اور آس پاس دیکھتے دوسرے ملازمین کے سامنے کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا چاہا مگر وہ اسے تو ضرور تنبیہ کرے گا کہ آئندہ اس کا کوئی رشتہ دار خاص کر معیز قطعی یہاں ہرگز نہ آئے۔

وہ ولی سے بے شمار بار بدتمیزی کر چکی تھی' بہت بار اس کی سیدھی باتوں کے بھی الٹے جواب دے چکی تھی مگر آج وہ سوچے ہوئے تھی کہ بہت تہذیب اور شائستگی کے ساتھ وہ اسے معیز سے ہوئی ساری بات بتا دے گی۔ اس ساری بات سے وہ خود ہی سمجھ لے گا کہ اپنے کسی بھی رشتہ دار کی یہاں آمد میں فارہ کی کتنے فیصد مرضی شامل ہوتی ہے۔

اسے گل خان ایک کمرے سے نکلتا نظر آیا۔

یہ آغا جان کے بالکل برابر والا کمرہ تھا' یہ کمرہ ولی صیب خان کا ہے وہ جانتی تھی۔

"ولی کیا اپنے کمرے میں ہے؟" اس کے سوال کا گل جان نے اثبات میں جواب دیا تھا تو وہ اس سے کچھ

بھی کہے یا پوچھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"وہ پوچھے تو بتا دینا میں اپنے پورشن میں ہوں۔" ایک سیکنڈ کے توقف کے بعد اس نے گل خان سے کہا اور پھر آغا جان کے کمرے میں آ کر وہی دوسرے کونے والا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اس حصے تک جانے کا یقیناً کوئی دوسرا باہر سے بھی راستہ ہوگا مگر فی الحال کوئی نئے راستے ڈھونڈنے اور دیکھنے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سفید گیٹ کی کنڈی کھول کر وہ اندر آ گئی اور پھر لان عبور کر کے لاؤنج سے گزرتی اپنے کمرے تک جانا چاہتی تھی مگر قالین پر صوفے کے بالکل پاس اسے ایک کاغذ گرا نظر آیا۔

وہ آگے آئی اور وہ نیچے گرا کاغذ اٹھا لیا۔ اس کاغذ کی پلاسٹک کوٹنگ ہوئی ہوئی تھی اور اس کو تہہ کر کے اتنا چھوٹا بنا لیا گیا تھا جیسے والٹ کی زینت۔ تہہ کھولتے کھولتے اسے اچانک ہی یاد آ گیا کہ یہ کاغذ آغا جان کی جیب سے گرا تھا۔ اس وقت جب وہ ان کی جیب سے والٹ نکال رہی تھی تو ساتھ کوئی کاغذ بھی گرا تھا۔

سوفٹ پلاسٹک کوٹنگ ہوئے اس کاغذ کی سب تہیں کھل چکی تھیں اور اب وہ کھلا ہوا پورا کا پورا اس کے سامنے تھا۔ اس سفید کاغذ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ اس کے باپ کی آخری تحریر تھی۔

ان کا استعفیٰ۔ باقی سب الفاظ ٹائپ شدہ تھے مگر وہ دستخط تو ان کی اپنی لکھائی تھی۔ بے ساختہ اس نے ان حروف پر اس دستخط پر اپنے لب رکھ دیے۔ کسے والہانہ چوم لیا اسے پتا نہیں تھا ڈیڈی کے انتقال پر ان کی میت ساتھ لے جانے آئے آغا جان اپنے ساتھ چپکے سے یہ غیر اہم سا کاغذ اٹھا لائے تھے۔

اس نے ڈیڈی کی میز پر جب وہ استعفیٰ رکھا دیکھا تھا مگر بکھراتے بڑے غم اور ناقابل تلافی نقصان نے اسے اس کاغذ پر کبھی دھیان دلایا ہی نہیں تھا۔

اس نے وہ کاغذ اسی طرح واپس تہہ کیا اور اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہاں سے واپس جاتے وہ اسے حفاظت سے آغا جان کے کمرے میں رکھ دے گی۔ یہ سوچتے ہوئے منہ ہاتھ دھو کر ابھی وہ بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔

آنے والی لڑکی ریشم نام کی وہ دوسری ملازمہ تھی جو صمدو کے ساتھ ہر وقت کچن میں مصروف نظر آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی اشیاء سے بھری ایک ٹرے تھی۔ اس ٹرے میں موجود اشیاء صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا مجموعہ تھیں۔ وہ اپنے لیے کھانے، ناشتے، چائے یا کسی چیز کا کہہ کر نہیں آئی تھی تو اگر یہ سب کچھ اس کے پاس لایا گیا تھا تو اسے لانے کا گھر کے کسی فرد ہی نے حکم دیا تھا اور وہ فرد کون تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اس نے اسے ناشتے یا لنچ کے لیے بلوایا نہیں تھا بلکہ جہاں پر وہ تھی وہیں اس کا کھانا بھجوا دیا تھا۔ وہ اگر اسے ڈائننگ روم میں بلواتا وہ وہاں بھی بخوشی چلی جاتی مگر جب یہاں آغا جان موجود نہیں تھے جن کے سامنے سب اچھا ہے اور سب ٹھیک ہے کا تاثر دینا ہوتا تھا تو ضرورت کیا تھی ان دو لوگوں کو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی جو ایک

دوسرے کے ساتھ ہر رشتہ ختم کر دینے کا عہد کر چکے تھے۔

اس نے خاموشی سے ملازمہ کے ہاتھ سے ٹرے لی اور بیڈ پر سکون سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

وہ آغا جان کے سامنے اپنا مرجھایا زرد بہت زیادہ رویا اور بالکل کملایا ہوا چہرہ لے کر نہیں بلکہ بالکل فریش خوش باش اور ہنستا مسکراتا صحت مند چہرہ لے کر جانا چاہتی تھی۔ خود کو پوری طرح کھانے کی طرف راغب کر کے اس نے پوری دل جمعی سے سب کچھ کھایا۔

تھرماس میں بھری چائے کے بھی دو کپ پی ڈالے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اب وہ موبائل اٹھا کر اپنی ممی کے موبائل نمبر ملا رہی تھی۔

"السلام علیکم ممی! کیسی ہیں آپ؟" جب لاہور اپنے گھر اکیلی رہ رہی تھی تب وہ اس کی کالز ریسیو نہ کرتی تھیں مگر اب جب کہ وہ ان کے دشمن کے پاس جا پہنچی تھی تب انہوں نے کال ریسیو کر ہی لی تھی۔

"کیوں فون کیا ہے تم نے مجھے؟" ان کا لہجہ بے حد تلخ اور انداز دل دکھانے کی حد تک اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

"ممی! آغا جان کو ہارٹ۔"

"تمہارے آغا جان کو جو کچھ بھی ہوا ہے، تم ان کی لاڈلی چہیتی پوتی ان کی خدمت کے لیے پہنچ تو چکی ہو ان کے پاس۔ خوب دل لگا کر ان کی خدمت کرو اور اگر اب تک انہوں نے اپنے پوتے کے ساتھ تمہاری رخصتی نہیں کروائی تو ان کی عنقریب آٹھ دس بیس سالوں بعد ہونے والی موت کا سوچ کر فی الفور کروا لو۔" ان کے لفظوں میں زہر تھا، کڑواہٹ تھی۔

اس کی نوک زبان پر کئی تلخ جواب آتے آتے رہ گئے مگر وہ لب بھینچ کر خاموش رہی کہ ماں کو جواب دینا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ وہ تو انہیں وہ تمام جھوٹ بھی نہ جتا سکی جو انہوں نے اس سے ہمیشہ بولے تھے اور جو غلط بیانیاں ہمیشہ اس سے کی تھیں۔ وہ سب کچھ جان چکی ہے وہ انہیں جتا نہ پائی۔

اپنے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈلوانے یا فادر کے ساتھ جائنٹ ہولڈر بننے سے آغا جان کو سختی اور دو ٹوک انکار کر دینے کے بعد انہوں نے اسے ہمیشہ یہی تاثر دیا تھا کہ یہ آغا جان ہی نے کیا ہے، بہو کی حیثیت زیرو کر کے صرف پوتی کو فوقیت دی ہے۔ آغا جان کو اس سے ملنے کے لیے آنے سے کئی شرائط عائد کر کے روک دینے کے بعد انہوں نے ہمیشہ الزام ان پر ہی دھرا تھا کہ دادا بے تحاشا پیسہ پھینک کر سمجھتے ہیں کہ پوتی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

"آج کے بعد مجھے کبھی فون مت کرنا۔ میں زندگی بھر تمہاری شکل دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ آواز سننا چاہتی ہوں، تمہیں جہاں جانا تھا تم وہاں جا چکیں۔ میں تمہارے لیے اور تم میرے لیے مر چکیں۔ اس وقت جو فون پر مجھ سے بات کر رہی ہے وہ میری بیٹی نہیں، محمد اختیار خان کی پوتی ہے۔ تم میرے لیے مر چکی ہو فارہ!" نفرت بھرے لہجے میں اپنے جملے مکمل کر کے انہوں نے فوراً رابطہ ختم کر دیا۔

CamScanner

"ایسے ہی کہہ دینے سے کوئی کسی کے لیے نہیں مر جاتا ممی!" خاموش موبائل ہاتھ میں لیے وہ آنسو پیتی آہستہ سے بولی۔

جب وہ آغا جان کی محبتوں سے انکاری ہوتی تھی تب انہیں کیسا لگتا ہوگا' وہ کتنے ہرٹ ہوتے ہوں گے۔ انہیں کتنی تکلیف' کتنا دکھ پہنچتا ہوگا۔

اگر آغا جان نے اپنے بیٹے کو ایک انجان اور غیر لڑکی کے لیے اپنے مقابل کھڑا ہوتا پا کر اسے گھر سے نکال دیا تھا تو آپ انہیں ظالم جابر اور سخت دل کیوں قرار دیتی ہیں۔

میں تو پھر اپنے دادا کے پاس آئی ہوں' وہ دادا جو برسوں سے مجھ پر محبتیں نچھاور کر رہا ہے' محبت کے ساتھ ساتھ جس کے مجھ پر بے شمار' بے حساب احسانات بھی ہیں' ڈیڈی تو باپ کی ستائیس برس کی محبت اور شفقت بھرے ساتھ پر چھبیس یا ستائیس ماہ سے بھی کم کے ایک لڑکی کے ساتھ کو فوقیت دے گئے تھے۔

اگر آپ اپنی بیٹی سے اپنی غلط اور ناجائز بات پر بھی فرماں برداری اور سعادت مندی کی توقع رکھتی ہیں تو آغا جان بھی تو بیٹے سے آپ ہی جیسی اپنی توقعات رکھ سکتے تھے اور ان کے نہ پورا ہونے پر آپ ہی کی طرح اس سے قطع تعلق کا اعلان کر سکتے تھے۔

وہ اس کی بات سنے بغیر کب کا رابطہ منقطع کر چکی تھیں اور وہ جوں کی توں اسی طرح فون کان سے لگائے بیٹھی تھی۔

ریشم کھانے کی ٹرے واپس لینے آئی تو اس نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ اس کا سامان یہاں رکھوا لے۔ ڈیڈی کا جو کمرہ اسے یہاں استعمال کے لیے ملا تھا وہاں سے اس کے دو بیگز اور ایک سوٹ کیس پر مشتمل سامان جو ابھی تک جوں کا توں بیگز اور سوٹ کیس ہی میں تھا وہ اس نے ریشم کے ساتھ مل کر اپنے اس بیڈ روم کی وارڈ روب میں بالکل ٹھیک سے سیٹ کر لیا۔

رات میں وہ شاید یہاں اکیلے نہ سو سکے کہ یہ حصہ باقی گھر سے ذرا ہٹ کر ہے مگر اب سے دن میں وہ اس جگہ کو استعمال کرے گی اور اس کا سارا سامان بھی رہے گا۔ نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکل کر آغا جان کے کمرے اور وہاں سے لاؤنج میں آ گئی۔

بلیو جینز اور وائٹ کاٹن کی شرٹ پہنے ولی وہاں بیٹھا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی جیکٹ بھی صوفے پر پاس ہی پڑی ہوئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر چکا تھا اور اس کے بیٹھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جانے کے لیے بالکل تیار ہے۔

پتا نہیں وہ کس سے بات کر رہا تھا اور اسے یہاں بیٹھنا چاہیے تھا یا نہیں یہی سوچتے وہ لاؤنج سے نکل کر باہر گارڈن میں آ گئی۔

"چلو۔" وہ دس منٹ بعد باہر آیا اور اسے آنے کا کہتے سیدھا پورچ کی طرف چلا گیا۔

تمام راستہ اس نے اس انتظار میں گزارا کہ اب وہ معیز کی آمد پر کچھ کہے گا۔ کوئی تنبیہہ' کوئی غصہ' کوئی تحکم' کوئی سرزنش مگر وہاں تو بس اک گہری خاموشی اور سنجیدگی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

عبادی ممی عائشہ آنٹی آغا جان کی عیادت کے لیے آئی تھیں اور ان کے بعد بھی آغا جان کے کئی رشتے دار' دوست' میل ملاقاتی ان کی عیادت کے لیے آتے رہے تھے۔ مغرب کے وقت اسے آغا جان کے پاس فرصت سے ایسے بیٹھنے کا موقع مل سکا جب ان دونوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

ولی اور عبادی نماز کے لیے گئے ہوئے تھے اور زرینہ آغا جان کے ابھی کچھ دیر قبل ہوئے ای سی جی اور خون کے کچھ ٹیسٹوں کی رپورٹس بھیج کے کسی سینئر کارڈیالوجسٹ سے ڈسکس کرنے گئی ہوئی تھی۔

وزیٹنگ آورز ختم ہوئے تھے تو ملنے جلنے اور آنے جانے والوں کا رش ختم ہوا تھا۔

"جوس پئیں گے آغا جان!" اس نے ان سے پوچھا۔ انہیں بہت ہلکی غذا دی جا رہی تھی اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ پیٹ بھر کر کھانے یا پینے سے دل کا کام بڑھ جاتا تھا اور پھر ان کی طبیعت میں بے چینی اور خرابی پیدا ہونے لگتی تھی اس لیے انہیں دن میں وقفے وقفے سے کئی بار تھوڑی تھوڑی سی ہلکی خوراک دی جا رہی تھی۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ گلاس میں جوس نکال کر ان کے پاس آ گئی۔ ان کا سرہانا اونچا کر کے وہ انہیں آہستہ آہستہ جوس پلا رہی تھی ان میں فی الحال اٹھ کر بیٹھنے یا گلاس اپنے ہاتھ میں پکڑ لینے کی قوت بالکل نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ سے جوس پیتے اُسے مسلسل دیکھ بھی رہے تھے۔ کل کے مقابلے میں آج ان کی طبیعت بہتر کہی جا سکتی تھی۔

وہ کل پورا دن' کل پوری رات کن کیفیات سے گزری ہے وہ انہیں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی مگر ایک بات تھی جو وہ ان سے کہنا چاہتی تھی' جو کہنے کے لیے وہ کل سے بے قرار تھی۔

"کل آپ نے اتنا کچھ کہا اور میرا جواب سننے سے پہلے طبیعت خراب کر لی۔" چند گھونٹ جوس پینے کے بعد انہوں نے گردن سے بس کا اشارہ کیا تو وہ گلاس سائیڈ میں رکھ کر ٹشو پیپر سے ان کے لبوں اور داڑھی پر گرے جوس کے چند قطرے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"میں بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں آغا جان! بس یہ ہوتا ہے ناں کہ کوئی محبت ہمیں بہت وافر مل رہی ہوتی ہے' ہم یہ سوچ کر کہ یہ تو ہمیں ہمیشہ سے مل رہی ہے اور ہمیشہ ہی ملتی بھی رہے گی' اس سے کچھ بے نیاز سے ہو جاتے ہیں' اسے اپنا حق جو سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

اسے For granted لے رہے ہوتے ہیں لیکن کل جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی' آپ کو کھو دینے کا خوف میرے اندر پیدا ہوا' یہ احساس جاگا کہ یہ محبت مجھ سے چھن بھی سکتی ہے تو مجھے پتا چلا' میں آپ سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں۔ میں آپ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی آغا جان!

آپ کو میرے لیے ٹھیک ہونا ہے' آپ کو میرے لیے زندہ رہنا ہے آغا جان! کیا یہ صرف ولی اور زرینہ کا حق ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہیں؟ میں آپ کے ساتھ' آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں آغا جان! میں اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں زندگی بھر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ آپ نے میرے اور ممی کے لیے جو پورشن بنوایا ہے ناں آغا جان! میں بھی اب اس میں رہوں گی اور ممی کو بھی ایک نہ ایک دن ضرور وہاں لے آؤں گی۔

"یہ میرا آپ سے وعدہ ہے آغا جان!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک کر ان کے رخسار پر گرے تھے۔

وہ دل کے مریض ہیں اور اسے انہیں ٹینشن نہیں دینی چاہیے' اسے ان کے سامنے رونا نہیں چاہیے۔ وہ یہ جانتی تھی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کوئی دوا اور کوئی علاج انہیں اتنی جلدی ٹھیک نہیں کر سکتا جتنا اس کا محبت کا یہ اظہار۔

وہ بستر پر سخت بیمار پڑے اس انسان سے جو اس کا دادا ہے' والہانہ پیار کرتی ہے' بے تحاشا محبت کرتی ہے اور یہ بالکل سچ تھا۔

یہ فارہ بہروز خان کی زندگی کا سب سے بڑا سچ تھا کہ وہ محمد بختیار خان سے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ پتا نہیں کب سے۔

☆☆☆

"زرینہ! اس میں تھوڑا سا سوپ اور ڈال کر دے دو۔" وہ آغا جان کو سوپ پلا رہی تھی۔

اس نے پیالے میں تھوڑا سا سوپ ڈالا تھا کہ اگر انہیں اچھا لگا اور مزید پینے کی رغبت پیدا ہوئی تو اور ڈال لائے گی۔ زرینہ باتھ روم سے وضو کر کے نکلی تھی' کہنیوں سے اوپر چڑھی آستینیں نیچے کرتے اس نے حیرت اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔

اس کا حیرت سے دیکھنا اپنی جگہ درست تھا' وہ اس سے اتنے معمول کے نارمل سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی جیسے روزمرہ کی یہ بات چیت ان کے درمیان رہا ہی کرتی تھی۔

مگر پھر فوراً ہی اپنے چہرے سے حیرت بھرے تاثرات ہٹاتی وہ نارمل سے انداز میں چلتی آغا جان کے بیڈ کے پاس آئی اور فارہ کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ لے لیا۔

آغا جان کے پاس اس وقت وہ دونوں تھیں اور یہ ان دونوں کے درمیان پہلی باضابطہ بات تھی جو فارہ نے کی تھی ورنہ اس سے قبل صبح سے وہ دونوں سارا وقت آغا جان کے ساتھ ہونے کے باوجود آپس میں ایک لفظ نہ بولی تھیں۔

وہ کل رات بھی پرسوں ہی کی طرح آغا جان کے پاس ہسپتال میں رکنا چاہتی تھی مگر انہوں نے اسے اور زرینہ دونوں کو گھر جانے کا حکم دیتے صرف ولی کو اپنے پاس رکنے دیا تھا۔ صبح دس بجے وہ آئی تھیں تو آغا جان نے ولی کو گھر بھیج دیا تھا۔

دوپہر بارہ بجے آغا جان کے کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر محمد نثار علی خان ان کا معائنہ کرنے آئے تو ان کی طبیعت میں بہتری پا کر انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا تھا۔

زرینہ ولی کو صبح کال پر فوراً یہ بتا کر جلدی جلدی پرائیویٹ روم میں شفٹ ہونے کے لیے آغا جان کا سارا سامان سمیٹنے لگی تھی۔ اس سمیٹا سمیٹی میں پوری دل جمعی سے فارہ نے زرینہ کی مدد کروائی تھی بغیر آپس میں کوئی بات

کیے اور پھر آغا جان کو ہسپتال کے عملے کی مدد سے وہ پرائیویٹ روم میں لے آئی تھیں۔

ولی دوپہر دو بجے ان دونوں کا کھانا ساتھ لے کر آیا تھا۔ آغا جان کے بیڈ کے پاس سامنے وہی کھڑی تھی اس لیے اس نے وہ بڑا سا پلاسٹک بیگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کھانا ہے تم دونوں کا۔" اسے وہ سامان پکڑا کر وہ فوراً ہی آغا جان کی طرف جھکا۔ ان کے بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بیٹھتے وہ سرگوشیوں میں ان سے کیا راز و نیاز کرنے لگا تھا۔

زرینہ ابھی نماز پڑھ کر فارغ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے آغا جان کی صحت یابی کے لیے نجانے کون کون سے وظائف شروع کر رکھے تھے اس لیے اس کی ہر نماز بے حد طویل ہوتی تھی۔

کسی ٹرے کی عدم دستیابی کے سبب اس نے صوفے پر ایک اخبار بچھایا اور سارے ڈبے اور ہاٹ پاٹ وغیرہ کھول کھول کر اس پر رکھے' پلیٹیں' چمچے' گلاس اور پانی کی بوتل بھی ساتھ سجا لی۔

"آ جاؤ زرینہ! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس لڑکی نے پرسوں سفاک لہجے میں اسے کیا کہا تھا۔ اپنی بہت جلد غصے میں آنے اور بھڑک جانے والی عادت کے برخلاف وہ سب بھلانے بہت نارمل اور دوستانہ سے انداز میں اس سے بولی۔

جائے نماز تہ کرتی زرینہ نے ایک پل کو تعجب سے اسے دیکھا پھر سر اثبات میں ہلاتی صوفے پر آ گئی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں اور ولی کی باتیں سنتے آغا جان بڑی محویت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ انہیں یہ منظر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ان کے تینوں پوتی پوتا ان کے پاس ہیں اور آپس میں بہت خوشگوار دوستانہ ماحول بھی استوار کر چکے ہیں۔

آغا جان کی یہ کیفیت جب وہ سمجھ سکی تھی جو ہمیشہ ان سے بہت دور رہی تھی تو ولی اور زرینہ جو پل کر بڑے ہی ان کے پاس ہوئے تھے کیونکر نہ سمجھ پاتے۔ غالباً یہی وجہ تھی جو زرینہ چند لقمے لینے کے بجائے اطمینان سے کھانا کھانے لگی تھی۔

"یہ فرائیڈ رائس باقی کے تم لے لو۔ میں صرف یہ چکن جلفریزی اور رولز لوں گی۔"

وہ دونوں جیسے بچپن کی بچھڑی سہیلیاں تھیں جنہیں ایک دوسرے کی پسند ناپسند سب ازبر تھی' کم از کم اس کے بولنے کا انداز تو ایسا ہی تھا۔

جبکہ سچ تو یہ تھا کہ ابھی ابھی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اسے یہ پتا چلا تھا کہ زرینہ چاولوں کو روٹی یا کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتی ہے۔ وہ باقی سب ڈشز کو چھوڑ کر صرف چاولوں پر تھوڑی سی جلفریزی اور سلاد ڈال کر کھانے کھانے میں مگن تھی۔

ولی نے گردن گھما کر بس ایک ہی بار ان دونوں کو کھانا کھاتے دیکھا تھا اس کے بعد وہ پھر آغا جان کے ساتھ کانا پھوسی میں مصروف ہو گیا تھا۔

پیٹ بھر کر کھانا کھا لینے کے سبب کھانے کے بعد کچھ وقت ان دونوں کا اونگھتے گزرا تھا۔ عصر کے وقت عیادت کی

اور پھر آغا جان کو خدا حافظ کہتی دو تین منٹ کے اندر ہی چلی گئیں۔ آغا جان نے متشکر نگاہوں سے اپنی ان رشتہ دار خاتون اور پھر بدتمیز و منہ پھٹ پوتی کو دیکھا۔ وہ آغا جان کی نگاہوں کا نوٹس لیے بغیر سکون سے واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

ولی نے اپنے چہرے کو ہر طرح کے تاثرات سے عاری کر رکھا تھا۔ وہ خوش ہوا ہے یا ناخوش وہ جان نہیں سکتی تھی۔ زرمینہ حیرت سے گنگ اسے دیکھ رہی تھی شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ان صفات کی اور میں بھی پائی جا سکتی تھیں جب کہ عباد چہرے پر محظوظ سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں سمجھتا تھا یہ خوبیاں صرف میری بیگم میں پائی جاتی ہیں۔"

"آغا جان کہتے ہیں یہ ہماری خاندانی اور موروثی خوبیاں ہیں۔ ان میں نہ ہمارا کمال ہے نہ قصور۔" عباد کی شوخی کا اس نے بے ساختہ اور برجستہ جواب دیا تھا۔

اس جواب پر عباد کے ساتھ آغا جان بھی بے اختیار کھل کر ہنس پڑے تھے جب کہ زرمینہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

وہ اپنے میاں بھائی اور دادا سب سے اپنے لیے منہ پھٹ اور بدلحاظ اور بدتمیز کے القاب سنا کرتی تھی مگر ان صفات پر اس نے یوں گردن اکڑا کر فخر کا اظہار کبھی نہ کیا تھا جیسے قارہ کر رہی تھی۔

***

آغا جان کو ساتویں دن ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ کل وہ پھر وہ ہاسپٹل سے گھر آ گئے تھے اور پھر ان کی عیادت کے لیے آنے والوں کا جو تانتا بندھا تھا تو ان سب میں سے کسی کو بھی رات گئے تک ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں ملا تھا۔

صبح وہ اپنے معمول کے وقت پر بیدار ہو گئی تھی۔ آغا جان کو جاگے دیکھا تو وہ ان کے لیے ناشتہ بنانے کچن میں آ گئی۔ وہ دلیہ چولہے پر چڑھا کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ زرمینہ کچن میں آ گئی۔

"آؤ زرمینہ چائے پیو گی؟" اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور وہ خوش اخلاقی سے اسے بھی چائے آفر کر رہی تھی۔

"نہیں میرا کافی کا موڈ ہے۔ ناشتے میں ساتھ کافی لوں گی۔" وہ قارہ کو جواب دیتی اس کے پاس ہی آ گئی۔

"دلیہ چڑھایا ہے میں نے آغا جان کے لیے۔ جب تک ولی ان کا منہ ہاتھ دھلوا کر لباس تبدیل کروائے گا یہ تیار ہو جائے گا۔" زرمینہ کو کوکنگ رینج کی طرف دیکھتا پا کر اس نے بتایا۔

سر اثبات میں ہلاتے وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی مسلسل خود پر مرکوز نگاہوں سے حیران ہوتے اس نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"قارہ! میں نے اس روز تمہارے ساتھ بہت مس بیہیو کیا تھا۔ میں تم سے اپنی اس دن کی تمام باتوں کے

آمد ہوئی تھی اور پھر اس کے کچھ دیر بعد وزیٹنگ آورز شروع ہو جانے کے سبب رشتے داروں اور دوست احباب کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ہر رشتے دار کو بیماری کی پوری تفصیل جاننا تھی اور وہ بھی آغا جان کی زبانی۔ مشرقی رکھ رکھاؤ، وضع داری اور آپس میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آنے والی ہماری تمام روایات جتنی بھی اچھی ہوں کم از کم عیادت اور تعزیت کا ہمارا طریقہ کار انتہائی نامناسب' تکلیف دہ بلکہ غیر اخلاقی ہوتا ہے۔

یہ بلا مبالغہ آغا جان کی ساتویں یا آٹھویں رشتہ دار خاتون تھیں جنہیں وہ پرسوں صبح اپنے نہانے سے لے کر ہسپتال پہنچنے تک کی ساری روداد مفصل سنا رہے تھے۔

یہ خاتون باقی تمام رشتے داروں سے بھی بڑھ کر جابت ہو رہی تھیں۔ باقی سب نے تو صرف پرسوں آغا جان کی طبیعت خراب ہونے کا تمام احوال سن کر جان بخشی کر دی تھی' یہاں تو اور بہت طویل گفتگو اور عوامی مشوروں کا ان کی زبانی بھی سامنا تھا۔

"آپ صبح صبح نہانے ہی تو غلط۔"

پھر دواؤں سے متعلق سنے سنائے مشورے' مشہور مشہور کارڈیالوجسٹ کے نام ایسے روانی سے لیے جا رہے تھے گویا وہ بچپن میں ان کے ساتھ کھیلتی آئی ہوں۔ ڈاکٹر شاہد کی پروفیشنل مہارت پر شک' کارڈیالوجسٹ بدلنے کا مشورہ جو دوائیں دی جا رہی تھیں ان پر اعتراض۔

"خون پتلا کرنے والی یہ دوا تو بالکل غلط دی جا رہی ہے اور بلڈ پریشر کے لیے یہ دوا؟ اس کے سائیڈ ایفیکٹس اتنے خطرناک ہیں۔"

وہ اپنے چھ یا سات دوستوں اور رشتے داروں کی بیماریوں اور اموات کے قصے مسلسل سنا رہی تھیں۔ آغا جان کو کوئی خوشی تو ہرگز نہیں پہنچا رہی تھیں۔ "ان سب میں سے کوئی کچھ کہہ کیوں نہیں رہا۔" وہ بری طرح جھنجلائی۔

ولی بے حد ناپسندیدگی و ناگواری سے انہیں دیکھ ضرور رہا تھا مگر غالباً براہ راست کچھ کہتے یا ٹوکتے رواداری آڑے آ رہی تھی۔ عباد تو تھا ہی بامروت انسان لیکن اسے زرمینہ جیسی منہ پھٹ اور صاف گو لڑکی سے اس بزدلی کی ہرگز توقع نہ تھی۔

زرمینہ چہرے پر جھنجلاہٹ اور ناراضی لیے ان خاتون کو دیکھ رہی تھی مگر تھی بالکل خاموش۔

"اچھا! آئیں باہر میں رات سے رونا تھا۔ ویسے بھی غلطی کی نا آپ نے اگر آپ رات ہی۔" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ یک دم ہی صوفے پر سے اٹھ کر آغا جان کے بیڈ کے پاس آ گئی۔

"آغا جان! اب آپ کی دوا اور سونے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ باقی باتیں پھر کبھی کر لیجیے گا۔" وہ بظاہر نرم و شیریں لہجے میں بولی۔

"ارے ہاں دیکھو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ بیٹھے بیٹھے اتنی دیر ہو گئی۔" وہ خاتون ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر فوراً کھڑی ہو گئیں۔

CamScanner

لیے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔"

"معذرت؟ لیکن مجھے تو تمہاری کوئی بات بری ہی نہیں لگی۔ ہم غصہ اسی کو دکھاتے ہیں جس پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔" وہ اس کے ہاتھ تھام کر رسانیت سے بولی۔

"وہ غصہ نہیں بدتمیزی اور بہت دل دکھانے والی باتیں تھیں فارہ! یقین کرو مجھے اپنی باتوں پر تب ہی بہت افسوس ہوا تھا۔ عباد سے بھی مجھے اس رات گھر آ کر بہت ڈانٹ پڑی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "تم نے اس کی حالت دیکھی نہیں تھی؟ وہ کتنی پریشان تھی اور پھر تم نے اس سے وہ سب کیوں کہا؟" یقین کرو بقول تمہارے ہماری خاندانی اور موروثی عادتوں کے باوجود میں حقیقت میں اتنی بدتمیز نہیں۔ دراصل مجھے تم پر بہت غصہ تھا اور جس پر مجھے غصہ آ رہا ہو میں اس سے میٹھی بن بن کر منافقت نہیں دکھا سکتی۔" زرمینہ کی صد درجہ سنجیدگی کے باوجود اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

اپنی خاندانی و موروثی بدتمیزی پر فخر میں وہ بھی اس کی طرح جتاتی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑی۔

"میں پہلے تمہیں بہت غلط نہیں سمجھتی تھی۔ بہروز پاپا کے انتقال کے بعد تمہارے رویوں کے لیے میں تمہیں کہیں نہ کہیں رعایت بھی دے دیا کرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا اتنے برسوں کی غلط فہمیاں ہیں تمہیں اور ان کی تلافی کو کچھ عرصہ تو لگے گا آغا جان کے خلوص کو سمجھنے میں مگر جب تمہارا ایم بی بی ایس فائنل ایئر کا رزلٹ آیا اور تم نے اپنے رزلٹ کی اطلاع آغا جان کو نہیں دی تب مجھے تم پر پہلی بار بہت شدید غصہ آیا تھا۔

وہ تمہارا رزلٹ آنے سے پہلے اتنے پرجوش تھے "میری فارہ کا رزلٹ آنے والا ہے' میری پوتی ڈاکٹر بننے والی ہے" وہ اپنے ہر ملنے والے سے ذکر کیا کرتے تھے۔

وہ شرارت سے مجھے چھیڑتے تھے کہ تم پیچھے رہ گئیں فارہ تم سے پہلے ڈاکٹر بن گئی...... لیکن جب تم نے انہیں اپنے رزلٹ سے آگاہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی تم سے فون کر کے تمہارے رزلٹ کے متعلق پوچھا اور یہ پتا چلا کہ رزلٹ آئے بھی بیس پچیس دن ہو چکے ہیں تب ان کے چہرے پر بکھرا رنج اور اداسی دیکھ کر مجھے تم بہت بری لگی تھیں۔

وہ تمہارے اس رویے سے ہرٹ ہوئے تھے۔ میں آغا جان سے اس روز بہت لڑی بھی تھی کہ وہ ایک بے حس لڑکی پر کیوں اپنی محبتیں برباد کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا "زرمینہ! فارہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنی محبت دیکھی ہے۔ بس صرف اپنی زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتی۔ بہروز کی بیٹی ہے ناں اس کی طرح تھوڑی سی ضدی۔"

مجھ سے بہت پر یقین لہجے میں یہ سب کچھ کہہ کر جب وہ تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں بہت شوق سے تمہارے لیے تحائف لے کر تمہارے پاس لاہور گئے تو...... تو وہاں اس روز جو کچھ ہوا اور گھر واپس آنے کے بعد جو درد اور غم میں ڈوبا وجود میں نے آغا جان کا دیکھا تو اس کے بعد مجھے تم پر پہلے سے بھی زیادہ شدید غصہ آیا اور تم بہت بری لگیں۔

پھر ابھی دو ڈھائی مہینے پہلے جب انہوں نے سی سی یو سے تمہیں فون کیا تھا۔ میں اور لالہ اس وقت ان کے پاس تھے۔ ان کی طبیعت اب تو بہت بہتر ہے فارہ! یقین کرو اس وقت تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ نہ کرے وہ اب بچیں گے ہی نہیں۔

اور پھر میرے اور لالہ کی موجودگی میں وہاں سے جو کچھ آغا جان کو سننے کو ملا اور اس کے بعد جتنی ان کی طبیعت خراب ہوئی' میرے دل میں تمہارے لیے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

اس روز میں تمہیں کوئی رعایت نہیں دے سکی تھی فارہ! تم نے پہلے جو کچھ بھی سنا تھا پر چھ سال سے آغا جان کو دیکھ بھی تو رہی تھیں۔

مجھے لگا یہ کیسی لڑکی ہے اسے تو محبت بھی اپنی طرف کھینچ نہیں پاتی۔ آغا جان اس سے سوائے محبت کے کچھ بھی تو نہیں مانگتے۔" اس کے چہرے کے یک دم ہی پھیکے پڑ جانے والے رنگوں کو دیکھ کر زرمینہ نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ دبائے۔

"تم تو دل کی بہت اچھی ہو' اگر تم دل کی اچھی نہ ہوتیں تو اتنا سارا جھگڑا کھڑا کر دینے اور معاملہ کورٹ تک لے جائے جانے کے بعد صرف لالہ کے یہ کہہ دینے پر کہ آغا جان بیمار ہیں' کبھی ان کے ساتھ پشاور آتیں؟

اور اب تو میرے دل میں تمہارے لیے کوئی غصہ' کوئی نفرت اور کوئی بغض نہیں بلکہ تمہاری محبت اور بہت قدر ہے۔ تم واقعی ان سے بہت محبت کرتی ہو جب ہی تو ان کی بیماری کا سنتے یہاں آ گئی ہو اور تم دل کی بھی بہت بہت اچھی ہو فارہ!"

زرمینہ کی سچے دل سے کی گئی اس تعریف نے مزید کچھ رنگ اس کے چہرے پر سے غائب کر دیے تھے۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ وہ یہاں کیسے آئی تھی' پھر وہ اسے کیسا سمجھے گی۔ پھر وہ اس کے متعلق کیا کہے گی کیا سوچے گی؟

اگر ولی اسے سچ بتا دے نہیں۔ وہ یک دم ہی پوری کی پوری کانپ گئی۔ اس کی وہ سچائی کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ کاش ولی بھی اس دن کو بھول جائے۔

ولی کچن کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ زرمینہ سے آغا جان کا ناشتہ لانے کو کہہ رہا تھا۔ شاید اس نے زرمینہ کی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے ولی کے چہرے پر طنزاً استہزا اور تمسخر تلاش کرنا چاہا مگر وہاں صرف ایک دبیز سنجیدگی چہرے کا احاطہ کیے ہوئی تھی۔

اگر وقت پیچھے کی طرف لے جایا جا سکتا ہے تو اس پل فارہ بہروز خان نے شدت سے یہ دعا مانگی تھی کہ کم جنوری کی وہ دوپہر لوٹ آئے۔ وہ اس میز پر ولی کے سامنے بیٹھی ہو۔

وہ اپنی شرط فارہ کے سامنے رکھے' وہ اس شرط کو قبول کرنے کے بجائے بضد ہو کر اس شرط کے پیش کیے جانے کے اسباب پوچھے۔

اس کے پیہم اصرار پر جب وہ اسے یہ بتانے پر مجبور ہو جائے کہ آغا جان کی بیماری کے سبب وہ کسی بھی قیمت

پر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے' اس لیے یہاں آیا ہے' تب وہ اس سے کہے کہ وہ آغا جان کے پاس چل رہی ہے بغیر کسی شرط اور معاہدے کے۔

ولی زرینہ سے ناشتے کا کہہ کر فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور زرینہ جلدی جلدی آغا جان کے ناشتے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ اس عجلت اور تیز رفتاری کے عالم میں اس کا دھیان فارہ کی خاموشی کی طرف بالکل نہ گیا تھا۔

وہ "زرینہ ماں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر وہاں سے نکل کر اپنے پورشن میں آ گئی۔ سیدھی اپنے کمرے میں آ کر الماری میں رکھے بیگ کی زپ کھول کر اس نے اس میں سب سامان کے بالکل نیچے دبا لفافہ نکالا اور وہ کاغذ آخر باہر نکال لیا۔

اس پر نظر ڈالے بغیر اس نے اسے پرزے پرزے کیا اور پھر وہ سب پرزے ہاتھوں میں سمیٹے کچن میں لے آئی۔ چولہا جلا کر اس نے وہ سب چھوٹے چھوٹے پرزے آگ پر رکھ دیے تھے۔

***

آغا جان کو ہسپتال سے آئے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہتری پا کر ولی نے دو دن سے دوبارہ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ زرینہ ابھی یہیں تھی۔ عباد بھی ہر ایک دن چھوڑ کر آغا جان کی عیادت کے لیے آ رہا تھا۔

اس رات بھی وہ آیا ہوا تھا۔ بہت خوشگوار سے ماحول میں آغا جان ہی کے کمرے میں رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے جب کہ یہ سب صوفوں پر بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا تم اتنی جلدی کھا بھی چکیں؟" اسے پلیٹ خالی کر کے میز پر رکھتا دیکھ کر زرینہ بے ساختہ بولی۔

"لگتا ہے فارہ کو ہمارے پشاوری کھانے پسند نہیں آ رہے۔ بھئی زرینہ! کھانے میں تھوڑا سا لاہوری ذائقہ بھی شامل کر لو۔" عباد مسکرا کر بولا۔

"نہ پشاوری نہ لاہوری' ان خاتون کو سرے سے دیسی کھانوں ہی سے رغبت نہیں ہے' یہ تو چائنیز پسند کرتی ہیں۔" وہ جواباً خاموشی سے مسکراتی رہی تھی مگر اس کی طرف سے فوراً یہ جواب زرینہ نے دیا تھا۔

عباد چٹکلے اور لطیفے سنا سنا کر سب کو ہنساتا ماحول کو بہت خوشگوار بنائے ہوئے تھے۔ اسے عباد کا یہ بے تکلفانہ دوستانہ انداز اچھا لگا تھا۔

اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنے گھر وہ پچھلے کئی برسوں سے اکیلے کھانا کھانے کی عادی ہو چلی تھی۔ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ فیملی کے سب لوگ اگر ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں تو عام سا کھانا بھی کتنے مزے کا لگنے لگتا ہے۔

ولی بھی اس کی طرح کھانا کھا چکا تھا اور اب وہ حذیفہ کے ساتھ مصروف تھا جو ماموں کا سر کھاتا اس سے بے بلیڈ چلانا سیکھنا چاہ رہا تھا۔

"برخوردار! یہ وکیل صاحب کو آپ نے کس کام پر لگا دیا ہے؟" عباد نے بیٹے سے کہا۔

"یار ولی! ہمارے بچپن میں یہ لٹو کتنے روپے کے ملا کرتے تھے' کچھ یاد ہے؟"

"کارٹون نیٹ ورک کے کرشمے ہیں سب۔ اب لٹو جیسی عام سی چیزیں بھی بچے کئی کئی سو کی خرید کر لاتے ہیں۔" حذیفہ کے ساتھ مصروف ولی نے عباد کو جواب دیا۔

***

اگلے روز جب کہ ولی دفتر جا چکا تھا اور آغا جان کی آنکھ لگی ہوئی تھی تب وہ دونوں لاؤنج میں فلور کشنز پر براجمان باتیں کر رہی تھیں۔

وہ واقعی اس کے جیسی تھی جب بدتمیز اور بد اخلاق تھی تو بے حد اور اب خوش مزاج اور خوش اخلاق تھی تو بھی بے حد۔ وہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں باتیں کیا کرتی تھی' مگر اس بے تکلفی کے باوجود وہ اس کے اور ولی کے رشتے کے متعلق یا اس کی ممی کے متعلق کبھی بھی کچھ نہ کہتی تھی۔

نہ ہی اس کی پچھلی کسی بات کا کوئی حوالہ دیتی تھی۔ وہ جیسے پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے لیے دل بالکل صاف اور کشادہ کر چکی تھی۔

لنچ ٹائم میں ابھی کافی دیر تھی مگر زرینہ کو بھوک لگ رہی تھی' اس کی بھوک کے علاج کے لیے فارہ ایک بڑا سا پیالہ گرم گرم پاپ کارن کا بنا کر لے آئی۔

"ارے پاپ کارن! زندہ باد۔ اس کا مطلب ہے تم خاصی سگھڑ لڑکی ہو۔"

پاپ کارن بنا کر لے آنے پر اس نے اسے سگھڑاپے کا سرٹیفکیٹ پیش کیا اور جلدی سے اٹھ کر فریج سے ڈائٹ پیپسی کے کین بھی نکال کر لے آئی۔

دونوں بچے وہیں بیٹھے ٹی وی پر کارٹون دیکھنے میں مصروف تھے۔ حمنا پاپ کارن دیکھتے ہی ان دونوں کے پاس آ گئی اور ان دونوں سے بھی پہلے کھانا شروع ہو گئی جب کہ حذیفہ ویسے ہی کالی اور میکس کو بے بلیڈ چلاتا دیکھنے میں مگن رہا۔

زرینہ حذیفہ کو پیار سے پچکار پچکار کر اپنے پاس بلا رہی تھی۔

"بیٹا! کھا کر تو دیکھو کتنے مزے کے پاپ کارن بنا کر لائی ہیں فارہ آنٹی!"

پھر وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی اور زبردستی اس کے منہ میں دو تین پاپ کارن ٹھونسے۔ مزید کھانے سے انکار میں سر ہلاتے اس نے اپنی نظریں پھر کارٹون پر جما دیں۔

"اسے اگنور کرو' ابھی خود آ جائے گا کھانے۔" فارہ نے ڈائٹ پیپسی کا ٹن کھولتے اسے نصیحت کی۔

"نہیں آئے گا۔ کھانے سے تو جیسے اسے الرجی ہے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تم تھوڑے دن کے لیے اپنے اس نخریلے بیٹے کو میرے پاس چھوڑ دو میں اسے ٹھیک کر دوں گی۔" اس نے

CamScanner

عشنا کو گود میں چڑھا لیا۔

وہ اس کی گود میں بیٹھی مزے سے پاپ کارن بھی کھا رہی تھی اور اس کے کین سے چسکی کے گھونٹ بھی لیے جا رہی تھی۔

"ہمیں تو یہ موٹی گڑیا پیاری لگتی ہے۔" اس نے عشنا کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔

"تم میرے بچوں میں فرق کر رہی ہو۔ خبردار! دیکھو میں تمہیں وارن کر رہی ہوں اپنے بیٹے میں میری جان ہے اگر مجھ سے بڑا کر رکھی ہے تو اسے اس کے نخروں سمیت دل کھول کر پیار کرنا ہوگا۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا تم نے کنفرم بھی کر دیا۔ ہو ناں وہی روایتی اماں' بیٹے کو بیٹی پر فوقیت دینے والی۔"

"ہاں تو کچھ غلط ہے کیا۔ یہ تو شادی کر کے چلتی بنیں گی۔ ہمارے بڑھاپے کا سہارا تو یہ بیٹا ہی بنے گا۔" روایتی کا لفظ سن کر اس نے بھی بالکل روایتی اور گھسا پٹا جملہ بڑے فخر سے بولا پھر اسے گھورتا پا کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"یار تمہیں ٹوئن بچوں کے ساتھ مشکل نہیں ہوتی تھی۔ اب تو خیر یہ کچھ بڑے ہو گئے ہیں مگر جب پیدا ہوئے ہوں گے تم دونوں کو ساتھ سنبھال لیتی تھیں؟"

"تم یہ بات کر رہی ہو مجھے تو پریگنیسی کے دنوں میں ڈاکٹر نے اول اول جب یہ بتایا تھا کہ میرے ہاں جڑواں بچے ہوں گے تو میرے تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میں نے اتنے ارمانوں سے ٹوئن بچوں کی ڈبل سواری والی پرام کاٹ سب چیزیں خریدی تھیں پھر جب یہ پیدا ہوئے اتفاق سے اس ہاسپٹل میں ان دنوں کسی اور کے ہاں جڑواں بچے ہوئے نہیں تھے۔ میں اتنے فخر سے ان دونوں کو گود میں لے کر پھرتی تھی۔

بس صرف یہ کہنے کی دیر ہوتی تھی' تمہارے پاس تو بس ایک ایک ہے میرے پاس تو دو دو ہیں۔ یار! مجھے منفرد نظر آنے کا شوق ہے۔ روایتی اور عام سے کام تو میں کر ہی نہیں سکتی اور پھر اس میں ایک فائدہ بھی ہے' دونوں ساتھ مل کر بڑے ہو گئے۔ شروع میں بے شک بہت مشکل ہوئی مگر بچے دو ہی اچھے کے اصول پر اگر چلا جائے تو میرا فائدہ بھی تو دیکھو۔ ایک وقت میں دو مشکلات سے نکل آئی۔ ساتھ بڑے ہو گئے' ساتھ اسکول جانا شروع کر دیا چلو اماں کی مشکل ختم ہوئی۔" وہ اتنے مزے سے بول رہی تھی کہ اس سے اپنا قہقہہ روکنا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہاں بس نقصان اتنا ہوا کہ میرا پڑھائی کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ کالج میں کلاس ریگولر اٹینڈ نہیں کر پائی تھی' اس لیے سیکنڈ ایئر کا ایگزیم نہیں دیا۔ اسی وجہ سے اب فائنل ایئر چل رہا ہے لیکن خیر کیا فرق پڑتا ہے ابھی نہ سہی اگلے سال مکمل ڈاکٹر بن جاؤں گی۔"

"تمہاری پڑھائی کے دوران شادی ہوئی کیوں تھی زرینہ!"

وہ اب یہ بات پورے یقین کے ساتھ جانتی تھی کہ آغا جان نے اس شادی کے لیے زرینہ کو مجبور نہیں کیا ہوگا۔ پہلے وہ اس خاندان کی عورتوں کو مظلوم' دبا ہوا اور مردوں کو ظالم اور حاکم سمجھا کرتی تھی۔

اس خاندان کی عورتیں باپردہ رہا کرتی تھیں تو یہ ایسی کوئی برائی تو نہیں جس پر یہاں کے مردوں کو قدامت پرست اور ظالمانہ وحاکمانہ ذہنیت کا مالک قرار دے دیا جائے۔

گھر سے باہر تو زرینہ اور اس فیملی کی دوسری خواتین بڑی بڑی چادروں میں ملفوف ہو کر جایا کرتی تھیں مگر گھر کے اندر بھی اس نے زرینہ کو کبھی دادا یا بھائی تک کے سامنے کھلے سر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر میں بھی ہر وقت سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ سر پر لیے رکھتی تھی۔ جبر یا زبردستی سے نہیں اپنی خوشی سے۔

اس نے زرینہ کو فیشن کے مطابق ہاف سلیوز یا بے تحاشا گلے کو نمایاں کرتی فٹنگ والے کپڑے پہنتے نہیں دیکھا تھا۔

اس کا لباس فیشن کے مطابق ہوتا تھا مگر وہ فیشن بس اسی حد تک جاتا تھا جہاں تک ہمارا مذہب ہمیں جانے کی اجازت دیتا ہے۔

اس سب میں کہاں برائی تھی' کہاں ظلم تھا' کہاں دقیانوسیت تھی' بغیر جانے' بنا قریب سے دیکھے وہ اس فیملی کے متعلق بالکل اسی طرز کے پروپیگنڈے کا شکار تھی جیسے مغربی میڈیا مسلمان ملکوں کی باپردہ خواتین کے متعلق کرتا ہے' جو سر پر اسکارف باندھ لے' خود کو ڈھکا چھپا کر باہر نکلے وہ بے چاری مردوں کے ظلم کا شکار ہے۔ اس ظلم سے رہائی کے لیے اسے عورتوں کے حقوق کی علمبردار کسی تنظیم سے فوراً رابطہ کرنا چاہیے۔

"بس یار! حالات کچھ ایسے بنے کہ میری شادی ذرا جلدی اور افراتفری میں ہوگئی۔" زرینہ اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

"اصل میں میرے سسر ان دنوں بہت بیمار تھے۔ بیمار کیا ڈاکٹرز انہیں جواب دے چکے تھے۔ مہینہ دو مہینہ بہت سے بہت چھ مہینے' ڈاکٹرز کے مطابق بس اتنا وقت باقی تھا ان کے پاس۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی کسی ایک اولاد کی خوشی تو دیکھ لیں۔

عباد سب سے بڑے ہیں ناں۔ اپنے بہن بھائیوں میں تو شادی انہیں کی ہونی تھی لیکن اس خواہش کے باوجود میری تعلیم کو ادھورا دیکھتے ان کی آغا جان سے یہ بات کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اسکول کے آخری سالوں میں میری منگنی عباد کے ساتھ کر دینے کے بعد آغا جان نے اور تب تو ماما اور پاپا بھی زندہ تھے ان تینوں نے عباد کے بابا سے بالکل واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ شادی میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہوگی اور اس سے قبل شادی کا نام بھی نہیں لیا جائے گا۔

لیکن اس وقت کسی نے یہ بھی تو نہیں سوچا تھا کہ عباد کے بابا یوں ایک دم اتنے موذی مرض کا شکار ہو جائیں گے۔

تب پھر عباد میرے پاس آئے تھے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے اس شادی کے لیے فورس نہیں کر رہے لیکن اگر میں ان کی خواہش مانتے ابھی شادی کے لیے راضی ہو جاؤں تو وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو ایک آخری خوشی دے پائیں گے۔

CamScanner

فیصلہ مشکل تھا۔ میں بہت پڑھاکو' کتابی کیڑا ٹائپ کی لڑکی تھی۔ ڈاکٹر بننا میرا جنون تھا اور میڈیکل کی پڑھائی کے ساتھ شادی' اتنی بڑی ذمہ داری' کشمکش و پیچ و الجھن میں مبتلا میں نے آخر آغا جان کی ایک بات پر عمل کیا۔

وہ کہتے ہیں فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو وہ کیا کہہ رہا ہے اور میرا دل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ شادی تو تمہاری اس شخص سے ہونا طے ہے کہ تم اس سے منسوب ہو اب نہیں ہوتی تو چار پانچ سال بعد ہوگی' پھر ایک چھوٹی سی قربانی دے کر اس کا مان رکھ لو۔

اور یقین کرو فارہ! شادی اس وقت کر لینے کا میرا وہ ایک چھوٹا سا فیصلہ میری شادی شدہ زندگی کے لیے کتنا اچھا ثابت ہوا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں' حالانکہ اس وقت میری ادھوری تعلیم اور کم عمری کی وجہ سے لالہ کو اس شادی پر بہت تحفظات تھے۔

میری شادی ہوگئی اور شادی کے ایک مہینے بعد ہی میرے سسر کا انتقال ہوگیا تب مجھے خود اپنے فیصلے کے درست ہونے کا احساس ہوا۔ میرا وہ ایک چھوٹا سا فیصلہ ایک مرتے ہوئے شخص کو خوشی دے گیا اور بدلے میں عمر بھر کے لیے میرے شوہر کی نگاہوں میں میری عزت اور قدر و منزلت کئی گنا بڑھا گیا۔

میری اس ایک قربانی کی ان کی نگاہوں میں بے حد عزت ہے بہت قدر ہے' میرے ساتھ کمپرومائز کرتے ہیں تو اپنے کام تو چھوڑ وہ میرے کام تک خود کر دیتے ہیں۔

میں جب ڈاکٹر بن جاؤں گی تو میری اس ڈگری میں پچاس فیصد کریڈٹ میرے شوہر کے تعاون' حوصلہ افزائی' مدد اور محبت کا ہوگا۔" وہ زرینہ کی باتیں بے دھیانی میں سن رہی تھی۔

اس کی سوچیں زرینہ کے صرف ایک جملے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ "فیصلہ کرنے کے لمحے میں؟"

"زرینہ! تم نے کیا کہا تھا ابھی۔ فیصلہ کرنے کے لمحے میں دل کی آواز سنو؟" زرینہ جیسے ہی خاموش ہوئی اس نے بے حد حیرت سے اس کے یہ الفاظ کھوئے کھوئے سے انداز میں دہرائے۔

"ہاں یار! یہ آغا جان کہتے ہیں۔ یہ آغا جان کے فیورٹ اور غالباً خود ایجاد کردہ جملے ہیں اور یہ وہ ہمیں بچپن سے سکھاتے' بتاتے اور سناتے آئے ہیں۔"

"فیصلہ کرنے کی گھڑی اور فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو۔"

دل دلیلیں نہیں مانگتا اس لیے جرأت مند بھی ہوتا ہے جب کہ دماغ ہر کام کرنے سے پہلے دلیلیں' ثبوت اور گواہیاں طلب کرتا ہے اس لیے بزدل ہوتا ہے۔

لیکن دل کی ماننے کا یہ مشورہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے اپنی اس مشین کو ٹھیک working condition میں رکھا ہوا ہوتا ہے اس پر جھوٹ' نفرت' عداوت' لالچ' حرص' حسد' بغض اور کینہ کا زنگ نہیں لگنے دیا۔" زرینہ ہنستے ہوئے آغا جان کے الفاظ ہو بہو انہی کے سے انداز میں دہرا رہی تھی اور وہ حیرت سے گنگ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"آغا جان کی اپنی ہی طرز کی بڑے مزے مزے کی مثالیں اور باتیں ہوا کرتی تھیں جو وہ ہمیں بچپن میں سکھایا کرتے تھے۔ یہ جو ضمیر انکل ہیں ناں' یہ بھی وہ ہیں دل کے کہیں آس پاس ہی رہتے ہیں۔

ان کا کام ہماری اس مشین کی نگرانی اور حفاظت کرنا ہے۔ ٹوکتے رہتے ہیں اگر ہم ان کی چیخ و پکار پر دھیان دیں اس زنگ کی بروقت روک تھام کر لیں تب تو خیر ہے۔ سمجھ لو ہم نے اپنی مشین کو خرابی سے بچا لیا' نہیں تو پھر وہ زنگ آہستہ آہستہ ہماری اس قیمتی اور نازک مشین کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے کر اسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔"

زرینہ آغا جان کی باتیں انہی کے الفاظ اور لہجے میں مسکراتے ہوئے دہرا رہی تھی۔

اور وہ حیران ہو رہی تھی۔

تو ڈیڈی نے جو بچپن میں ایک بار اسے بھی سب باتیں انہی الفاظ میں نصیحت کی تھیں وہ انہیں آغا جان نے سکھائی اور بتائی تھیں؟

اور آغا جان کی بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں کتنی سچی۔ کچھ دیر بعد جب زرینہ' عباد کا فون آنے پر وہاں سے اٹھی اور وہ لاؤنج میں اکیلی رہ گئی جب وہ آغا جان کی ان باتوں کی روشنی میں اپنا تجزیہ کرنے لگی۔

اسے کیا بات ڈسٹرب کرتی تھی۔ جب خلع کا ایشو اٹھا تب' جب آغا جان سے جائیداد میں حصہ مانگنے کے مطالبے پر وہ مطلق خاموش ہوتی تھی۔

تب' جب اپنے گھر میں اس نے آغا جان سے اس رشتے کے لیے انکار کیا تب' جب اس نے دو مہینے پہلے آغا جان کی فون کال نہیں سنی تھی تب۔

اس کی ہاؤس جاب میں کارکردگی خراب کیوں جا رہی تھی' اس کا فائنل ایئر کا رزلٹ بہت اچھا کیوں نہیں آ سکا تھا' اس کا دل اس کے خلاف چلا آ رہا تھا۔

جو کچھ بھی وہ کر رہی تھی اس پر اس کا دل اس سے ناخوش تھا۔ "فارہ! تم مجھ پر زنگ پر زنگ لگا رہی ہو' تم میری درست ورکنگ کنڈیشن کو خراب کر دینے پر تلی ہو' تم مجھے ناکارہ بنا دینے کے کام کر رہی ہو۔"

اور اس کا دل اس سے پہلی بار بدگمان اور شاکی کب ہوا تھا' جب آغا جان اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروا کر گئے تھے۔

دل کی دنیا کی اپنی دلیلیں اور اپنی منطقیں ہوتی ہیں' دل جسے اچھا قرار دے دے پھر وہ بے دلیل بھی اچھا ہوتا ہے اور جسے برا کہے پھر وہ اپنے حق میں ہر دلیل اور ہر حجت رکھنے کے باوجود برا ہی رہتا ہے۔

اور اس کے دل نے اس روز آغا جان کو اچھا مان لیا تھا' ان کی محبت کو قبول کر لیا تھا اس سے پہلے اس کا دل نہ انہیں اچھا سمجھتا تھا نہ برا' مگر اس روز ان کے ساتھ بینچ پر بیٹھ کر فارم بھرتے اس کے دل نے ان کی سچائی' ان کے خلوص اور ان کی محبت کو پہچان لیا تھا۔

آج اسے پہلی بار پتا چل رہا تھا کہ چھ سالوں سے وہ الگ سمت میں بھاگ رہی ہے اور اس کا دل الگ سمت

CS CamScanner

میں اس کا دل اس کے مد مقابل اس کے خلاف کھڑا تھا۔

یہ تو اب طلاق خلع اور جائیداد والے ایشوز اور اکاؤنٹ سے سارا پیسہ حواثر خرچ کروا لینے والے معاملے کے بعد ہوا تھا جو وہ ممی سے خفا اور بہت دور ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے تک تو ان تمام برسوں میں اس نے ہمیشہ انہیں ان کے ہر عمل کے لیے حق بجانب سمجھا تھا۔

صرف اس نے' اس کے دل نے نہیں۔ دل میں ماں کی محبت نہ ہو یہ ہو سکتا تھا بھلا؟ مگر اس کا دل جسے اتنا چاہتا تھا اسے برباد ہوتا اور غلط کرتا بھی تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ جس سے محبت کرتا تھا اسے تباہی و بربادی سے بچا لینا چاہتا تھا اور اس کی ممی وہ خود کو تباہ ہی تو کر رہی تھیں۔

ایک بہت اچھی گھریلو مشرقی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی نے شوہر کی زندگی کے آخری ایام میں اس کا ساتھ نہیں نبھایا' مرنے سے پہلے اسے تنہا چھوڑ گئی۔

اپنے اندر ابھرتے احساس ندامت' شرمندگی اور پچھتاووں سے بچنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ سب الزام آغا جان پر دھر دیں اور خود کو زندگی کے دوسرے مشاغل میں اتنا الجھا لیں کہ اپنے اندر سے ابھرتی کوئی پچھتاووں بھری یاد انہیں آنے ہی نہیں۔

کبھی جو ایک بہت گھریلو عورت' بہت اچھی بیوی اور بہت اچھی ماں تھی وہ اب امیر طبقے کی محض ایک ایسی عورت تھی جس کا کام پیسہ دونوں ہاتھوں سے لٹانا تھا۔

شاپنگ' ڈنرز' پارٹیز اس کی زندگی کا محور یہی چیزیں بن گئی تھیں۔

اس کا دل اسے سمجھاتا تھا' اکساتا تھا کہ وہ ماں کو اس خودکشی سے روکے اسے غلط کرنے سے روکے' اسے سمجھائے کہ وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کا بہادری سے سامنا کرے۔

وہ ماں کا ساتھ ایک اچھی فرماں بردار بیٹی کی طرح دے تو رہی تھی مگر اندر یہ احساس شدت سے موجود تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ سب کا سب غلط ہے۔

پچھلے چھ سات مہینوں سے وہ کتنی الجھی ہوئی اور بے قرار تھی' وہ کتنی نڈھال اور کتنی بے سکون تھی۔ وہ اپنے ہی دل کے خلاف لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔

اسے آغا جان کے پاس پشاور چلے جانا چاہیے۔ یہ اس کے دل نے اس سے کہا تھا اور اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے دل کی مانی تھی۔

اتنے دنوں میں پہلی بار اسے خود پر تھوڑا سا فخر ہوا۔ اس کا ندامت سے جھکا سر کچھ اوپر اٹھ سکا' وہ اپنے دل کی مان کر یہاں آ گئی تھی۔ دل کے پیش کردہ کسی معاہدے کو نہیں۔

اس کا دل ابھی صحیح working condition میں تھا' ہر چند اس نے اسے داغ دار بہت کرنا چاہا مگر وہ ابھی تک صحیح سلامت تھا۔

زرینہ کی بظاہر ایک عام سی بات نے اس کے لیے سوچ کے کتنے نئے در وا کیے تھے۔

ماں سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ماں کی غلطیوں کا بہت پیار سے احساس دلائے' اس کی غلطیوں کے لیے جواز ڈھونڈنا چھوڑ کر اور اس سے ناراض ہونا ترک کر کے وہ اس سے وہ بات کہے جو اس کا دل سمجھاتا آیا ہے کہ اسے اپنی ماں سے کہنی چاہیے۔

شام کے وقت اپنے پورشن میں آ کر اس نے وہاں سے انہیں فون کیا تھا۔

کانپتی ہوئی مضطرب انگلیوں سے اس نے ممی کا نمبر ملایا تھا۔

"السلام علیکم ممی!"

"میں نے تم سے کہا تھا اب مجھے کبھی بھی....." وہ اپنا جملہ مکمل کرتے ہی یقیناً لائن منقطع کر دینے والی تھیں' اس لیے وہ بے ساختہ ان کی بات کے درمیان ہی بول پڑی۔

"ممی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ میری بات پوری ہونے سے پہلے فون بند نہیں کریں گی۔ اگر آپ نے زندگی میں کبھی ڈیڈی سے محبت کی تھی تو میں آپ کو اس محبت کا واسطہ دے رہی ہوں۔"

"فارہ!" اس کے لہجے میں کوئی گستاخی' کوئی بدتمیزی نہیں تھی مگر شاید انہیں ایسا ہی لگا تھا جب ہی تیکھی انداز میں اس کا نام لیا۔

"ممی! ایک شخص تھا محمد بہروز خان' وہ بہت اچھا شوہر تھا' وہ بہت اچھا باپ تھا' وہ اپنی شادی شدہ زندگی کے تئیس سالوں میں اپنی بیوی کے ساتھ بہت مخلص بہت وفادار رہا۔

اس نے بیوی کو محبت' عزت' وفا' سکھ' چین وہ سب کچھ دیا جو ایک چاہنے والا شوہر دیا کرتا ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی اور وہ اس بیٹی کو اس کی زندگی کے اٹھارہ سالوں تک بے حد و بے حساب پیار دیتا رہا۔

اسے عیش و آرام' محبت' شفقت وہ سب کچھ دیا جو ایک محبت کرنے والا باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔ پھر آپ کو پتا ہے کیا ہوا؟

اس کا بھائی مر گیا' اس کا باپ بستر پر بیمار' غم سے نڈھال پڑا تھا۔ وہ اتنے برسوں ضد باندھ کر ناراض ہو کر باپ اور بھائی سے کیوں دور رہا؟ ان سے کبھی ملا کیوں نہیں' بیٹے اور بھائی کا فرض کبھی نبھایا کیوں نہیں۔ وہ غم میں بھی تھا' وہ زندگی بھر باپ اور بھائی سے دور رہنے پر نادم بھی تھا۔

اور پتا ہے ان حالات میں تئیس سال ساتھ رہنے والی بیوی اور اٹھارہ سال باپ کی شفقتوں کے سائے میں پلی بیٹی نے کیا کیا؟

بیوی نے تئیس سال کے محبت بھرے ساتھ سے بدگمان ہونے میں تئیس گھنٹے بھی نہ لگائے اور بیٹی نے اٹھارہ سال کی محبت محض اٹھارہ گھنٹوں میں بھلا ڈالی۔

آپ کو معلوم ہے جب وہ شخص تین روز بعد مر گیا تو کس حال میں مرا تھا۔ اس کی بیوی نے اس سے تین روز سے بات کرنا بند کر رکھی تھی اور بیٹی خود کو بہت مظلوم اور بہت ستم رسیدہ سمجھ کر ایک کونے میں باپ سے لاتعلق بیٹھی

تھی۔

اس کی بیوی اور بیٹی اس پر اعتبار کرتی ہیں، اس کا یقین کرتی ہیں، اس کی محبت کو دل کی گہرائیوں سے مانتی ہیں' وہ سننا چاہتا تھا' وہ دیکھنا چاہتا تھا' اس لیے کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔

اسے شاید پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہ شاید جاں کنی کی تکلیف میں بستر پر نڈھال ہو کر گر بھی گیا تھا۔ اس کے حلق میں پانی کا ایک قطرہ ٹپکانے والا کوئی اس کے پاس نہ تھا' نہ بیوی' نہ بیٹی۔

اس نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ وہ بھوکا' پیاسا شاید پیاس کی شدت سے تڑپا' نزع کا عالم' جاں کنی کی تکلیف سب کچھ تنہا جھیل کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔" وہ بھرائی آواز میں انہیں ایک کہانی سنا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بڑی شدت سے بہنے لگے تھے کہ یہ کہانی آنسوؤں کے بغیر سنائی نہ جا سکتی تھی۔

"پھر اس بیوی اور بیٹی کا کیا ہوا؟ آپ کو شاید یہاں تک سن کر ایسا لگا ہو کہ پھر وہ بدل گئی ہوں گی' اپنے کیے پر بے حد شرمندہ ہوں گی' اپنے اس بہت عزیز انسان کی ایسی موت پر ان کے دل ہل گئے ہوں گے۔

نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس زندہ کو انہوں نے جتنی اذیتیں دیں' اس کے مرنے کے بعد بھی اسے اذیتیں دینا ختم نہ کیں۔ اب وہ تو نہیں رہا تھا' ہاں اس کا وہ باپ تو زندہ تھا جس سے وہ بے تحاشا محبت کیا کرتا تھا۔

اس شخص سے بدلہ لینے کا' اسے تکلیف پہنچانے کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اب اس کے دکھی باپ کے غمزدہ دل کو مزید غم پہنچائے جائیں۔

جانتے ہیں وہ ماں اور بیٹی اتنی سخت دل کیسے تھیں؟ کیوں تھیں؟ انہیں کوئی حادثہ' کوئی سانحہ نہیں ہلاتا تھا۔ مزے کی بات بتاؤں انہیں اپنے مرحوم شوہر اور باپ سے محبت کا بھی بڑا زبردست دعویٰ تھا۔

کوئی مجھ سے محبت کا دعویٰ کرے مگر میری ماں سے نفرت کرے تو کیا میں اس شخص کی محبت کو قبول کروں گی؟ سچ مان لوں گی؟

کوئی آپ سے بہت محبت کرے مگر آپ کی بیٹی کے خلاف دل میں بغض رکھے تو کیا آپ ایسے شخص کو اپنی محبت میں سچا سمجھیں گی؟

اگر مرے ہوؤں کو زندوں کے اعمال کی خبر پہنچا کرتی ہے تو وہ مر جانے والا ان ماں اور بیٹی کی اپنے سے محبت کے دعوؤں کو کیونکر سچ سمجھتا ہوگا' کیونکر ان پر اعتبار کرتا ہوگا۔"

"قارہ! قارہ! بس کرو۔"

انہوں نے اسے چپ کرانا چاہا' مگر وہ چپ ہونے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے روتے ہوئے بولی۔

"ممی! ڈیڈی آپ کے بہت اچھے شوہر تھے' میرے بہت اچھے باپ تھے' مگر آپ اچھی بیوی نہ بن سکیں' میں اچھی بیٹی نہ بن سکی۔

ہم نے اپنا یہ گناہ قبول کر لیا' آپ کب کریں گی؟ ابھی وہ بوڑھا انسان زندہ ہے ہم ازالہ کر سکتے ہیں۔"

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ایک دو منٹ تو اس سے کچھ بولا بھی نہ جا سکا۔

"ممی! میں بس آپ سے ایک آخری بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک آخری بات۔ اس کا جواب آپ مجھے ابھی مت دیں۔ بعد میں سوچ کر دے دیجیے گا۔

ممی! کیا کوئی شخص ایک ہی وقت میں اچھا شوہر' اچھا باپ' اچھا بیٹا اور اچھا بھائی نہیں بن سکتا؟ کیا محبت کے لیے اللہ نے ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی سی جگہ رکھی ہے؟ ہم ایک وقت میں اپنے بہت سے قریبی رشتوں سے ایک جیسی محبت کر ہی نہیں سکتے؟" زار و قطار روتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

زرینہ مزید چار روز رہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ آغا جان کی صحت کی طرف سے گو وہ ابھی بھی متفکر تھی مگر بہرحال وہ اپنے گھر کو بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

آغا جان کے پاس ولی کے ساتھ اب قارہ بھی ہے' یہی اطمینان لیے وہ اپنے گھر رخصت ہوئی تھی۔

"اب میں یہاں آیا کروں گی تو تم مجھے یہاں ہر بار اسی طرح رخصت کرنے آیا کرو گی ناں؟" پورچ میں آ کر رکتے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ اس سے بولی۔

ان گزرے دنوں میں ان کے بیچ دوستی' اعتماد اور پیار کا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

"ہاں میں تمہارا ہر بار استقبال بھی خود کروں گی اور رخصت کرنے بھی خود آیا کروں گی۔" مسکرا کر اس نے اسے یقین دہانی کرائی تھی۔

بچوں کے دم سے گھر میں کتنی رونق تھی اب ایک دم خاموشی سی ہو گئی تھی۔ گھر کے مکین وہ کل تین نفوس تھے' ان میں سے دو آپس میں کچھ خاص زیادہ بات نہیں کرتے تھے تو گھر میں خاموشی ہی کا احساس ہوتا تھا۔

ان دونوں کی آپس میں ہر بات آغا جان ہی کے حوالے سے ہوتی تھی۔ صبح اکثر وہ دونوں بھی آغا جان کے ساتھ ان کے کمرے ہی میں ناشتہ کر لیا کرتے تھے' اس کے بعد وہ چلا جاتا اور قارہ آغا جان کی ڈاکٹرز' نرس اور کک کی تمام ذمہ داریاں زرینہ ہی کی طرح سنبھال لیتی۔

لنچ ٹائم میں ولی اکثر آغا جان کی وجہ سے گھر آ جایا کرتا تھا' مگر لنچ ٹائم سے قبل بھی دو تین بار اس کی فون کال آتی' اگر کال کسی ملازم نے بھی ریسیو کی ہوتی تو وہ اس کو بلوایا کرتا۔

اس سے ان کی پوری طبیعت پوچھتا' انہوں نے دوا لے لی' تم نے بی پی چیک کر لیا وغیرہ مگر یہ مختصر بات وہ بہت فاصلہ رکھ کر کیا کرتا۔ اس میں کسی بھی طرح کا کوئی ذاتی یا بے تکلفانہ انداز ہرگز شامل نہ ہوتا تھا۔

پھر آغا جان کی خیریت معلوم کر لینے کے بعد وہ مزید کوئی غیر متعلقہ بات کیے بغیر فون بند کر دیتا۔ شام میں وہ اکثر بہت جلدی ہی گھر آ جاتا' ہاں کبھی کبھار معمولی سی دیر ہو جاتی تھی' تب وہ فون کر کے آغا جان کو اپنے دیر سے

آنے سے آگاہ کیا کرتا تھا۔

گھر آنے کے بعد پھر وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ اس کی کیا کوئی سوشل مصروفیات، دوست احباب کچھ نہیں تھے یا ان دنوں آغا جان کی وجہ سے اس نے تمام مصروفیات ترک کر رکھی تھیں۔

وہ حیران ہو کر سوچتی۔ اس یک اتنے میں جو تبدیلی اور ٹھہراؤ اس نے خود پر طاری کر رکھا تھا وہ اس پر خاصی متعجب تھی۔

"آغا جان کی تیمارداری اور دفتری کام کیا اس کی زندگی ابھی ذمہ داریوں کے گرد گھوما کرتی تھی۔ شام میں گھر آنے کے بعد پھر وہ تقریباً سارا وقت آغا جان کے ساتھ گزارتا۔ وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ جاتی۔

اگر آغا جان اس سے چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق کر رہے ہوتے تو ولی خاموش بیٹھا رہتا اور ولی سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں ہوتے تو وہ چپ رہتی۔

پھر وہ تینوں ایک ساتھ وہاں کھانا کھاتے۔ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور وہ بھی آغا جان کو دوا دینے کے بعد اپنے کمرے میں آ جاتی۔

اپنے پورشن میں دن میں بھی اس کا آغا جان کی وجہ سے بہت ہی کم وقت گزرتا تھا کیونکہ زیادہ وقت وہاں ہوتی تو یہاں وہ بالکل تنہا ہو جاتے اور رات میں تو اس الگ تھلگ اور مکینوں سے خالی غیر آباد حصے میں جا کر سونے کی وہ ہمت کر ہی نہیں سکتی تھی سوائے ڈیڈی کا کمرہ سونے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

ہاں، وہ اپنے اس پورشن کی خود جا کر روز صفائی کرواتی، دن میں نہانا، لباس تبدیل کرنا اور ظہر کی نماز پڑھنا بھی سب وہیں پر کیا کرتی۔

ہر رات اپنے کمرے میں آتے ہی تنہائی ملتے ہی دن بھر آغا جان کے لیے چہرے پر سجائی تمام مسکراہٹیں اس کے چہرے پر سے غائب ہو جاتیں۔ اسے ممی کا خیال آنے لگتا۔

وہ جو کچھ کہہ سکتی تھی اس نے کہہ دیا اب کیا کرے؟ ان کی طرف سے جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ آغا جان سے جاتے وعدے وہ ہسپتال میں کیے تھے ان کا کیا ہو گا؟ وہ ممی کی نفرتوں کو کس طور ختم کر پائے گی؟

فروری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، یہ فروری کے مہینے کی بالکل ابتدائی تاریخیں تھیں اور وہ ممی کی اس مسلسل اور پیہم خاموشی پر بے حد دلبرداشتہ اور اداس تھی۔

وہ اپنا ذہن بٹانے کے لیے ٹی وی دیکھتی، کوئی میگزین پڑھنے کی کوشش کرتی تب بھی اس کا ذہن اور دل ممی ہی میں اٹکا رہتا۔

زرینہ تقریباً ہر روز چاہے کھڑے کھڑے ہی آ جائے آغا جان کی خیریت پوچھنے آ رہی تھی۔ کبھی عباد ساتھ ہوتا، کبھی وہ ڈرائیور کے ساتھ آ جاتی اور کبھی کسی کام سے نکلی ہوتی تو خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتی یہاں کا بھی ایک طوفانی دورہ کر لیا کرتی۔ فون پر تو اس کا فارہ اور آغا جان سے تفصیلی گفتگو کرنا لازمی ہوا ہی کرتا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے آغا جان کی طرف سے بہت مطمئن تھی۔

ولی باقی ہر چیز کا بہت اچھی طرح دھیان رکھ لیتا تھا مگر آغا جان کا کھانا پینا۔ وہ نوکروں کو ہدایات تو دے دے گا مگر وہ کیا کر رہے ہیں اور کیسے پکا رہے ہیں، یہ تو وہ کھڑا رہ کر نہیں دیکھ سکتا۔

کارن آئل ختم ہو گیا، زیتون کے تیل کا ڈبا نہیں نکلا، چھوڑو، کون تردد کرے۔ یہ سامنے تو گھی رکھا ہے، کھانا اسی میں پکا کر جان چھڑا لو۔

بکرے کا گوشت اگر بغیر چکنائی مکمل طور پر ہٹائے بھی پکا لیا تو کیا حرج ہے۔

نوکر تو نوکر ہوتے ہیں اور جب کوئی ان کے سر پر کھڑا ہو کر دیکھنے والا نہ ہو تو وہ اپنی سہولت اور موڈ کے لحاظ سے ایسی کارگزاریاں دکھا سکتے ہیں۔

فارہ آغا جان کے لیے پرہیزی کھانا زرینہ ہی کی طرح خود پکاتی تھی، اس پر زرینہ مطمئن تھی۔ اس کے روز و شب ان دنوں آغا جان کے ساتھ گزر رہے تھے۔

اور فروری کے ان ابتدائی دنوں میں سے ایک دن آغا جان نے اس سے اس کے لاہور واپس جانے کی بابت پوچھا تھا۔ اس کے ہاؤس جاب کی تو خیر انہیں جو فکر تھی سو تھی مگر اصل فکر انہیں ممی کی تھی۔

"بیٹا! تمہاری ممی وہاں تنہا ہیں۔ تمہیں اب ان کے پاس چلے جانا چاہیے۔ میری طبیعت یوں بھی اب پہلے سے بہتر ہے۔"

وہ ان کے دل کو رنج پہنچانے والی کوئی بھی بات ان سے کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے ہلکے پھلکے خوشگوار انداز میں انہیں بتانے لگی کہ وہ ممی تو رنٹو خالہ سے ملنے گئی ہوئی ہیں اور ابھی چند ماہ وہیں رہیں گی، لہٰذا ان کے لاہور میں اکیلے ہونے کا کوئی مسئلہ ہی در پیش نہیں، اس لیے وہ یہاں اطمینان سے خوب لمبا رہ سکتی ہے۔

یہاں آ کر اس نے اب تک بھی یہ بات انہیں بتائی ہی نہیں تھی، وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ لاہور میں ہیں اور اس نے ان کی غلط فہمی دور نہ کی تھی۔ اب جب انہیں یہ بات بتائی تو اس کے ہلکے پھلکے انداز کے باوجود وہ بہت کچھ بھانپ سے گئے۔

انہوں نے اسے کریدا۔ پہلے وہ بات کو یہاں وہاں گھماتی رہی مگر ان کے پیہم بضد انداز پر آخر اسے سچائی بتانی ہی پڑی۔

"وہ کینیڈا مجھ سے ناراض ہو کر گئی ہوئی ہیں۔"

"کیا یہاں آنے پر؟" وہ بے اختیار لیٹے سے اٹھ بیٹھے، حد درجہ متفکر اور پریشان۔

"آپ اور کس کس بات کو، کس کس گناہ کا الزام اپنے سر لیں گے آغا جان! یہاں آنے پر نہیں، وہ اس سے بہت پہلے سے مجھ سے ناراض ہو کر ٹورنٹو چلی گئی تھیں۔ جب میں یہاں آئی تو انہیں گئے پندرہ روز ہو چکے تھے۔ آپ ولی سے پوچھ لیں، میں اپنے گھر کو تالا لگا کر آئی تھی۔"

اس نے خود کو رونے سے بدقت روکا تھا۔ وہ ان کے سامنے بالکل بھی نہیں رونا چاہتی تھی۔ وہ ان کے سامنے کوئی تکلیف دہ یا موضوع چھیڑنا ابھی نہ چاہتی تھی مگر اب ان کے اصرار پر اسے یہ تکلیف دہ موضوع اٹھانا ہی پڑا تھا۔

CamScanner

"اور تم پندرہ دنوں سے اکیلی رہ رہی تھیں؟" انہیں نجانے کون کون سے وہم اور پریشانیاں ستانے لگیں۔

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں آغا جان جب جو کچھ بھی ہوا اب تو میں آپ کے پاس ہوں بالکل محفوظ اور امان میں اور آپ بھی کسی کی ناراضی کی فکر مت کریں انشاءاللہ بہت جلد وہ اپنی ساری ناراضی بھلا دیں گی۔

اور میرے ہاؤس جاب کی بھی آپ فکر مت کریں۔ ہاؤس جاب اور میرا سپیشلائزیشن میں ہر چیز کے متعلق پوری سنجیدگی سے سوچوں گی مگر ابھی نہیں۔ پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جائیں۔ اٹھ کر چلنے پھرنے اور اپنے سارے کام خود کرنے کے قابل ہو جائیں تب تک کا یہ وقت میں صرف اور صرف آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔

اور یہ تو خیر آپ بھول ہی جائیں کہ میں آپ کو چھوڑ کر یہاں سے کہیں جانے والی ہوں۔ آپ کو تنگ کرنے کو رہوں گی تو میں اب ہمیشہ یہاں پر ہی۔"

وہ بھی کی اس سے ناراضی اور کینیڈا آگئے ہونے کا سن کر خاصے متفکر ہوئے تھے۔ اپنی بیماری کی وجہ سے نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں وہ اس کی خیریت نہ خود جا کر سکے نہ دل سے کروا سکے تھے جیسے ہمیشہ کرلیا کرتے تھے ورنہ تو اس کے اکیلے رہنے کا انہیں پہلے ہی پتا چل جاتا۔

وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے مسکرا رہی تھی اور وہ اسے اپنے لیے پریشان ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے مسکرا رہے تھے۔

"آپ دل کو دماغ پر فوقیت دیتے ہیں؟" اس نے آغا جان سے پوچھا۔

وہ ان کے ساتھ بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔ لنچ کے لیے ان کا پرہیزی سالن چڑھا کر آنے کے بعد اب وہ ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور ادھر ادھر کی باتوں کا ذکر نکلتے نکلتے وہ انہیں یہ بتانے لگی کہ ان کی کچھ باتیں اسے اس کے ڈیڈی نے بچپن میں بتائی تھیں۔

وہ دلچسپی سے اس کے لبوں سے اپنے ہی فقرے سن رہے تھے اور یقیناً یہ جان کر بے پناہ خوش بھی ہو رہے تھے کہ ان کے بیٹے نے ان سے دور چلے جانے اور بظاہر خفا نظر آنے کے باوجود بھی درحقیقت انہیں ہمیشہ اپنے دل میں آباد کیے رکھا تھا تب ہی تو ان کی باتیں اپنی بیٹی کو بتایا کرتا تھا۔ وہ اس کا سوال سن کر مسکرائے۔

"ہاں اقبال کا سچا معتقد ہوں نا اس لیے۔" پھر اسے بغور دیکھتے وہ اسی دھیمی مسکراہٹ کو چہرے پر لیے نرم لہجے میں کہنے لگے۔

"تم اللہ کو اپنے رب کو دل سے مانتی ہو یا دماغ سے؟ یقیناً دونوں سے مانتی ہو گی مگر ان دونوں کے ماننے میں فرق بہت ہے۔ دل اللہ کو بے دلیل اپنا رب مانتا ہے اور دماغ دلیل کے ساتھ۔"

اسی مسکراہٹ کو چہرے پر لیے مزید کہنے لگے۔

"تمہاری میڈیکل سائنس کی زبان میں اگر بات کروں تو طب کی ایک کتاب میں پڑھی کچھ باتیں" زمانہ قدیم کے طبیبوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ چونکہ دماغ رئیس الاعضاء ہے اور دوسرے تمام اعضا کی طرح دل بھی دماغ کے پوری طرح تابع ہے اور دماغ ہی نے دل کو دھڑکنے کے لیے ابتدائی مہمیز دی اور اسی کے احکام پر دل دھڑکتا ہے اس غلط فہمی کو ایک مشہور عالم نے دور کیا۔

اس نے یہ چونکا دینے والا اور حیرت انگیز انکشاف کیا کہ پیدائش سے قبل جب بچے کے اعضاء نشوونما پانے کے مرحلے سے گزر رہے ہوتے ہیں تب بچے کا دل اس وقت دھڑکنا شروع کر دیتا ہے جب کہ ابھی دماغ کی پوری طرح تشکیل بھی نہیں ہوئی ہوتی۔

اس بات نے دنیا بھر کے ڈاکٹروں، سائنس دانوں کو آج تک سرگرداں کر رکھا ہے کہ وہ کیا قوت ہے جو دل کو اول اول دھڑکنا سکھاتی ہے۔" وہ پڑھی لکھی کتابی قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔

"ارسطو نے کہا تھا کہ دل ہی ایک عضو ہے جو سب سے پہلے حرکت کرتا ہے اور سب سے آخر میں اس کی حرکت بند ہو کر سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ اللہ کی مشیت اس کا قانون اور اس کا فیصلہ ہے کہ اس نے دل کو دوسرے تمام اعضاء پر فوقیت دی ہے۔"

"آپ اپنے جسم کے جس عضو سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں اسی نے آپ کو کس قدر تنگ کر کے رکھا ہوا ہے۔" وہ ان کی بیماری کا لطیف پیرائے میں ذکر کرتی شرارت سے مسکرائی۔

وہ بھی جواباً کھل کر ہنسے۔ کچھ دیر ان کے بیچ یہی موضوع رہا۔ وہ دل کے قصیدے پڑھتے رہے، وہ سنتی رہی اور جوابی تبصرے کرتی رہی۔ کافی دیر بعد جب یہ موضوع ختم ہوا تب کچھ خیال آنے پر وہ اس سے بولے۔

"بیٹا! میں اپنی وصیت تیار کروا رہا ہوں۔ یہ گھر میں روحی کے نام کر رہا ہوں اور تمہارے۔" وہ بولتے بولتے اس کے چہرے کے رنگوں کو یکدم ہی پھیکا پڑتا دیکھ کر یکلخت چپ ہوئے۔

ابھی وہ اتنا مسکرا رہی تھی ان کے ساتھ شوخی و شرارت بھری باتیں کر رہی تھی اور اب۔

"فارہ! بیٹا کیا ہوا؟"

"آغا جان! آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔ آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔" وہ ان کے پاس بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ یکدم ہی ان سے دور ہٹنے لگی۔

"نہیں فارہ! ایسا نہیں۔"

"اور میں یہ سوچ کر بھی آپ سے اپنے کسی پچھلے رویے کی معافی نہیں مانگتی تھی کہ مجھے لگتا تھا میرا اور آپ کا رشتہ آپ کی مجھ سے محبت 'معافی' کے ایک لفظ سے بہت اونچی ہے۔ میں معافی مانگ کر آپ کی محبت کی توہین کروں گی آپ کو ایک دم ہی بالکل پرایا اور اجنبی کر دوں گی۔ آپ میرے معافی مانگنے سے ہرٹ ہوں گے آپ کو لگے گا فارہ اب بھی مجھ سے سچے دل سے پیار نہیں کرتی۔ بس صرف شرمندہ اور نادم ہوتی ہے۔"

وہ ہسپتال میں جو پہلے دن ان کے سامنے روئی تھی اس ایک وقفے کے بعد وہ پھر دوبارہ کبھی ان کے سامنے نہ

روئی تھی مگر اس وقت اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

"فارہ! ایسا نہیں بیٹا تم غلط سمجھ رہی ہو۔ یہ میں کسی ناراضی یا غصے میں یا روحی کے مطالبے کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ یہ تو مجھ پر فرض ہے، یہ کام تو مجھے ہر حال میں کرنا ہی ہے۔" انہوں نے اسے اپنے قریب کر کے رسانیت سے سمجھانا چاہا۔

"آپ مجھے دولت جائیداد کا لالچی سمجھتے ہیں، جب کہ سچ یہ ہے کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ صرف ممی کا تھا میرا نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں میں اس مطالبے میں ان کی ہم نوا تھی؟ میرا انہی سے اختلاف ہی اس بات پر ہوا تھا آغا جان اور مجھے چھوڑ کر کینیڈا چلی ہی اس لیے گئیں کہ میں ان کی مخالفت کرنے کا جرم کر بیٹھی تھی۔"

اس روز ممی کے جانے کے اسباب ان سے قسمیں میں چھپا لینے والی اس وقت روتے ہوئے سب کچھ بتانے لگی تھی۔

"میں جانتا ہوں یہ میری بیٹی کا مطالبہ نہیں تھا۔ یہ صرف روحی کا مطالبہ تھا لیکن بیٹا! اس کے اس مطالبے میں ایسا غلط تو کچھ بھی نہیں جو تم ماں سے خفا ہو جاؤ۔ اس کا اپنا حق مجھ سے مانگنا بالکل جائز تھا اور ہے۔

لیکن میں اس وقت اس مطالبے پر قصداً خاموش اس لیے رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ یہ مطالبہ وہ خود اتنا نہیں کر رہی جتنا دوسرے کچھ لوگ اس سے کروا رہے ہیں۔ کچھ اور لوگ اسے اکسا رہے ہیں۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں تمہارے اور روحی کے حق پر وہ دوسرے لوگ بعد میں قابض نہ ہو جائیں، تم لوگوں کا حق چھین نہ لیں بس اس لیے خاموش رہتا تھا۔ بیٹا! اس کی طرف سے دل برا مت کیا کرو۔ وہ بس سادہ اور کم عقل ہے، وہ دوست دشمن میں فرق نہیں کر پائی۔

یہ سب کسی ناراضی میں نہیں اپنا فرض، اپنی ذمہ داری سمجھ کر اور تم سب کی محبت میں کر رہا ہوں۔

تم، ولی، زرمینہ، روحی، مجھ پر فرض ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہر ایک کو اس کا جائز حق اپنے ہاتھوں دے دوں۔

تمہیں اگر میں اپنے ہاتھ سے کچھ دوں تو کیا تمہیں مجھ سے لینا اچھا نہیں لگے گا؟ میں چاہتا ہوں میرے جانے کے بعد بھی میری بیٹی کو کبھی کوئی تکلیف، کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ وہ ہمیشہ بہت پرسکون، پرآسائش اور آسودہ زندگی گزارے۔"

وہ بہت تدبر اور رسانیت سے بولے مگر وہ ان کے کسی بھی لفظ کا کوئی اثر قبول کیے بغیر اسی ضدی لہجے میں روتے ہوئے بولی۔

"مجھے آپ سے محبت کے سوا اب کچھ بھی نہیں چاہیے آغا جان! مجھے دولت، جائیداد کچھ نہیں لینی۔ آپ جس کے نام چاہیں اپنی جائیداد کر دیں مجھے مطلب نہیں اور آغا جان! آپ سے سچ کہہ رہی ہوں اگر آپ نے اپنی جائیداد میں سے کوئی ایک چیز بھی میرے نام کی تو میں آپ کو چھوڑ کر ہمارے اس گھر کو چھوڑ کر زندگی بھر کے لیے کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گی کہ پھر آپ عمر بھر مجھے تلاش کرتے رہیں گے اور میں ملوں گی نہیں۔" وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

"میرے ضدی بیٹے کی ضدی بیٹی جو تم ہو گی ہی ہو گا۔ اب یہ آنسو ذرا صاف کر لو ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔" اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہوں نے اسے بہت پیار بھری خفگی سے ڈانٹا۔

وہ آغا جان کے جائیداد کی بات کرنے سے بے حد مضطرب ہوئی تھی۔ گو انہوں نے وہ موضوع وہیں ختم کر کے پھر اس پر کچھ بھی نہ کہا تھا مگر وہ حقیقتاً مضطرب ہوئی تھی۔ دوسری طرف ممی کی طویل خاموشی تھی۔

وہ ان کی اس خاموشی کے کیا معنی نکالے۔ تیسری طرف ولی اور اس کی پراسرار خاموشی تھی۔ آغا جان اور زرمینہ دونوں نے اس کی سچائی اور خلوص کو اس کے بدل جانے کو سچے دل سے قبول کر لیا اور ولی، کیا وہ سمجھتا ہے۔

وہ بدلی نہیں صرف اپنے مطلب کے لیے تین مہینے گزار رہی ہے؟ کیا آغا جان سے جائیداد کی تقسیم کی بات بھی اس نے کروائی تھی؟

آغا جان اور زرمینہ نہیں جانتے لیکن ولی بخوبی جانتا ہے کہ وہ یہاں کس طرح آنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں میں کس مقام پر تھی اسے اندازہ تھا۔

وہ اس سے آغا جان کے متعلق بات کرنے کے علاوہ کسی بھی اور موضوع پر کبھی ایک لفظ نہیں بولتا تھا۔ ان کا ہر تعلق صرف آغا جان کی وجہ سے تھا۔ وہ اگر ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے یا بولتے تھے تو صرف ان کی خاطر ان کی وجہ سے کاغذ پھاڑ کر پھینک دینے یا جلا دینے سے وہ اپنی اس روز کی باتوں سے مکر نہیں سکتی تھی لیکن وہ پھر بھی اس سے اپنے پچھلے رویوں پر معذرت کر کے اسے اپنا یقین دلا کر اس کی نگاہوں میں کچھ عزت پانا چاہتی تھی، اس لیے کہ اب وہ ولی کے ساتھ اپنے رشتے کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ہاں یہ سچ تھا۔ سو فیصد سچ۔ یہ اس کے باپ کا مرنے سے پہلے بیٹے کے حق میں آخری فیصلہ تھا اسے اپنے باپ کے اس آخری فیصلے کی عزت اور اس کا پاس رکھنا تھا۔

ان دنوں روز رات جب وہ سونے لیٹتی تو اس کمرے میں چھ سال قبل کہا ڈیڈی کا ایک جملہ اس کے کانوں میں گونجا کرتا۔

"فارہ! تمہیں کیا لگتا ہے تمہارے ڈیڈی تمہارے ساتھ کیا کبھی کچھ برا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں آپ میرے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں کر سکتے۔"

یہ سوال روز رات اس کے کانوں میں گونجا کرتا تھا پر اس کا جواب اس نے آج رات روتے ہوئے بے آواز دیا تھا۔

برسوں باپ کے اس ایک فیصلے پر شاکی وہ اس سے دل ہی دل میں خفا رہی تھی مگر اب جان گئی تھی کہ بہت چاہنے والا باپ اپنے مرنے سے صرف تین دن پہلے بیٹی کے حق میں کچھ برا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ فیصلہ ان کے دل کا فیصلہ تھا۔

CamScanner

فیصلہ کرنے کے لمحے میں شاید انہوں نے اپنے دل کی آواز سنی تھی' جو کسی سانحے کے رونما ہونے کی انہیں پیشگی خبر دے رہا تھا۔

معیز اس کی پسند' اس کی خواہش ضرور تھا' محبت ہرگز نہیں لیکن اگر وہ اس کی محبت ہوتا تب بھی وہ ایک بیٹی کا فرض نبھاتی' اسی راستے کا انتخاب کرتی جو راستہ اس کے لیے اس کے باپ نے چنا تھا۔

اور جب وہ یہ سوچ چکی' فیصلہ کر چکی تو اب اسے ولی کے پاس جانا تھا۔ وہ خاموش بیٹھ کر سکون سے وقت نہیں گزار سکتی۔

اسے اس کے سامنے اپنے تمام بدترین اور بدصورت رویوں کی وضاحت کر کے' معافی طلب کر کے اس سے سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنے کی بات کرنی تھی۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔

بہت ہی زیادہ مشکل۔ جس سے وہ ہمیشہ چیخ چیخ کر طلاق کا مطالبہ کرتی رہی ہے' جس سے اس نے ہمیشہ علی الاعلان نفرت کا اظہار کیا ہے' جس کے ساتھ وہ یہاں آئی ہی طلاق ملنے کی امید پر ہے' اس سے کہنا کہ آؤ سب بھلا کر زندگی نئے سرے سے جیئیں۔ کوئی آسان اور معمولی بات نہیں تھی۔

سوچ لینے' فیصلہ کر لینے کے باوجود اسے ولی کے پاس جانے کی ہمت کرنا مشکل ہو رہا تھا' مگر زندگی میں جو جو کچھ غلط وہ کر چکی تھی اسے ٹھیک کرنا' سنوارنا بھی تو اسے ضروری تھا۔

اگلے روز دوپہر میں آغا جان کے کھانے کے بعد سو جانے پر وہ اپنے پورشن میں آ گئی۔ آج اسے ولی سے بات کرنا تھی مگر اس سے بات کرنے سے قبل وہ معیز سے بات کرنا چاہتی تھی۔

پہلے غصے میں اندھے ہو کر کبھی سوچا نہیں تھا۔ اب سوچتی تو اسے خود پر شرم آیا کرتی۔ کسی کی منکوحہ ہو کر وہ کسی اور کا شادی کا پیغام قبول کیے بیٹھی تھی۔

اگر یہ طے کر چکی تھی کہ اسے ولی کے ساتھ نہیں رہنا' اس سے طلاق لینی ہے تب بھی جب تک اس کے نکاح میں تھی۔ کیا اخلاقی لحاظ سے یہ مناسب تھا کہ وہ کسی دوسرے کا شادی کا پرپوزل قبول کر لیتی۔

جب دوران عدت عورت کو کسی کا شادی کا پیغام قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے تو کسی کے نکاح میں ہوتے یہ مذہبا کیسا فعل ہوگا۔ معیز نے تو اسے اب پرپوز کیا ہے اور اس کا پرپوزل قبول کیے اسے دس گیارہ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں بیتا جب کہ یہی رشتہ جمیل ماموں کے ساتھ آج سے دو ڈھائی سال پہلے طے کر چکی تھیں۔

وہ ممی پر اس رشتے کو قبول کر لینے کا الزام ڈال کر خود کو بے قصور ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ میڈیکل فائنل ایئر کی طالبہ اتنی نادان اور نا سمجھ نہیں ہوتی کہ اسے اچھے برے' صحیح اور غلط کی پہچان نہ ہو اور اگر اسے یہ پہچان نہیں ہے تو اس پہچان کے نہ ہونے میں بھی قصور اس کا اپنا ہی ہے۔

یہ فروری کا وسط تھا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل معیز یہاں سے اس سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ آغا جان کی بیمار

داریوں میں مصروف نہ بھی' اس نے معیز کو سوچا نہ وہ اسے یاد آیا نہ اسے اس کی ناراضی کی فکر ہوئی۔

وہ اس سے ناراض تھا تو وہ تم روٹھے' ہم چھوٹے کی عملی تفسیر بنی اس سے یکسر بے نیاز ولاتعلق اسے مکمل فراموش کیے آغا جان کے ساتھ اپنے روز و شب گزارتی رہی مگر پھر کچھ دنوں کی ناراضی کے بعد اس کے موبائل پر معیز کی کالز اور messages آنے لگے تھے۔

وہ اس کی کالز ریسیو نہیں کر رہی' اس کے messages کا کوئی جواب نہیں دے رہی' مگر بھی وہ ہمت نہ ہارتا۔ اسے تقریباً ہر دوسرے روز کال کر رہا تھا اور بے حساب SMS روز بھیج رہا تھا۔

وہ اسے واضح الفاظ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ سنا کر ختم کر دینا چاہتی تھی۔

وہ معیز کو کال ملا چکی تھی۔ وہ اس کی کال ریسیو کرتا خاصا خوش اور پرجوش تھا۔

"شکر تم واپس آ گئیں۔ مجھے یقین تھا' تمہارا یہ بچپنا یا ایڈونچر جو بھی اسے کہیں' جلد ختم ہو جائے گا۔" وہ جیسے سب ناراضی اور شکوے بھلا چکا تھا۔

"معیز! میں پشاور سے کال کر رہی ہوں۔ آغا جان کے گھر سے' اپنے گھر سے۔" اس نے پرسکون انداز میں اس کی غلط فہمی دور کی۔

وہ ایک پل بالکل خاموش ہوا' شاید جواب میں فوراً کچھ کہہ نہ پایا تھا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ فارہ! یہ تمہیں دادا جان کی محبت کا اچانک بخار چڑھ کیوں گیا ہے۔ ساری زندگی تم ان سے بے زار رہی ہو اور اب ایک دم ہی..... کسی کی طرح جادو ٹونوں پر مجھے ذرا یقین نہیں مگر اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے واقعی تم پر کسی نے جادو ہی کر دیا ہے۔ تم مجھے وہ فارہ ہی نہیں لگ رہیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا معیز! مجھ پر جادو ہو گیا ہے۔ محبت کا جادو اور محبت کے جادو کے اثر سے میں اب زندگی بھر نکل نہیں پاؤں گی۔ ہاں میں وہ فارہ نہیں ہوں جسے آپ جانتے تھے۔ میں بدل چکی ہوں۔ میری خواہشات میری ترجیحات سب بدل گئی ہیں۔"

"اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کہو گی کہ تم اپنی ساری زندگی ولی صاحب خان کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار ہو چکی ہو' طلاق کے مطالبے سے دستبردار ہو چکی ہو۔"

"آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ میں نے دراصل آپ کو یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ میں ولی کے ساتھ اپنے رشتے کو قبول کر چکی ہوں۔ یہ رشتہ میرے ڈیڈی کا قائم کیا ہوا ہے اور میں اسے اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک نبھاؤں گی۔"

"تم پاگل ہو چکی ہو فارہ! تم واقعی ہوش و حواس بالکل گنوا چکی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے' وہ گھمنڈی انسان تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے کوئی عزت دے کر ساتھ رکھے گا؟ اتنا اعلیٰ ظرف تو کوئی عام مرد بھی نہیں ہوتا کجا کہ اس جیسا مغرور انسان۔ تم ہمیشہ اسے مسترد کرتی رہی ہو۔ وہ تمہیں اپنا کر صرف اپنی انا کی تسکین کرے گا اور پھر زندگی بھر تم سے اپنے مسترد ہونے کا انتقام لیتا' تمہیں اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائے گا۔ ابھی جو یہ عزت کروں گی اور

بھاؤں گی کے ڈائیلاگ بول کر تم خود کو کسی جذباتی فلم کی ہیروئن سمجھ رہی ہو اس وقت پھر سر پکڑ کر روؤ گی۔"
وہ دوستانہ نرمی والا انداز ترک کر کے وہ یکدم ہی غصے سے بولا۔
"میں سر پکڑ کر روؤں گی یا پچھتاؤں گی تو بھی دوبارہ آپ کے پاس ہرگز نہیں آؤں گی اور یہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جو فیصلہ میں کر چکی ہوں صرف آپ کو اس سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی' میں نے اسی لیے فون کیا تھا۔"
وہ سکون سے بات مکمل کر کے اب خدا حافظ کہہ دینا چاہتی تھی مگر ایسا کر نہ سکی کیونکہ معیز فوراً ہی بولنے لگا تھا۔
"میں نہیں جانتا وہ خبیث تمہیں کیا کہہ کر پٹا ورلا پایا تھا مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ سب ان عظیم دادا پوتے کی تمہارے اور پھوپھو کے خلاف کوئی انتہائی گہری' گھناؤنی اور گھٹیا سازش ہے۔"
"معیز! اپنے کسی بھی قریبی رشتے کے متعلق میں کوئی غلط لفظ اب ہرگز نہیں سنوں گی۔ میں اس کہنے والے کو زندگی بھر کے لیے چھوڑ دوں گی۔ چاہے وہ میرا اچھا مخلص اور پرانا دوست معیز جمیل ہی کیوں نہ ہو۔" اس بار وہ سکون سے نہیں غصے اور تنبیہی لہجے میں بولی۔
"بہت بے عزت کروایا میں نے اپنے دادا کو اپنے مرحوم باپ کو اپنے شوہر کو اب نہیں۔ اب ہرگز نہیں۔ اب جیسے مجھ سے دوستی اور محبت کا دعویٰ ہے اسے ہر اس رشتے کی عزت کرنی ہوگی جس کی میں عزت کرتی ہوں' جس سے میں پیار کرتی ہوں۔
ماں باپ' دادا' شوہر ان تمام رشتوں پر اگر کوئی لڑکی کزن اور دوست کے رشتے کو ترجیح دے تو وہ کس کردار کی لڑکی ہوگی؟ اور میں ایسے کردار کی لڑکی کبھی بھی نہیں بنوں گی۔"
دوٹوک اور مستحکم لہجے میں بولتی وہ بغیر خدا حافظ کہے فون بند کر چکی تھی۔

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو ذرا دین دار ہوتا۔" رات کے کھانے کے دوران آغا جان ولی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔
مختلف مشہور مصرعوں میں وہ اپنی مرضی کے الفاظ جوڑتے توڑتے اسے ستا رہے تھے۔
"خود ہی نے یہ نام رکھا تھا اب خود ہی میرے نام کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"
"رکھتے وقت سوچا تھا کہ نام کا اثر لازمی پڑے گا مگر ہائے افسوس!" وہ اس کے شکوے کے جواب میں مسکرا کر بولے۔
وہ اس چھیڑ چھاڑ سے لاتعلق سر جھکا کر نوالے بنانے اور منہ میں رکھنے کے عمل کو ایک کے بعد ایک دہرا رہی تھی کل رات فیصلہ کر لیا تھا کہ آج رات آغا جان کے سو جانے کے بعد وہ ولی کے پاس جا کر بات کرے گی مگر اب جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں' اس کی ٹینشن اور گھبراہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

پریشانی میں اس کی بھوک بالکل مر گئی تھی اور اس وقت اسے آغا جان کی کسی انتہائی پر لطف بات پر بھی ہنسی نہیں آ رہی تھی' وہ جبراً چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر لا رہی تھی۔
وہ اپنے کس کس عمل کی اسے کیا توجیہہ پیش کرے گی' وہ اس کا جانتی تھی لاتا تھا وہ انہیں جو کوئی وضاحت مانگے بغیر اسے سینے سے لگا لے اس کے ساتھ کزن کا رشتہ ہو یا شوہر کا اس کے دونوں ہی رشتے انا رکھنے والے رشتے تھے۔
بس صرف ایک امید اس کی آغا جان سے بے تحاشا محبت تھی۔ وہ آغا جان سے بے تحاشا والہانہ محبت کرتا ہے اور شاید ان کی خاطر وہ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کے اسے معاف کر سکے۔
کھانے اور دوا کے تمام مراحل سے فارغ ہونے کے بعد جب آغا جان سونے لیٹ گئے تو وہ دونوں بھی روز کی طرح اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔
آغا جان گہری نیند سو جائیں' اس نے کچھ وقت صرف یہی سوچ کر اپنے کمرے میں گزارا اور جب کافی دیر بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ اب تک وہ گہری نیند سو چکے ہوں گے تب وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں پر آئی۔
وہ لوگ آغا جان کی وجہ سے جلدی کھانا کھا لیا کرتے تھے اور ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں کیا کر رہا ہوگا۔ کیا وہ کمرے میں جاتے ہی سو گیا ہوگا یا کچھ دیر ٹی وی دیکھ رہا ہوگا یا کسی دوست سے فون پر بات کر رہا ہوگا یا کچھ پڑھ رہا ہوگا یا انٹرنیٹ استعمال کر رہا ہوگا۔
وہ اس کی اس ڈل اور روکھی پھیکی زندگی پر حیرت کے ساتھ اب افسوس بھی محسوس کرنے لگی تھی۔
وہ آغا جان کی وجہ سے کہیں نہیں جاتا تھا اس کا اپنا سوشل سرکل یقیناً تھا مگر وہ اسے چھوڑے فرائض اور ذمہ داریوں میں الجھا رہتا تھا۔ آغا جان اس کے لیے بھی آزردہ رہتے تھے۔
بہت یک ٹائپ میں وہ وہ زندگی گزار رہا تھا جیسی کوئی پچاس پچپن سال کی عمر میں بھی گزارنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ گھر' دفتر' کام' ذمہ داریاں' ذمہ داریاں اور صرف ذمہ داریاں' اس ایک جیسی روٹین والی لائف میں تفریح تو کہیں نظر ہی نہ آتی تھی۔
وہ آغا جان کے برابر والے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ آغا جان نے اسے بتایا تھا کہ پہلے ولی کا بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھا مگر ان کی طبیعت کے مسلسل خراب رہنے پر اس نے یہ برابر والا کمرہ اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا تاکہ رات میں کسی بھی وقت آغا جان کو ضرورت ہو تو وہ ان کی ایک آواز پر فوراً ان کے پاس آ سکے۔
دروازہ پر آہستگی سے دستک دے کر اس نے خود کو پرسکون رہنے کی تلقین کی اسے کمرے میں اندر آنے کی اجازت دیتے غالباً اس کے ذہن میں کوئی اور تھا۔
دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو حیرت پھیلی اس نے اسے بتا دیا کہ اس وقت وہ اپنے کمرے میں کسی کی بھی آمد کی توقع کر سکتا تھا سوائے اس کے۔
"اگر تم بزی نہ ہو تو مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" اپنے اندر اعتماد اور جرأت پیدا کرتے وہ آہستگی سے

CamScanner

بولی۔

اندر ہی اندر اس پر گھبراہٹ اور کچھ پریشانی طاری تھی مگر وہ اسے عیاں ہونے نہیں دے رہی تھی۔

وہ بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور کمرے میں کوئی میٹھی سی دھن بھی مدہم سروں میں بج رہی تھی۔

ٹانگیں سمیٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور ریموٹ سے میوزک بند کیا اور ساتھ ہی اس سے بھی کہا۔ ”بیٹھو۔“

وہ سامنے صوفے پر بہت پُرتکلف سے انداز میں بیٹھ گئی۔

کتاب بند کر کے سائیڈ میں رکھتے اس نے فارہ کو دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر حیرت نہیں صرف سنجیدگی اور خاموشی تھی۔

اسے کیا کہنا ہے وہ بہت کچھ سوچ کر اور جملے مرتب کر کے آئی تھی مگر بات کا آغاز کرنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے ہمارے نکاح کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

یہ بات کہتے وہ اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہیں کر پائی تھی اس لیے نظریں دانستہ اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

وہ اس کے کچھ کہنے کی منتظر تھی مگر وہ بالکل خاموش تھا اور خاموشی کا وقفہ بے حد طویل ہو گیا تھا۔

کیا وہ کمرے سے اٹھ کر چلا گیا؟ وہ یہاں پر اکیلی بیٹھی ہے؟ اس نے بوکھلا کر سر اوپر اٹھایا، وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری سنجیدگی کس جذبے کا اظہار کر رہی ہے؟ وہ سمجھ نہ پائی۔

”میں چاہتی ہوں، ہمارا رشتہ ختم نہ ہو۔ آغا جان کی اس رشتے میں اتنی خوشی ہے۔ کیا ان کی خوشی کی خاطر ہم اس رشتے کو نبھا نہیں سکتے؟“ وہ اس کی مسلسل خاموشی سے اپنا اعتماد کھونے لگی تھی۔

یہ کچھ تو بولے، الزامات ہی عائد کرے، برا بھلا ہی کہے، کچھ تو کہے۔

”میں جانتی ہوں، تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ میں نے ماضی میں ایسا کچھ کیا بھی نہیں جس کے بل بوتے پر مجھے اپنی اچھائی کا کوئی دعویٰ ہو۔ زرمینہ نے ہسپتال میں مجھے جو کچھ کہا اگرچہ وہ بھی میرے گزشتہ اعمال کے مقابلے میں بہت کم ہی تھا مگر تم نے تو مجھے اتنا بھی کچھ نہیں کہا مگر تمہارے کچھ کہے بغیر بھی میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اس سے بھی زیادہ برا سمجھتے ہو، شاید مجھ سے نفرت بھی کرتے ہو۔

تم مجھے کیسا سمجھتے ہو، یہ اس بات سے واضح ہے کہ تم نے لاہور میرے پاس آ کر بجائے یہ کہنے کے کہ آغا جان شدید بیمار ہیں، مجھے دیکھنے کو تڑپ رہے ہیں لہٰذا میں تمہارے ساتھ چلوں، مجھے اپنے ساتھ لانے کے لیے ایک معاہدہ میرے سامنے رکھا۔

میں اپنی کسی بھی پچھلی برائی سے انکار نہیں کر رہی، جو غلطیاں میری ہیں، وہ میری ہی ہیں، انہیں کسی اور کے

کھاتے میں ڈال کر میں خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی۔ میں نے زندگی میں اب تک جو کچھ غلط کیا مجھے اس کا احساس ہے اور میں اسے ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔ جو کاغذ تم نے مجھے دیا تھا وہ میں کب کا جلا کر ضائع کر چکی ہوں۔ میں اب یہاں سے کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔ میرے پاس میری کسی بدتمیزی، کسی بدسلوکی، کسی برے رویے کی کوئی توجیہ، کوئی جواز نہیں جو کچھ میں نے کیا وہ سب کا سب سراسر غلط تھا۔

پھر بھی اگر تم اعلیٰ ظرفی سے کام لے کر مجھے معاف کر سکو تو میں چاہتی ہوں یہ رشتہ جڑا رہے۔ اس رشتے سے میرے ڈیڈی اور تمہارے پاپا کی بہت سی خواہشات و امیدیں جڑی ہیں، اس رشتے سے آغا جان کی بے شمار خوشیاں وابستہ ہیں۔ اتنے دکھ دینے کے بعد میں اب انہیں مزید کوئی دکھ اپنی وجہ سے نہیں دے سکتی۔ کیا آغا جان کی خوشیوں کے لیے ہم دونوں پچھلی ہر بات بھلا کر اس رشتے کو نبھا نہیں سکتے؟“

ٹھہر ٹھہر کر بہت سنبھل کر اور محتاط ہو کر اس نے ایک ایک لفظ ڈرتے ڈرتے ادا کیا۔

اور جب کہہ چکی تب خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آغا جان کی خوشی کے لیے اس رشتے کو نبھائیں؟“ وہ ایک پل بالکل خاموش رہا۔

اس پل بھر کی خاموشی کے بعد اس نے اس کے الفاظ بہت سکون اور سنجیدگی سے دہرائے۔ وہ غصے، نفرت یا اشتعال میں نہیں بلکہ بہت پرسکون اور ہموار لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”تمہاری غلطی پتا ہے کیا ہے فارہ! تم نے ہمیشہ آغا جان کے ساتھ اپنے رشتے کو اس نکاح کے ساتھ ملا کر ایک ہی تناظر میں رکھا۔ یہی غلطی تم اب کر رہی ہو۔ تم نے ہمیشہ آغا جان کے ساتھ برے رویے بھی اسی لیے اختیار کیے کیونکہ تم اس رشتے سے ناخوش تھیں۔ آغا جان کے ساتھ تمہارا دادا پوتی کا رشتہ تو ایک بہت الگ رشتہ تھا فارہ!

آج اگر ہمارا رشتہ ختم ہو جائے تو کیا آغا جان سے اس گھر سے، یہاں تک کہ مجھ سے بھی تمہارا ہر رشتہ ختم ہو جائے گا؟

تم دو الگ الگ چیزوں کو ساتھ کیوں ملاتی ہو۔ پہلے جب انہیں اپنے دادا کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہ تھیں، اس گھر میں آنے پر راضی نہ تھیں تو اس رشتے کو ختم کر دینے کا اعلان کرتی تھیں۔ آج جب آغا جان کی محبت قبول کر لی اور یہاں رہنے پر آمادہ بھی ہو گئیں تو تمہیں یہ کیوں لگتا ہے تمہارے یہاں رہنے کی شرط یہ نکاح اور اس کا قائم رہنا ہے؟“

اس نے کسی وضاحت کے لیے لب کھولنا چاہے مگر وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

”اب یہ موضوع چھڑا ہے تو پھر مجھے ساری بات کر لینے دو۔ تم اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو، پچھتا رہی ہو، اپنی غلطیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہتی ہو یہ سب ٹھیک ہے لیکن ان غلطیوں کے ازالے کے لیے ایک ایسا رشتہ جسے کبھی تمہارے دل نے قبول نہ کیا کیوں نبھانا چاہتی ہو؟ شادی دل کی خوشی کا نام ہے فارہ! کسی جبر اور زبردستی کا نہیں۔ ایک لڑکی جو میرے ساتھ اپنے رشتے کو قبول نہیں کرتی، میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی میں اسے ایک معاہدہ

کر کے اپنے ساتھ لے آؤں۔ وہ بوڑھے بیمار دادا کو دیکھے گی یہ جانے گی کہ دادا کی یہ حالت میرے سبب ہے تو بری طرح شرمندہ ہوتے اپنے انکار سے تائب ہوتی اس رشتے کو قبول کر لے گی؟ یہ تو بہت سستی جذباتیت بلکہ انتہا درجے کی گھٹیا ترین حرکت ہے۔

اگر تم سے اس رشتے کو ایسے ہی کسی طرح منوانا میرا مقصد ہوتا تو اس گھٹیا ترین جذباتی ہتھکنڈے سے لاکھ گنا بہتر تھا کہ میں تمہیں تمہارے برسوں پہلے کے خوف کے عین مطابق گن پوائنٹ پر اغوا کر کے اپنے ساتھ لے آتا۔ تمہیں زبردستی اور جبراً اٹھالانے میں پھر بھی شاید کچھ مردانگی، کچھ عزت اور کچھ وقار موجود ہوتا مگر آغا جان کی بیماری کو ہتھیار بنا کر تمہاری جذباتی کمزوری کا فائدہ اٹھانا اس سے پست حرکت تو میری نظر میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس نے پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

"میں نے زندگی میں اپنے مقام اور وقار سے نیچے اتر کر کبھی کوئی کام نہیں کیا فارہ۔ میں تمہیں یہاں اس لیے ہرگز ہرگز نہیں لایا تھا کہ آغا جان کی حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھ کر شرمندہ و نادم ہوتے تم مجھے قبول کر لو۔

آغا جان تم سے شدید محبت کرتے ہیں، یہ بات اب تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم ان کے پاس آ کر رہنے لگو ان کے بیٹے کی نشانی پھر سے ان کے پاس آ جائے یہ نجانے ان کی کتنے برسوں پرانی خواہش ہے۔

مگر جب یہ خواہش پوری ہونے کے بجائے انہیں لگا کہ تم ان سے اپنا ہر تعلق ختم کر دینا چاہتی ہو تب وہ شدید بیمار پڑ گئے۔ وہ تمہیں اپنے قریب دیکھنے کے لیے، تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے تڑپ رہے تھے وہ پوری پوری رات بے قراری سے روتے رہتے تھے تب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی بھی طرح تمہیں ان کے پاس لے آؤں۔

میں نے اسی وقت Divorce (طلاق) دینے کے بجائے تین مہینے بعد کا وعدہ کیوں کیا اس لیے کہ تم نے Divorce (طلاق) کے ساتھ جائیداد میں حصے کا مطالبہ بھی کر رکھا تھا۔ تمہاری طرف سے یہ دونوں مطالبے ایک ساتھ کیے گئے تھے۔ تم یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ چاہتی تھیں۔

میں اپنا اور تمہارا رشتہ خاموشی سے ختم کر کے تمہیں یہاں لا سکتا تھا اور آغا جان کو یہ بات پتا بھی نہ چلتی مگر جائیداد کی تقسیم خاموشی سے ہونے والا کام نہ تھا اور میں ایک مرتے ہوئے شخص کو یہ اذیت دینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی اولاد کے مابین ہر رشتے اور ہر تعلق کو اپنی آنکھوں سے ختم ہوتا دیکھے۔

جائیداد کی وہ تقسیم اس وقت اس انداز میں انہیں جائیداد کی نہیں بلکہ اپنے گھر اور اپنی اولاد کی تقسیم لگتی۔"

جائیداد کے نام پر جو تاثر اس کے چہرے پر پھیلا وہ اس تاثر کو بغیر پڑھتا فوراً بولا۔

"ہاں یہ بات میں اب جانتا ہوں فارہ! کہ جائیداد میں حصے کا مطالبہ تمہارا نہیں تھا مگر تب میں یہی سمجھا کرتا تھا اسی لیے تب میں نے ان دونوں چیزوں کو کچھ مہینے بعد طے کرنے کا تم سے وعدہ کیا تھا اور میں نے تین مہینے ہی کیوں کہے تھے تو صرف اس لیے کہ مجھے تمہارے سامنے کوئی نہ کوئی ٹائم پیریڈ تو رکھنا تھا۔ سچ تو یہ ہے فارہ! کہ

اس وقت مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ آغا جان تین مہینے بعد زندہ ہوں گے بھی یا نہیں۔ تم نے ان کی وہ حالت نہیں دیکھی جو میں نے دیکھی ہے۔ تب مجھے کیا ان کے ڈاکٹرز تک کو ایسا ہی لگا کرتا تھا کہ شاید اب وہ زیادہ دن نہ جی سکیں گے۔

تمہیں یہاں لاتے وقت میں بس یہ چاہتا تھا کہ اگر یہ آغا جان کا آخری وقت ہے تو مرنے سے پہلے تمہیں اپنے پاس دیکھ لیں۔ تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا دیں اور جو کچھ وہ ان برسوں میں تم سے بھی کہہ نہ پائے وہ سب کہہ ڈالیں۔

اگر وہ ان کا آخری وقت تھا تو میں تمہیں اس آخری وقت میں ان کے قریب لا کر ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دینا چاہتا تھا فارہ!"

اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ پھیلا ہوا تھا۔ وہ اب کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے بجائے خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آغا جان اور تمہارے تعلقات میں رکاوٹ کا سبب ہمیشہ یہ نکاح ہی بنا۔ ان گزرے برسوں میں تم شاید کبھی ان کی محبت کو قبول کر ہی لیتیں مگر تمہیں یہ بات بھولتی نہیں کہ والہانہ محبتیں نچھاور کرتے اس دادا نے تمہیں ایک جبر کے رشتے میں باندھا ہے۔" وہ نے بغور اسے دیکھتے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں تمہیں بہت سی باتوں کے لیے غلط سمجھتا ہوں لیکن جبراً قائم ہوئے اس رشتے سے انکار میں تم حق بجانب ہو۔

مرجانے والوں کی خواہشات پر زندہ لوگوں کو قربان کر دانا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ جب یہ نکاح ہوا ہم اس روز سے پہلے کبھی ایک دوسرے سے ملے تک نہ تھے ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔

میں شاید انکار کر دیتا مگر تب پاپا کے انتقال کو ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھا۔ مجھ سے بڑے پاپا نے اس رشتے کے لیے کہا اور میں ان لمحوں میں انہیں انکار نہیں کر پایا لیکن کچھ عرصے میں جب میری ذہنی حالت بہتر ہوئی میں پاپا کی موت کے صدمے سے باہر نکلا میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ جبر اس رشتے کو نہیں نبھاؤں گا۔ آغا جان کہتے تھے ابھی فارہ کی تعلیم مکمل ہونے دو اس موضوع کو نہ چھیڑو مگر میں نے ان سے بالکل واضح انداز میں کہہ دیا تھا کہ میں فارہ سے براہ راست بات کیے بغیر اس سے اس کی مرضی جانے بغیر کبھی اس شادی کے لیے آمادہ نہیں ہوں گا۔

میں نے ایک بار تمہیں فون کر کے بھی یہی یقین دلانا چاہا تھا تم اس نکاح سے ڈسٹرب نہ ہو۔ تمہاری مرضی کے خلاف کبھی بھی کچھ نہیں ہوگا۔

کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ تم مجھ سے خائف رہتی ہو تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہیں زبردستی اٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز تم سے بات نہ ہو سکی لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرنے لگا مجھ پر یہ بہت اچھی طرح واضح ہوتا چلا گیا کہ تم اس رشتے سے کس قدر بے زار اور نالاں ہو۔

میں جبر کے اس رشتے کو برقرار رکھنے کے کبھی بھی حق میں ہی نہ تھا مگر آغا جان کے بارے میں، میں تمہیں

بتاؤں فارہ! وہ اس نکاح کو ختم کرتے اس لیے ڈرتے تھے۔ مجھے اس لیے روکتے تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ یہ رشتہ انہیں ان کے مرحوم بیٹے کی نسل کے ساتھ جوڑ کر رکھ سکتا ہے۔

اس نکاح اور رخصتی کی خواہش میں ان کی صرف یہی غرض پوشیدہ تھی فارہ کہ اس طرح پھر تم ان کے قریب، ان کے پاس آ جاؤ گی۔

وہ اس رشتے کے ٹوٹنے سے ڈرتے تھے فارہ! انہیں لگتا تھا کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو شاید پھر تم ان سے اپنا ہر رشتہ توڑ ڈالو گی ان سے کبھی ملو گی نہیں۔

لیکن یہ شادی ایسے ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تمہارے فائنل ایئرز تک میں آغا جان کی وجہ سے معاملہ خاموش تھا مگر فائنل ایئرز کے بعد میں خود تم سے یہ کہنے کے لیے تم سے ملنے آ رہا تھا کہ تمہاری مرضی نہیں ہے چنانچہ ہم اس رشتے کو باہمی خوشی ختم کر دیتے ہیں۔

لیکن یہ سب کہنے کے ساتھ میں تم سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ تم آغا جان کے ساتھ اپنے رشتے کو اس نکاح سے ہٹ کر دیکھو اور ان کے ساتھ اپنے رشتے کو قبول کر لو۔ ان کے دل کی خوشی کے لیے ایک بار یہاں ہمارے گھر ضرور آ جاؤ۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں تم سے آ کر علیحدگی اور طلاق کی بات کرتا تمہاری طرف سے یہ مطالبہ لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدل کے ساتھ پیش ہو گیا۔

دو پڑھے لکھے لوگوں کے مابین جو ایک معاملہ خوش اسلوبی اور ڈیسنٹ طریقے سے حل ہو سکتا تھا وہ انتہائی جاہلانہ انداز میں سامنے لایا گیا۔

طلاق جائیداد میں حصے کا مطالبہ، بات نہ کرنا، رابطہ رکھنا پسند نہ کرنا، ان سب کا آغا جان کیا مطلب لیتے بھلا؟ یہی ناں کہ تم اس نکاح کو نہیں درحقیقت انہیں رد کر رہی ہو۔ ان سے قطع تعلقی کا اعلان کر رہی ہو۔ ان کی طبیعت کی اس اچانک خرابی کی وجہ بھی یہی بات تھی۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر اسی دھیمے لب و لہجے میں دوبارہ گویا ہوا۔

"یہ سب تفصیل میں نے تمہیں اس لیے بتائی ہے کہ تم سمجھ سکو کہ آغا جان کی خوشیوں کا تعلق تمہارے ان کے قریب ہونے ان کے پاس آ کر رہنے سے ہے نہ کہ ہمارے نکاح یا رخصتی سے۔

وہ ہم سے کوئی قربانی نہیں صرف محبت مانگتے ہیں۔ ان کی خوشیاں ہم لوگوں کی خوشیوں میں پوشیدہ ہیں۔"

اس بار پہلے سے زیادہ فارہ مضطرب سی ہو کر بولی۔

"لیکن اس رشتے میں ان کی خوشی تو تھی ناں!"

"آغا جان کی خوشی تمہیں اپنے پاس دیکھنے میں ہے فارہ! تم یہاں ان کے پاس آ گئیں سب بدگمانیاں دور ہو گئیں۔ تم نے ان کی محبت کو پورے دل کے ساتھ قبول کر لیا تو تم خود دیکھ لو وہ کیسے صحت مند اور خوش نظر آنے لگے ہیں۔

اور اب جب کہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے تو پھر اب آغا جان کے رنجیدہ ہونے کے لیے کیا باقی بچا ہے۔"

"لیکن ولی! اگر ہم نے طلاق کی بات کی تو انہیں تکلیف تو پہنچے گی۔ کتنا بھی کچھ کہیں بہرحال اس نکاح سے ان کے دونوں بیٹوں کی یادیں ان کی آرزوئیں جڑی ہیں۔ کیا آغا جان کے دل کو دکھ نہیں ہوگا ہمارے اس رشتے کو ختم کرنے پر۔" وہ پھر بے چینی اور اضطراب میں گھر کر بے ساختہ بولی۔

"آغا جان کے دل کو اس وقت زیادہ تکلیف اور دکھ پہنچے گا فارہ! جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی پوتی صرف ان کے دل کی خوشی کے لیے قربانی دے کر ایک سمجھوتے کی زندگی کا انتخاب کر رہی ہے۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"ساری زندگی ساتھ گزارنے کے فیصلے کسی کے لیے اور کسی کی خاطر نہیں کیے جاتے۔ تمہاری شادی وہیں ہونا چاہیے جہاں تمہارے دل کی مرضی ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جو میرا ساتھ میرے لیے میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔ تم میرے تایا کی بیٹی ہو، میرے لیے ہمیشہ قابل احترام رہو گی۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں اس غلط فہمی کو اپنے دل سے نکال دو۔ ہم اس رشتے کو خوش اسلوبی سے بغیر کسی جھگڑے اور فساد کے ختم کر دیں گے۔ تمہیں اس حوالے سے کسی بھی طرح کی ٹینشن لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

میں تمہیں گارنٹی دے رہا ہوں کہ آغا جان نہ تم سے خفا ہوں گے نہ مجھ سے بلکہ وہ ہم دونوں کی خوشی میں مکمل طور پر خوش اور راضی ہوتے ہوئے اسی خوشی ہم دونوں کی وہاں شادیاں کروائیں گے جہاں ہم کرنا چاہیں گے۔"

اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا اور اس کے کہنے کے لیے اس نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ اس نے اسے کمرے سے جانے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن اب وہ یہاں بیٹھ کر کیا کرتی۔

وہ ساری بات ختم کر چکا تھا۔ نہ الزامات عائد کیے، نہ برا بھلا کہا، وہ اس سے کیا کیا کچھ سننے کی امید لے کر آئی تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے گا، اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کرتا چلا جائے گا، اسے کیا کیا کچھ سنائے گا، کڑوی کسیلی باتیں کرے گا، اس سے نفرت کا اظہار کرے گا۔

"تم سے شادی کروں؟ تم ہو کیا چیز فارہ بہروز خان! کیا سمجھتی ہو خود کو؟ مس ورلڈ، مس یونیورس، کہیں کی کوئی راج کماری، شہزادی اور میں تمہارا ادنیٰ غلام۔

تم کو کیا شادی نہیں کرنی، طلاق دے دوں، میں دے دوں گا۔ تم کو کیا طلاق کا سودا نہیں، چلو شادی کر لیتے ہیں، میں شادی کر لوں گا۔" نفرت سے بولتا وہ اس کی اوقات یاد دلائے گا۔

"فارہ بہروز خان! تم جیسی گھٹیا لڑکی کو میں اپنی بیوی کی حیثیت دوں گا؟ یہ خوش فہمی تمہیں لاحق ہو کیسے گئی کہ میں تمہیں اپنی بیوی کے مرتبے پر فائز کروں گا۔"

وہ یہ اور اس سے بھی زیادہ دل دکھانے والے فقروں میں ڈوبے تحقیر سے ولی کی جانب سے سننے کی امید لے کر آئی

تھی۔

وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا' خوش شکل تھا' اچھے خاندان سے تھا' دولت مند تھا' اس میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ ایک ایسی لڑکی کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا جو زندگی بھر اسے ٹھکراتی آئی تھی۔

اس کی ہر نفرت آج وہ اسے لوٹا سکتا تھا لیکن ولی صہیب خان نے تو اس کے ساتھ نفرت کا رشتہ بھی نہیں رکھنا چاہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ کوئی بھی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ واقعی اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں تھا وہ عنقریب اسے چھوڑ دینے والا تھا۔

جو شخص نے پرسکون' مہذب لہجے میں فاصلہ رکھتے ذاتیات کو درمیان میں لائے بغیر بات کرے اسے کیا کہیں گے۔

اس نے تو آپ کے ساتھ سرے سے کوئی بھی رشتہ چاہے وہ نفرت اور دشمنی ہی کا کیوں نہ ہو رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔

ڈیڈی کی آخری خواہش کا احترام ان کے قائم کردہ رشتے کی عزت' سعادت مند' فرماں بردار بیٹی کا فرض وہ کیا کیا بلند عزائم لے کر اس کے پاس آئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے طلاق کے مطالبے کو درست سمجھتا ہے۔

مردہ قدموں سے زینہ چڑھتے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چلا چلا کر روئے۔ شاید اس کی فرسٹریشن اسی طرح دور ہو پائے۔

وہ پوری رات شدتوں سے روتی رہی تھی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی تھی۔ اذان کی آواز کانوں میں پڑی تب وہ بستر سے اٹھی۔ یہ اس کے ڈیڈی کا قائم کردہ رشتہ ہے اسے ٹوٹتا دیکھنا اس کے لیے جسم سے روح نکال دینے والا عمل ہوگا۔ ٹوٹتا دیکھنا تو بہت دور کی بات اسے تو صرف یہ جان کر ہی کہ ولی نے اس کے اس رشتے کو توڑنے کا جو وعدہ اس سے کر رکھا تھا۔

وہ اپنے اس وعدے پر پوری طرح قائم بھی ہے اور عنقریب اسے توڑ بھی دینے والا ہے' اسے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں' نماز کے لیے سر پر دوپٹہ لپیٹے اس نے سوچا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔ میں ولی صہیب خان کے ساتھ کسی بھی قیمت پر نہیں رہنا چاہتی۔" جائے نماز بچھاتے اس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

پہلے وہ صرف یکم جنوری کی دوپہر کو بدلنا چاہتی تھی۔ آج ماضی کے کئی لمحے تھے جنہیں وہ بدلنا چاہتی تھی جنہیں وہ دوبارہ جینا چاہتی تھی۔

ولی کی فون کال...... اب وہ اس سے بات کرے گی' وہ اس کی بات سنے گی۔

زرمینہ کی شادی کا کارڈ۔ اب بھی حقارت آمیز تاثر کریں' کارڈ ہاتھ میں نہ پکڑیں' وہ سامنے صوفے سے

اٹھ کر اس کے پاس آئے گی اس سے کارڈ لے گی۔

ہال کے داخلی دروازے پر وہ اس کا منتظر کھڑا ہے اور پیچھے کہیں معیز بھی موجود ہے اس کی سالگرہ کا دن ہے' اسے وہ معیز کے پاس اندر نہیں جائے گی پہلے ولی کی بات سنے گی۔

وہ بے وجہ تو نہیں آیا یقیناً کچھ کہنے کوئی بات کرنے آیا ہے' وہ معیز کے ساتھ وقت گزار رہی ہے' ولی اسے اس کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر غصے سے اٹھ کر چلا گیا ہے۔

وہ اس روز گھر آ کر اسے فون کرے گی بتائے گی کہ معیز صرف اس کا دوست ہے' ڈیڈی کے انتقال کے بعد جب ممی کے بے حد تلخ رویوں کے سبب وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی تب اس کے قریب معیز کے علاوہ اور ایسا کوئی نہیں تھا جس سے وہ دل کی باتیں کہہ سکتی' اس کے باقی سب دوست اس کے ہم عمر' ٹین ایجرز' لاابالی اور غیر سنجیدہ تھے جب کہ وہ اس سے سات سال بڑا تھا' سمجھ دار اور سلجھا ہوا تھا۔

وہ اپنی پڑھائی اور دیگر معاملات و مشکلات میں اس سے مشورے لینے لگی تھی۔ اپنے دکھ سکھ اس سے کہنے لگی تھی۔ اس سے بڑھ کر اس کا معیز سے کوئی رشتہ نہیں۔

وہ آغا جان کے ساتھ اس کے رزلٹ کا سن لینے کے بعد آیا ہے' ممی تجمل ماموں اور معیز ڈرائنگ روم میں ان لوگوں سے اعلانیہ طلاق کا مطالبہ اور جھگڑا شروع کریں اس سے پہلے وہ خود ڈرائنگ روم میں چلی جائے گی۔

ولی اس کی پڑھائی ختم ہو جانے ہی کا انتظار کر رہا تھا نا۔ آج یقیناً وہ خود اس سے اس کی علیحدگی ہی کی کوئی بات کرنے آیا ہے وہ اس کی ہر بات پورے دھیان اور توجہ سے سنے گی۔

کاش ماضی کے ان لمحوں پر اب اسے اختیار مل جائے۔ کاش' کاش' ماضی کا المیہ بھی تو ہے کہ وہ یاد ہمیشہ رکھا جا سکتا ہے' بدلا کبھی نہیں جا سکتا۔

سنتوں کی ادائیگی کے بعد اس نے فرض کی نیت باندھی۔ وہ نماز یکسوئی سے نہیں پڑھ رہی تھی۔ نماز کے دوران آنے والے خیالات پر گرفت نہیں مگر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنا تو چاہیے۔ ذہن کو یکسو کرتے اس نے فرض ادا کیے۔

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سمجھ میں نہ آیا وہ اللہ سے کیا مانگے۔ زندگی کے پچھلے کئی برسوں سے وہ اللہ سے ولی صہیب خان سے نجات پانے کی دعا مانگتی آئی تھی آج کیا مانگے؟

"اب مجھے اس سے نجات نہیں اس کا ساتھ چاہیے؟"

"وہ سب بھلا کر مجھے اپنانے کے لیے تیار ہو جائے؟"

"وہ ہمارے اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے آمادہ ہو جائے؟"

"وہ پھر کبھی بھی مجھے چھوڑنے کی بات نہ کرے؟"

وہ دعا میں سوائے آنسو بہانے کے اللہ سے کچھ بھی نہ مانگ پائی۔ بہت دیر خاموش آنسو بہاتے رہنے کے بعد وہ جائے نماز سے اٹھی۔

''میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جو میرا ساتھ میرے لیے' میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔''

جائے نماز کارپٹ پر سے واپس اٹھاتے اسے ولی کے الفاظ یاد آئے اور ان لفظوں کے ساتھ کچھ بھی مغروریت لیے لفظ خود پسندی و تکبر والی سوچیں۔

''اور اگر معیز کا ساتھ کسی سبب اسے نہ مل سکا' اس کے لیے دنیا میں آخری مرد ولی صہیب خان بچا تو وہ کنواری رہنے اور تنہا زندگی گزارنے کو اپنے لیے منتخب کرے گی۔'' وہ جائے نماز تہ کرنے لگی۔

''اس کی دنیا میں آنے والا پہلا مرد ولی صہیب خان ہے' اس کی دنیا میں آنے والا آخری مرد ولی صہیب خان ہوگا۔ ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں میں سے بھی اسے کسی ایک کو چننے کو کہا جائے تو وہ اپنے لیے اسی کو چنے گی۔'' اس نے اپنے دل کی آواز سنی۔

جائے نماز تہ کرتے اس کے ہاتھ یکلخت ہی ساکت ہوئے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھتی وہ ایک دم ہی جائے نماز ہاتھ میں لیے لیے ہی کارپٹ پر گر سی گئی۔

''جو میرا ساتھ میرے لیے' میری وجہ سے چاہے گی اور جو مجھ سے محبت کرے گی۔''

محبت کا کوئی Litmus test نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے ہاں یا ناں کا پتا نہیں چلتا' بعض اوقات تو خود اپنی ہی کیفیات انسان بہت دیر بعد جا کر سمجھ پاتا ہے۔

وہ آج ساری رات کیوں روئی ہے' اس لیے کہ جس سے وہ محبت کے رشتے میں بندھ گئی ہے وہ اس سے ہر رشتہ توڑ دینے کی بات کہہ رہا ہے۔

وہ اسے اپنا یقین نہیں دلا سکی' اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکی اسی لیے مضطرب ہے' اس لیے بےقرار ہے۔

محبت؟ ولی صہیب خان سے؟ جس سے وہ نفرتوں کا اعلان کرتی آئی ہے اس سے؟ ہاں' ہاں اس سے۔ یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔

معیز سے اسے کبھی بھی محبت نہیں تھی' اگر ہوتی تو وہ اس سے طلاق یا رابطہ چاہے نہ کرتی' اسے دل میں یاد ضرور کرتی۔

یہاں اس گھر میں آئے اسے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا اور ان ڈیڑھ مہینوں میں آغا جان' ممی اور ڈیڈی کے بعد جس چوتھے شخص کو اس نے ہر وقت سوچا' وہ صرف ولی صہیب خان تھا۔

یہ محبت تھی یا ان کی بیچ موجود مضبوط رشتے کی کشش' وہ تو ابھی یہ بھی نہیں سمجھ سکی۔

لیکن وہ اتنا ضرور جانتی ہے کہ جب آغا جان ہسپتال داخل ہوئے تھے' جب اس نے اور ولی نے ہسپتال میں وہ رات ساتھ گزاری تھی' جب وہ کوریڈور کے آخری اندھیرے میں ڈوبے حصے میں عبادت کر رہا تھا اور وہ چند انچوں کی دوری پر زمین پر بیٹھی اسے عبادت کرتا دیکھ رہی تھی' تب اس اندھیرے میں ایک روشنی پھیلی تھی۔

وہ روشنی اسے ولی صہیب خان کا ظاہر' باطن سب دکھا رہی تھی' وہ روشنی اسے اس شخص کی محبت میں مبتلا کروا

رہی تھی۔

اس رات کے ان لمحوں کے بعد جب وہ اس کے پاس سے اٹھی' تب سے آج تک گزرنے والے ہر لمحے میں وہ اس کے مخالف نہیں' اس کی سمت اس کی طرف جانے والے راستے پر بھاگ رہی تھی۔

محبت کی روشنی بکھیرتی اس رات کو اگلی صبح آغا جان کے گھر پر معیز اس کے سامنے کھڑا تھا اور ولی برابر میں تو اسے معیز کی نہیں' ولی کی پروا تھی۔

اسے معیز کا ولی کو گالی دینا برا لگا تھا۔

وہ اس سے پہلے معیز سے بالکل سکون سے بات کر رہی تھی لیکن ولی کے لیے اس کی اس بدکلامی کے بعد وہ یکدم بھڑک اٹھی تھی۔

آگہی کا یہ لمحہ اور ادراک کا یہ پل بےحد قیمتی تھا۔ وہ اپنے دل میں اس شخص کے لیے محبت پا رہی تھی جو کہہ رہا تھا وہ صرف اس سے شادی کرے گا جو اس کی محبت میں اس تک آئے گی' جو کسی کے لیے اور کسی کی خاطر نہیں' صرف اس کے لیے' اس کی خاطر اس سے رشتہ باندھے گی۔

وہ بےاختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اپنی زبان سے' اپنے عمل سے' ہر طرح اس نے ہمیشہ ولی کو یہی بات سمجھائی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ولی صہیب خان کو نہیں' صرف معیز جمیل کو شامل کرنا چاہتی ہے۔ پھر آج اگر وہ جا کر اس سے محبت کا اقرار کرے تو کیا وہ اس کا یقین کرے گا؟

اسے معیز سے محبت نہیں' ولی سے محبت ہے' وہ چیخ چیخ کر بھی ولی کو بتائے گی' وہ تب بھی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ بےشمار بار' بےحساب بار وہ اپنے لفظوں اور رویوں سے سب کچھ اس کے برعکس ثابت کر کے دکھا چکی ہے۔

اپنے راستے میں کانٹے اس نے خود بچھائے تھے' وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔

وہ جھوٹی اور منافق لڑکی نہیں تھی' یہ اس میں شاید واحد خوبی تھی۔ اس میں اتنی جرأت تھی کہ جس سے نفرت کرتی ہو اس سے نفرت کا اظہار کر سکے اور جس سے محبت کرتی ہو اس سے محبت کا اقرار کر سکے۔

مگر جس سے وہ ہزاروں بار نفرت کا اظہار کر چکی ہے' اب یہ کیسے کہے کہ ''میری آن واحد میں دل کی دنیا ہی بدل گئی' میں پوری کی پوری بدل گئی۔''

محبت کے ہونے کا ادراک پا کر رونا' یہ بھی شاید صرف فارہ بہروز خان ہی کی طرح زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑنے والے لوگوں ہی کے نصیب میں ہوتا ہے۔

محبت پانا' کرنا ہوتا' وہ ان سب سے بھی پہلے ادراک وآگاہی کے اس پہلے ہی لمحے میں شکست کھاتی بری طرح رو رہی تھی۔

"آپ اچھی بیوی نہ بن سکیں' میں اچھی بیٹی نہ بن سکی۔ میں نے اپنا یہ گناہ قبول کرلیا' آپ کب کریں گی؟"

وہ ان دنوں اپنے گناہوں کو یاد کرنے اور قبول کرنے کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ بیٹی نے ایک سوال ان کے آگے رکھا تھا اور وہ اس کا جواب تلاش کرتی اپنے پورے ماضی کو دہرا رہی تھیں۔

"کیا کوئی شخص ایک ہی وقت میں اپنے تمام رشتوں کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا؟ کیا محبت کے لیے اللہ نے ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی سی جگہ رکھی ہے؟"

"ہم ایک وقت میں اپنے تمام قریب ترین اور عزیز ترین رشتوں سے ایک جیسی محبت کیوں نہیں کر سکتے۔" کیوں نہیں کرسکتے۔ بالکل کرسکتے ہیں۔ اچھا شوہر' اچھا بیٹا ہوگا اور اچھا بیٹا بہت برا شوہر' یہ کہاں لکھا تھا' یہ کس نے کہا تھا؟

اس شخص محمد بختیار خان سے انہیں پرخاش تھی کیا؟ یہ نفرت' یہ دشمنی تھی کن بنیادوں پر؟ اس شخص سے برسرِ پیکار نفرت کے جس مضبوط قلعے میں وہ برسوں سے مقید تھیں' اس کی بنیادیں کھڑی کس چیز پر تھیں' کس جذبے پر تھیں۔

ایک آواز ابھر رہی تھی ان کے اندر سے' صرف ایک آواز' حسد' حسد اور صرف حسد۔ وہ اس بڑھے کمزور انسان سے حسد کرتی تھیں' روزِ اول سے کرتی تھیں۔ اپنی شادی شدہ زندگی کے پہلے روز سے کرتی تھیں۔

ماں باپ کو چھوڑ کر ان کے دلوں کو دکھا کر انہیں ناراض کر کے سمجھیں کہ ہم خوش رہ لیں گے تو حقیقت میں ایسا ہوا نہیں کرتا۔

ہمارے ہر گناہ' ہر غلطی کی سزا ہمیں روزِ آخرت' جزا و سزا کے دن ملے گی' مگر ماں باپ کی نافرمانی وہ واحد گناہ ہے جس کی سزا آخرت کے ساتھ ہم اس دنیا میں بھی دل کی بے سکونی و بے اطمینانی کی صورت پاتے ہیں اور ساری زندگی پاتے رہتے ہیں۔

ان کی محبت میں اپنے باپ کو' بھائی کو' اپنے گھر کو چھوڑ کر آنے والا ان کا وہ محبوب شوہر راتوں کو سوتے سوتے بے قراری سے اٹھ کر کیوں بیٹھ جایا کرتا تھا۔

اکثر ان کے ساتھ باتیں کرتے' مسکراتے وہ یک لخت چپ کیوں ہو جایا کرتا تھا' کبھی بہت کھلکھلا کر ہنستے یک دم ہی اس کی آنکھوں میں اداسیاں کیوں چھا جاتی تھیں۔

شادی کے پانچ سالوں بعد بہت منتوں مرادوں کے بعد وہ بیٹی پیدا ہوئی' جس کے پیدا ہونے سے پہلے وہ اتنے پرجوش' اتنے خوش تھے تو اسے پہلی بار دیکھتے' گود میں اٹھانے پر بجائے مسکراہٹ کے ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں امڈ آئے تھے۔

اس پل کس کی کمی محسوس کی تھی انہوں نے اپنی زندگی میں؟ صرف اس پل نہیں زندگی کے ہر لمحے میں' ہر خوشی کے موقع پر' ہر کامیابی کی منزل طے کرنے پر۔

شاہانہ ٹھاٹ باٹ' عیش و آرام' دولت کی فراوانی چھوڑ کر آنے والے اس شخص نے اپنی اور ان کی وہ دنیا جو

بنائی تھی۔ محنت کر کے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کر کے' اس محنت کے بعد ملازمت میں ترقیاں مل رہی ہیں تو لبوں پہ جو مسکراہٹ ہے مگر آنکھوں میں درد چھپا ہوا ہے۔ بہت محنت' جدوجہد کے بعد اپنا ذاتی گھر تعمیر کیا ہے تو اس میں پہلا قدم رکھتے چہرے پر خوشی نہیں دکھ رقم ہیں۔

بیٹی کی پہلی سالگرہ' اس کے اسکول کا پہلا دن' اس کی پہلی تعلیمی کامیابی' ان کی زندگی کی ہر خوشی پر اداسیوں کے رنگ چھائے رہتے۔ ان محبت کرنے والے میاں بیوی کے بیچ ان کی شادی شدہ زندگی کے پہلے دن سے ایک شخص موجود تھا۔

وہ شخص جو ان کے شوہر کو کبھی سچے دل سے ہنسنے اور خوش ہونے نہیں دیتا تھا۔ جب وہ دونوں تنہا ہوتے' ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہوتے' تب کہیں سے وہ ایک شخص اچانک ان کے بیچ آ کھڑا ہوتا۔

اس کی آمد کی خبر انہیں شوہر کے چہرے پر پھیلتی اداسیاں دیا کرتیں' اس کی آنکھوں میں بکھرتا درد دیا کرتا۔

باپ' بھائی' گھر' ان سب کو چھوڑ آنے والا وہ شخص درحقیقت ان سب کو اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔

تب نہیں مگر آج جانتی تھیں کہ وہ اس گھر' اس کے در و دیوار اور وہاں بستے ایک ایک فرد سے حسد میں مبتلا تھیں۔ وہ سب ان کے شوہر کی زندگی میں موجود نہ ہوتے ہوئے اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھے۔

اور ان سب میں وہ سب سے زیادہ حسد کرتی تھیں اس انسان سے جو ان کے شوہر کا باپ تھا' جس کی یادوں میں جب ان کا شوہر کھوتا تو انہیں لگتا وہ اپنے آپ تک کو بھول جایا کرتا تھا۔

وہ ان میاں بیوی کی تنہائیوں میں شامل تھا' وہ ان کی خلوتوں میں شامل تھا' وہ ان کی مسکراہٹوں میں شامل تھا' وہ ان کی خوشیوں میں شامل تھا' وہ ان کی زندگی کے ہر لمحے اور ہر پل میں شامل تھا۔

وہ اسے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دینا چاہتی تھیں' مگر وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکیں۔ وہ اس ان دیکھے' ان جانے شخص سے جلن' حسد اور رقابت میں مبتلا تھیں جو شوہر کے ساتھ گزرے ان کی زندگی کے تئیس برسوں میں بھی ان سے نہ ملا' مگر وہ ہر پل' ہر آن اپنی موجودگی کا' اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہا۔

وہ بھائی کی موت پر اپنے گھر تئیس برس بعد گیا تو انہیں اس کے بھائی کی موت کا غم نہیں' یہ فکر لاحق ہوئی کہ تئیس برسوں تک ان کے شوہر کے دل پر حکمرانی کرتے وہ سب لوگ پھر اس کی زندگی کا حصہ بن جانے والے ہیں۔

جب وہ نہیں تھے' تب تھے' تو اب تو وہ ہوں گے' اب تو وہ واقعی پس منظر میں چلی جائیں گی۔

وہ شوہر کو اب بھی نظر نہیں آئیں گی' شوہر انہیں فراموش کر دے گا۔

حاسد کسی بھی دوسرے انسان سے زیادہ سب سے زیادہ اپنے ہی آپ کو نقصان پہنچایا کرتا ہے' انہوں نے بھی یہی کیا۔

یہ نہ سوچا' یہ نہ سمجھا کہ ان کے کچھ گھنٹے باپ کے اور دوسرے خونی رشتوں کے ساتھ گزارنے کے بعد جب وہ ان کے پاس آئیں گے تو پورے کے پورے ان کے ہو کر آئیں گے۔

ان کی تنہائیوں میں پھر کوئی تیسرا شامل نہیں ہوگا۔ پہلے شوہر ان کے ساتھ ہوتا تھا مگر پورا کا پورا ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا اس کے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ کہیں اور ہوتا تھا۔

اگر وہ حاسد نہ ہوتیں' سمجھدار اور عقل مند ہوتیں تو سمجھداری ہی کا فیصلہ کرتیں' شوہر کی محبت کو کسی خوشی اس کے باپ کے ساتھ بانٹ لیتیں۔

یہی غلطی تھی ان کی' یہی قصور تھا ان کا اور یہی گناہ تھا ان کا۔ شوہر کا بھائی مرا ہے' اسے تسلی نہیں دی' ہمدردی و محبت کے دو بول نہ بولے۔ اس کے باپ کو احترام سے سلام تک نہ کیا' شوہر سے' اس کے باپ سے' اس گھر کے ہر فرد سے روٹھ کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

اس پہلے سے غم زدہ شکست خوردہ اپنے شریک حیات کو اپنی ذات سے کوئی راحت' کوئی تسکین دینے کے بجائے مزید دکھ' مزید پریشانیاں' مزید الجھنیں دیں۔

گناہوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا' غلطیوں کی نہ ختم ہونے والی فہرست تھی۔

وہ کتنا اچھا انسان تھا' کتنا سچا' کتنا باوفا' کتنا محبت کرنے والا اور وہ اپنے حسد کی آگ میں جلتی اسے اس کی موت سے قبل کتنی اذیتوں سے دوچار کرگئی تھیں۔

ان دنوں ان کی زندگی کے پچھلے تیس سال ان کے سامنے بکھرے پڑے رہتے تھے اور وہ ان ماہ و سال کے رنج و الم' درد و غم' پچھتاوے' دکھ' ملال' غلطیاں' گناہ' ہر ایک چیز دیکھتی' شمار کرتی جارہی تھیں۔

ان کا دل شاید سیاہ ہوگیا تھا شاید پتھر کا ہوگیا تھا جب ہی تو اس پر کچھ بھی اثر ہوتا نہیں تھا مگر فارہ کا فون' اس کی باتیں انہیں یوں لگا جیسے اس پتھر کو کسی نے یک دم ہی ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا۔

فارہ رو رہی تھی اور اس کی باتیں سنتی وہ بھی بے آواز رو پڑی تھیں۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی اور یہ روتے ہوئے سن رہی تھیں۔

"جب وہ اپنی زندگی کے آخری بارہ گھنٹے جی رہا تھا تو اس کی بیوی ناراض ہو کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھی۔

اس کی منتظر نگاہیں پلٹ پلٹ کر دروازے کی طرف بھی جارہی تھیں۔ ابھی اس دروازے سے شاید اس کی بیوی آجائے' تمہاری وفا کا ثبوت میرے پاس ہمارے ساتھ گزارے تیس سال ہیں۔

اس کی بیوی اور بیٹی اس پر اعتبار کرتی ہیں' اس کا یقین کرتی ہیں' اس کی محبت کو دل کی گہرائیوں سے مانتی ہیں' وہ سننا چاہتا تھا' وہ دیکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔"

فارہ روتے ہوئے فون بند کرچکی تھی اور وہ روتے ہوئے ریسیور ہاتھ میں لیے زمین پر گرتی چلی گئی تھیں۔

کئی روز وہ ہسپتال داخل رہی تھیں' کئی روز وہ شدید بیمار رہی تھیں مگر انہوں نے اپنی بہن کو فارہ کو اطلاع دینے سے سختی سے روک دیا تھا۔ وہ اس سے روٹھ کر ان دنوں سات سمندر پار بیٹھی ہیں۔

وہ ویزا اور دوسری قانونی مشکلات کے سبب ان کے پاس آ نہ سکے گی تو وہاں اکیلی نجانے کس قدر پریشان

ہوگی۔ ہسپتال سے آئے بھی اب انہیں کافی دن ہوچکے تھے مگر ابھی بھی وہ سارا وقت بستر پر لیٹ کر اپنے کمرے میں بند گزارا کرتی تھیں۔

شوہر کے ساتھ بتایا ہر پل ان دنوں ان کے سامنے آرہا تھا اور اس ہر پل کا اختتام آخر میں ایک ہی پچھتاوے پر ہوتا تھا۔

"وہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس سے روٹھ کر دور کیوں ہوئیں؟" ان پچھتاووں سے لڑنا اتنا آسان نہ تھا۔

وہ روز قیامت شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی؟ جو اس کے ساتھ روا رکھا وہ سلوک ہی کم نہ تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ۔

وہ باپ جس سے وہ والہانہ محبت کرتا تھا۔ ایک محبت کرنے والی' وفا شعار بیوی کا فرض نبھاتے کبھی اس کے باپ کی عزت نہ کی۔

اس شخص سے حسد کرتی تھیں اس لیے اس کی محبت قبول نہ کرتی تھیں' حسد' بغض و کینہ خود کے دل میں تھا اور الزام اس پر لگاتی تھیں۔

وہ بھی انسان کسی سے کیا چھینے آتا تھا؟ وہ تو نت نئی محبتیں بانٹنے چاہتیں برسانے ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ حسد کو نفرت کے پردوں میں چھپا کر وہ واقعی اندھی ہوگئی تھیں۔

برے سے برا اور غلط سے غلط کام کرتے بھی انہیں نہ افسوس ہوتا تھا' نہ شرمندگی' نہ ملال نہ پچھتاوا۔

وہ اپنی پوتی سے نہیں ملے گا' اسے جلدی جلدی فون بھی نہیں کرے گا' یہ پابندی اس پر لگائی تو وہ بغیر اختلاف کے ان کی بات مانتا یوں ہی کرنے لگا' ہاں ان سے رابطہ کرکے بہت جلدی جلدی اپنی پوتی اور ان کی خیریت پوچھا کرتا۔

وہ جوا کس طرح بات کرتیں۔ یہ ایک الگ گناہ تھا' پوتی کو وہ ہر ماہ خرچے کے لیے دی جانے والی رقم سے ہٹ کر خود کچھ نہیں دے سکتے۔

ان پر یہ پابندی لگائی تو وہ اسے بھی مانتے۔ پوتی اور ان کے دونوں کے لیے تحائف کبھی ولی کے ہاتھ' کبھی کسی ملازم سے' کبھی کسی اور ذریعے سے ان ہی کو بھجوادیا کرتے کہ وہ خود اسے یہ سب دے دیں۔

بیٹی کے دل پر دادا کی چاہتیں' الفتیں کہیں اثر نہ کرجائیں اس خوف سے وہ وہ تحائف بھی اسے دیا ہی نہ کرتیں' اکثر اپنی کسی بھانجی بھتیجی یا بھتیجوں یا بھانجوں کو دے دیا کرتیں۔

اگر کبھی اس کے لیے آئی کوئی چیز اسے دیتیں بھی تو یہ کہہ کر کہ یہ میں تمہارے لیے بازار سے خرید لائی تھی یا ماموں نے تمہارے لیے لی ہے یا ممانی نے دی ہے' یا خالہ نے بھجوائی ہے۔

اس کے لیے آئی بہت قیمتی چیزیں تو اسے دیا ہی نہ کرتیں کہ کہیں اسے شک نہ ہوجائے کہ بے جا اور بے موقع ماموں یا خالہ قیمتی تحفہ نہیں دے سکتے اس کے لیے برسوں سے آتے قیمتی قلم' پرفیوم' برانڈڈ بیگز' سوئٹرز

شالیں' ملبوسات' امپورٹڈ جیولری کا سیکشن۔

سونے کی کئی زنجیریں' انگوٹھیاں' بالیاں' بریسلیٹ یہاں تک کہ بہت مہنگا سو بالکل نئے ماڈل کا لیپ ٹاپ اور ڈیجیٹل کیمرہ تک بھی ان کی بیٹی نہیں کوئی بھتیجا یا بھتیجی یا بھانجی یا بھانجا استعمال کیا کرتے۔

بے حد فخر و ناز سے پھوپھا یا خالہ کا قیمتی تحفہ جان کر اسے قبول کرتے ہوئے۔ ان کے حسد نے کسی اور کے ساتھ تو کیا انہیں ان کی بیٹی تک کے ساتھ مخلص نہ رہنے دیا۔

وہ اس سے جھوٹ بولتی تھیں' وہ اس سے غلط بیانیاں کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی دادا کا بھجوایا پیسہ بہت سنبھل کر' بڑی احتیاط سے اور صرف خاص خاص ضرورتوں کے لیے استعمال کرتی اور وہ اس پیسے کو پانی کی طرح بہاتیں۔

ان کے پرس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا اور وہ اپنے بھائی بہن کی سب سے لاڈلی بہن' بھاوج کی سب سے چہیتی نند' بھتیجوں' بھتیجیوں کی سب سے اچھی سب سے پیاری پھوپھو اور بھانجے بھانجیوں کی سب سے لاڈلی خالہ بنی رہتیں۔

حسد میں پاگل ہوتے انہوں نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اگر محمد بختیار خان کا مالی تعاون مسلسل ان کے ساتھ نہ ہوتا تو شوہر کی وفات کے بعد وہ اور ان کی بیٹی کہاں کھڑی ہوتیں۔

اس جواں عمری کی موت کے بعد ان کا شوہر جو چھوڑ کر ان کے لیے گیا وہ کسی عیش پرستی و شاہ خرچی کا تو کیا ایک عام متوسط درجے کی زندگی گزارنے کے لیے بھی ناکافی تھا۔

وہ اس با حیثیت خاندان کی بہو نہ ہوتیں' اپنے سسرال کی انہیں مکمل مالی سپورٹ حاصل نہ ہوتی پھر دیکھتیں کہ کون سا بھائی' کون سی بہن' کون سی بھاوج' کون سا بھانجا اور کون سا بھتیجا انہیں پوچھ رہا ہے۔

اپنی بیٹی تنہا چھوڑ کر جس بہن کے پاس بہت اترا کر فخر سے وہ کینیڈا آئی تھیں کہ بہن نے بڑی چاہت سے انہیں اپنے پاس بلایا تھا۔ اگر وہ شخص انہیں اپنی بہو نہ مانتا' اپنی دولت سے انہیں بے تحاشا نہ نوازتا' تو بھی کیا یہ بہن اتنی ہی محبت سے انہیں پاس بلاتی؟ ڈھائی مہینے سے وہ یہاں رہ رہی ہیں۔ کیا وہ رہ پاتیں۔

محمد بختیار خان کو اذیتیں دینے پر کمربستہ وہ تو اپنی ہی بیٹی کی زندگی اجاڑنے چلی تھیں۔ مائیں بیٹیوں کا گھر بسانے کی فکر کرتی ہیں اور وہ اجاڑنے کا سوچا کرتی تھیں' اس کی بسی بسائی زندگی اجاڑ دینے کے درپے تھیں۔

جسے بیٹی کے لیے باپ نے چنا تھا' وہ خونی رشتوں کا احترام کرتا تھا' ان کی عزت اور ان سے پیار کرتا تھا۔

اور جسے انہوں نے بیٹی کے لیے چنا' وہ ایک مادہ پرست لالچی اور مطلبی انسان تھا۔

کیا وہ جانتی نہ تھیں کہ معیز کو فارہ سے شادی پر کیا چیز اکساتی ہے' فارہ نا تجربہ کار و نا سمجھ ہے مگر وہ ایک عمر کے تجربات اور اتنی زندگی گزارنے کے بعد کیا انسانوں کو پہچاننے کے قابل نہ ہو سکی تھیں؟

وہ جانتی تھیں۔ وہ بالکل جانتی تھیں کہ اپنا کیریئر بنا لینے اور زندگی میں ہر طرح اسٹیبلش ہو جانے کے باوجود ان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ' ہینڈسم' بہترین کیریئر رکھنے والا اور دیگر بے شمار ظاہری خوبیوں کا مرقع بھتیجا اپنے لیے موجود کئی کنواری و غیر شادی شدہ لڑکیوں کے بہترین رشتوں کو چھوڑ کر ان کی نکاح شدہ بیٹی سے شادی کا کیوں خواہش

مند تھا۔

خود فارہ میں نہیں اسے وراثت میں ملنے والی کروڑوں کی دولت' جائیداد میں تھی۔ وہ جائیداد کا مطالبہ بھی خلع کے ساتھ ہی کر دیں' انہیں یہ مشورہ دینے والا بھی معیز تھا۔

جو شادیاں لالچ میں کی جاتی ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے' کیا وہ جانتی نہ تھیں؟

بس ولی صیب خان نہ ہو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔ وہ ان کی بیٹی سے محبت کرے یا نہیں اس کے ساتھ مخلص ہو یا نہیں۔

آج جب اپنے گناہ شمار کر رہی تھیں تو روتے ہوئے اپنے مرحوم شوہر کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ وہ جاتے جاتے بیٹی کو نکاح جیسے مضبوط رشتے میں باندھ گیا۔

اگر وہ اس روز فارہ کا نکاح نہ کرتے' صرف زبانی بات طے کرتے یا منگنی ہی کر دیتے تو وہ کب کی وہ منگنی کی انگوٹھی ولی صیب خان محمد بختیار کے منہ پر مار کر فارہ کی معیز کے ساتھ خوب دھوم دھام سے شادی کروا چکی ہوتیں۔

یہ ان کی بیٹی کے باپ اور دادا کی دعائیں اور ان کے درست فیصلے ہی تھے جو وہ اپنے تمام تر حسد' نفرت اور انتقام کی آگ میں پاگل ہو جانے کے باوجود بیٹی کی زندگی کو کسی بڑے سانحے سے دوچار نہ کر پائی تھیں۔

جوان بیٹی کو دنیا کے رحم و کرم پر بالکل تنہا چھوڑ کر خود یہاں ایک دوسرے ملک آ بیٹھیں' ایسا کرتے نہ دل کا نپا نہ وجود پر لرزش طاری ہوئی۔

آج وہ ان کے کیے کا خمیازہ بھگت رہی ہے' ان کی بیٹی اکیلی مشکلات میں گھری زندگی گزار رہی ہے یا پھر اپنے شوہر سے وہ کیسے معافی مانگیں۔ وہ تو ان سے روٹھ کر دور کہیں جا بسا ہے۔

"میں نے اپنا گناہ قبول کر لیا' آپ کب کریں گی؟ اسی زندگی میں کر لیں۔ ابھی وہ بوڑھا انسان زندہ ہے۔ ابھی ہم اپنے گناہوں کی اس سے معافی مانگ سکتے ہیں۔"

کئی ہفتوں سے حواس پر بیٹی کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے مگر وہ خود میں اتنا حوصلہ تو پیدا کر پاتیں کہ اس کا سامنا کر سکیں' اس سے معافی مانگ سکیں۔

اس صبح کانپتے ہاتھوں سے وہ محمد بختیار خان کے گھر کا فون نمبر ملا رہی تھیں۔ کسی ملازم نے فون اٹھایا تھا اور انہوں نے بیٹی کے بجائے سسر سے بات کرنا چاہی تھی۔

"ہیلو! ردی بیٹا! تم ہو؟" ان کی سماعتوں سے وہ بوڑھی نحیف آواز ٹکرائی تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"آغا جان! مجھے معاف کر دیں۔"

انہیں اس احترام والے لقب سے انہوں نے زندگی میں پہلی بار مخاطب کیا تھا ورنہ گفتگو بغیر کسی لقب کے صرف آپ سے شروع ہوا کرتی تھی۔ وہ کیا بولیں' ان سے کچھ بولا ہی نہ جا رہا تھا۔

CamScanner

گناہ اتنے تھے وہ کس کس کا اعتراف کریں، کس کس کی معافی مانگیں۔ "روؤ بیٹا تم!" ان کا محبت میں ڈوبا لہجہ انہیں ندامتوں کی عمیق گہرائیوں میں دھکیلنے لگا ان پر جیسے کوئی کوڑے برسا رہا تھا۔

"میرے گناہوں کی گٹھڑی بہت وزنی ہے آغا جان! بہت وزنی۔ آپ سے اپنے کس کس قصور کی معافی مانگوں؟ چاہتی تو یہ ہوں کہ آپ کے پاس آ کر آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں۔

میں تو آپ کے سامنے آ کر کھڑے ہونے کی جرأت بھی خود میں نہیں پاتی۔" وہ رو رہی تھیں۔

"انسانوں میں رنجشیں، گلے شکوے، لڑائیاں سب کچھ ہو جایا کرتا ہے بیٹا! انہیں یاد رکھنا اور دل سے لگانا نہیں بھول جانا چاہیے۔ تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا میرے لیے یہی بہت ہے۔ تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، میں تم سے خفا نہیں۔ بس اب سب کچھ بھول کر یہاں آ جاؤ۔"

یہ اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی انہیں مزید کچھ اور ندامتوں کے سمندر میں دھنسا گئی۔

"میں آپ کے پاس آؤں گی آغا جان! ضرور آؤں گی۔ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی مگر مجھے کچھ وقت دے دیں۔"

"میں ولی کو بھیجوں تمہارے پاس یا کہو تو قارہ کو تم ان کے ساتھ۔" وہ ان کی شرمندگی و پشیمانی اور تذبذب کو دیکھ کر بے اختیار بولے۔

"نہیں کسی کو نہیں۔ آپ وعدہ کریں مجھے لینے کسی کو نہیں بھیجیں گے۔ واپسی کا یہ سفر میں خود طے کروں گی۔ اس بار آپ نہیں میں آپ کے پاس آؤں گی۔ بس مجھے کچھ مہلت، کچھ وقت دے دیں۔" پھر انہوں نے قارہ سے بات کروانے کی درخواست کی۔

"السلام علیکم ممی!" وہ شاید وہیں کہیں پاس ہی موجود تھی جب ہی تو لائن پر اگلے ہی پل وہ موجود تھی۔

"قارہ دیکھنا آغا جان مجھے لینے کسی کو نہ بھیجیں، ورنہ میں پچھتیوں میں کچھ اور دھنس جاؤں گی انہیں ایسا مت کرنے دینا قارہ! میں کوشش کر رہی ہوں، تم دعا کرو میں خود میں جلد اتنا حوصلہ اور ہمت جمع کر پاؤں کہ یہاں تم سب کے پاس آ سکوں۔" وہ اس سے روتے ہوئے بولیں۔

"تم مجھے بہت یاد آ رہی ہو بیٹا! میں جلد تمہارے پاس آؤں گی۔" وہ خاموشی سے ان کی آواز سن رہی تھی۔

اس روز اس نے بہت کچھ کہا تھا شاید آج وہ صرف انہیں بولنے کا موقع دے رہی تھی۔

"قارہ! میں تمہارے قابل نہیں۔ جو میں نے چاہا وہ غلط جو تمہارے ڈیڈی نے چاہا وہ صحیح تھا۔" اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے وہ دھیمی آواز میں بولیں۔ "نفرتوں کو انتہاؤں تک لے جانے میں، میں نے کوئی کمی نہیں رکھی لیکن اگر ولی ابھی بھی اس رشتے کے لیے راضی ہو جاتا ہے تو تم اس رشتے کے لیے فوراً ہاں کر دینا قارہ! جو اپنے والدین اور اپنے خونی رشتوں کے ساتھ مخلص ہے، وہ دنیا کے ہر رشتے کے ساتھ مخلص ہوگا۔" وہ ولی سے کہنا چاہتی تھیں کہ ان کے گناہوں کی سزا وہ ان کی بیٹی کو نہ دے، وہ معصوم ہے، وہ بے قصور ہے، وہ بہت اچھی، بہت اچھی ہے۔ وہ اسے اپنا لے اپنا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا رہنے دے، انہیں چاہے بھی معاف نہ کرے، ان سے

چاہے بھی نہ ملے، کوئی رابطہ کوئی واسطہ کوئی تعلق نہ رکھے۔

مگر اس سے یہ سب کہنے کا وہ منہ کہاں سے لاتیں؟ ان کا منہ نہیں تھا اس سے کچھ بھی کہنے کا۔ اب بس صرف دعاؤں پر انہیں بھروسہ تھا، صرف دعاؤں پر۔ ماں کی دعا، اس کی اولاد کے حق میں جو اللہ رد نہیں کرتا۔

☆☆☆

وہ آغا جان کو روتا دیکھ کر ان کے پاس آ گئی تھی اور یہ جان کر کہ یہ فون اس کی ماں کا ہے وہ ان کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

ماں کیا کہہ رہی ہے اسے پتا نہیں تھا مگر جواب میں آغا جان کیا کہہ رہے تھے وہ سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے۔

محبت کی جیت کے ان انمول اور یادگار لمحوں میں جب وہ پورے دل سے خوش ہو رہی تھی خوشی و مسرت کے آنسو برسا رہی تھی، تب ماں کی اس آخری بات نے اسے یاد دلایا تھا کہ خوشی اس کے حصے میں اب زندگی بھر کبھی بھی پوری آ نہیں سکتی۔

وہ جانتی تھی ولی کتنا بھی متحمل مزاج اور بظاہر غصہ اور ضد کرنے والا نہ لگتا ہو مگر وہ اسے کبھی بھی دل سے معاف نہیں کر سکتا۔

"آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے۔ آج سے لے کر اکتیس مارچ تک تمہیں وہاں ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اگر تم ایسا کرنے پر آمادہ ہو تو یکم اپریل کو جو تم چاہو وہ تمہیں مل جائے گا۔ تمہاری تسلی کے لیے آج پہلی اور آخری بار تمہیں یقین دہانی کروا رہا ہوں کہ تین مہینے سے اگلا ایک دن بھی تمہیں نہ یہاں رہنا پڑے گا اور نہ کسی ناپسندیدہ رشتے کو جوڑے رکھنا پڑے گا اور میں اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں۔"

اور وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے لفظوں سے پھرنے والا انسان نہیں۔ تین مہینے بعد وہ یہاں رہنا چاہے گی یا یہاں سے جانا چاہے گی، یہ اس کی ذاتی مرضی ہے۔ اس میں وہ مداخلت نہیں کرے گا کہ اس بات سے آغا جان بھی وابستہ ہیں مگر تین مہینے بعد وہ اسے چھوڑ دے گا۔ یہ ایک طے شدہ بات تھی۔

آغا جان اُن کا بیٹا بہروز خان، پوتیاں قارہ اور زرمینہ سب غصے کے تیز، ضدی، جذباتی اور انا پرست لوگ تھے جب کہ ان کا دوسرا بیٹا صہیب خان اور اس کا بیٹا ولی ٹھنڈے مزاج کے صبر و برداشت والے متحمل و نرم طبیعت لوگ تھے۔

مگر اس نرمی، برداشت اور تحمل کے باوجود وہ تھے تو اسی خاندان سے جو ضد اور انا ان سب میں تھی وہ ان میں کیوں نہ ہوتی۔ وہ ولی سے جس رات بات کر کے آئی تھی اسے گزرے چودہ دن ہو چکے تھے۔

یہ مارچ کی بارہ تاریخ تھی۔ وہ جانتی تھی Count Down شروع ہو چکا ہے۔ آج صرف انیس دن باقی بچے ہیں کل اٹھارہ پھر سترہ پھر سولہ۔

اس کی نگاہ کیلنڈر پر جاتی تو وہ اسے دیکھ کر مسکراتا۔

"فارہ بہروز خان! وقت کو روک سکتی ہو تو روک لو۔"

ولی سے اس رات بات کر کے آنے کے بعد اس رات کی صبح اس سے محبت کا ادراک پانے کے بعد سے وہ ہر پل وقت کے رک جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔

اس رات سے آج تک تمام دنوں میں وہ سارا دن آغا جان کے ساتھ مصنوعی قہقہے لگاتی اور رات میں بستر میں منہ چھپا کر بے آواز رویا کرتی۔

جس سے اسے محبت ہے وہ اسے معاف کیوں نہیں کر دیتا؟

ان کی بہو نے ایک عمر گزارنے کے بعد آخر کار ان کی محبت کو تسلیم کر لیا۔ محبت کی جیت کی یہ سرشاری ایسی تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش اور مطمئن نظر آنے لگے۔

اب انہیں اٹھانے بٹھانے کے لیے سہارا دینے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ باتھ روم خود چلے جاتے تھے' کسی کسی وقت ہمت ہوتی تو آہستہ آہستہ چلتے اس کے پاس کچن میں آ جایا کرتے' وہ کام کرتی رہتی' وہ کچھ دیر کچن ٹیبل پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہتے پھر تھکنے لگتے تو واپس اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

ولی صبح یا کبھی کبھی شام کے وقت انہیں تھوڑی بہت چہل قدمی بھی کروانے لگا تھا۔

کبھی ان کی طبیعت میں کوئی تھوڑی بہت خرابی ہوتی' کوئی دوا سوٹ نہ کر رہی ہوتی' کسی کا کوئی سائیڈ افیکٹ ہونے لگتا تو وہ ان کی دواؤں میں معمولی سی رد و بدل' مقدار میں کمی یا تبدیلی کر دیا کرتی۔

ہاں ایسا وہ ہمیشہ ڈاکٹر نثار سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد کیا کرتی۔ آغا جان اسے چھیڑنے کو اکثر کہتے کہ ان کی تیمارداری کے بہانے وہ ایک سینئر ڈاکٹر کے زیر نگرانی اپنے تجربات اور قابلیت کو بڑھانے میں مگن ہے۔

ان دنوں ان کے ساتھ ہنسنا بھی کتنا دشوار عمل ہوا کرتا تھا مگر وہ اپنے کسی بھی انداز سے اپنی کوئی ٹینشن اور الجھن ان پر ظاہر کیا نہ کرتی تھی۔

زرینہ کے ساتھ بھی اس کا محبت بھرا تعلق مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

اس حد تک کہ ان دنوں جب وہ اپنی پڑھائی کی شدید نوعیت کی مصروفیات و پریشانیوں میں گھری تھی تب اس کی ٹینشن کو کچھ کم کرنے اور پڑھنے کا بھرپور موقع فراہم کرنے کو وہ عشنا اور حذیفہ دونوں کو ڈرائیور کے ساتھ جا کر یہاں لے آئی تھی۔

اس نے تو یونہی فون پر فارہ سے عائشہ آنٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی مصروفیات اور پڑھائی کے لیے مناسب وقت نہ ملنے اور اسائنمنٹس وغیرہ کی تاریخوں کا ذکر کر ڈالا تھا مگر فارہ' آغا جان کو سب بتا کر اسی روز اس کے گھر جا پہنچی تھی۔ عباد گھر پر نہ تھا اور زرینہ اس کی اجازت کے بغیر اس طرح بچوں کو اس کے ساتھ بھیجتے ہچکچا

رہی تھی۔

"عباد ناراض ہوں گے فارہ! انہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ میں اپنی روزمرہ کی چھوٹی موٹی مشکلات کے حل کے لیے اپنے میکے کی طرف دوڑوں۔"

"میں عشنا اور حذیفہ کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ عائشہ آنٹی آ گئیں تو یہ واپس آ جائیں گے۔ تم ان کے یونیفارمز' اسکول بیگز وغیرہ سب چیزیں جلدی سے میرے سپرد کر دو اور پانچ چھ دنوں کے لیے ان کے کپڑے بھی۔ تب تک میں عباد بھائی سے فون پر بات کر رہی ہوں۔" یہ بھی بہت پہلے کا قصہ تھا جب اسے عباد کو عباد بھائی کہنا زبردستی کا رشتہ جوڑنا لگتا تھا۔

"عباد بھائی! کیا عشنا اور حذیفہ میرے کچھ نہیں لگتے؟" اس نے زرینہ ہی کے گھر سے عباد کا موبائل نمبر ملایا اور سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی بولی۔

"ہاں! تم نے یہ پوچھنے کے لیے مجھے زندگی میں پہلی بار فون کال کی ہے؟" وہ اس کے انداز پر حیران بھی ہوا اور محظوظ بھی۔

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میرا ان دونوں کے ساتھ کوئی معمولی سا بھی رشتہ ہے تو مجھے یہ اجازت دیجیے کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جب تک عائشہ آنٹی کراچی سے واپس نہیں آ جاتیں اس وقت تک کے لیے۔"

"اس پورے جملے میں اجازت کا لفظ زبردستی گھسایا ہوا لگ رہا ہے اس لیے کہ آپ کا انداز مکمل طور پر دھونس و دھمکی دینے والا ہے۔"

"چلیں! میں اس لفظ کو کیا اپنے جملے ہی کو بدل لیتی ہوں۔ میں عشنا اور حذیفہ کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

"ہاں یہ انداز فارہ بہروز خان کو زیادہ سوٹ کرتا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا بھی تھا۔

جواباً وہ بھی بے ساختہ مسکرائی تھی اور ان کی باتیں خاموشی سے سنتی زرینہ بھی۔ یوں وہ بچے آج کل اپنی ننھیال میں رہ رہے تھے۔

صبح وہ دونوں یہیں سے اسکول جاتے' وہ انہیں تیار کروا کر ڈرائیور کے ساتھ روانہ کرتی کہ ولی آفس آغا جان کے ساتھ ناشتہ کر لینے اور ان کے ساتھ کچھ دیر باتیں کر لینے کے بعد ذرا تاخیر سے جایا کرتا تھا۔

اس کے بعد باقی کا سارا دن پھر وہ دونوں آغا جان اور فارہ کے ساتھ بھرپور شرارتیں کرتے اور کھیلتے کودتے گزارتے۔

شام میں ماموں کی گھر واپسی پر باہر گھما کر لانے اور آئس کریم کھلانے کی فرمائش ہوتی جو ہر بار ہی پوری کی جاتی۔

آغا جان کے ساتھ باتیں کرتے وقت کے سوا اگر کسی وقت ولی کے چہرے کی دبیز سنجیدگی بے تحاشا مسکراہٹ اور والہانہ پن میں بدلتی تو صرف اپنے بھانجی بھانجے کے لیے۔

رات اس نے دیکھا تھا کہ حذیفہ اس کے ساتھ ریسلنگ کر رہا تھا' اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھا وہ اس کے

CamScanner

کندھے ایک ، دو تین کی گنتی کرتے کار پیٹ سے لگانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اور ولی کے فرائض انجام دیتی عشنا بھی کچھ دیر بعد اس کے کندھے پر جھولتی نجانے کون کون سی داستانیں فرانٹے سے اسے سنانے میں مگن تھی۔

اس کے ساتھ آئس کریم کھانے کے لیے جانے والی عشنا واپسی میں اپنی باربی کے لیے سائیکل، ڈریسنگ ٹیبل، کچھ نئے کپڑے، جیولری اور سینڈلز خرید کر لائی تھی۔

اور حذیفہ درجن بھر چھوٹے سائز کی اسپورٹس کارز، جن کا مقصد و مصرف محض اتنا ہوتا تھا کہ پھر فراغت کے اوقات میں مکینیکل انجینئر صاحب ان کے ٹائر اور دیگر سارے پرزہ جات الگ الگ کر کے کسی نئی ایجاد و دریافت میں کوشاں ہو جاتے تھے۔

بہن کو باربی کا گھر سجانے سے فرصت نہ تھی اور بھائی کو گاڑیاں توڑنے سے۔ ان بچوں کے ہونے سے گھر میں بے حد رونق اور ہنگامہ تھا۔ اب وہ تینوں کھانا کھاتے تو وہاں آغا جان کی باتیں اور ان دونوں کی سنجیدگی جیسا کوئی ماحول نہ ہوتا تھا۔

آج شاید ان دونوں کے یہاں قیام کا آخری دن تھا کہ عائشہ آنٹی کی آمد آج متوقع تھی۔ آج جمعہ کا دن بھی تھا۔ کئی ماہ کی بیماری کے بعد آج آغا جان کا جمعہ کی نماز مسجد میں جا کر ادا کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ گھر پر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور جمعہ کے دن جب وہ مسجد نہ جا پاتے تھے اور مساجد سے جمعہ کے خطبے اور اذانوں کی آوازیں آیا کرتیں تو وہ بے قرار سے ہو اٹھتے تھے۔

آج مسجد جانے کا پروگرام انہوں نے رات ولی کے ساتھ طے کر لیا تھا اور وہ انہیں مسجد لے جانے حسب وعدہ نماز کے وقت سے کافی پہلے گھر پر موجود تھا۔

وہ اس وقت نہانے اور جمعہ کا بھرپور اہتمام کرنے میں مصروف تھے۔ ساتھ ساتھ فارہ کو یہ بھی بتاتے جا رہے تھے کہ انہوں نے ہمیشہ جمعہ کی نماز کا اہتمام بھی بالکل عید کی نماز کی طرح کیا ہے اور جب اس کی دادی زندہ تھیں تو وہ انہیں اور اپنے دونوں بیٹوں کو جمعہ کی تیاری میں خوب خوب مدد کرواتی تھیں۔

وہ اتنے عرصوں بعد مسجد جانے کی ایکسائٹمنٹ میں بے حد خوش تھے۔ وہ آغا جان کی پرجوش تیاریوں کو دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

حذیفہ اس سے ضد کر کے اپنا بھی لباس تبدیل کروا چکا تھا۔ کلف لگے کڑھائی ہوئے شلوار قمیص اور سواتی ٹوپی کے ساتھ جناب کا بھی نماز کے لیے جانے کا ارادہ تھا۔

عشنا نے بھی جمعہ کے احترام میں سلیولیس ہی سہی کیپس شلوار اور دوپٹہ منتخب کر کے پہن لیا تھا۔

مگر اس بھرپور تیاری اور اہتمام کے بعد جب وہ دونوں بہن بھائی اسے کمپیوٹر پر ساتھ بیٹھ کر Lion King کھیلتے نظر آئے تو پتا چلا احترام سارا ہو چکا اب اپنا کام ہو رہا ہے۔

ولی آغا جان کو گاڑی میں بٹھا کر مسجد لے گیا تھا۔ وہاں سے واپس آ کر وہ تھکے ہوئے نہیں بلکہ بے حد خوش

اور ایکٹو سے تھے۔ انہی کی فرمائش پر فارہ نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوایا۔

ایک طویل عرصہ بعد وہ اپنے گھر کے اس کمرے میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر گھر کے سربراہ کی وہ خصوصی کرسی آج ایک بار پھر ان کے وجود سے سج جانے والی تھی۔ فارہ نے آج ان کے لیے بھی تھوڑا اہتمام والا بنایا تھا اور باقی سب کا کھانا بنایا تو صدرہ نے تھا مگر میٹھے میں گاجر کا حلوہ فارہ ہی نے بنایا تھا۔

خوب محنت سے اور تمام تر لوازمات اس میں شامل کر کے کھویا، میوے، ابلے انڈے، چاندی کے ورق اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔

آغا جان اتنے دنوں بعد مسجد گئے تھے تو ان کے پاس سنانے کے لیے کئی قصے تھے۔ وہ وہاں پانچ وقت کے جانے پہچانے اور باقاعدہ نمازی تھے تو سب سے دوستیاں بھی خوب تھیں۔

اب وہ خوشی خوشی یہی بتا رہے تھے کہ مسجد میں ان کے دیرینہ دوستوں اور ساتھیوں نے آج ان کا استقبال کس والہانہ گرم جوشی سے کیا ہے۔

وہ زرینہ کے بیٹے کو انسان بنانے کی کوششوں کے ساتھ ان کی باتیں بھی پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔

اس کی پلیٹ میں چاول ڈالنے کے بعد اس نے اسے دھمکی دے دی تھی کہ اگر لنچ کے بعد وہ کمپیوٹر پر گیم کھیلنا چاہتا ہے اور شام میں اس کے ساتھ پارک بھی جانا چاہتا ہے تو بغیر کوئی برا سا منہ بنائے یہ پلیٹ خالی کر دے۔

ولی آغا جان کے پاور دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھا تھا جب کہ وہ عشنا اور حذیفہ کے ساتھ۔ اس کے سامنے والی کرسی پر اپنی پلیٹ میں موجود کھانا ختم کر کے ولی میز پر رکھے پھل اٹھا کر آغا جان کے لیے کاٹنے لگا۔

وہ بے چارے حسرت بھری نگاہوں سے گاجر کے حلوے کو دیکھتے صبر شکر کر کے پھل کھا رہے تھے۔ کبھی کبھار کی بداحتیاطی میں فارہ کو کوئی حرج نہ لگتی تھی۔

ایک شخص پورا اور مکمل پرہیز کرتا ہے اگر کبھی کبھی کچھ بداحتیاطی کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بہرحال وہ ایک زندہ جیتا جاگتا انسان ہے آپ اس پر اللہ کی ہر نعمت بند نہیں کر سکتے۔

مگر ولی ان کے سخت پرہیز کا قائل تھا۔ فارہ اس سے "میں ڈاکٹر ہوں یا تم" کہہ کر کوئی بحث نہیں کر سکتی تھی سو خاموش رہی۔

ولی نے خود بھی آغا جان کے ساتھ پھل ہی کھائے تھے گاجر کے حلوے کا ایک چمچ بھی نہ کھایا تھا۔

کھانے کے اختتام پر شادی کے کسی بلاوے کا ذکر ہونے لگا۔ وہ کچھ رشتے داروں کو جانتے تو لگی تھی مگر بہت اچھی طرح سب سے ابھی بھی واقف نہ ہو سکی تھی۔

ہفتہ بھر پہلے وہاں سے شادی کا کارڈ آیا تھا اور اب آغا جان اسے یاد دلا رہے تھے کہ یہ شادی ان کے کسی رشتے سے لگتے تو اسے کی ہے اور ولی، زرینہ اور فارہ نجانے اس بندے کے کس رشتے کے کزن ہیں۔

آغا جان تو شادی کی تقریب میں ظاہر ہے شرکت نہ کر سکتے تھے کہ اتنی دیر بیٹھنا ان کے لیے ناممکن تھا مگر

انھوں نے فارہ سے کہا تھا کہ ولی کے ساتھ وہ اس شادی میں شرکت کرے۔
وہ اس فیملی کی فرد ہے تو اسے سب کی خوشی اور غم میں بھی فیملی کے افراد ہی کی طرح شریک ہونا چاہیے۔

وہ ولی کے ساتھ شادی کی تقریب میں جا رہی تھی۔ وہ بالکل خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی خود بھی بالکل خاموش اور سنجیدہ سی تھی۔

وہ حیران ہوتی تھی اس شخص کے بے پناہ کنٹرول پر۔ اسے خود پر اپنے جذبات پر کتنا قابو تھا۔ اب تو خیر اسے اس سے بات کیے بہت دن ہو چکے تھے مگر جس رات وہ اس سے بات کر کے گئی اس کی اگلی صبح اس نے ولی کو نارمل اور پرسکون دیکھا تھا جیسے روز دیکھتی تھی۔

یہاں تک کہ اس نے فارہ سے بھی بالکل روزانہ والے انداز میں "آغا جان کا بی پی چیک کرلو میں ان کی دوائیں لے آیا تھا دیکھ لو کتنی ہیں۔" وغیرہ جیسی روٹین کی باتیں تک کی تھیں۔

کوئی اور تو کیا ان دونوں کے ساتھ صبح شام رہتے آغا جان تک ان دونوں کے مابین کوئی غیر معمولی انداز یا ماحول بھانپ نہ پائے تھے۔

ولی کا یہ لاتعلق و بے نیاز سا انداز اسے نفرت اور غصے سے کہیں بڑھ کر انسلٹنگ لگتا۔ وہ تو اسے اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ اس پر کوئی طنز ہی کر دے صبیح کے حوالے سے کوئی چبھتی بات کوئی طنزیہ فقرہ ہی کہہ دے۔

اس کا دل چاہتا وہ ولی سے کہے۔

"تم مجھ پر چیخ چلا لو برا بھلا بول دو اپنا سارا غصہ نکال لو مگر پلیز یہ لاتعلقی اور بے گانگی کی مار مجھے مت مارو۔ یہ طرز مستغنی غصہ اور نفرت سے کہیں زیادہ کڑی ہے۔"

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی' کوئی میوزک تک نہ بج رہا تھا۔ وہ شاید میوزک اجنبیوں کے ساتھ انجوائے کرنا پسند نہیں کیا کرتا تھا۔

اس نے اسٹیئرنگ پر جمے اس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کو دیکھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھے اور کہے۔

"ولی! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ پلیز پچھلی ہر بات بھلا کر مجھے صرف ایک موقع دے دو۔"

وہ یہ سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ محبت کے اظہار میں پہل کرتے اسے کوئی عار نہ تھی مگر اپنی جرأت اور صاف گوئی کا وہ آج سے پہلے بے شمار بار احمقانہ انداز میں نفرت کے اظہار میں استعمال کر چکی تھی کہ آج اس کی محبت کا یقین کرتا کون؟ کاش جتنی اس میں جرأت ہے اتنی ہی عقل بھی ہوتی تو آج وہ یہ دن نہ دیکھ رہی ہوتی۔

وہ دونوں شادی کی تقریب میں پہنچے تو ان کے ساتھ ساتھ ہی زرمینہ اور عباد کی گاڑی بھی آ کر رکی۔

ان لوگوں کو دیکھ کر فارہ اور ولی ادھر ہی آ گئے۔

"تم اور ولی گاڑی سے ساتھ اترتے شاندار لگ رہے تھے۔" عائشہ آنٹی اور عباد کو سلام کرنے کے بعد وہ زرمینہ کی طرف بڑھی تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر گرم جوشی اور محبت سے بولی۔

اس کی آہستہ آواز میں کہی بات عائشہ آنٹی کے بلند اور مخصوص نوعیت کے قہقہوں میں مزید دب گئی تھی۔

شکر تھا کہ اس کی آواز دب گئی ورنہ اس کے اس جملے پر سب اس کا ردعمل اس کے چہرے پر پڑھنا چاہتے۔

اس نے ولی کی طرف دیکھا وہ عباد کے ساتھ بے تکلف قسم کی ہائے ہیلو میں مصروف تھا۔

اس نے پھر زرمینہ کی طرف دیکھا اس نے کوئی جواب طلب بات نہ کی تھی صرف اپنی ایک رائے ایک فیلنگ اس سے شیئر کی تھی وہ ابھی بھی مسکراتی نگاہوں سے فارہ کو دیکھ رہی تھی۔

جانے زرمینہ نے کس چیز اور کس بات سے یہ رائے قائم کی تھی کہ ان دونوں کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔

اگر وہ ان دونوں کی شادی میں ساتھ آنے کی وجہ سے ایسا سمجھ رہی تھی تو یہ صرف اس کی خوش فہمی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ زرمینہ کو کیسے بتاتی کہ اپنی طرف کھلتے خوشیوں اور محبتوں کے در اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیے ہیں' وہ یہاں پشاور ولی صاحب خان کے ساتھ ساری زندگی گزارنے نہیں بلکہ زندگی کے فقط تین مہینے گزارنے آئی تھی اور ان تین مہینوں کے اختتام پر وہ اسے اس کی حسب خواہش و فرمائش اپنے نام سے آزادی کا پروانہ دے دے گا۔

وہ یہاں ایک معاہدہ کر کے آئی تھی اور اب اپنی کہی کسی بھی بات سے وہ مکر نہیں سکتی' اسے بھلا نہیں سکتی اگر چاہے تو بھی نہیں۔

ایک دم ہی اسے اتنی وحشت نے گھیرا کہ وہ اپنے پورشن سے نکل کر سیدھی آغا جان کے کمرے میں آ گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لیٹے تھے مگر اب عصر کا وقت ہونے والا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ نماز کی تیاری کے لیے جاگ چکے ہوں گے۔

وہ پچھلے دنوں میں بے شمار بار آغا جان کے پاس یہ مسئلہ لانے کا سوچ چکی تھی مگر ہر بار جب اپنی یکم جنوری کی وہ حرکت یاد آتی اس کے اٹھتے قدم بے اختیار رک جاتے۔

یہ بات انہیں بتانے کے لیے حوصلہ کتنا چاہیے تھا۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی شدید بیماری کا سن کر سب کچھ بھلا کر یہاں آ گئی تھی اگر انہیں حقیقت پتا چل گئی تو انہیں کس قدر دکھ ہو گا۔

وہ ان کا مان توڑنے کا خود میں حوصلہ کہاں سے لاتی؟ مگر اس وقت وہ ان کے پاس آنے سے خود کو روک نہ پائی۔ دن پر دن گزر رہے ہیں۔ کیا وہ خاموشی سے اس رشتے کو ختم ہو جانے دے گی۔ ولی کی پاس پھر جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

"آغا جان!"

"آؤ میری جان!" وہ بستر سے اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔

"آغا جان! میں آپ سے اپنے اور ولی کے رشتے کے بارے میں....." انھوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ

رکھ کر اسے آگے بولنے نہ دیا۔

"تمہیں اس رشتے کے متعلق کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے جان عزیز! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ جو تمہاری خوشی ہے وہی میری بھی خوشی ہے۔"

وہ اس موضوع پر بات کرنے ہی کو آمادہ نہ تھے۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے کہ وہ صرف ان کی صحت کی طرف سے متفکر ہوتی اس رشتے کو کسی انجام تک پہنچائے جانے سے ڈر رہی ہے۔

آخر وہ آغا جان سے کہہ بھی کیا اور کیسے؟ اور ولی؟ کیا فائدہ آغا جان کو اس رشتے کے قائم رکھنے کے حوالے سے اپنا ہمنوا بنا لے تو وہ حکم کے غلاموں کی طرح عاجزی سے اس کی پسند و خواہش پر سر جھکا دے گا۔ یوں آغا جان کا سہارا لے کر ان کے ذریعے اپنی بات منوانے کی کوشش کر کے تو وہ خود کو اس کی نظروں میں مزید اپنی چلانے اور من مانی کرنے والی ضدی و خود سر لڑکی ثابت کرے گی۔

اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ وہ آغا جان سے اس معاملے میں کسی بھی طرح مدد نہیں لے سکتی۔

ان سے مدد مانگنے کا صرف ایک معقول طریقہ ہے کہ آپ انہیں الف سے یے تک سب کچھ بتا دیں اور اتنی ہمت وہ خود میں ہرگز نہیں پاتی تھی۔

٭٭٭

یہ اس روز سے دو دن بعد کی بات تھی جب ولی آفس سے واپسی میں کچھ دیر سے بھی آیا اور ساتھ کچھ شاپنگ بھی کر کے لایا۔

چند ایک چیزیں تو آغا جان کے لیے اور گھر کے لیے تھیں مگر شاپنگ کا بنیادی مقصد عباد اور زرمینہ کی شادی کی سالگرہ کا تحفہ خرید کر لانا تھا۔

ان دونوں کے لیے خریدا گیا قیمتی تحفہ وہ آغا جان کو دکھانے لگا۔ انہوں نے تحفے کو کافی پسند کیا۔

فارہ پہلے سے جانتی تھی کہ زرمینہ کی ویڈنگ اینیورسری آنے والی ہے۔ آغا جان کئی روز پہلے سے یہ بات بتا چکے تھے اور یہ بھی کہ بچوں کی سالگرہ تو وہاں منائی ہی بہت دھوم دھڑکے سے جاتی ہے اور یہاں سے اس میں شرکت بھی بھرپور ہوتی ہے۔

مگر زرمینہ اور عباد کی شادی کی سالگرہ پر بھی ہر سال یہاں سے ولی اور آغا جان کی طرف سے ان دونوں کے لیے ایک مشترکہ تحفہ جایا کرتا ہے۔

جب تحفہ سب گھر والوں کی طرف سے مشترکہ دیا جا رہا تھا تو وہ بھی اسی گھر کا حصہ تھی اس لیے اس کے الگ سے کچھ تحفہ دینے کی تک بنتی نہیں تھی۔

ہاں اس نے تب ہی آغا جان سے زرمینہ کی شادی کی سالگرہ کا تذکرہ سننے کے بعد یہ ضرور طے کر لیا تھا کہ وہ تحفے کے ساتھ وہاں لے جانے کے لیے ایک اچھا سا کیک ضرور بیک کرے گی۔

اس کا خیال تھا کہ ولی اسے چلنے کے لیے نہیں کہے گا مگر وہ واقعی کوئی عجیب اور تھرڈ کلاس جذباتی حرکتیں نہیں کیا کرتا تھا۔

اگلی شام جب وہ آفس سے گھر آ گیا تو آغا جان سے دعا سلام اور خیر و عافیت کے بعد اس سے بولا۔

"زرمینہ کے گھر چلو گی؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اسی غیر جذباتی و لاتعلق سی ٹون میں بولا۔

"آٹھ بجے تک چلیں گے تیار ہو جانا۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا ان دونوں کا آپس کا یہ رشتہ نہ بھی رہے تب بھی وہ اس گھر کی فرد اور اس کی تایا کی بیٹی تو رہے گی اور وہ عادت کر کے دکھا رہا تھا کہ وہ سب کچھ کتنی خوش اسلوبی اور کس خوشی انجام دلوا دینے والا ہے۔

اس کے غیر جذباتی، سنجیدہ اور شائستہ انداز کے جواب میں خود بھی اس رویے کا مظاہرہ کرتی سنجیدگی سے سر ہلا گئی۔

آٹھ بجنے میں بھی کچھ منٹ تھے جب وہ تیار ہو چکی تھی۔ چاکلیٹ کیک وہ دوپہر ہی میں تیار کر کے فریج میں رکھ چکی تھی۔ اس نے زرمینہ ہی کا کچھ روز پہلے تحفے میں دیا ملبوس اور گہرے رنگوں کے امتزاج والا سوٹ پہنا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد لپ اسٹک، آئی لائنر اور مسکارے کے ساتھ تیاری کو مکمل کرتے وہ گہرے اور ملیح شیشوں اور دھاگوں کے کام سے آراستہ دوپٹے کو سر پر لیتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھی تو خود ہی چونک سی گئی۔ بالکل زرمینہ ہی کے سے انداز میں ہر وقت دوپٹہ سر پر لیے رکھنا اس کی کب سے عادت بن گیا تھا اسے خود احساس نہیں ہو سکا تھا۔

ابتداً خاندان کے افراد کی آغا جان کی عیادت کے لیے آمد کے دوران ان کی مہمان نوازی و میزبانی کے دوران اس نے قصداً ایسا کرنا شروع کیا تھا مگر یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس وقت وہ کسی شعوری کوشش کے بغیر خود بخود ایسا کر گئی۔

اسے خود پر تعجب بھی ہوا اور اچھا بھی لگا۔ ان دونوں کی وہاں آمد جیسے ایک متوقع بات تھی۔

زرمینہ تو جیسے بے صبری سے بیٹھے سے کسی کی آمد کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اسے اور عباد کو تحفہ دینے سے قبل ولی بچوں کو ان کے لیے لائی گئی چاکلیٹس دینے لگا۔

"ننھیال کے اس غیر ضروری لاڈ پیار نے میرے بچوں کا ستیاناس کر دیا۔" عباد نے ایک سرد آہ بھری۔

"میں نے سختی سے کہہ دیا تھا اب آٹھ باربی کے کپڑے، جوتے، زیورات، گھر کا آرائشی سامان، ان کا جم، جوئی سیلون وغیرہ وغیرہ کچھ خرید کر نہ دوں گا مگر میری سختی کا اثر کیا ہونا تھا ماموں جان جو گاڑی لے کر موجود ہیں۔ وہاں سے ایسی بھرپور شاپنگ کر آئی ہیں کہ اب مجھ سے فرمائش ہے انہیں باربی کا دولہا معہ اس کی مکمل وارڈ روب کے فراہم کیا جائے۔"

ولی اس کے شکووں پر دھیان دیے بغیر عائشہ آنٹی کی طرف متوجہ ہوا تو عباد فارہ سے کہنے لگا۔

"میری بہن اچھے بچوں جیسی ہی ہیں اور کوئی ظالم باپ نہ سمجھ لینا۔ مگر اس چھٹانک بھری باربی کے نخروں کی کوئی حد تو ہو۔ پچھلی بار بڑی خوشی خوشی خود بیٹی صاحبہ کے لیے وہ آفت کی پرکالہ خرید کر لایا تھا۔ کیا معلوم تھا گھر میں بیٹی کی باربی لا کر دینا گھر میں ہاتھی رکھ لینے کے مترادف ہے۔ گڑیا خرید کر آپ آٹھ اخراجات سے بچ گئے ایسا

سوچیں بھی ست۔ کھلونوں کی دکانوں پر آنسہ کے کپڑوں، جوتوں سے لے کر دیگر تمام ضروریات زندگی کا وہ سامان موجود ہے کہ بندہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہ جائے۔ پچھلے مہینے ان کے کپڑوں کی استری کا مسئلہ حل کرنے کے لیے آئرن اسٹینڈ اور ایک استری خریدی گئی تھی۔ ساتھ ٹی پارٹی کا سب ساز و سامان اور اگر آنسہ کو پکنک پر جانا ہو تو اس کے تمام لوازمات خرید کر دیے گئے تھے اور خیر اب تو دولہا میاں بھی چاہئیں۔ یعنی ایک نہ شد دو شد۔"

وہ عباد کی باتوں کو انجوائے کرتی ہنس رہی تھی۔ ایک اتنا خوش مزاج ایک اتنا زیادہ سنجیدہ۔

جانے ان کے مزاج کے اس فرق کے باوجود اس میں اور ولی میں اتنی زیادہ دوستی کیسے تھی؟ چونکہ کھانے کا اہتمام ہو رہا تھا اس لیے کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ہی زرمینہ کھانا لگوانے اٹھ گئی۔

بھائی کی آج آمد غیر متوقع نہ تھی اس لیے اس نے ڈنر پر خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں کیک کا کوئی اہتمام نہ تھا بقول عباد کے بڑھاپے میں یہ چونچلے کون کرے۔ فارہ جو کیک لے کر گئی تھی اس پر چھری چلانے کے لیے بھی اماں ابا سے پہلے دونوں بچے بے چین و بے قرار تھے۔

ان کا آپس کا کیک کاٹنے پر جھگڑا ان کے چچا نے دونوں کے ہاتھ میں بیک وقت چھری تھما کر نمٹوایا۔

"ہاں بھئی یہ دیسی ٹیسٹ رکھنے والے کہاں کیک کھائیں گے۔" کھانے کے اختتام پر میٹھے کی باری آئی تو ولی کو اخروٹ کا حلوہ پلیٹ میں ڈالتا دیکھ کر عباد بولا۔

"تعلیم امریکی حاصل کی ہے مگر کھانے انہیں سارے کے سارے دیسی پسند ہیں۔" ولی کے علاوہ باقی سب نے میٹھے میں کیک ہی لیا تھا۔

"ہائے فارہ! تم نے اتنا زبردست کیک کیسے بنا لیا؟ یہ تو گھر کا بنا ہوا معلوم ہی نہیں ہو رہا۔ پلیز مجھے اس کی ریسپی دے دو۔ میرا سادہ کیک تو بن جاتا ہے مگر کریم والے سارے کے سارے انتہائی فضول۔"

زرمینہ کیک کا پہلا لقمہ ہی منہ میں رکھ کر باآواز بلند بولی۔

"لیجیے یہاں خالص قسم کی خواتینی گفتگو عنقریب شروع ہونے والی ہے۔ چلو ولی! ہم لوگ لاؤنج میں چلتے ہیں۔"

عباد جو اب ریسپیز کے یہ تبادلے دیکھ دیکھ کر خاصا اکتایا ہوا تھا، تب ہی اپنی پلیٹ ہاتھ میں لے کر ولی کو بھی اٹھنے کا اشارہ کرتا فوراً کھڑا ہو گیا۔

وہ کیک کی ریسپی بتا چکی تو فائزہ آپی اپنی کچھ مشہور زمانہ ریسپیز ان دونوں سے شیئر کرنے لگیں۔ وہ ان دونوں کے ساتھ گفتگو کو اتنا انجوائے کر رہی تھی کہ گیارہ بجے گھر چلنے کے لیے اسے ولی ہی نے کہا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد کچن میں جا کر ایک کام نمٹا کر وہ آغا جان کو دوا دینے کے لیے ان کے کمرے میں آنے لگی جب ان کے برابر والے کمرے سے آتی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

ولی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید وہ آفس جا چکا ہے مگر وہ ابھی گیا نہیں تھا۔

"جی وحید صاحب! آپ پیپرز تیار کروا لیجیے۔ ہاں وہ پہلے میں نے آپ کو اس لیے روک دیا تھا کیونکہ اس

وقت تک میں نے آغا جان سے بات نہیں کی تھی۔" ایک لمحے کے لیے اس نے دوسری طرف کی کوئی بات سنی پھر دوبارہ بولا۔

"میں پانچ چھ دنوں کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔ آج بائیس ہے نا زیادہ سے زیادہ تیس یا اکتیس تک آ جاؤں گا۔ آپ پیپرز مجھے تب تک بھجوا دیجیے گا۔ جی ہاں ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔"

اسے ریسیور رکھے جانے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ فوراً وہاں سے ہٹنے کا جو سب سے پہلا طریقہ اس کی سمجھ میں آیا وہ برابر والے کمرے میں داخل ہو جانا تھا اور وہ فوراً ہی ایسا کر بھی گئی تھی۔

ادھر وہ کمرے میں آئی ادھر اپنے کمرے سے نکل کر ولی بھی آغا جان کے دروازے پر آیا۔

"آغا جان! میں جا رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ شاید لیٹ ہو گیا تھا اس لیے دروازے پر سے انہیں خدا حافظ کہتا فوراً واپس مڑ گیا۔

آغا جان نے ولی کو کچھ خاص توجہ سے نہ دیکھا، خدا حافظ کہا۔ ان کی توجہ فارہ کی طرف تھی۔ "کیا ہوا بیٹا!" اس کی پریشانی، اس کا خوف، اس کا اضطراب اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ وہ آغا جان سے اپنے تاثرات چھپانا چاہتی تھی مگر ناکام ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا فارہ! زرمینہ ٹھیک ہے نا؟ کل تو تمہاری اس سے فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ اگلے مہینے آنے کا وعدہ کر رہی تھی پھر اچانک۔" اسے جانے ایک دم ہی کیا ہوا، وہ دوڑتی ہوئی آئی اور آغا جان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"آغا جان! ولی مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں اس سے معافی تک مانگ چکی ہوں پھر بھی نہ اس نے مجھے معاف کیا اور نہ مجھ سے نفرت ختم کی۔ آپ کہتے ہیں وہ بہت کھلے ذہن کا ہے، بہت معاملہ فہم، بہت صابر اور برداشت والا ہے۔ وہ میری اور زرمینہ کی طرح ضدی، جذباتی اور غصے والا نہیں مگر میں آپ کو بتاؤں، وہ مجھ سے اور زرمینہ سے بھی زیادہ ضدی اور غصے والا ہے۔ اس میں انا بھی ہم دونوں سے کہیں زیادہ ہے۔

ہم دونوں تو منہ پر بول کر دل صاف کر لیتے ہیں، وہ دل میں کینہ و بغض رکھنے والے لوگوں میں سے ہے۔ وہ منہ سے کہتا ضرور ہے مگر دل سے اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"نہیں بیٹا! وہ تم سے نفرت نہیں کرتا۔" آغا جان نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس نے اپنا دل میری طرف سے بالکل صاف نہیں کیا۔ میں آپ کو اس کی نفرت کی انتہا بتاؤں، وہ میرے ہاتھ کی بنی کوئی چیز تک کھانا پسند نہیں کرتا۔ اس دن میں نے گاجر کا حلوہ بنایا تھا، آپ کو یاد ہے؟ آپ ایک بار زرمینہ اور ولی کی بچپن کی باتیں بتاتے ہوئے بتا رہے تھے کہ ولی کو بچپن میں آمنہ چاچی کے ہاتھوں کے بنے حلوے بہت پسند تھے۔ وہ ان سے گاجر کا حلوہ فرمائش کر کے بنواتا تھا اور اس دن جب میں نے حلوہ بنایا تو اس نے اسے اگنور کر کے فروٹ کھانے شروع کر دیے۔

کل زرمینہ کے گھر اس نے میرے بنائے کیک کے بجائے اخروٹ کا حلوہ کھایا۔ میرے بنائے کھانوں میں

CS CamScanner

جیسے زہر ملا ہوتا ہے۔ یہ ہے اس کی مجھ سے نفرت...... پھر آپ کہتے ہیں وہ بچھو رہے۔

اگر وہ بچھو رہتا تو کیا اسے یہ نظر نہ آتا کہ میں اب بدل گئی ہوں۔ میں اب پہلے جیسی نہیں ہوں۔ میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں۔" وہ روتے ہوئے بے سوچے سمجھے بولے چلی جا رہی تھی۔

مگر یک دم ہی اسے خود ہی احساس ہوا۔ اب ان سب باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ وہ آغا جان سے ساری بات کر چکا ہے اور ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے بعد اس نے وکیل کو طلاق کے کاغذات تیار کروانے کو کہہ دیا ہے۔

اب گلے شکوے، شکایتیں اور یہ آنسو کس کام کے ہیں؟ ان سے فائدہ کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

وہ اب آغا جان کے روبرو سوال جواب سے خائف تھی۔ وہ جانتی نہیں اس سے کیا پوچھیں گے اور وہ ان سے کیا کہے گی۔

اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں مگر شکر ہوا ابھی اس نے ان کی گود سے سر اٹھا کر شرمندگی میں بری طرح گھرتے آنسو صاف کرنے شروع کیے ہی تھے کہ ان کے ایک بہت پرانے واقف ان کی عیادت کے لیے آ گئے۔

وہ لندن سے آئے ہوئے تھے۔ آغا جان کی کئی برسوں بعد ان سے ملاقات ہو رہی تھی، سو ان کے ساتھ ان کا گفتگو کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جو لنچ کے بعد بھی کافی دیر جاری رہا تھا۔

بڑھاپے میں انسان کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس نے آغا جان کے صبح کی بابت کچھ نہ پوچھنے پر سکون کا سانس لیتے سوچا۔

ولی اسی شام کراچی چلا گیا تھا۔

آغا جان کہہ رہے تھے وہاں اسے آفس کا کوئی کام ہے۔ رات کے کھانے پر صرف وہ اور آغا جان تھے۔

کھانے کے بعد وہ کچھ دیر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ کمی جو اگلے مہینے یہاں آ جانے والی ہیں وہ موضوع کچھ دیر آغا جان نے بڑی خوشی کے ساتھ اس سے ڈسکس کیا پھر انہیں دوا دینے کے بعد کمرے کی لائٹس بند کر کے وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔

گھر میں ملازمین کے علاوہ صرف وہ اور آغا جان تھے۔ رات میں خدانخواستہ کسی وقت ان کی طبیعت خراب ہوتی یا انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو وہ فرسٹ فلور پر اپنے کمرے میں بے خبر پڑی سوتی رہ جاتی۔

کچھ سوچ کر اس نے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ وہ یہاں نہیں، اسے کیا پتا چلے گا کہ وہ یہاں سوئی تھی۔

یوں بھی وہ اس کے کمرے کی کسی چیز کو استعمال کرنے یا خراب کرنے نہیں، صرف آغا جان کی وجہ سے یہاں لیٹ رہی ہے۔

بیڈ پر آ کر لیٹتے وہ جانتی تھی کہ یہ ایک جھوٹی تاویل ہے جو وہ خود کو پیش کر رہی ہے۔ وہاں ان دو بیڈ رومز کے

سوا اور کوئی بیڈ روم نہیں باقی سب بیڈ روم ہٹ کر ہیں یا فرسٹ فلور پر ہیں مگر وہ لاؤنج میں سو سکتی ہے۔

آغا جان کے کمرے ہی میں سو سکتی ہے پھر نہیں کیوں؟ اس لیے کہ اس کی زندگی میں الٹی گنتی چل رہی ہے۔

یہ کمرہ اس کا ہو سکتا تھا۔

وہ اس جگہ آ سکتی تھی مگر چند روز بعد جب ہر رشتہ ختم ہو جائے گا تب وہ اس کمرے پر اپنا کوئی حق باقی نہ رکھ پائے گی۔ ابھی وہ حق اس سے چھنا نہیں۔

الٹی گنتی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ تیس تاریخ ہے۔ وہ جب تک کراچی گیا ہوا ہے وہ ان پانچ چھ دنوں تک یہ ایک معمولی سی چوری تو کر سکتی ہے۔

بیڈ کی جس سائیڈ پر اس نے اس رات اسے بیٹھے دیکھا تھا وہ اسی سائیڈ پر آ کر لیٹی اسی تکیے پر سر رکھ کر۔

اس تکیے پر سر رکھ کر بے آواز روتا اپنے کمرے میں رونے سے بہت بہتر لگ رہا تھا۔ یہاں ایک مانوس خوشبو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اس کے بیڈ پر اس کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹنا، اس کا بلینکٹ اوڑھنا۔ وہ ایک ایک خوشی، ایک ایک احساس کو اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اپنے اندر بسا رہی تھی۔

یہ سب اس کا ہو سکتا تھا۔ یہ سب اسے چوری سے، چپکے سے اور ڈر ڈر کر نہیں پوری عزت اور احترام کے ساتھ مل سکتا تھا اگر وہ زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں سب کچھ برباد نہ کر چکی ہوتی۔

وہ بے بسی سے روتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آٹھ دن بعد جب سب کچھ آغا جان کی رضامندی و خوشی کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور پھر وہ اس کی کہیں اور شادی کروانا چاہیں گے پھر وہ انہیں کیا کہے گی۔

وہ اب کبھی بھی آغا جان کو کسی بات کے لیے نہیں کہہ سکتی لیکن ولی کے علاوہ وہ کیسے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر پائے گی؟ وہ کیسے کسی دوسرے شخص سے محبت کر پائے گی؟

اس کے پاس آنسو بہانے اور پچھتانے کے سوا زندگی میں کچھ بھی نہ بچا تھا اور وہ اب یہی کر رہی تھی۔

"آپ نے کہا تھا آپ قارہ کو اپنی بہو بنائیں گے۔ آپ نے یہ بھی مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے اور میرے ابو دیکھتے رہ جائیں گے۔ پھر آج جب آپ کا بیٹا آپ کی بہو کو چھوڑ دینے والا ہے تو آپ اسے روک کیوں نہیں رہے۔ صہیب چاچا؟"

رات کا وقت تھا اور وہ اپنے پورشن اور آغا جان کے کمرے کے بیچ بنی اس جھیل کے پاس بیٹھی تھی۔ چاند کہیں بادلوں میں چھپا تھا اور اردگرد اس کا اجالا نہیں بلکہ بہت دور جلتا ایک بلب ہی یہاں پر مدھم سی روشنی پھیلا رہا تھا۔

یہ تیئیس مارچ کی رات تھی۔ ولی آج شام واپس آ گیا تھا۔

رات کا کھانا ان تینوں نے ڈائننگ روم میں کھایا تھا اور کھانے کے بعد آغا جان اور ولی قہوے اور کافی سے بالترتیب لطف اندوز ہوتے، لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب کہ وہ کھانے تک بھی بمشکل ان دونوں کا

ساتھ بھابی فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

آغا جان کے کمرے میں ایک کونے میں رکھی بیا البم وہ اپنے ساتھ اٹھا کر باہر جھیل کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ صہیب چاچا اور اپنے ڈیڈی کے کالج کی ایک تصویر دیکھتی اپنے چاچا سے مخاطب تھی۔

کتنی خوشیاں، کتنی آرزوئیں جڑی تھیں ان دونوں بھائیوں کی اس رشتے کے ساتھ۔ اپنے شہرِ دل کے اجڑنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں عزیز ترین ہستیوں کے خوابوں کی پامالی کا بھی دکھ ستا رہا تھا۔

اور اس دکھ میں یہ احساس شدت سے شامل تھا کہ ایسا سب کچھ ہونے کی وجہ بھی وہی خود ہے۔

ولی واپس آ کر اتنا ہی پرسکون اتنا ہی کمپوزڈ تھا جتنا جاتے وقت تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس سے بھی سلام دعا اور خیر خیریت جیسی رسومات اور فارمیلیٹیز بخوبی اور با آسانی نبھائی تھیں۔

صہیب چاچا اور ڈیڈی کی تصویروں کو دیکھتے ہوئے وہ ولی کے کمرے کے دروازے اور کھڑکی کو دیکھنے لگی۔

آغا جان ہی کی طرح اس کے بھی کمرے کا پچھلا دروازہ یہاں جھیل کے سامنے کھلتا تھا اور اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر شاید وہ صبح کے وقت اس جگہ کی یہ ہریالی، سبزہ اور نیلگوں پانی کی خوب صورتیاں دیکھا کرتا ہوگا۔

وہ جھیل کے پاس اکیلی بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔ گھٹنے پر سر رکھ کر بے آواز بالکل گھٹ گھٹ کر یونہی روتے روتے اسے وقت کا خیال آیا۔ وقت کا احساس جاگا۔ بے اختیار چونک کر سر اٹھاتے اس نے اپنے موبائل میں ٹائم دیکھا، گیارہ بج کر پچپن منٹ۔

بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی بچے ہیں اور بارہ بجے کیلنڈر کا نیا ورق الٹ دیا جائے گا۔

اگر وہ اپنی بات کا، اپنی ضد اور اپنی ہٹ کا پکا ہے تو صبح ہونے کا بھی انتظار نہیں کرے گا اور ٹھیک بارہ بجے اسے وہ لا دے گا جسے لینے تین مہینے پہلے وہ یہاں آئی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ بھی کیوں اگلا ہونے دے۔

وہ اچانک ہی بری طرح خوف زدہ ہوئی۔ خوف میں گھری وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وہاں سے اٹھی۔

آغا جان اپنے کمرے میں جا چکے ہوں گے مگر وہ لاؤنج ہی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اور اس اپنے کمرے میں جانے کے لیے لازمی طور پر لاؤنج سے گزرنا پڑے گا۔ ایک چیز ملنی طے ہے لیکن ابھی کیوں۔ کیا وہ خود غرضی کے یہ چند گھنٹے اور نہیں گزار سکتی؟

اس نے اپنے کمرے اور لاؤنج سے گزرنے کا ارادہ فوری طور پر رد کیا۔ اس کا رخ آغا جان کے اس طرف کھلنے والے دروازے کی سمت تھا۔ خوف سے اس کا دل انتہائی تیز رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے دل کی دھک دھک صاف سن رہی تھی۔

لمحوں کی چوتھائی میں وہ دروازہ کھول کر آغا جان کے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ نائٹ بلب تک روشن نہیں تھا مگر وہ سوئچ بورڈ تک جانے اور نائٹ بلب جلانے تک میں ایک لمحہ بھی مزید ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگر ولی بارہ بجے جو کہ بس بجنے ہی والے ہیں، اسے ڈھونڈتا یہاں آغا جان کے کمرے میں آ گیا تو۔ وہ اس

کے یہاں آنے سے پہلے بستر میں گھس جانا چاہتی تھی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر برق رفتاری سے وہ بیڈ پر لیٹی، کمبل منہ تک اوڑھ جا حالانکہ موسم بدل رہا تھا اور کمبل کی اب ضرورت نہ تھی پھر بھی اور آنکھیں اتنی مضبوطی سے بند کر لیں جیسے بہت گہری نیند سو رہی ہے۔

اب اگر وہ یہاں آیا بھی تو اسے گہری نیند سوتا پا کر واپس لوٹ جائے گا۔ خوف سے اس کا دل ابھی بھی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے۔

اچھا خوشگوار موسم ہونے کے باوجود جسم پسینوں میں نہا رہا تھا اور دل اس رفتار سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس خاموشی میں اس کی ایک ایک بے ترتیب دھڑکن کو سن رہی تھی۔

آغا جان بستر پر موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ابھی تک ولی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کبھی بھی اتنی رات تک نہیں جاگ سکتے تھے۔

لیکن آج کی رات کوئی عام رات تو نہ تھی۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ جب اس کے اور ولی کے درمیان سب کچھ دوستانہ انداز میں ختم ہو تو وہ بھی وہاں موجود رہیں۔

وہ کبوتر کی طرح خطرہ دیکھ کر آنکھیں بند کر رہی تھی یا شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا رہی تھی۔ جو بھی تھا وہ اس پل کہیں چھپ جانا چاہتی تھی۔ بھاگ جانا چاہتی تھی۔

گھڑی میں بارہ بج چکے تھے اور وہ سانس روکے آنکھیں مضبوطی سے بند کر کے لیٹی تھی۔

ایک، دو، تین گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ مزید کئی سیکنڈز اور کئی منٹ گزر گئے مگر نہ آغا جان اپنے کمرے میں آئے اور نہ ولی اسے ڈھونڈتا یہاں آیا۔

اس نے آنکھیں بند کیے نیند کی بڑی شدت سے آرزو اور دعا کی۔ اس رات کی صبح میں کیا ہوگا وہ تو اسے دیکھنا ہی پڑے گا۔ مگر یہ چند گھنٹے تو اسے مزید اس رشتے کے احساس کے ساتھ مل جائیں۔

اس کی رات کیسی گزر رہی تھی۔ انتہائی بے چینی والی۔ وہ سو گئی تھی مگر بہت بے قرار اور بہت بے چینی والی نیند۔

وہ پچھلی آٹھ راتوں میں پوری پوری رات روئی تھی۔ مگر آج رات خوف نے اسے رونے بھی نہ دیا تھا۔ وہ جاگتے میں روئی تھی نہ سوتے میں۔ اس خوف اور پریشانی سے وہ گہری نیند میں بھی چونک چونک جا رہی تھی۔

اس کی اس وجہ چونکنے والی بے قرار نیند بالکل گہری نیند میں کب بدلی اسے پتا بھی نہیں چلا۔ ہاں اس کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ کسی نے اس کا کندھا آہستہ سے ہلایا تھا۔

"صبح ہو گئی؟" آنکھیں کھولنے سے بھی پہلے بیداری کے ساتھ پہلا ڈراتا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا۔

اس صبح کے نہ ہونے کی اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔

"خاتون! اگر آپ برا نہ مانیں تو اٹھ جائیے۔ کیونکہ صبح کے سات بج چکے ہیں۔"

اپنے سر پر کھڑے ولی کو دیکھ کر وہ پوری کی پوری ہل گئی۔

وہ اسے چھوڑنے کے لیے اتنا بے قرار ہے کہ اس کے جاگنے کا بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ خود آ کر اسے جگا رہا

ہے۔ سب سے پہلی دل دکھاتی سوچ اس کے ذہن میں یہ آئی' مگر اگلے پل ولی پر سے ہوتی اس کی نگاہیں جو کمرے کے درودیوار سے ٹکرائیں تو بے اختیار وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ آغا جان ہی کے کمرے میں تو آئی تھی۔ اس نے آغا جان کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا یا جلدی اور بوکھلاہٹ میں۔ اس برابر والے کمرے میں گھس آئی تھی۔ رات اس گھپ اندھیرے میں پل بھر کے لیے کہیں یہ احساس جاگا تو تھا کہ بیڈ کی ترتیب اسی طرح ہونے کے باوجود یہاں کچھ مختلف ہے' کچھ مختلف ہونے کے اس احساس پر غالب آئے خوف نے اس سے کیا کروا دیا۔ خوف' عجلت اور بوکھلاہٹ میں وہ کتنی غلط حرکت کر بیٹھی ہے۔ اس کی خجالت سے بری حالت تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اپنی اس حرکت کی ولی کو کیا وضاحت پیش کرے؟

"سوری آپ کو اتنی گہری نیند سے جگانا مجھے اچھا معلوم نہیں ہو رہا لیکن ابھی اگر کوئی ملازم یا آغا جان میرے کمرے میں آ گئے تو میں کیا وضاحت دے پاؤں گا۔ امید ہے آپ میری مشکل سمجھ رہی ہوں گی۔"

وہ ہمیشہ سے مختلف انداز میں بات کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس انتہائی بے تکی حرکت کو انجام دے کر اپنا تماشا تو اس نے خود لگوایا تھا۔

اب وہ جو مرضی چاہے کہتا' جتنا چاہے مذاق اڑا لیتا۔ وہ پنہ کھینچ کر سر پر لیتی وہ ایک پل میں بیڈ پر سے اتر گئی۔

"آئی ایم سوری' رات میں باہر تھی۔ وہاں اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ میں آغا جان کا کمرہ سمجھ کر غلطی سے یہاں آ گئی۔" اس کی طرف دیکھتے اس نے سنجیدگی' بردباری اپناتے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"ایسی حسین غلطیاں مجھ سے کیوں نہیں ہوتیں۔ میں تو جب آغا جان کا کمرہ سمجھ کر کسی کمرے میں گیا وہ ہر بار ان ہی کا کمرہ نکلا۔"

وہ واقعی بالکل سیدھا سیدھا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس پر ہنس رہا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر مزید کوئی وضاحت دینا اپنا مزید تماشا بنوانا تھا۔ وہ چپلیں پاؤں میں ڈالے بغیر ایک جھٹکے سے وہاں سے ہٹی۔

مگر وہ آگے ایک قدم بھی نہ اٹھا سکی۔ ولی نے اسے ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

اس نے ایک نظر ولی کو اور ایک نظر اس کے ہاتھ میں جکڑے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اگر وہ بے وقوفی کی حد تک خوش فہم ہوتی تو شاید اس ہاتھ پکڑنے میں سے کوئی رومانوی معنی ڈھونڈ نکالتی۔

مگر وہ خوش فہم نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے یہاں روکنا چاہتا ہے۔ کیوں روکنا چاہتا ہے' یہ سوچتے ہی اسے پھر مضبوط قدموں سے زمین پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

"مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میرا ہاتھ چھوڑو۔"

"تمہیں پتا ہے آج کیا تاریخ ہے؟"

وہ ولی صہیب خان ہے کوئی جن یا بھوت نہیں مگر پھر بھی اس پل اس کی شکل دیکھتے وہ یوں خوف زدہ ہوئی جیسے کوئی بھوت یا آسیب دیکھ لیا ہو۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنا بھول گئی۔

اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ بیڈ پر آ بیٹھا' ساتھ اسے بھی بٹھا لیا۔ وہ اس کی طرف نہیں بلکہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ سے تلاش ہو رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

"میں نے تم سے فرسٹ اپریل کا وعدہ کیا تھا۔ آج فرسٹ اپریل ہے۔" وہ کاغذوں کو الٹ پلٹ اوپر نیچے کرتا ہوا بولا۔

وہ بھاگ جائے' غائب ہو جائے' کھو جائے' گم ہو جائے' ہوا میں تحلیل ہو جائے۔ ایک پل میں نجانے کتنی بے شمار دعائیں اپنے وجود کے مٹ جانے کی اس نے کر ڈالیں۔ سانس روکے وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا بھی تھا اور بری طرح کپکپا بھی رہا تھا۔

"وکیل نے پیپرز بھجوا تو دیے تھے۔ پتا نہیں گل خان نے لا کر کہاں رکھے ہیں۔" وہ دراز میں مطلوبہ کاغذ تلاشتا خود کلامی کر رہا تھا۔

"پیپرز بالکل تیار ہیں۔ بس صرف مجھے ان پر....." بولتے بولتے وہ ایک دم خاموش ہوا۔

"تو یہ رکھا ہے۔ اس فائل کے نیچے۔" اس نے کسی فائل کے نیچے دبا ایک لفافہ باہر نکالا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں یہاں تھا نہیں نا' اس لیے میں نے فون پر گل خان سے کہہ دیا تھا' وکیل کوئی پیپرز بھجوائے تو وہ احتیاط سے میرے کمرے میں رکھ دے۔" بولنے کے ساتھ وہ لفافہ کھولنے لگا۔

اس نے دہشت زدہ ہو کر اس لفافے کو دیکھا۔ اس میں ایک انتہائی زہریلا سانپ تھا جو باہر نکل کر اس کی پوری زندگی کو ڈس لینے والا تھا۔

"مجھے طلاق نہیں چاہیے۔" اب ان لفظوں کے کہنے سے کچھ ہو سکتا تھا یا نہیں' پھر بھی بے بسی اور بے اختیاری کی ملی جلی کیفیت میں وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"میں نے تم سے کہا تو تھا تمہیں آغا جان کے بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں میں....." وہ لفافہ کھول چکا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں مجھے طلاق نہیں چاہیے۔" اس کی کپکپاتی آواز پہلے سے بہت بلند تھی۔

"آغا جان ہمارے فیصلے میں بہت خوش ہیں اور وہ....." اپنے مخصوص سنجیدہ و مدبرانہ انداز میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

"آغا جان کی رضامندی اور خوشی سے میں نے سب کچھ کیا ہے۔"

ایک دم ہی اسے کچھ ہوا تھا' اس نے جھپٹ لینے والے انداز میں ولی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کھینچا۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں' مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں' تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟" وہ روتے ہوئے بہت زور سے چلائی۔

کھینچنے میں آدھا کاغذ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور آدھا ولی کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ کاغذ ہاتھ میں لیے وہ

زار و قطار رو رہی تھی۔

ولی کی ماں کراس گزرے پل میں جو ایک بات اس سے کہہ دی پتا نہیں اب اس کے کہنے سے کوئی فرق پڑ سکتا تھا یا نہیں مگر وہ دل کی بات کہہ چکی تھی اور اب سر جھکائے زار و قطار رو رہی تھی۔

"مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ میرے پاس دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی موجود ہیں اور سوچنے کے لیے دماغ بھی۔ مگر میں یہ بات آپ کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ایک انا پرست اور ضدی لڑکی کی ضرورت سے زیادہ اونچی ناک اور اکڑ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔" وہ اپنے ہی بولے لفظوں کی بازگشت سنتی سر جھکا کر بری طرح رو رہی تھی جب اس نے یہ آواز سنی۔

بے اختیار سر اوپر اٹھا کر اس نے ولی کو دیکھا۔ اس نے مسکراہٹ کو ضبط کیا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں کسی بات کا لطف اٹھاتی مسکرا رہی تھیں۔

ولی نے اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے کھینچ کر نکالا اور پھر اپنے اور اس کے دونوں ٹکڑوں کو ملا کر اس کے سامنے کر کے دکھایا۔ وہ آغا جان کی کسی پراپرٹی کی فروخت سے متعلق کوئی کاغذات تھے۔ اس بار اس کی اچھی بوکھلائی شکل کو دیکھ کر وہ اپنی ہنسی روک نہ پایا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بڑی شریری ہنسی ہنس رہا تھا۔

"چھپ چھپ کر میرے کمرے کے باہر سے باتیں سن کر جب آغا جان سے میری شکایتیں کرنے گئی تھیں۔ کچھ کا علم نہیں کھاتا اور ٹھیک نہیں کھاتا وغیرہ تو اس وقت میں وکیل سے اس پراپرٹی کی فروخت ہی سے متعلق بات کر رہا تھا۔"

وہ چھپ چھپ کر باتیں نہیں سن رہی تھی۔ کہنا چاہتی تھی مگر باقی ساری بات نے اس کے حواس ایسے گم کیے تھے کہ وہ یہ وضاحت کر ہی نہ سکی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اس کی بوکھلاہٹ زدہ شکل کو انجوائے کر رہا تھا۔

"دیکھو میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ فرسٹ اپریل کو تمہیں فول نہیں بناؤں گا لیکن اگر کوئی خود اپنے آپ کو فول بنائے تو اس میں میرا کیا قصور؟" وہ اس کی حماقت اور بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔

"آغا جان نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ فارہ کے معنی ذہین اور سمجھدار کے ہیں۔ صد افسوس تم نے تو اپنے نام کی بھی لاج نہ رکھی۔"

اس کا مطلب ہے یہ سب جھوٹ تھا، مذاق تھا، ولی نے اسے طلاق نہیں دی۔ وہ اب بھی اس کے ساتھ اسی رشتے میں بندھی ہے جس میں پہلے بندھی تھی۔ شرمندگی، خجالت یا جھینپ میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ ایک دم ہی پرسکون ہو گئی۔

اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ ایک پل میں ختم ہوئی۔ دل کی دھڑکن لمحہ بھر میں معمول پر آ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابھی بھی گر رہے تھے مگر سکون، اطمینان اور طمانیت والے۔ وہ آنکھوں میں بڑی شریری چمک لیے ابھی بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ تو بقول خود اپنے موروثی و خاندانی صاف گو، منہ پھٹ لڑکی ہیں پھر اتنی سی بات کہنے میں آپ کو کیا مشکل پیش آ رہی تھی؟"

"مجھے لگا تھا میں اپنی بات کہہ کر گنواؤں گی۔ نفرت کا جھوٹ تم سے ہمیشہ اتنی شدت سے بولا ہے کہ آج میری محبت کا سچ کا تم یقین نہیں کرو گے۔" وہ روتے ہوئے نظریں جھکا کر بولی۔

"اور میں یقین کیوں نہیں کرتا؟ ایسا سخت دل بھی نہیں ہوں کہ ایک انتہائی خود سر، بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی میرے لیے نیک، پروین، پروردہ شیشن بن جائے۔ معدے کے ذریعے میرے دل تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈے۔ میں کیا کھاتا، کیا پیتا اور کیا کرتا ہوں کا چوبیں گھنٹے حساب رکھے۔ چھپ چھپ کر میرے کمرے کے باہر سے میری باتیں سنے، میں اس کی پکائی چیزیں نہیں کھاتا، مجھے اس کی محبت نظر نہیں آتی وغیرہ جیسی میری شکایتیں آغا جان سے کرے۔ میں گھر سے کہیں چلا جاؤں تو بڑے اطمینان سے پورے حق کے ساتھ میرے کمرے میں آ کر سونا شروع کر دے اور میں پھر بھی اس کی محبت کا یقین نہ کروں؟" لبوں پر مسکراہٹ روکتا وہ بڑی سنجیدگی سے انگلیوں پر اس کی ایک ایک خوبی اسے گنوا رہا تھا۔

اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔

"میں اپنے کمرے کے متعلق بڑا حساس واقع ہوا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔ یہاں کی صفائی ستھرائی بھی میں اپنے سامنے کرواتا ہوں۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کل شام واپس آ کر مجھے یہ نہ پتا چل پاتا کہ میرے پیچھے یہاں کوئی آیا تھا۔

مجھے کمرے میں گھستے ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہاں میرے پیچھے کوئی آیا ہے لیکن پھر مجھے زیادہ سوچنے کا تردد یوں نہ کرنا پڑا کہ آپ جیسی سمجھدار اور ذہین خاتون یہاں ایک عدد ثبوت بھی میری آسانی کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔" اس نے سائیڈ کی اسی دراز میں سے اس کا براؤن کلچر نکال کر دکھایا۔

"یہ میرے بیڈ پر میرے تکیے کے بالکل پاس پڑا تھا۔ شکر کرو سے میں نے ہی دیکھا۔ اگر آغا جان یا کوئی اور دیکھ لیتا تو مجھ بے چارے کی تو عمر بھر کی ساری پارسائی دھری کی دھری رہ جاتی۔ میں معصوم تو پھر عمر بھر اپنی شرافت ثابت کرتا ہی رہ جاتا۔" وہ اس کی بوکھلاہٹ زدہ شکل سے مزہ اٹھاتا ہنستے ہوئے بولا۔

شرمندگی و خجالت میں گھرتے وہ فوراً وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ ہر بات کی وہ اسے وضاحت دے دے مگر راتوں کو اس کے کمرے میں آنے کی کیا وضاحت دیتی؟

وہ فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر وہ بھاگ کیسے؟ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ بیڈ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اس نے مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔

"ابھی یہ سارا قصہ اتنی جلدی سلجھانے، نمٹانے اور ختم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جس لڑکی نے چھ سال مجھے اپنے پیچھے خوار کروایا ہے۔ میں کم از کم چھ مہینے تو اسے اپنے پیچھے خوار کرواتا مگر تمہاری اس جرأت مندی اور بہادری نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں اپنی ساری انتقامی کارروائی سے تائب ہو گیا ہوں۔

میرا خیال ہے اتنی بہادر نڈر اور جرأت مند لڑکی مجھے اس کرۂ ارض پر دوسری کوئی بھی نہیں مل سکتی جسے اگر میں اپنی زندگی میں شامل کرنے سے انکار کر رہا ہوں تو وہ میرے انکار کو خاطر میں نہ لاتی۔ بے خوف و خطر خود ہی میرے بیڈ روم اور میری زندگی میں داخل ہو جائے۔

سول و فوجی اعزازات میرے مشورے سے تقسیم نہیں کیے جاتے ورنہ کل رات کی تمہاری بہادری اور جرأت مندی پر میں تمہیں تمغۂ شجاعت یا ستارۂ جرأت وغیرہ جیسے کسی اعزاز سے ضرور نوازتا۔" وہ سر جھکا کر بری طرح نروس ہوتی اس کی بظاہر سنجیدگی سے کہی باتیں سن رہی تھی۔

اس سنجیدگی میں چھپی شرارت اور طنز وہ با آسانی محسوس کر رہی تھی۔

"رات گیارہ بجے میں اور آغا جان اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ محترمہ کسی دکھیاری فلمی ہیروئن کی طرح جھیل کنارے رونے کا شغل فرما رہی ہیں۔ تسلی دینے کے لیے جانے کا گو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں دیکھتا کافی دیر رہا۔

پھر میں نے سوچا اب سو جانا چاہیے۔ اپنے لیے آنسو بہاتا آپ کسی کو کتنی دیر دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے میں بور ہو گیا۔ سونے سے پہلے میں باتھ روم گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محترمہ بصد اطمینان میرے بیڈ پر پورے حق سے موجود ہیں۔ رونے کا شغل ختم کر کے اب سونے کی تیاری ہے اور وہ بھی میرے کمرے میں، میرے بیڈ پر۔ اس جرأت مندی بہادری اور دلیری پر اش اش کرتا میں اس سامنے رکھے صوفے پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اس جرأت مندانہ حرکت کے بعد یہ لڑکی کیا رد عمل دکھاتی ہے کل صبح سارا ہنگامہ سمیٹ لیا جائے۔ تمہاری بہادری اور دلیری نے واقعی مجھے بہت امپریس کیا ہے۔" اس نے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کی۔ وہ واقعی اس وقت یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

شرم و خفت سے اس کا پورا کا پورا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"سنو! تم کیا مجھ سے شرما رہی ہو؟ اگر ایسا ہے تو یہ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز انکشاف ہو گا کہ فارہ بہروز خان جیسی نڈر اور جرأت مند خاتون کسی سے شرمایا بھی کرتی ہیں۔"

"ولی! تم مجھے نروس کر رہے ہو۔ تمہیں پتا ہے میں رات کو یہاں جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ میں غلطی سے....." اس نے منمنا کر کہنا چاہا۔

"رات نہیں آئی تھیں؟ اس سے پچھلی راتوں میں تو آتی تھیں؟ یا جب بھی غلطی ہو جاتی تھی اور غلطی ہی سے تمہاری چیزیں خود چل کر یہاں آ جایا کرتی تھیں؟"

ہاں ان آٹھ راتوں میں وہ واقعی جان کر ارادتاً اس کمرے میں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنے رشتے کے آخری دن گزار رہی تھی اس لیے لیکن وہ اس سے یہ بات کہہ تو نہیں سکتی تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

"تم اور زرمینہ اپنے دل کی کوئی بات کسی سے بھی نہیں چھپا سکتیں۔ تم دونوں ایک سی ہو۔ واقعی جو دل میں ہے وہی چہرے پر ہے۔ تم دونوں کے چہروں پر تمہارے دل کو پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے لیے کسی غیر معمولی

ذہانت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آغا جان کہتے ہیں میری پوتیوں کے دل شفاف آئینوں کی طرح ہیں۔ ان کے دل ان کے چہرے پر دکھتے ہیں اور اس منافق دور میں یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ تو جب میں تئیس چوبیس سالوں سے اپنی زبان دراز منہ پھٹ صاف گو اور بدتمیز بہن صاحبہ کو بھگتتا آ رہا ہوں تو اسی جیسی خصوصیات رکھنے والی ایک دوسری لڑکی کو کیوں نہیں سمجھ سکتا؟"

وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہولے سے کھینچتا ہوا شرارت سے بولا۔

"جب دھوم دھڑکے سے نفرت نفرت کا شور مچاتی تھیں، تب نفرت پوری طرح ظاہر ہوتی تھی اور جب میرے کمرے میں آ کر "آغا جان کے لیے اس رشتے کو برقرار رکھتے ہیں" "ان کی خاطر" "ان کی خوشیوں کے لیے" وغیرہ جیسے میلوڈرامیٹک ڈائیلاگز بول رہی تھیں، تب بھی تمہارا دل تمہارے چہرے پر رکھا مجھے بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے تم سے محبت ہے مگر اس کا اظہار کرتے اس کی مشہور زمانہ قسم کی انا آڑے آ رہی ہے۔ ناک اونچی رکھنے کے مسئلے درپیش ہیں اسے۔"

وہ بیڈ پر رکھا اپنے ہاتھ کے نیچے دبا اس کا ہاتھ بیڈ پر سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے ہاتھ کی لمبی مخروطی انگلیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"جب اس رات میرے پاس آئی تھیں تو تب تک میں نے کچھ بھی سوچا نہیں تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور نظر آتا تھا کہ میری بدتمیز اور خود سر بیوی تھوڑی سی تمیز دار ہو گئی ہے۔ کچھ سدھر گئی ہے اور ذرا نیک بن گئی ہے۔

عباد کہتا ہے ہم دونوں کی بیویاں ایک جتنی بدتمیز ہیں۔ مگر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم اس لحاظ سے شاید خوش قسمت ہیں کہ بدتمیز اور زبان کی کڑوی یہ دونوں لڑکیاں دل کی میٹھی ہیں مگر ان کے دل کی مٹھاس اور اچھائی جاننے کے لیے آپ کو ذرا رک کر ٹھہر کر انہیں دیکھنا ہو گا۔" اس نے سر اٹھا کر ولی کو دیکھا۔

وہ اس بار اس کا مذاق نہیں اڑا رہا تھا اس کی کسی کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا تو رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور سچائی تھی۔

"میں چودہ سال کا تھا تو دس سال کی اسکول یونیفارم پہنی ایک کیوٹ سی لڑکی کی تصویر بابا مما کو وہ تصویر دکھاتے کہہ رہے تھے کہ وہ لڑکی ان کی بھتیجی ہے۔ اس کا نام فارہ ہے اور وہ اسے ایک دن اپنی بہو بنائیں گے۔ اپنے ولی کی دلہن بنائیں گے۔" وہ اپنے لفظوں پر محظوظ سا ہو کر ہنس پڑا۔

"دیکھو اب یہ بات چاہے کتنی بھی سننے والی اور بیوقوفانہ سی لگے مگر چودہ سال کی عمر میں "ولی کی دلہن فارہ" کے الفاظ میرے لیے بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ اس ٹین ایج عمر میں یہ الفاظ میرے دل اور دماغ میں بالکل چپک ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ شاید اپنی زندگی کا پہلا عشق شروع کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا جب بابا وہ تصویر اپنے ساتھ لائے۔

میں نے اس تصویر کو بہت غور سے دیکھا۔ بہت حق سے دیکھا۔ بابا کہہ رہے ہیں تو غلط تو نہیں کہہ سکتے۔ ان

کی ہر بات سچ ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔

یہ سب سوچتے تب میں نے سوچا تھا کہ زندگی میں چھوٹی موٹی پسندیدگی یا کشش کبھی کسی کی طرف محسوس ہوتو ہو مگر مجھے اپنی زندگی اسی لڑکی کے ساتھ گزارنی ہے جسے پاپا نے ولی کی دلہن کہا ہے۔ میں اس لڑکی کے لیے پوزیسو ہو گیا۔

میں نے اس کی وہ تصویر اس بچکانہ عمر میں کئی بار آغا جان کے کمرے میں آ آ کر چپکے سے دیکھی بھی۔ مگر کا وہ بچکانہ دور ختم ہوا اور میں پڑھنے امریکہ چلا گیا تو وہ تصویر دیکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

مگر اس لڑکی کے لیے میری Possessiveness کبھی ختم نہ ہوئی۔ میں زندگی میں کہیں بھی چلا جاؤں، کسی سے بھی ملوں، کسی کو بھی پسند کروں مگر آخرکار مجھے زندگی اسی لڑکی کے ساتھ گزارنی ہے جسے پاپا نے میرے لیے پسند کیا ہے۔ یہ جیسے ایک طے شدہ بات تھی۔

مگر جب وہ لڑکی مجھے ملی تو پتا چلا دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ پاپا سے معصومیت سے "آپ کیا بچوں کو اغوا کرنے والے ہیں؟" پوچھنے والی تصویر میں بہت کیوٹ اور بہت سویٹ نظر آنے والی وہ لڑکی دل بھر کر بدتمیز زبان دراز اور منہ پھٹ تھی۔ میرے دل کو پہلا صدمہ اس سچائی کو جان کر پہنچا۔"

وہ سنجیدہ باتیں انتہائی غیر سنجیدگی سے کر رہا تھا۔ وہ حیرت میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔

ولی اسے اتنے پہلے سے جانتا ہے، وہ اس کے لیے اتنے پہلے سے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے؟

"دیکھو میں بہت لمبی بات نہیں کرتا۔ شروع میں جو کچھ تم نے کیا اس سے چاہے مجھے دکھ پہنچا ہو مگر تمہارے نظریے سے اگر سوچوں تو شاید تم اتنی غلط بھی نہیں۔ تم ایک دم کسی بھی مسلط کردہ رشتے کو کیوں قبول کرتیں۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ جیسا تم مجھے سمجھتی ہو میں ویسا نہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بہروز پاپا کے انتقال کے بعد تم خود کو بہت تنہا سمجھتی ہو۔ میں تمہارے اس احساسِ تنہائی کو بھی بانٹنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا ہم میں دوستی ہو، تمہاری غلط فہمیاں دور ہوں اور پھر آہستہ آہستہ تم اس رشتے کو قبول بھی کرلو مگر میری کوششوں سے کیا ہوسکتا تھا، تم تو مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہوتی تھیں۔ امریکہ جانے سے پہلے وہاں سے واپس آ کر میں نے ہر بار کوشش کی مگر سب بے کار۔ پھر بھی میں تمہارے دل سے تمام غلط فہمیاں دور کرنے سے مکمل مایوس نہ ہوا تھا۔ جب تک کہ میں نے تمہیں اور تمہارے اس ڈیئر کزن کو ساتھ ڈنر کرتے نہ دیکھ لیا۔

میں تمہیں پہلے بھی اس کے ساتھ دیکھتا رہا تھا۔ تمہاری زندگی میں اس کی غیر ضروری مداخلت مجھے کھلتی بھی تھی۔ تم اپنے ہاسپٹل میں مجھے اگنور کر کے اس کے ساتھ چلی گئی تھیں تب مجھے بہت برا ضرور لگا تھا پر تم سے نفرت محسوس نہ ہوئی تھی مگر تمہیں اس کے ساتھ اتنے خوش خوش ہنستے مسکراتے بہت بے تکلفانہ انداز میں ڈنر کرتے دیکھ کر میرے دل سے تمہیں اپنانے کی ہر خواہش ختم ہو گئی تھی۔ میری طرف نفرت سے نگاہ اٹھانے والی یہ لڑکی کسی اور کو اتنی محبت سے دیکھتی ہے۔

میں حق رکھتا تھا، میرا تم سے رشتہ تھا کہ میں تمہیں ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچتا ہوا لے جاؤں۔ تمہارے اس

عاشق صادق کو دو چار ٹھیک ٹھاک قسم کے تھپڑ اور گھونسے رسید کروں اور تمہیں اپنے گھر میں قید کر کے کہوں، "خبردار! یہاں سے باہر قدم بھی نکالا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" مگر میرا تم پر یہ حق جتانے کو بھی جی نہ چاہا تھا۔

اس روز تم میرے دل سے اتر گئی تھیں۔ اس روز تم میری نگاہوں سے بہت نیچے گر گئی تھیں۔ یہ لڑکی کسی کے بھی ساتھ زندگی گزارے مگر میں اسے اپنی زندگی میں اب شامل نہیں کروں گا۔ اسے میرے ساتھ اپنے رشتے کا کیا پاس ہوتا اسے تو اپنے مرے ہوئے باپ کی بھی شرم نہیں۔ میں تم سے اس روز نفرت کرنے لگا تھا اور تب میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر کبھی آغا جان کی وجہ سے مجھے مجبوراً تمہیں اپنانا پڑ گیا تو میں تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت دے کر اپنے ساتھ رکھ کیسے پاؤں گا؟

جو لڑکی میرے نکاح میں ہوتے کسی دوسرے کے ساتھ محبت کا تعلق جوڑ رہی تھی میں اس لڑکی کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ میں اس لڑکی کو کبھی بھی اپنی بیوی کا مقام نہیں دے سکتا تھا۔

آغا جان، پاپا، بہروز پاپا کے لیے بھی اگر ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا تب بھی تمہیں صرف ظاہری طور پر قبول کرتا۔ میں دل سے تمہیں کبھی بھی اپنا نہیں سکتا تھا۔

اس بیچ پھر اور کیا ہوا، یہ گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوگی مگر یہ بالکل سچ ہے کہ آغا جان کی شدید بیماری کا جب تم نے سنا اور پھر ان کی فون کال تک سننے سے انکار کر دیا تب تمہاری نفرت میرے دل میں مزید گہری ہو گئی اب تم مجھے ایک سخت دل، بے حس اور خود غرض لڑکی بھی لگنے لگیں۔

مگر میری مجبوری یہ تھی کہ جس سے میں نفرت کر رہا تھا، آغا جان کی اس میں جان تھی۔ میں صرف آغا جان کی وجہ سے تمہارے پاس لاہور آیا تھا اور تمہارے پاس لاہور آنے اور تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آنے کے حوالے سے میں نے تم سے اس رات جو جو کچھ کہا تھا وہ سب سچ تھا۔

میں تمہیں اس وقت انتہائی برا سمجھا تھا کہ تم صرف طلاق کا لفظ سن کر ہی یہاں آنے پر آمادہ ہوگی اور آغا جان کی بیماری کے کسی تذکرے سے تمہارے دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

تم یہاں آ کر بدل جاؤ گی۔ آغا جان کی حالت، ان کی محبت تمہیں تبدیل کر دے گی، ایسی کوئی سوچ میرے ذہن میں نہ تھی نہ ہی ہو سکتی تھی۔ تمہارے یہاں آنے اور یہاں آ کر تبدیل ہو جانے اور پھر ہمارے اس رشتے کے مستقبل کے حوالے سے بھی میں نے اس رات جو کچھ کہا اور اپنی جو فیلنگز بتائیں وہ سب بالکل سچ تھا۔

یہ وضاحت دوسری بار اس لیے کر رہا ہوں کہ تم کبھی اپنی عادت کے مطابق بدگمان ہونے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگاتے ہوئے یہ سوچنے لگو کہ میری اس رات کی تمام باتیں جھوٹ اور اداکاری تھی۔

ہاں میں تم سے اپنی کچھ فیلنگز تب ضرور چھپا گیا تھا کیونکہ یہ تو گفتگو کے اختتام سے کچھ دیر قبل میری سمجھ میں آیا تھا کہ آغا جان کا نام لے لے کر اتنی بے قراری اور اضطراب سے ہمارے رشتے کے قائم رہنے کی بات کرنے والی یہ محترمہ درحقیقت میری محبت میں مبتلا نظر آ رہی ہیں۔

"لیکن ولی! اگر ہم نے طلاق کی بات کی تو آغا جان کو تکلیف تو پہنچے گی اس رشتے میں ان کی خوشی تو تھی نا

CamScanner

ولی!" جیسے کچھ جملے جو میری بات کے جواب میں بہت پریشانی کے عالم میں کہے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے چونکایا تھا' یہ بتایا تھا کہ بات صرف آغا جان کی نہیں کسی اور محبت کی بھی ہے۔

خیر میں کہاں نکل گیا' میں تمہیں تمہارے یہاں آنے کے بعد کی بات بتا رہا تھا۔ میں آغا جان کی حالت دیکھتے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنے دل میں تمہارے لیے بہت ساری نفرت رکھ کر تمہیں یہاں لایا تھا لیکن تمہارے یہاں آنے کے اگلے ہی روز مجھے تمہارے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کرنے پڑے۔

تمہیں یاد ہے اس رات جب آغا جان نے تمہیں اپنے کمرے میں روک لیا تھا۔

میں کچھ دیر بعد وہاں دوبارہ آیا تھا' تمہارے بدتمیز ماموں جان کا فون آیا تھا۔ میں انہیں ہولڈ کروا کر تمہیں ان کے فون کی اطلاع دینے آیا تھا۔

مگر جب میں وہاں آیا تو تم اور آغا جان دونوں آنکھیں بند کیے رو رہے تھے۔ تب آغا جان کے سینے پر سر رکھ کر روتی وہ لڑکی مجھے اتنی قابل نفرت اتنی بے حس اور اتنی خود غرض و سخت دل نہ لگی جتنی لگا کرتی تھی۔ تمہارے لیے میرے خیالات تبدیل ہونے شروع ہو گئے۔

مجھے لگا کہ شاید میں تمہیں غلط سمجھتا ہوں یا شاید تم خود اپنے آپ کو ٹھیک سے نہیں سمجھتیں اس لیے اتنا غلط اور اتنا برا کرتی ہو۔

آغا جان کی بیماری' ان کا ہاسپٹل جانا' وہاں سے آنا' یہ سب واقعات ترتیب سے وہ تھے جب میں نے تمہیں ٹھیک سے جاننا شروع کیا۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ تمہارا اپنے کزن سے ایسا کوئی تعلق نہیں جیسا تم جان بوجھ کر مجھے غصہ دلانے کے لیے میرے آگے ثابت کیا کرتی تھیں۔

بہت اچھی اور نیک پروین بن جانے والی یہ خاتون میری محبت میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ یہ بہرحال مجھے اس وقت تک پتا نہیں چلا تھا۔

کچھ لگتا تو تھا کہ محترمہ میری فکر میں ذرا زیادہ مبتلا رہتی ہیں۔ میں آغا جان سے بات کر رہا ہوں تو چپکے چپکے مجھے دیکھا کرتی ہیں مگر یہ سب بس صرف شک ہی تھا' یہ شک کنفرم تو اس رات ہوا جب مجھ سے اس رشتے کو آغا جان کی خاطر قائم رکھنے کی فرمائش کی گئی۔

"دیکھو تم نے اور مجھے ٹھیک سمجھا ہو یا نہیں مگر یہ بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ میں ضدی اور انا پرست ہوں۔ واقعی مجھ میں انا بہت ہے اور اب یہ واقعی میری انا کا مسئلہ تھا کہ ایک لڑکی جو زندگی بھر مجھے ٹھکراتی رہی ہے وہ خود آ کر مجھ سے کہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ اپنے لیے اپنی اس محبت کی وجہ سے میرے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دینا چاہتی ہے۔

اب تمہیں خود میرے پاس آ کر مجھ سے کہنا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرا ساتھ چاہتی ہو' اس سے کم تر میں کسی بھی بات کے لیے راضی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مگر بہت منہ پھٹ' بغیر کچھ لیٹی رکھے بے سوچے سمجھے بولنے والی میری زوجہ محترمہ کو بھی ایک بات بولنے

میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس رات کی میری کسی بات کو نہیں' ہاں اس رات کے بعد کی تم میری ہر بات کو چاہو تو ڈرامہ' اداکاری' پوز کرنا یا جتانا قرار دے سکتی ہو۔

آغا جان کو فکر ہو رہی تھی کہ ان کی پوتی اتنی اداس' اتنی خاموش کیوں رہنے لگی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو کیوں بھرے رہتے ہیں۔

انہوں نے مجھ سے باز پرس کی' میں نے ان سے کہا۔ "یہ میرا اور میری بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ اپنی پوتی کی کوئی طرف داری مجھ سے نہیں کریں گے۔ اس نے چھ سال تک میری زندگی کو جہنم بنائے رکھا ہے۔ میں جواب میں کیا چھ مہینے بھی پچھلی کسی بات کا کوئی حساب نہیں لے سکتا۔ اعلا ظرفی اور وسیع القلبی کا یوں بھی مجھے کوئی دعوا نہیں کہ صرف یہ دیکھ کر کہ محترمہ میرے لیے کھانے پکایا کرتی ہیں۔ میرے لیے پوری کی پوری بدل گئی ہیں۔ بہت نیک اور سعادت مند بن گئی ہیں۔ میری ہلکی جدائی کے غم میں ساری ساری رات آنسو بہایا کرتی ہیں اور صبح جب اٹھ کر آتی ہیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ یہ رات بھر روتی رہی ہیں' ان کی ان کی محبت کو قبول کر لوں۔

آپ مجھے اظہار چاہیے تھا بالکل واضح اور صاف مجھ سے محبت کا اقرار۔ باقی ان رونے دھونے اور کھانے پکانے والی باتوں سے میں تبدیل ہونے والا نہیں تھا۔

ہاں مختصر یہ تم پر تھا کہ تم یہ بات کہنے میں کتنا وقت لگاؤ گی۔ میں اتنا انتظار کر سکتا تھا۔ تم فرسٹ اپریل سے خائف ہو اور یہ مجھ ہی ہو کہ میں پہلی جنوری کی اتنی پرانی وہ ایک فضول سی بات اب تک یاد رکھے بیٹھا ہوں گا۔ یہ تو مجھے ابھی ۳۱ مارچ کی صبح پتا چلا۔

میں بالکل مگن آغا جان کے وکیل سے باتیں کر رہا تھا' مجھے شک تو ہوا کہ شاید دروازے پر آ کر کوئی کھڑا ہے مگر میں نے اسے توجہ نہ دی۔ آغا جان کو خدا حافظ کہہ کر جب میں چلا گیا اور پھر یہ خیال آنے پر فوراً ہی واپس بھی آیا کہ میں نے جلدی میں ان کے پاس جا کر ان سے پیار نہیں کروایا تو کیا دیکھتا ہوں' دھواں دھار روتے آغا جان سے میری شکایتیں کی جا رہی ہیں۔

بات تو ذرا فلمی انداز اور سنگ دلانہ ہی ہے کہ ایک بندہ رو رہا ہے اور دوسرے اس کے رونے پر ہنس رہے ہیں لیکن اس وقت میرے ساتھ ساتھ آغا جان بھی ہنس رہے تھے۔ رونے کی مصروفیت سے سر اٹھا کر اگر تم اس وقت دیکھ لیتیں تو وہ تمہیں ہنستے ہوئے نظر آتے۔

اب گاجر کا حلوہ نہیں کھایا اور کیک نہیں کھایا جیسی شکایتوں پر وہ ہنسنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہاں بعد میں انہوں نے میرے کان کھینچے کہ "تم نے میری پوتی کا پکایا حلوہ کیوں نہیں کھایا جو پکایا بھی تمہاری ہی خاطر گیا تھا۔"

میں نے ان سے کہا۔ "آپ اس سارے معاملے میں کچھ بھی نہ بولیں۔ اپنی مغرور اور گھمنڈی پوتی کی مجھ سے طرف داری بھی نہ کریں۔ حلوہ پکانے میں تین چار گھنٹے برباد کر سکتی ہے تو "مجھے تم سے محبت ہے" کہنے کا ایک سیکنڈ بھی ضرور اپنے وقت میں سے نکال سکتی ہے۔"

ویسے سچی بات ہے' تمہاری اس روز کی باتوں سے مجھے تمہارے فرسٹ اپریل کے خوف کا پتا چلا اور پھر تو

CamScanner

واقعی میرا ہر عمل سو فیصد اداکاری ہی تھی۔

مجھے دل میں یہ سوچ کر ہنسی بھی آتی کہ وہ ایک پرانی بات جو میں نے اس فارہ سے کی تھی جس سے میں نفرت کرتا تھا وہ اس فارہ نے جسے میں نے اب جانا اور سمجھا ہے جو اس پرانی لڑکی سے بالکل مختلف ہے اور جو مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اب تک یاد رکھ کر بیٹھی ہوئی ہے جب کہ سچ بتاؤں تو تمہیں جاننے اور سمجھنے کے بعد میں تو اس ساری بات کو تو بھلا چکا تھا۔

زیادہ ہنسی مجھے یہ سوچ کر آتی کہ اگر تمہیں وہ ساری بات یاد ہے تو یہ بھی ضرور یاد ہوگا کہ میں نے اس دن تم سے کیا کہا تھا کیا وعدہ کیا تھا۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا میں فرسٹ اپریل کو فارہ بہروز خان کا ہر مطالبہ خواہ وہ کچھ بھی ہو پورا کرنے کا پابند ہوں گا۔

گو اس وقت ایسا اس لیے کہا تھا کہ میں تمہیں طلاق کے ساتھ کچھ دوسری چیز اس کا طلب گار بھی سمجھتا تھا لیکن فارہ بہروز خان اگر واقعی اپنے نام کے معنوں کے مطابق ذہین اور سمجھدار ہوتیں تو وہ کاغذ ضائع کرنے کے بجائے اتنا رونا دھونا مچانے کے بجائے میرے اس وعدے کو آج اپنے حق میں استعمال کرتیں۔

آج میرے پاس آ کر کہتیں۔ یہ رہا تمہارا عہد نامہ آج اسے پورا کرو۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اپنے لفظوں پر قائم رہتے میرے مطالبے کو تسلیم کرو مگر میری زوجہ اتنی ذہین ثابت ہوئی نہیں۔ ۲۳ مارچ کو ہی پھر میں نے یہ سوچا کہ ایک بندی جو خود ہی اتنا ڈر رہی ہے پتا نہیں آگے تک کا کیا کیا کچھ سوچ چکی ہے تو کیا حرج ہے اگر اسے تھوڑا سا میں بھی ڈرا لوں۔

آج فرسٹ اپریل کے لیے میں نے کچھ دوسری باتیں سوچ رکھی تھیں۔ تمہیں ڈرانے کے کچھ شاندار پلان تیار کر رکھے تھے مگر میرے کمرے میں میری بغیر اجازت پورے حق کے ساتھ گھس کر یہاں ساری رات گزار کر تم نے واقعی مجھے باقی سارے پلان بھلا دیے۔ چھ سال جس نے مجھے خوار کیا افسوس میں اسے چھ مہینے بھی خوار نہ کر سکا۔"

اسے پتا ہی نہیں تھا وہ ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ اوپر سے وہ اتنا سنجیدہ، اکھڑا اکھڑا اور خشک سا لگتا ہے اور اندر سے اتنا مختلف ہے وہ اسے دوسروں کے ساتھ مسکراتے اور بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھتی تھی تو اسے ان دوسروں پر رشک آتا، ان سے حسد ہوتا تھا جنہیں اس کا قرب اس کی بے تکلفی اور اس کی دوستی حاصل تھی۔ آج وہ اس سے ان سب لوگوں سے بھی زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہا تھا تو بے اختیار اسے خود اپنے آپ پر رشک آیا۔

وہ اس کا یقین کر رہا ہے اسے سچ سمجھ رہا ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ کتنی محبت سے پکڑ رکھا ہے۔ اس کی مضبوط گرفت میں ایک محبت بھرا استحقاق ہے۔

"ولی! کیا تم میرا یقین کرتے ہو؟" یک بارگی اس کا دل چاہا وہ بہت کچھ جو وہ پہلے اس کے یقین نہ کرنے کے خوف سے کہہ نہ پائی تھی آج کہہ ڈالے۔

"ولی! معیز میری زندگی کا کوئی اہم انسان نہیں تھا۔ وہ صرف ایک کزن، ایک دوست تھا۔ میں ڈیڈی کے بعد تنہا ہو گئی تھی۔ ممی مجھ سے بہت دور ہو گئی تھیں تب میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر میرا اس سے کوئی

رشتہ نہیں تھا اور اس رشتے کو بھی میں مکمل طور پر ختم کر چکی ہوں۔ اب نہیں اب سے بہت پہلے۔ تمہیں یاد ہے جب آغا جان ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے ہم دونوں گھر واپس آئے تھے اور معیز اسی وقت یہاں آیا تھا تب تمہیں پتا ہے میں نے اس سے ....." ولی نے یک دم اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

"مجھے تمہارا یقین ہے فارہ! تمہیں اب مجھ پر کچھ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اس کے ساتھ ذرا کرتے دیکھ کر جو کچھ میں نے سوچا یا اس کی تمہاری زندگی میں غیر ضروری مداخلت پر جو کچھ میں سوچتا تھا یہ سب تب کی باتیں تھیں جب تم یہاں آئی نہیں تھیں جیسے تم نے ان تین مہینوں میں مجھے سمجھا ہے ایسے ہی میں نے بھی تمہیں ان تین مہینوں میں سمجھا ہے۔

ان تین مہینوں میں میں نے جانا ہے کہ فارہ بہروز خان وہ نہیں جو پچھلے چھ سالوں میں جان بوجھ کر چیخ چلا کر بدتمیزیاں کر کے ہم سب پر ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وہ ہم سب سے نفرت اس لیے کرتی تھی کیونکہ اسے ہم سب سے نفرت کرنی ہی سکھائی گئی تھی۔

اس نفرت ہی کے سبب وہ جان کر ہمارے سامنے خود کو اتنا برا بناتی تھی جتنی بری وہ ہرگز نہیں تھی۔

فارہ بہروز خان ضدی، جذباتی، غصے کی تیز، منہ پھٹ، بدتمیز سب کچھ ہو سکتی ہے مگر وہ ایک باوقار اور سچی لڑکی ہے۔ وہ اگر مجھ سے محبت نہ کرتی تو کبھی محبت کا جھوٹا اظہار بھی نہ کرتی اور میں یہ بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا معیار کبھی بھی اتنا پست اور گرا ہوا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بھی گھٹیا اور سطحی ذہن کے انسان کو پسند کر لیتی اور اس کی محبت میں بھی مبتلا ہو جاتی۔"

وہ اس پر اعتبار کرتا ہے، اس کا یقین کرتا ہے، خود اپنے آپ کو اپنی ہی نظروں سے سرخرو ہوتا دیکھنا ایسا تھا کہ ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"جیسے آج میرا اعتبار کر رہے ہو ایسے مجھ پر ہمیشہ اعتبار کرنا ولی! کبھی مجھے غلط مت سمجھنا۔ یہ بھی مت یاد رکھنا کہ میں پہلے تم سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی۔ جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تھی تو نفرت کیسے کرتی؟ میں نے تمہیں اب جانا ہے اب سمجھا ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ میرے ڈیڈی نے میرے لیے ایک بہت اچھے انسان کو چنا تھا۔" اس کے لبوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کے تیزی سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتا وہ ایک دم ہی ہنس پڑا۔

"میری تعریف کے جواب میں یہ تعریف اتنی ضروری تو نہیں تھی۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اپنی تعریف سننے کی امید پر تمہاری تعریف کی تھی۔"

اس کا لہجہ چاہے کتنا ہی غیر سنجیدہ اور لاابالی سا ہو مگر وہ اپنے چہرے پر سے آنسو خشک کرتے اس کے ہاتھ کی ہر انگلی اور ہر پور میں یہ جذبات محسوس کر سکتی تھی کہ چاہے وہ زبان سے نہیں کہہ رہا مگر اسے اس کا رونا اچھا نہیں لگ رہا۔

وہ اس کے کل رات کے رونے کا چاہے جتنا بھی مذاق اڑا لے یا لطف لے لے مگر در حقیقت وہ اسے روتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ کوئی آپ کی پروا کرتا ہے۔ آپ کسی کے لیے بہت اہم ہیں، یہ احساس کتنا دل کو خوشی بخشنے والا احساس ہوتا ہے۔

CamScanner

"تم میرا اعتبار کرتے ہو ولی! اس لیے میں تمہیں ایک بات اور بتا رہی ہوں ورنہ شاید کبھی بھی بتا نہیں پاتی۔

تین مہینے پہلے فرسٹ جنوری کو جب تم مجھے لینے لاہور آئے تھے۔ میں ان دنوں بہت ڈسٹرب، بہت پریشان تھی۔ ممی مجھ سے ناراض ہو کر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ میں اپنے گھر پر بالکل تنہا تھی۔ میں اپنی زندگی میں بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔

مگر اس پریشانی سے بڑھ کر میں آغا جان کے ساتھ اختیار کردہ اپنے رویوں پر اندر ہی اندر پریشان اور پشیمان تھی۔

میں نے ان سے فون پر بات نہ کی اپنے گھر پر ان سے مس بی ہیو کیا۔ ان سب باتوں نے مجھے اندر ہی اندر بہت زیادہ گلٹی فیل کیا ہوا تھا۔

تم نے مجھ سے یہاں آنے کو کہا تو پتا ہے زبان سے چاہے میں نے تم سے جو کچھ کچھ بھی کہا ہو مگر دل سے میں کسی طلاق کے لالچ میں نہیں صرف اپنے دل کے یہ کہنے پر تمہارے ساتھ آئی تھی کہ مجھے آغا جان کے پاس جانا چاہیے جو آغا جان نے تم لوگوں کو سکھایا! وہ مجھے ڈیڈی نے سکھایا تھا۔ "فیصلہ کرنے کے لمحے میں ہمیشہ اپنے دل کی آواز سنو" میں اپنے دل کی آواز سن کر یہاں آئی تھی ولی! تم سے طلاق لینے کی امید پر ہرگز نہیں۔"

اپنے دل کی وہ باتیں جو اسے لگتا تھا وہ اسے کبھی بتا نہ پائے گی اور بتائیں تو وہ ہرگز ان پر یقین نہیں کرے گا۔

وہ سب اسے بتانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو کسی بوجھ سے آزاد کرتی جا رہی ہے۔

وہ اس کے آنسو صاف کر چکا تھا مگر اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے چہرے پر تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اس نے اب بھی بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

"اب ایک ایک کر کے تم مجھے پچھلی کی ہر بات کی وضاحت دو گی؟ جب مجھے یہ یقین ہے کہ فارہ بہروز خان ایک سچی لڑکی ہے تو پھر دل سے یقین ہے۔ مجھے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تمہاری ایک خوبی بتاؤں فارہ! دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی غلطیاں کرتی ہو مگر تم میں اور دوسرے لوگوں میں یہ فرق ہے کہ جب تمہیں تمہاری غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو پھر تم اپنی غلطی پر اڑی نہیں رہتیں۔ تم اپنی غلطیاں بڑے ظرف کے ساتھ قبول کرتی ہو پھر تم اپنی غلطیوں کے لیے تاویلیں نہیں ڈھونڈ کر لاتیں۔ دوسروں کی طرح اپنی غلطیاں کسی اور کے سر ڈال کر خود کو بری الذمہ نہیں سمجھتیں۔

اس منافقت، جھوٹ اور دھوکے سے بھری دنیا میں تمہاری سچائی، صاف گوئی اور اپنی غلطیاں قبول کر لینے کا ظرف بہت نایاب اور قابل قدر خوبیاں ہیں۔"

وہ بہت سنجیدگی سے بولتے آخر میں کچھ سوچ کر مسکرایا پھر شرارتی لہجے میں اس سے بولا۔

"اب تمہاری باری ہے میری تعریف کرنے کی۔ اس بات کے لیے آغا جان فارسی کی ایک بڑی اچھی مثال دیا کرتے ہیں۔ افسوس مجھے موقع پر یاد آ نہیں رہی۔"

وہ بھی جواباً مسکرائی مگر پھر کچھ اور یاد آ جانے پر دوبارہ سنجیدہ ہو گئی۔

"میں ایک بات کہوں ولی!؟" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولنے لگی۔

"ممی یہاں آنے والی ہیں۔ کیا تم ان کے پچھلے تمام رویے بھلا کر ان کے لیے اپنا دل وسیع کر پاؤ گے؟ میں ان کا کوئی فیور نہیں کر رہی ولی! میں مانتی ہوں انہوں نے تمہارے ساتھ ہمیشہ بہت برائی ہی کیا ہے ان کی طرف سے میں تم سے معافی مانگ رہی ہوں۔ پلیز میری خاطر ان کی طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔"

وہ ان دو لوگوں کے بیچ جن سے اسے شدید محبت تھی اب کوئی کشیدگی اور تناؤ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ولی نے اس کی آنکھوں کی امید کی طرف دیکھا۔

وہ آس و ڈر اس میں گھری اسے کچھ ڈرتے ڈرتے دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ جواب میں کیا کہہ دے۔

وہ آغا جان جتنا وسیع القلب اور عالی ظرف نہیں تھا۔ صرف اس کے لیے اپنے ساتھ کوئی بدسلوکی اور بدتمیزی ہوئی ہوتی تو وہ با آسانی بھول جاتا مگر روحی بہروز خان نے ایک بار نہیں کئی بار اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے آغا جان کی توہین کی تھی۔ ان کا دل دکھایا تھا۔ ان کی بے عزتی کی تھی۔ معاف کرنا اگر مشکل تھا تو بھول جانا اس سے بھی زیادہ مشکل۔

مگر وہ اس لڑکی کی آنکھوں کی یہ امید بجھتی نہیں دیکھ سکتا تھا کسی اور حیثیت سے نہ سہی لیکن جس سے وہ محبت کرتا ہے اس کی ماں سمجھ کر وہ کوشش کرے گا کہ روحی بہروز خان کے لیے اپنے دل میں وسعتیں پیدا کر سکے۔

سر اثبات میں ہلاتے اور اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے دباتے اس نے فارہ کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس کے اور اپنی ماں کے تعلقات کے حوالے سے فکر مند نہ ہو۔

"ولی! یہ تم نے فارہ کو کہیں....." باہر سے ہی بولتے آغا جان اچانک ہی اس کے کمرے کا دروازہ ایک ہلکی سی دستک کے ساتھ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

ولی نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور اس کے چہرے پر سے بھی فوراً اپنا ہاتھ ہٹایا۔ ہاتھ چھوڑنے اور ہٹائے جانے کو انہوں نے دیکھا یا نہیں مگر پانچ فٹ سات انچ کی اپنی وجاہت سالم پوتی تو انہیں بغیر چشمے کے بھی اس بیڈ پر ولی کے برابر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

انہوں نے اسے اچانک انٹری دی تھی کہ صورت حال کو فوری سمجھتے اور بوکھلا کر ولی کے برابر سے کھڑے ہونے میں بھی اسے ایک سیکنڈ تو ضرور لگا۔

"میں سارے گھر میں سب سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں فارہ کہاں ہے، صبح ہو گئی اب تک میرے پاس نہیں آئی۔ رات بھی مجھے شب بخیر کہنے نہیں آئی تھی۔"

وہ اس طرح سنجیدگی سے بولے جیسے کمرے میں موجود ماحول اور صورت حال نہ انہوں نے دیکھی ہے اور نہ سمجھی ہے۔

وہ بوکھلائی ہوئی اور بے حد نروس تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آ سکا کہ وہ جواباً کیا کہے۔

"آغا جان! فارہ مجھ سے یہ کہنے آئی تھی کہ آغا جان سے کہو ہماری شادی کروا دیں۔ آخر نیک کام میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں؟"

ولی کا اطمینان اور سکون اگر قابل رشک تھا تو یہ جملہ بھی کم از کم اس کے چودہ طبق روشن کر دینے والا تھا۔

CamScanner

بوکھلاہٹ بھلا کر اس نے ولی کو غصے سے دیکھا۔ اتنی فضول بات اور وہ بھی اس کے نام سے۔

"بات تو بھی بالکل ٹھیک ہے۔ نیک کام میں دیر ہرگز نہیں ہونی چاہیے، کیا خیال ہے تم لوگوں کا" کب کی تاریخ رکھیں۔" آغا جان اس کی بوکھلائی اور غصے میں جل جل شکل کا مزا لیتے بظاہر سنجیدگی سے بولے۔

"بس اس مہینے کا کوئی سا بھی مبارک جمعہ رکھ لیں۔"

"جمعے تو سارے مبارک ہوتے ہیں۔"

"بس تو پھر جو سب سے پہلا جمعہ آ رہا ہے وہ رکھ لیں۔" ان دونوں کے بیچ اس گفتگو میں وہ جیسے خاموش تماشائی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آغا جان! بیٹھیں نا۔" ولی انہیں دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر فوراً بولا۔

"آنے والے جمعے میں دن کتنے کم رہ گئے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہنے سے سب کام نہیں ہو جائیں گے۔

ہتھیلی پر سرسوں جماتے وہ دادا پوتا کھڑے کھڑے شادی طے کر چکے تھے۔ آغا جان جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے وہ اس پر برہم ہوئی۔

"تم کتنے جھوٹے ہو ولی! آغا جان ٹھیک کہتے ہیں تم صرف نام کے ولی ہو۔ ولیوں والی کوئی ایک بھی صفت تم میں نہیں۔"

اور ولی کے کمرے سے باہر نکل کر اپنے کمرے کی طرف آتے آغا جان پوتی کی اس جھنجھلائی غصے بھری آواز کو سن کر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

ان دونوں کو ایک ساتھ اور اتنا خوش دیکھتے انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے دور کہیں آسمانوں پر ان کے دونوں بیٹے بھی اس منظر کو ان ہی کی طرح دیکھ رہے ہوں۔ اس پر انہیں کی طرح خوش ہو رہے ہوں۔

وہ قاروں کی خوشی کے لیے اس رشتے کو اگر کبھی ختم کرتے تو اس رشتے کے ختم ہونے سے انہیں بہت تکلیف بہت دکھ پہنچتا۔ اس رشتے سے ان کے دو بیٹوں کی آرزوئیں اور ان کی خوشیاں جڑی تھیں۔

وہ اپنے بیٹوں کی خوشی ان کی آرزو پوری ہو جانے پر بے حد خوش تھے اور اس پر بھی کہ خوشیوں کی یہ تکمیل کسی جبر سے نہیں محبت سے ہوئی تھی۔ وہ محبت کی جنگ ہارے نہیں تھے۔

وہ سب نفرتوں کو اپنی ایک محبت سے شکست دے گئے تھے۔ ان کی ایک محبت نے ہزار نفرتوں کو ہرا دیا تھا۔

ان کے دل میں یہ یقین مزید راسخ ہو رہا تھا کہ محبت، محبت ہی سے جیتی جاتی ہے اور محبت کبھی ہارتی نہیں۔ محبت کبھی ہار ہی نہیں سکتی۔

انسانوں کے انسانوں کے ساتھ باہمی تمام جذبوں کو جب اللہ نے روزِ ازل تخلیق کیا تو محبت ہی وہ واحد جذبہ تھا جس کی تقدیر میں جیت، جیت اور صرف جیت لکھی گئی۔

محبت کی قسمت میں ہار نہیں اور یہ اس رب کا فیصلہ ہے۔

CS CamScanner